

روزانہ درس قرآن پاک

تفسیر

سُورَةُ الْبَقَرَةِ

جلد ۲

لفاد لیت

حضرت مولانا صفوی عبدالحمید صاحب سواتی

خطیب جامع مسجد نور گوہر حلب النوالہ

طبع سولہ

(جملہ حقوق بحق انجمن محفوظ ہیں)

معالم العرفان فی درس القرآن (سورۃ البقرہ و آیت ۱۴۱)

حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی خطیب جامع مسجد نور کوہ جرائوالہ

الخان للعلوین۔ ایم اے علوم اسلامیہ

۳۹۶ صفحات

پانچ سو (۵۰۰)

سید الخطاطین حضرت شاہ نقیص الحسنی مدظلہ

محمد امین اللہ قادری کوہ جرائوالہ

مکتبہ درس القرآن فاروقی کتب کوہ جرائوالہ

۱۵۵ روپے

نام کتاب

افادات

مرتب

نئی مدت

تقدیر و سہولت

بروز

تاریخ

نشر

قیمت

دسمبر ۲۰۰۷ء بمطابق ذیقعد ۱۴۲۸ھ

ملنے کے پتے

(۱) مکتبہ درس القرآن محلہ فاروقی کتب کوہ جرائوالہ (۵) کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی

(۲) دارالافتاء دارالحدیث دارالعلوم کوہ جرائوالہ (۶) کتب خانہ مجیدیہ بیرون پور کیتھ مائن

(۳) مکتبہ قادیانہ دارالحدیث دارالعلوم کوہ جرائوالہ (۷) مکتبہ علمیہ نزد جامعہ دارالحدیث کوہ جرائوالہ

(۴) مکتبہ سید احمد شہید دارالحدیث دارالعلوم کوہ جرائوالہ (۸) اسلامیہ کتب خانہ اذکار کوہ جرائوالہ

(۹) مکتبہ رشیدیہ برکی روڈ کوہ جرائوالہ

فہرست مضامین

دروس القرآن پارہ ۱ جلد ۱

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۲	استقامت کی ضرورت	۱۵	پیش لفظ (زالحان علی بن خطاب) ائمہ علوم اسلامیہ (لاہور)
۰	مبادی	۱۹	سخن گوئی (ذکر شریف فاضل در نصرة العلوم وچراغ الالہ)
۳۳	سجاد	۳۳	درس اول (آیت ۱۲)
۳۴	درس دوم (آیت ۱۳)	۰	سورۃ اور آیت
۰	محکمات متشککات مقلعات	۰	آیت کے مختلف معانی
۳۵	۱۰۰۱ حدیث اور ان کی تفہیم	۲۵	سورتوں اور آیتوں کی ترتیب
۰	حدیث مقلعات پر مضمون کے باب میں	۲۷	صحابیوں کی آثار و عطا طراست
۳۶	حضرت صدیق اکبرؓ	۲۷	ذکر تسمیہ
۰	حضرت علیؓ	۰	مکی اور مدنی سورتیں
۰	حضرت ام شہیدؓ	۲۸	ترتیب تلاوت کی اہمیت
۰	حضرت ابن مسعودؓ	۰	فہمیت سورۃ
۳۷	حضرت ام رازقہؓ	۲۹	مضامین سورۃ
۰	مقلعات اسمائے الہی ہیں	۳۰	نام اور کوائف
۳۸	مقلعات اسمائے قرآنی ہیں	۳۱	سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ میں رب
۰	مقلعات بحیثیت جلیغ	۰	مہات دین
۳۹	اہم اخلاقی حکم رائے	۰	معرفت الہی
۰	عبداللہ بن عباسؓ کا قول	۳۲	ثبوت نبوت

۵۵	انسانوں سے تین گروہ	۴۰	امام ہودؑ کی تحقیق
۵۶	کفر و معنی	۴۱	شیخ ابن عربی کا قول
	کفر کی مختلف اقسام	۴۱	نزول مقطعات معجزہ سرور کائنات
	کفر و انکار	۴۲	امام بیضاوی کا قول
۵۷	کفر و خود	۴۲	امام شاہ ولی اللہؒ کا فلسفہ
۵۸	کفر و غدار	۴۳	مولانا سودر دی کا نظریہ
	کفر و نفاق	۴۴	مذہب فریبی کا قول
	کفر و شک	۴۵	خیرت و خسر
۵۹	کفر و بہات	۴۶	درس سوم ۲ (آیت ۵۱)
	کفر و تاویل	۴۷	لفظ ذہن کی حکمت
	عملی کفر	۴۸	لفظ زاریب کا مفہوم
	کفر و ہریت	۴۹	مولانا شیخ السنہ کی تفسیر
	ایک اشکال اور اس کا جواب	۵۰	منہجین کے لیے ہدایت
۶۳	درس پنجم ۵ (آیت ۵۲)	۵۱	تقویٰ کی تعریف
	گزشتہ سے پیوستہ	۵۲	تقویٰ کے تین درجات
	ان آیات کا مسند اق کون میں	۵۳	مستقی کون ہیں
۶۵	مہر لگانے کا مطلب	۵۴	ایمان بالغیب
	دلوں کی سیاہی	۵۵	اقامت صلوٰۃ
۶۷	اعضائے ریکشٹ میں باز پرس ہوگی	۵۶	انفاق فی سبیل اللہ
۶۸	اعضائے ریکشٹ میں سے قدب کی اہمیت	۵۷	کتاب سادہ پر ایمان
۶۹	غدا اب عظیم کی وجہ	۵۸	ایمان بالآخرت
	اعضائے ریکشٹ کام نر ایک ہے	۵۹	ہریت و ہنر لوگ
۷۱	درس ششم ۶ (آیت ۵۳)	۶۰	درس چارم ۴ (آیت ۵۴)

۹۰	منافقین کی مثال	۷۱	گزشتہ سے پیوستہ
۹۱	انہی دوسری منافقت قسمیں	۷۲	منافقین کا گروہ
۹۳	منافقین کی بدعتی	۷۳	منافقین کی قسمیں
۹۵	درس ششم ۹۰ (آیت ۱۲۰ تا ۱۲۹)	۷۴	نفاق دینی بیماری ہے
"	گزشتہ سے پیوستہ	۷۵	فاد فی ارض
۹۶	منافقوں کی دوسری مثال	۷۶	منافقین کی دھوکہ دہی
"	اعتقادی اور عملی منافق	۷۷	حکومتی سطح پر نفاق
"	دل کی چار قسمیں	۷۸	عذاب عظیم اور عذاب الیم میں فرق
۹۷	ایمان اور نفاق کی مثال	۷۹	درس ہفتم ۹۰ (آیت ۱۶۳ تا ۱۶۴)
"	قلب کی چھ حالتیں	۸۰	گزشتہ سے پیوستہ
۹۸	بارش کی مثال	۸۱	حقیقی ایمان
۹۹	منافقین کی بے بسی	۸۲	معیار حق
۱۰۰	درس و ہکم ۱۰ (آیت ۲۲ تا ۲۳)	۸۳	انسان اور اس کا دل
"	گزشتہ سے پیوستہ	۸۴	حقیقی انسان کون ہیں
"	خاطیہ قرآن	۸۵	بیوقوف کون ہیں
۱۰۲	چار ہم جنس ضامین	۸۶	منافقوں کی دوسری پالیسی
"	ترتیب	۸۷	استنزاز من اللہ کا مفہوم
۱۰۳	صفات النبی	۸۸	ہدایت کے بدلے گمراہی
"	معرفت النبی	۸۹	درس ہشتم ۱۰ (آیت ۱۸۰ تا ۱۸۱)
۱۰۵	عبادت النبی	۹۰	گزشتہ سے پیوستہ
۱۰۶	وجود النبی پر دلائل	۹۱	کتب آسمانی اور اشد
۱۰۹	درس یازدہم ۱۰ (آیت ۲۲ تا ۲۳)	۹۲	تفاسیر اہم القرآن
"	ترجیح عبادت کے لیے شرط ہے	۹۳	مثال کی حکمت

۱۳۰	۱۱۰	گزشتہ سے پیوستہ	۱۱۰	دلائل توحید
۱۳۱	۱۱۱	حقیر چیزوں کی مثالیں	۱۱۱	کب اتنا سوال اور اس کا جواب
۱۳۲	۱۱۲	حیا کی مختلف قسمیں	۱۱۲	عبادت کیوں ضروری ہے
۱۳۳	۱۱۳	ہدایت اور گمراہی	۱۱۳	عبادت کے لائق صرف ذات باری ہے
۱۳۴	۱۱۴	فاسق کا معنی	۱۱۴	زمین کے فوائد
۱۳۵	۱۱۵	ہیرو و منافقین کی عمدہ شہنشاہی	۱۱۵	آسمان اور پانی کی نعمت
۱۳۶	۱۱۶	قطع رحمی	۱۱۶	لفظ نہ کا معنی
۱۳۷	۱۱۷	صلہ رحمی	۱۱۷	نہ ٹھہرانے کی مختلف صورتیں
۱۳۸	۱۱۸	فساد فی الارض	۱۱۸	شرک فی المشیت
۱۳۹	۱۱۹	نافعین کی ناکامی	۱۱۹	شرک فی العادت
۱۴۰	۱۲۰	درس چہار و دہم ۱۴ (آیت ۲۸ تا ۲۹)	۱۲۰	شرک کی دوسری قسمیں
۱۴۱	۱۲۱	گزشتہ سے پیوستہ	۱۲۱	شرک خفی
۱۴۲	۱۲۲	اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر	۱۲۲	اطاعت بغیر اللہ
۱۴۳	۱۲۳	موت و حیات تصرف الہی میں ہے	۱۲۳	درس دواز دہم ۱۵ (آیت ۲۲ تا ۲۵)
۱۴۴	۱۲۴	محاسبے کا عمل	۱۲۴	گزشتہ سے پیوستہ
۱۴۵	۱۲۵	میت و دفن کرنے کے آداب	۱۲۵	قرآن پاک خاص معجزہ ہے
۱۴۶	۱۲۶	تمام چیزیں انسان کے لیے ہیں	۱۲۶	عبد با عزت لفظ ہے
۱۴۷	۱۲۷	موت سامان عبرت ہے	۱۲۷	قرآن بطورہ جلیج
۱۴۸	۱۲۸	شیار میں اسلحہ امت ہے	۱۲۸	سکھین قرآن کی سزا
۱۴۹	۱۲۹	آسمانوں کی تخلیق	۱۲۹	ایمانداروں کے لیے بشارت
۱۵۰	۱۳۰	علیم کل صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے	۱۳۰	بھپوں میں مشابہت
۱۵۱	۱۳۱	عبادت الہی لازم ہے	۱۳۱	بائیدہ بیویاں
۱۵۲	۱۳۲	درس پانزدہم ۱۵ (آیت ۳۰)	۱۳۲	درس سیز دہم ۱۶ (آیت ۲۶ تا ۲۷)

۱۴۰	جنت سے نروج	۱۴۰	گذشتہ سے بیروت
۱۴۱	زمین ہی اصل ٹھکانا ہے	۱۴۱	موضوع
۱۴۲	درس ہشودھم (آیت ۲۹ تا ۳۹)	۱۴۲	ہر صفتی بادشاہ ہوگا
۱۴۳	گذشتہ سے بیروت	۱۴۳	خلق انانی سے قبل کے اور
۱۴۴	حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ	۱۴۴	قرشتوں کا مادہ تخلیق
۱۴۵	حضور علیہ السلام کی حضرت آدم علیہ السلام پر نفیست	۱۴۵	بغاث اور شیاطین
۱۴۶	زمین پر اترنے کا حکم	۱۴۶	ان کا مادہ تخلیق
۱۴۷	حضرت آدم علیہ السلام اور حوا کی مباحثات	۱۴۷	حضرت آدم علیہ السلام خلیفۃ اللہ میں
۱۴۸	جنت کے تحفے	۱۴۸	مسک خلافت
۱۴۹	حضرت آدم علیہ السلام کا مقام نزول	۱۴۹	درس شانزدہم (آیت ۲۱ تا ۳۳)
۱۵۰	بعض افسانہ نویس اسلام کے پیٹھے	۱۵۰	گذشتہ سے بیروت
۱۵۱	توبہ کی قبولیت	۱۵۱	آدم علیہ السلام کو کن چیزوں کے نام سکھائے گئے
۱۵۲	توبہ کی نثر الط	۱۵۲	ہلالہ کا امتحان
۱۵۳	نورین یہ آتے کی حکمت	۱۵۳	آدم علیہ السلام کی کامیابی
۱۵۴	توبہ کی حقیقت	۱۵۴	درس سببہم (آیت ۲۲ تا ۲۹)
۱۵۵	ہدایت کے متبعین	۱۵۵	قرشتوں کی سجدہ ریزی
۱۵۶	کفار و مکذبین	۱۵۶	خدا تعالیٰ کے لوگوں پر سجدہ عوام ہے
۱۵۷	درس نوزدھم (آیت ۳۰ تا ۴۲)	۱۵۷	قرشتوں کے سجدہ کی بعض ترکیبات
۱۵۸	تاریخ بنی اسرائیل	۱۵۸	ابلیس کا انکار
۱۵۹	بنی اسرائیل پر انعامات	۱۵۹	محمد اولین گناہ ہے
۱۶۰	بنی اسرائیل کی تہ شکنی	۱۶۰	حضرت آدم علیہ السلام اور حوا جنت میں
۱۶۱	ایمان بالقرآن	۱۶۱	شجر ممنوعہ
۱۶۲		۱۶۲	شیطان دوسرے

۲۱۲	۱۸۹	دنیا کی محبت
۲۱۳	۱۹۰	تہیں اور کتنا حق
۲۱۳	۱۹۲	درسِ بست و ستر (آیت ۴۳ تا ۴۶)
۲۱۴	۱۹۱	گزشتہ سے پیوستہ
۲۱۵	۱۹۳	قبولِ حق سے انکار کی وجوہات
۲۱۶	۱۹۴	حبِ مال و جاہ کی بیماریاں
۲۱۷	۱۹۴	بیماریوں کا علاج
۲۱۸	۱۹۵	نماز جامع عبادات ہے
۲۱۹	۱۹۵	نماز باجماعت
۲۲۰	۱۹۶	قول و فعل میں تفاد
۲۲۱	۱۹۸	صبر و صلوٰۃ کی برکات
۲۲۲	۲۰۰	رجوع الی اللہ
۲۲۳	۲۰۱	درسِ بست و ستر (آیت ۴۷ تا ۵۰)
۲۲۴	۲۰۲	ربط آیات
۲۲۵	۲۰۳	بنی اسرائیل کی فضیلت
۲۲۶	۲۰۴	اسلامی تاریخ کی حفاظت
۲۲۷	۲۰۵	امت مسلمہ کی برتری
۲۲۸	۲۰۶	برتری کا معیار تقویٰ ہے
۲۲۹	۲۰۷	مذہبِ شاعت
۲۳۰	۲۰۸	فرعون سے نجات
۲۳۱	۲۰۹	فرعون کی مذبذبی
۲۳۲	۲۱۰	درسِ بست و ستر (آیت ۵۱ تا ۵۴)
۲۳۳	۲۱۱	نزولِ توراۃ

۲۵۰	آیات النی کا انکار	۲۳۱	حکم خداوندی میں تبدیلی
"	نبیاء عیسم السلام کا قتل	۲۳۲	عالمی قوانین اور حق شعور
۲۵۱	نافرمانی اور حد سے تجاوز	۲۳۲	وراثت میں شریک کا حصہ
۲۵۳	درس سبب و مہفت ^{۲۵} (آیت ۶۲)	"	ظلم و کاست
"	قانون نجات	۲۳۴	زمین کی آبادی اور بربادی
"	مذہبِ عالم	۲۳۵	درس سبب و مہفت ^{۲۵} (آیت ۶۰)
۲۵۴	اہل ایمان	"	رابطہ آیات
"	ہکادوا کا مضمون	"	بنی اسرائیل کا طلب آب
۲۵۵	یسودی کی وجہ تسمیہ	۲۳۶	استسقا کی حقیقت
"	یسودی عقائد	"	استسقا کا طریقہ
۲۵۶	نصاری کی وجہ تسمیہ	۲۳۷	ضربِ گھسی
۲۵۸	نصاری کے عقائد باطلہ	۲۳۹	پانی کی تقسیم
۲۵۹	صابی کون ہیں	۲۴۰	ایک اعتراض اور اس کا جواب
"	صابیوں کے عقائد	۲۴۱	معجزہ اور کرامت
۲۶۱	ضعیفی بقت بد صابی	۲۴۲	ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر
"	ایمان باللہ	۲۴۳	فاد فی الارض
۲۶۲	ایمان بالآخرت	۲۴۵	درس سبب و مہفت ^{۲۵} (آیت ۶۱)
"	اعمالِ صالحہ	"	رابطہ آیات
۲۶۴	درس سبب و مہشت ^{۲۵} (آیت ۶۳ تا ۶۴)	۲۴۶	غلامی کے اثرات
"	بنی اسرائیل کا عہد	"	طعام کی تبدیلی
۲۶۵	ارتقاءِ طور	۲۴۷	کاشتکاری و مشقت طلب کام ہے
۲۶۶	دین میں جبر نہیں	۲۴۸	پیشے بمطابق فطرت
۲۶۷	اسماکِ باکتاب	"	یسودیوں کی ذلت و رسوائی

۲۶۹	مصلحت النور	قرآن کی پابندی
۲۷۰	آ کی نشانیاں	بنی اسرائیل کی عمدگی
۲۷۱	آخر مجبور ہو گئے	درس بست و نہ (آیت ۶۵ تا ۶۶)
۲۷۲	فضول و کمالات کا نشانہ	یہود کا مقدس دن ہفتہ
۲۷۳	واقو قتل	جمعہ کی فضیلت
۲۷۴	ایسے موتی بھرد مجوزہ	یہود کی قانون شکنی
۲۷۵	قتل و زانیہ سے بڑھت	یہود کے تین گروہ
۲۷۶	درس کی وڈو (آیت ۶۷)	انسان بدہن گئے
۲۷۷	قادت قبی	جیل سازی بڑی خصلت ہے
۲۷۸	پتھر دل سے زیادہ سخت دل	جائز جیل سازی
۲۷۹	پتھر دل کے فوائد	تبدیلی اشکال کی توجیہ
۲۸۰	سجدہ تقرب الی اللہ کی علامت ہے	نشان عبرت
۲۸۱	جنس اکابر دین	درس سکی (آیات ۶۷)
۲۸۲	مسلمانوں کی ناکامی کی وجہ	رابط آیات
۲۸۳	درس کی وڈو (آیت ۶۸ تا ۶۹)	واقعہ ربط
۲۸۴	رابط آیات	وجہ قتل
۲۸۵	یہود کی طرف سے نا اہلی	قانون قاتل
۲۸۶	احکام میں تحریر	کثرت سوال سے بچو
۲۸۷	یہود کی ہٹ دھرمی	نبی سے قطع تعلقی
۲۸۸	یہود کے ساتھ موافقت اور ان کی مخالفت	ٹھانڈا ہے
۲۸۹	منافقین کی چالیاں	خوش بختی با نڈے
۲۹۰	یہود کی موجودہ آرزوئیں	درس کی ویکٹ (آیت ۷۰ تا ۷۱)
۲۹۱	تورہ میں تحریر	رابط آیات

۳۰۵	تحریر اور مسلمان	۳۰۵	درس کی ویرہشت (آیت ۸۲ تا ۸۶)
۳۰۶	تحریر کرنے والوں کو دینہ	۳۰۶	گزشتہ سے بیوستہ
۳۰۷	درس کی ویرہشت (آیت ۸۰ تا ۸۲)	۳۰۷	نور انوار اور جلالہ
۳۰۸	یہودیوں کے باطل عقائد	۳۰۸	بنی اسرائیل کی عہد شکنی
۳۰۹	عہد خداوندی	۳۰۹	یہودیوں کی باہمی لڑائیاں
۳۱۰	باطل عقائد کی بنیاد	۳۱۰	مسلمانوں کی حالت زار
۳۱۱	مسلمانوں کے باطل عقائد	۳۱۱	سید تعالیٰ عالم الغیب ہے
۳۱۲	قانون نجات	۳۱۲	درس کی ویرہشت (آیت ۸۴ تا ۹۰)
۳۱۳	کافر اور مشرک دائمی جہنمی ہیں	۳۱۳	کتاب اور رسول
۳۱۴	جنت کا چال	۳۱۴	حضرت مسیحی علیہ السلام اور معجزات
۳۱۵	درس کی ویرہشت (آیت ۸۳)	۳۱۵	روح القدس
۳۱۶	ربط آیات	۳۱۶	انبیاء عظیم السلام کے ساتھ سلوک
۳۱۷	قرعہ کے دو پہلو	۳۱۷	یہودیوں کا زعم باطل
۳۱۸	بنی اسرائیل کے مختلف عہد	۳۱۸	یہود پر اللہ تعالیٰ کی لعنت
۳۱۹	معرفت الہی	۳۱۹	زود اور نزول قرآن
۳۲۰	الدین سے حسن سلوک	۳۲۰	نظریہ قوسل
۳۲۱	قرابتہ اردو کے حقوق	۳۲۱	بنی انحراف الزماں علیہ السلام سے حسد
۳۲۲	یتیم، یتیمیں اور فقیہ	۳۲۲	غضب پر غضب
۳۲۳	درس کی ویرہشت (آیت ۸۳)	۳۲۳	درس کی ویرہشت (آیت ۹۱ تا ۹۶)
۳۲۴	گزشتہ سے بیوستہ	۳۲۴	گزشتہ سے بیوستہ
۳۲۵	تہذیب اخلاق	۳۲۵	دعوت ایمان
۳۲۶	حسن سکھ	۳۲۶	نبی عظیم السلام کا قتل
۳۲۷	نماز اور زکوٰۃ	۳۲۷	کوسلہ پرستی

۲۵۰	موت کی آرزو	۲۵۰	نبیاں نبوی میں مدانی	۲۵۱
۲۵۱	ظہر علیہ السلام کی خواہش	۲۵۱	نافع اور رضا علم	۲۵۱
۲۵۲	موت و حیات کی طلب	۲۵۲	یہودیوں سے معرفت	۲۵۲
۲۵۳	درس چہل ویکٹ (آیت ۱۰۷ تا ۱۱۰)	۲۵۳	درس چہل ویکٹ (آیت ۱۰۷ تا ۱۱۰)	۲۵۳
۲۵۴	شان نزول	۲۵۴	رابط آیات	۲۵۴
۲۵۵	نزول وحی کی مختصص صورتیں	۲۵۵	بنی اسرائیل کی اخلاقی بستی	۲۵۵
۲۵۶	مقرب فرشتے	۲۵۶	نصوح علیہ السلام کی نظریات	۲۵۶
۲۵۷	جبرائیل علیہ السلام سے دشمنی	۲۵۷	اہل ایمان کو خطاب	۲۵۷
۲۵۸	اہل ایمان کے لیے بشارت	۲۵۸	مشقیہ لفظ استعمال کی ممانعت	۲۵۸
۲۵۹	فرشتوں سے دشمنی اللہ تعالیٰ سے دشمنی ہے	۲۵۹	پیغمبر کے لیے لفظ لیدر کا استعمال درست نہیں	۲۵۹
۲۶۰	مقربین کا عہد دی معنی ہے	۲۶۰	نبرا کا عمل سے حد	۲۶۰
۲۶۱	واضح نشانیاں	۲۶۱	تفسیر آیات کی وجوہات	۲۶۱
۲۶۲	کتاب اللہ سے روگردانی	۲۶۲	بادشاہی اللہ تعالیٰ کی ہے	۲۶۲
۲۶۳	درس چہل ویکٹ (آیت ۱۰۷ تا ۱۱۰)	۲۶۳	درس چہل ویکٹ (آیت ۱۰۷ تا ۱۱۰)	۲۶۳
۲۶۴	شیطان کا اتباع	۲۶۴	رابط آیات	۲۶۴
۲۶۵	حضرت سلیمان علیہ السلام پر جادو گر جو شیکا الزام	۲۶۵	یہودیوں کے سوالات	۲۶۵
۲۶۶	جادو کے ذرائع	۲۶۶	مشقین کے حالات	۲۶۶
۲۶۷	ہدوت اور ہدوتوں کے	۲۶۷	نہرین گمراہی	۲۶۷
۲۶۸	ہدوت اور ہدوت کی معنی شہادت	۲۶۸	کثرت سوالات کی ممانعت	۲۶۸
۲۶۹	ہدوت اور ہدوت کے واقعے سے انکار	۲۶۹	اہل کتاب کے باطنی ارادت	۲۶۹
۲۷۰	سحر کیا ہے ؟	۲۷۰	حمد بہترین بیماری سے	۲۷۰
۲۷۱	کیا ہدوت، ہدوت انسان تھے ؟	۲۷۱	غیر مسلم ماحول اقوام	۲۷۱
۲۷۲	کیا سارا جادو کفر ہے ؟	۲۷۲	مد زہر پر اعتراضات	۲۷۲
۲۷۳	جادو گر کی سزا	۲۷۳		۲۷۳

۴۱۱	خوش و مضبوط	۲۹۱	قرآن پاک کے فطرت ساز
۴۱۲	استقبال قبلہ	۲۹۲	نماز اور زکوٰۃ
۴۱۳	درس چیل و شش (آیت ۱۱۹ تا ۱۲۰)	۲۹۳	نئی کامیابی
"	اللہ تعالیٰ اولاد سے پالے	۲۹۴	درس چیل و چہار (آیت ۱۲۱ تا ۱۲۲)
۴۱۵	تشبیہ اور شرک	"	ربط آیات
"	مُسْحَانْدُ کَاحِی	"	یسو و نصاریٰ
"	ملک بعد مملوک	۲۹۶	نجات کا دار و مدار
۴۱۶	صفت ابداع	۲۹۷	اتباع خداوندی
"	اللہ تعالیٰ کی طرف غلط نسبت	۲۹۸	نیک نیتی
۴۱۷	اللہ تعالیٰ سے کلام کی خواہش	۲۹۹	اعمال صالحہ
۴۱۸	حضور علیہ السلام کے معجزات	"	فرقہ بندی ذریعہ نجات نہیں ہے
"	حضور علیہ السلام کے لیے تسلی	۳۰۰	قانون نجات
۴۲۰	درس چیل و ہفت (آیت ۱۲۱ تا ۱۲۲)	"	اجر عظیم
۴۲۱	گذشتہ سے بہتر	۳۰۳	درس چیل و پانچ (آیت ۱۲۳ تا ۱۲۵)
"	رضائندی کے لیے اہل کتاب کی شرط	"	یسو و نصاریٰ آئیں آئیں
"	ہدایت الہی ہی اصل ہدایت ہے	۳۰۴	کتاب کاریہ بزرگ
۴۲۳	اہل کتاب میں سے اہل ایمان	"	حضرت سلیمان علیہ السلام پر الزام تراشی
"	حق قیامت	"	مشرکین کا نظریہ
۴۲۴	مشرکین کے لیے خار و	۳۰۵	آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی ہوگا
"	حق و باطل کی پہچان	"	تحویل قبلہ
۴۲۵	بنی اسرائیل پر انعامات	۳۰۷	جہنم میں رکاوٹ
۴۲۶	قیامت کا نقشہ	"	تمام چیزیں نے قابلِ تغیر ہیں
۴۲۷	درس چیل و ہشت (آیت ۱۲۶ تا ۱۲۷)	۳۰۹	سمجھ کے آداب
"	گذشتہ دروس پر ایک نظر	۳۱۰	

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پیش لفظ

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى

اما بعد

الْرَّحْمَنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ○ خَلَقَ الْإِنْسَانَ ○ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ○

یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ قرآن پاک ہی وہ ضابطہ حیات ہے جس پر عمل پیرا ہو کر انسان اس دنیا میں بھی اس دہین کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اور آخرت میں بھی جنت کی بے پایاں نعمتوں سے مالا مال ہو سکتا ہے۔ یہی وہ لائحہ عمل ہے جس نے عرب کے صحرائیوں کو قعر مذلت سے نکال کر ہم عروج تک پہنچایا۔ تاریخ اٹھ کر دیکھئے زندہ نزول قرآن میں پورا عرب کس قسم کے ماحول میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ کون سی بڑائی ہے جو قرآن پاک کے اولین مخاطبین میں نہ پائی جاتی تھی، وہ کونسا غیر فطری امتیاز ہے جو میر وغریب، اہل اہل کوہ سے، آقا و غلام، عربی و عجمی کی صورت میں موجود نہ تھا۔ منڈیوں میں عورتوں اور بچوں کی خیر و ذرہ منت ہوتی تھی۔ بچکوں کی زندہ دگر گرد کر دیا جاتا تھا، وہ لوگ سیاسی نظم و نسق کے نام سے ناشتا تھے، وہاں نہ کوئی باقاعدہ حکومت تھی، نہ کوئی ضابطہ اور قانون تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ خدشا رہتا تھا۔ کسی کی جان و مال محفوظ نہ تھے، جنگل کا قانون رائج تھا اور جس کی لامٹی اس کی بھینس والا معاملہ تھا۔

خداوند تعالیٰ نے یہ نام کی کوئی چیز ان کے ہاں نہ تھی، وہ لوگ جائز ناجائز، پاک، ناپاک اور طلال و حرام سے ناشتا تھے، زنا، جوارچ رزی، قتل و غارتگری کے دلدادہ تھے۔ ایک دلاشتہ سے کوئی پردہ نہ تھا، نیچے طواف ہوتے، اخلاقی گویوٹ کا یہ حال تھا کہ باپ کی موت کے بعد اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کر لیتے تھے بہت پستی و ذلیل پنہ تھی، توحید نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہ تھی، طرح طرح کے توہمات

کاشکار تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کے دعویدار اُن کی تعلیمات سے کوسوں دور تھے۔
 پھر وہ وقت بھی آیا جب حضور نبی کریم ﷺ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پاک ہوئی، نزولِ قرآن
 کا سلسلہ شروع ہوا، اور جب اسی حوالہ کی پروردگار جابل اور نوازندہ قوم نے قرآن پاک کو سینے سے لگایا تو
 دیکھتے ہی دیکھتے یہ بے لگام قوم دنیا کی مہذب ترین قوم بن گئی، قیصر و کسریٰ اس کے سامنے سرنگوں ہو
 گئے، رابین و اسہاب بن گئے۔ ————— پھر اور ڈاکو امین بن گئے، حسب و نسب پر فخر کرنے
 والے کالے کلوٹے بمبشی غلام کو سیدہ ناکتہ لگ، سیاست سے نابلد قوم، مہذب ترین قوموں کو سبق
 سکھانے لگی، ضرب و حرب کے وہ معرکے دکھائے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے تک
 اسلام کا پرچم بائیس لاکھ مربع میل پر لہرانے لگا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں قرآنی تعلیمات کے ثمرات دنیا
 کے گوشے گوشے میں نظر آنے لگے، مگر مقامِ افسوس ہے کہ گذشتہ چند صدیوں سے مسلمان پوری دنیا میں ذلیل
 ہوتے، ایک ارب کی آبادی اور دنیا میں چالیس سے زیادہ ملکوں پر حکمرانی کے باوجود مسلمان قوم ذلت
 و سکنت کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ وہ قومیں جو ان کے نام سے کانپا کرتی تھیں، آج ان پر سلاطینِ مملکت
 پیر بادشہز کے دستِ نچو ہو کر رہ گئے ہیں، حتیٰ کہ اسرائیل جیسا بزدل بھیڑیا جب چاہتا ہے ان کے محلے
 میں گھس کر انہیں شکار بنالیتا ہے۔ وجہ ظہر ہے۔ بقول علامہ اقبال:

وہ معزز تھے زمانے میں مسلمان ہو کر اور ہم خوار ہیں تارکِ قرآن ہو کر

جب سے مسلمانوں نے قرآن پاک کا دامن چھوڑا ہے، ذلیل ہو کر رہ گئے ہیں، مسلسل ناکامیوں
 کاشکار ہیں۔ بلاشبہ تمام غیر مسلم اقوام ملتِ واحدہ ہیں، اُن کی بیشتر سے یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان قوم
 مغلوب اور ذلتی دستِ نچو بن کر رہے، اس مقصد کے حصول کے لیے ان کے پاس ایک ہی نسخہ ہے کہ کسی طرح مسلمان قرآنِ کریم سے دستِ نچو
 ہو جائیں وہ خوب جانتے ہیں کہ مسلمان قرآنی پروگرام پر عمل کر کے کبھی غلبہ نہیں آئے تھے اور اس پروگرام کے محسن جاننے سے ہی مغلوب
 ہیں۔ نزولِ قرآن کے وقت بھی وہ یہ کہتے تھے وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ
 وَالْغَوْفِ بِهِ لَعَنَّكُمْ تَقْبَلُونَ ۝ دیکھنا تمہارے کانوں میں قرآن کی آواز نہ پہنچے پائے۔ بلکہ
 خوب شرمیہ تاکہ کوئی دوسرا بھی سن کر اس کا گرویدہ نہ ہو جائے۔ تمہاری کامیابی کا یہی راز ہے۔ آج
 جس وہ لوگ یہ نسخہ آزماتے ہیں مگر ہم خوابِ غفلت میں پڑے ہیں، قرآن پاک کی تعلیمات سے بے بہرہ
 ہو چکے ہیں۔ یہ کلام مقدس بآبی صورت میں ترجمہ سے دور نہیں، ہم اسے ریشمی غلافوں میں لپیٹ

کر اپنے طاقتوں میں سجاتے ہیں، کبھی کبھی قنوت بھی کر لیتے، حسن قرأت کی مخلصی بھی جہتے ہیں، مگر کبھی یہ توفیق نہیں ہوتی کہ قرآن پاک سے دریافت کریں کہ تیرے نذول کا مقصد کیا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری ذمہ داری قرآن پاک کے ادب و احترام تک ہی محدود ہے، اس کو سمجھ کر اس پر عمل کرنا کسی اور قوم کا کام ہے۔ یاد رکھئے، اگر آج ہم نے قرآن پاک کو سینے سے لگایا تو بارگاہ رب العزت میں کتنی ذلت و رسوائی اٹھانا پڑے گی جب خود رسول شکایت کریں گے۔ یَسْرِبُ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا یعنی اے مولا کریم! میری قوم نے قرآن پاک کو نظر انداز کر دیا تھا۔

قرآن پاک کو بیغام گھر گھر پہنچانے کے لیے مفسرین کرام نے ہر زمانے میں اپنی ذمہ داری پوری کی ہے۔ اور زبانی اور تحریری صورت میں قرآن پاک کی تفسیر و تشریح کا فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اور قیامت تک جاری رہیگا۔ ضرورت صرف ان لوگوں کی ہے جو قرآنی پروگرام کو لے کر اٹھیں اور دنیا میں ایک دفعہ پھر اسلامی انقلاب برپا کر دیں۔

دروس القرآن کا یہ سلسلہ بھی اپنی بساط کے مطابق قرآن پاک کے علوم و معارف کو آسان اور عام فہم زبان میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ آئیے ہم قرآن پاک کی آواز کو کانوں کے ذریعے دل میں جگہ دیں، اس پر غور فکر کرے اس سے رہنمائی حاصل کریں اور پھر عمل پیرا ہو کر اپنا کھریا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر لیں، نہ صرف دنیا کو امن کا گنوار بنادیں بلکہ آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں سرخرو ہو جائیں۔ وَمَا عَلِمْنَا إِلَّا الْبَلَاغَ

الحمد للہ سلسلہ دروس القرآن کی دوسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس سے پیشتر جلد اول جو کہ سورۃ فاتحہ پر مشتمل ہے شائع ہو چکی ہے۔ جلد دوم پارہ اول مکمل پر مشتمل ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس منصوبے کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ ایسے کام کے لیے پوری زندگی وقف ہوئی ہے۔ کام وسیع اور کمشن ضرور ہے، مگر ناممکن نہیں۔ اس کام کے لیے آج جس طرح وسائل میا ہیں اور کارکنان کی پوری ٹیم جس طرح قرآن پاک کے ساتھ والہانہ محبت اور دلی لگاؤ کے ساتھ مصروف کار ہے، ہم اُمید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مہربانی سے یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچے گا۔

اس جلد پر کام شروع کرتے وقت اس کی ضخامت کے متعلق تردد تھا کہ آیا یہ جلد پوری سورۃ بقرہ

پرمشکل ہوگی یا اسے پارہ اول تک محدود کرنا پڑے گا۔
 — پارہ اول کے مسودے کی ضخامت اور اس پر صرف ہونے والے وقت کے پیش نظر آخری فیصلہ ہوا، کہ سورۃ بقرہ کو دو حصوں میں شائع کیا جائے، پہلا حصہ مکمل پارہ اول پرمشکل ہوا اور دوسرے حصہ میں پارہ دوم اور سورۃ کا بقیہ حصہ از پارہ سوم آجائے۔ یہیں پورا پورا احساس ہے کہ اس جلد کی اشاعت میں ایک سال سے زیادہ عرصہ لگ گیا ہے اور قارئین کو اندازے سے کچھ زیادہ ہی انتظار کرنا پڑا اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

دوسرے پارے پر کام جاری ہے۔ ہمارا اندازہ یہ ہے۔ کہ سورۃ بقرہ کے ہر دو حصے تقریباً برابر برابر ضخامت کے ہوں گے۔ اور اس کے بعد ہر جلد ایک یا ایک سے زائد مکمل سورتوں پرمشکل ہو کر گی اس طریقے سے ہر جلد مکمل پارہ جات پرمشکل تو نہیں ہوگی، تاہم مکمل سورتیں اس میں آسکیں گی اسف صالحین نے اسی طریقہ کو پسند فرمایا ہے۔

اگرچہ وقت کے لحاظ سے تو نہیں مگر کام کی نوعیت کے اعتبار سے ہمیں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ کام جس قدر وسیع اور کٹھن ہے، اس کے لیے اُسی قدر مسلسل محنت کی ضرورت ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ کام کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے اسے مزید وقت دیا جائے تاکہ ہر آمدہ جلد کے لیے انتظار کی گھڑیاں کم سے کم ہو سکیں، قارئین کرام سے التماس ہے۔ کہ اس سلسلہ اشاعت سے وابستہ جملہ کارکنان خصوصاً صوفی صاحب محترم کی درازی عمر اور صحت اور اس عظیم کام پر استقامت کی دعا کریں۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ

احقر العباد

(الحاج، لعل دین، ایم اے (علوم اسلامیہ)
 شالامار ٹاؤن، لاہور

سخنہائے گفتنی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ
خَاتَمِ الْاَنْبِیَاۡہِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِهِ وَاَصْحَابِهِ وَاَزْوَاجِهِ وَاتَّبَاعِهِ
اَجْمَعِیْنَ۔ اَمَّا بَعْدُ

• خیر اُمّت: کا خطاب پانے والی قوم آن جس قدر دیگر گروں حالات، پستی اور
تہ تنزل کے جس خطرناک دور سے گزر رہی ہے۔ وہ کسی گوش شنوا اور چشم بینا سے مخفی نہیں۔ اعمال و
اخلاق اسلام کی قید سے تقریباً آزاد ہو چکے ہیں۔ ایسا دہمردی، مشترک اجتماعی مقاصد اور ملی ترقی کی
کوشش کے بجائے، نفس پرستی، خود غرضی، اور ذاتی حقوق مقصد حیات بن چکا ہے، دفتروں میں
عزت کی عمویت اور استیصال اس قدر عام ہے کہ پناہ بجز ابر دولت والا شخص جس کی عزت پر چاہے ہاتھ ڈالے
اور کمزور آدمی کے لیے جائز حقوق کا حصول بھی تقریباً ناممکن ہے اور حصول انصاف حقائق ہے۔ دوسروں کو
پچائی کا سبق دینے والی قوم نے آج خود جھوٹ کو روزی کھانے کا ذریعہ بنالیا ہے، عربانی و فحاشی عروج پر
ہے، فرقہ وارانہ کشمکش، فوجی استبداد، مارشل لا کی طاغوتی حکومتیں، جدید آلات و انکشافات کا غلط استعمال
تصویری فتنہ، مد سے زیادہ آرام طلبی اور رفاہیت باغیہ کافور، کھیل و تماشا کی کثرت، اسلام کو اپنے
غلط مقاصد کے لیے استعمال کرنا، ملکیت کی عشرت پسندیاں، اسراف اور بدت طرازیوں، اللہ تعالیٰ
کی کتاب کی غلط تفسیریں اور باطل تاویلیں، رسم و رواج کی فراوانی، اور دھوکا بازی اور فریب دہی
میں دوسری تمام قوموں کو مات کر دیا ہے۔ اور ان کے ماضی کا تمام ریکارڈ توڑ دیا ہے، قوم کی دیانت،

شرافت، صداقت اور امانت کا حال کسی سے مخفی نہیں، اِنَّكَ الْمَوْضُوْعُ لِمَنْ اِخْوَةٌ دِمَامُ مُسْلِمَانِ آپس میں بھائی بھائی ہیں) کی تعلیم پانے والی قوم کے ممالک اور افراد آپس میں نبرد آزما ہیں۔ آئے دن قتل میں اضافہ، گھر کے اندر عزت اور باہر جان محفوظ نہیں، اشتراکیت، سرمایہ داری کی لعنت کے عروج، عیسائیت، یہودی ازم کی تباہ کاریوں، ہندو ازم کی تنگ نظری سے متاثرہ قوم، زبان پر اسلام اسلام اور عمل اس کے برعکس اور اسلام کی پیٹیٹ میں ایک ذہر آلود خنجر ہے۔

بائیں ہمہ مسلم معاشرہ میں ایسے افراد بھی موجود ہیں۔ جو کہ صحیح معنوں میں قرآنی تعلیمات سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔ اور اسلام کی صحیح تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تمنا رکھتے ہیں، ان حالات میں مسلمانوں کے ساتھ دلی ہمدردی اور ان کی اس حالتِ زار پر دردِ دل رکھنے والے حضرات کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ کہ وہ ان کو صحیح قرآنی تعلیمات سے روشناس کرائیں۔

بحمد اللہ تعالیٰ حضرت مولانا صوفی عبد الحمید صاحب دَامَ مَجْدُہِم کا انداز بیان سادہ اور دلپسند ہے۔ قلیس، بناوٹ اور تکلف سے دور لیکن پُر مغز، جامع اور مسلک سلف کے مطابق منشاء قرآن کا صحیح منظر ہے۔ اور داعی الی القلِّ برصغیر پاک و ہند میں سب سے پہلے قرآن کریم کا ترجمہ فارسی زبان میں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کیا۔ اس کے بعد شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ نے اردو میں بے حد مفید ترجمے کیے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے حکیمانہ تفسیر لکھی۔ اور دیگر بزرگانِ دین نے بھی اپنی اپنی طاقت کے مطابق اس میں حصہ لیا۔ متاخرین میں حضرت تھانویؒ، کابیان القرآن، حضرت شیخ السنہ کا ترجمہ اور تفسیر، تفسیر عثمانی اور حضرت لاہوریؒ کا ترجمہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی تفسیر معارف القرآن اور اس قسم کے دیگر تراجم اور تفسیر مستند اور ہر اعتبار سے سے خلقِ خدا کے لیے نافع ہیں۔ اور دل میں کلامِ الہی پر عمل کا سچا جذبہ پیدا کرنے والے ہیں۔

معالم العرفان فی دروس القرآن بھی اسی پاکیزہ سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اور چند وجوہ کے اعتبار سے ممتاز بھی ہے۔ عام فہم طرز، انداز بیان میں مخاطبین کے ذہنوں کا لحاظ، واقعات کا سلسلہ انتہائی مربوط اور دورِ حاضر کی دینی ضرورتوں کو پورا کرنے کی رعایت، مسلمانوں کی بنیادی خامیوں کی واضح نشاندہی، تفسیری سلسلہ کے شبہات اور جدید دور میں پیدا ہونے والے بڑے بڑے شبہات کا بڑے لطیف انداز میں حل تحقیق کے نام پر تحریر کرنے والوں اور جدت پسند حضرات کی ٹھوکروں کی نشاندہی، سیاسی، اقتصادی، معاشی، فقہی مسائل اور جدید دور کے مسائل کی الجھی ہوئی گتھیوں کا قرآن و سنت اور سلف صالحین کے

مسک کے مطابق سمجھنا، تاریخی واقعات اور کہیں کہیں مغترین سلف اور ان کی کتب کا تعارف، فلسفہ دینی اور تصوف کا افادی پہلو، ویسے بھی حضرت صوفی صاحب دہم مجہد کا نام نامی ہی کسی کتاب کے مستند ہونے کے لیے کافی ہے۔

اجکل مسلمانوں کے باہمی اتفاق کے لیے بڑی پر زور کوششیں ہو رہی ہیں۔ تقاریر، جلسے، اخباری مضامین، لٹریچر، مباحثے، پیچھے اور تصنیفات کے ذریعے باہمی اتفاق پر زور دیا جاتا ہے۔ لیکن اصل میں جو چیز اتفاق کی جڑ ہے، اور کوئی توجہ نہیں کرتا، یعنی مخالفت پر تنقید میں حد اعتدال سے تجاوز، آپس کے اختلافات کی شدت اور ایک درس گھر سے بعد کا ایک بست بڑا سبب زبان کی درشتی اور تیزی ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ دروس القرآن میں باطل مذہب کی پوری پوری تردید، اور گمراہ فرقوں کے غلط عقائد و مسائل اور نظریات پر نئے ششہ انداز میں تنقید ہے۔ لیکن اعتدال کو کسی حالت میں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور عام آدمی پر بھی حقیقت حال واضح ہو جاتی ہے۔ اور قرآن و سنت کا صحیح مشاہدہ سامنے آ جاتا ہے۔ اور حق کا تلاشی حق کو پا لیتا ہے۔

سلسلہ دروس القرآن کی دوسری جلد آپ کے باقروا ہیں۔ اس سے پیشتر سورۃ فاتحہ پر مشتمل جلد اول شائع ہو چکی ہے۔ یہ جلد سورۃ بقرہ کے سولہ رکعات یعنی پہلا آیت پر مشتمل ہے۔ سورۃ بقرہ میں سینکڑوں منسائیں بیان ہوئے ہیں لیکن اس کا مرکزی مضمون یہود کے غلط عقائد کا بیان اور ان کی تردید، ان کی خباثت اور تنزیل کے اسباب، ان کی سیاہی غلطیاں اور روحانی بیماریاں اور ان کی اوصاف ہے۔ امت مسلمہ بھی آج انہیں حالات سے دوچار ہے جس میں بنی اسرائیل تھے۔ مجر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی حالات کی پیشین گوئی آج سے چودہ سو سال پہلے فرمائی تھی۔ لَبَّائِتَيْنَ عَلَىٰ اُمَّتِي كَمَا آتَىٰ عَلَىٰ اَبْنِیْ نَسْرَآبِیْكَ الْبَیْتَ مَزْدَرِیْمِیْنِ اَمْتِ پَرِیْ اِیْہِ لَوْرَیْہِ حَذُو النَّعْلِ بِالنَّعْلِ دَرَمَکَہِ

جس طرن بنی اسرائیل پر آیا یہاں کہ جوتے کے ساتھ جوتا ملے۔ تو اس طرن آن کے جملہ مسائل کا حل بھی صرف اور صرف قرآن پاک میں ہی ہے۔ قرآن پاک کا مشہور دہماد سمجھنے اور افہام کو کتاب الہی کے قریب تر کرنے کے لیے دروس القرآن یقیناً بہترین راہنما ہو چکی ہے۔ علماء، طلباء، خطباء اور خواہم بلکہ ہر طبقے کے لیے یہاں مفید ہے۔ تفسیر کے ساتھ ساتھ عام فہم، سلیس اور داور معنی خیز ترجمہ بھی سامنے آ رہا ہے۔

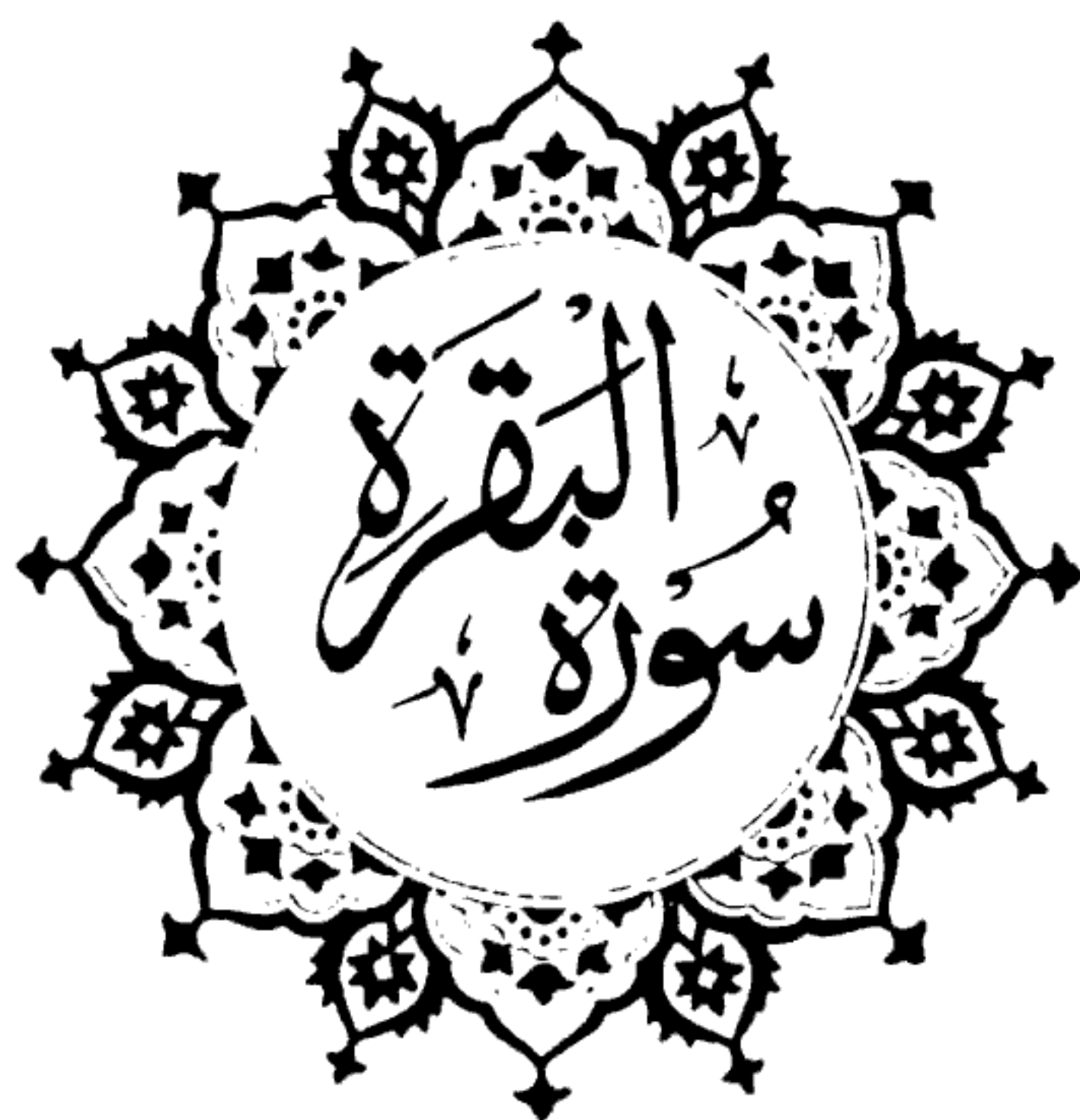
آخر میں دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دروس کو صاحب درس حضرت صوفی صاحب دہم مجہد اور انجمن مجاہد شاعت قرآن کے جملہ اراکین جو کہ دروس القرآن کی طباعت اور ان دروس کو کیسٹوں

کے ذریعے ہر خاص و عام تک پہنچانے کے لیے دن رات کوشاں ہیں۔ خصوصاً جناب الحاج لعل دین صاحب
ایم اے علوم اسلامیہ اور اس میں حصہ لینے والے تمام حضرات کی بخشش کا ذریعہ بنائے ان کی اس سعی کو قبول
فرمائے اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اس سے فیضیاب ہو سکی تو فی حق عطا فرمائے۔ آمین۔

فقط

محمد اشرف (فاضل مدرسہ نصرة العلوم)

۵ صفر ۱۴۰۵ھ مطابق ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء



آلہ

درس اول

البقرة

(آیت ۲ تا ۲۵۶)

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَكِّيَّةٌ نَبِيَّتُهَا هَانِئَانٌ وَسِتٌّ وَتَأْمَنُ آيَتُهَا الْعَوْنُ رُكُوعًا
سورة بقرہ مدنی ہے اور یہ دو سو چھیاسی آیتیں اور چالیس رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

آلہ ① ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۚ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲

ترجمہ۔ آلہ ① یہ کتاب، نہیں شک اس میں یہ رہنمائی کرتی ہے متقیوں کی ②

سورة کے موضوع اور نام سے پہلے قرآن کریم کی سورتوں سے متعلق چند بنیادی باتوں کا ذکر ضروری ہے، اس کے بعد سورة بقرہ کے نام کے بارے میں کچھ بیان ہوگا۔

لفظ سورة س کے ساتھ آیا ہے۔ اور اس کا معنی ہے قِطْعَةٌ مِّنَ الْاٰیٰتِ

سورة اور آیت

یعنی آیتوں پر مشتمل ایک ٹکڑا یا حصہ۔ گویا چند یا زیادہ آیتیں مل کر ایک ٹکڑا بن جائے تو

اسے سورة کہا جاتا ہے۔ کسی سورة کے لیے کم از کم تین آیات کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ

سورة غفر، سورة کوثر اور سورة نصر تین تین آیات پر مشتمل ہیں۔ سورة بقرہ سب سے لمبی سورة

ہے۔ اور اس کی دو سو چھیاسی آیات ہیں۔

سورة کے ہر ٹکڑے کو آیت کہتے ہیں۔ جس طرح سورتیں چھوٹی بڑی ہوتی ہیں۔ اسی

طرح آیتیں بھی چھوٹی بڑی ہوتی ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی آیت ایک لفظ کی بھی ہو سکتی ہے

جیسے اَلْحٰی یا حٰم۔ اور ایک حرف بھی ایک آیت ہو سکتا ہے۔ ق۔ ن وغیرہ اور

بعض آیات اتنی لمبی ہوتی ہیں کہ پورے ایک رکوع پر مشتمل ہوتی ہیں۔ جیسے سورة منزل کے

دو رکوع والی آیت ہے۔

آیت کا معنی علامت اور اس کا دوسرا معنی دلیل ہے۔ قرآن کریم میں آیت کا لفظ

آیت کے مختلف معانی

ان دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں زمین و آسمان کی پیدائش، دن رات کے اختلاف، پانی میں چلنے والی کشتی، بارش اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے پھلوں وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: لَا آيَاتٍ لَّهُمْ يُعَذِّبُونَ ۝ اس میں عتذروں کے لیے قدرت کی نشانیاں یا علامات ہیں۔ سورۃ روم میں فرمایا: وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ مِنَ الرَّحْمَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ۚ اذوآجاء یہ بات اللہ تعالیٰ کے دلائل قدرت میں سے ہے کہ اس نے تمہارے نفسوں میں سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے۔

قرآن میں آیت کا لفظ عبرت کے معنوں میں بھی آتا ہے جیسا کہ سورۃ بقرہ میں فرمایا: كَذَلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ مَا نَنْشَأُ وَخَبَرَ مَا نَكْشِبُ ۖ رَبَّنَا لَا تُخِزْ فِي آيَاتِكَ الْكَافِرِينَ ۚ کیا یہ بات لوگوں کو ہدایت نہیں کرتی کہ تم اھلکنا من قبلہم من القرون ہم نے اس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا ہے یُخْشَوْنَ فِي مَسْكِنِهِمْ جو اپنے مکانوں میں چلتے پھرتے تھے ۚ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ ۚ اس میں درس عبرت ہے۔ اسی طرح آیت کو معجزے کے طور پر بھی پیش کیا گیا ہے۔ بہت سے انبیاء علیہم السلام نے معجزات پیش کئے جن کا مطالبہ قوم کے لوگ کرتے تھے۔ سورۃ رعد میں دو مقامات پر آیات ۱۰ و ۱۱: وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا الْوَيْلُ لَنَا مَنْ نَزَّلَ عَلَيْهِ آيَاتُ رَبِّهِ ۖ كَفَرًا كَفَرْتُمْ ۚ كَذَلِكَ يَضِلُّ رَبِّي ۚ كَذَلِكَ يَضِلُّ رَبِّي ۚ كَذَلِكَ يَضِلُّ رَبِّي ۚ كَذَلِكَ يَضِلُّ رَبِّي ۚ كَذَلِكَ يَضِلُّ رَبِّي ۚ کفار کہتے ہیں کہ اس کے رب کی طرف سے اس پر کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل ہوتا گویا آیت کا معنی معجزہ بھی ہوتا ہے۔

آیت کا معنی حکم بھی آتا ہے۔ جیسے: يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ ۖ يَغْمِزُ فِيهِمُ الْقُرْآنَ ۚ كَذَلِكَ يَضِلُّ رَبِّي ۚ كَذَلِكَ يَضِلُّ رَبِّي ۚ كَذَلِكَ يَضِلُّ رَبِّي ۚ كَذَلِكَ يَضِلُّ رَبِّي ۚ کفار کہتے ہیں۔

تاہم ان تمام تر معانی کے باوجود جب آیت کا لفظ سورۃ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ تو اس کا معنی سورۃ کا ایک حصہ یا جزو ہوتا ہے۔ کیونکہ بہت سی آیات مل کر سورۃ ترتیب پاتی ہے جیسا کہ ابتداء میں عرض کیا گیا تھا، قرآن پاک کی کل ایک سو چودہ سورتیں ہیں۔ سب سے پہلی سورۃ فاتحہ ہے۔ دوسرے نمبر پر سورۃ بقرہ ہے۔ پھر آل عمران اور سورۃ نساء ہے۔ یہ ترتیب اجتہادی نہیں بلکہ توفیقی ہے۔ یعنی یہ ترتیب صحابہ کرامؓ کی دی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ یہ

سورتوں اور آیتوں
کی ترتیب

حضور علیہ السلام کی مقرر کردہ ترتیب ہے۔ اسی طرح ہر سورۃ میں آیات کی جو ترتیب ہے مثلاً
 پہلے الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ اس کے بعد الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اور پھر
 مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ یہ ترتیب بھی قرعنی ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: **ضَعُوا هَذِهِ
 الْآیَةَ فِي السُّورَةِ الَّتِي يُذْكَرُ فِيهَا كَذَاوَكَا** یعنی اس آیت کو فلاں مقام پر
 رکھ دو، تو صحابہ کرامؓ نے آپ کے فرمان کے مطابق آیات کو ترتیب دے لیا۔ انہوں نے اپنی
 طرف سے آگے پیچھے نہیں کیا۔ بلکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تعمیل کی۔ حدیث
 میں عبات طور پر آتا ہے کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو حضور علیہ السلام ارشاد فرماتے: اے
 فلاں مقام پر رکھ دو۔ تو صحابہ کرامؓ ویسے ہی کرتے۔ البتہ سورتوں کی ترتیب کے متعلق کچھ اختلاف
 پایا جاتا ہے۔ بعض مفسرین محققین فرماتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا
 قطعی فرمان نہیں ہے تاہم تمہور کہتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب بھی حضور علیہ السلام کے ارشاد کے
 مطابق ہی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ہی موجودہ ترتیب
 کو قائم کیا۔

سورتوں کے اقام
 بطاخط طوالت

قرآن پاک کی پہلی سات سورتوں یعنی سورۃ بقرہ سے لے کر سورۃ یونس تک کو
 سبع طوال یعنی سات لمبی سورتیں کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد چودھویں پائے میں سورۃ نحل تک
 کو ثانی یعنی طوال کے بعد دوسرے نمبر والی سورتیں کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد حجرات تک کی سورتوں
 کو تیسری کہا جاتا ہے۔ مبین سے مراد وہ سورتیں ہیں جو کچھ ویشس ایک سو آیات پر مشتمل ہوں
 اس کے بعد والناس تک سورتیں مفصلات کہلاتی ہیں۔ آگے مفصلات کے بھی تین گروپ
 ہیں۔ حجرات سے لیکر سورۃ بروج تک کو طوال مفصل بروج سے لے کر سورۃ جینہ تک کو

۱۔ تفسیر اتقان فی علوم القرآن للسیوطی ص ۶۲ مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور۔

۲۔ تفسیر اتقان ص ۶۱ ۳۔ ترمذی ص ۴۴۔

۴۔ ترمذی ص ۴۴، تفسیر اتقان ص ۶۱ مسند احمد ص ۱۰۰، متذکر حاکم ص ۲۳۔

۵۔ روح المعانی ص ۶۲ ۶۔ روح المعانی ص ۶۱۔

مفصل اور پھر آخر تک کو قصار مفصل کہا جاتا ہے۔ قصار کا معنی چھوٹی سورتیں ہیں۔

قرآن کریم کی مختلف سورتوں کے ناموں کی مختلف وجوہات ہیں۔ بعض سورتوں کے نام ان کے ابتدائی حروف ہیں ق۔ ص۔ ط۔ یس وغیرہ بعض سورتوں کے اسماء ان کے پہلی آیت کے کسی لفظ پر رکھے گئے ہیں۔ جیسے سورۃ کوثر کا نام اس کی پہلی آیت "اِنَّا اَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ" سے لیا گیا ہے۔ کسی سورۃ کا نام اس سورۃ میں مذکور مشہور واقعہ سے ماخوذ ہے۔ جیسے بقرہ کہ اس میں گائے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ اسی طرح اسراء میں معراج کا واقعہ آیا ہے۔ سورۃ اعراف میں اعراف کا واقعہ ہے۔ جو کہ ایک جگہ کا نام ہے۔ سورۃ الاعراف کا نام بھی واقعہ اعراف کی وجہ سے ہے۔ سورۃ یونس کا نام یونس اس لیے ہے کہ اس میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر ہے۔

زمانہ نزول کے لحاظ سے سورتوں کی دو قسمیں ہیں یعنی مکی اور مدنی سورتیں جو سورتیں ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں و زکی کہلاتی ہیں۔ خواہ وہ مکہ معظمہ میں قیام کے دوران نازل ہوئیں یا طائف میں یا کسی اور سفر کے دوران۔ مدنی سورتیں وہ ہیں، جو ہجرت مدینہ کے بعد نازل ہوئیں۔ ہجرت کے بعد جو بھی سورتیں نازل ہوئیں۔ خواہ وہ قیام مدینہ کے دوران یا تبوک یا خیبر یا کسی اور مقام پر وہ سب مدنی سورتیں کہلاتی ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے زمان و مکان کے لحاظ سے کئی قسمیں بیان کی ہیں مثلاً جو سورۃ حفصہ یعنی اقامت کی حالت میں نازل ہوئی۔ وہ حفصی کہلاتی ہے۔ اور جو سفر کی حالت میں اتری اس کو سفری سورۃ کہتے ہیں۔ اسی طرح رات کے وقت نازل ہونے والی سورۃ یسلی اور دن کے وقت اترنے والی نہاری کہلاتی ہے۔

بعض سورتیں دفعۃً یعنی یکدم نازل ہوئی ہیں۔ ان کو دفعی سورتیں کہتے ہیں اور بعض سورتیں تدریجی کہلاتی ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ وہ تدریجاً نازل ہوئی ہیں۔ کبھی چند آیتیں نازل ہو گئیں۔ پھر درمیان میں وقفہ آگیا پھر کچھ نازل ہو گئیں۔ یہ تدریجی سورتیں ہیں۔ بعض سورتیں ایسی ہیں جو کہلاتی تو مدنی ہیں مگر ان کے کچھ حصے مکی دور میں نازل ہوئے مثلاً

یہی سورۃ بقرہ مدنی سورۃ ہے۔ مگر اَمَّنَ الرَّسُولُ سے لے کر آخر تک کی آیتیں مکی زندگی کا حصہ ہیں۔ مشہور روایت میں آتا ہے کہ معراج کے دوران حضور علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تین تحفے دیے گئے۔ یعنی پانچ نمازیں۔ سورۃ بقرہ کی آخری آیتیں۔ اور ان لوگوں کے لیے خوشخبری جو شرک میں ملوث نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ آپ کا معراج مکی زندگی میں ہو۔ لہذا یہ آخری آیتیں مکی زندگی کی ہیں۔ اگرچہ سورۃ بقرہ مدنی سورۃ ہے۔

ترتیب تلاوت
کی حکمت

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ترتیب نزول کا تقاضا تو یہ تھا کہ پہلے مکی سورتیں آئیں اور اس کے بعد مدنی سورتوں کا بیان ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم تمام نوع انسانی کے لیے نازل ہوا ہے۔ اور مختلف انسانوں کے مزاج مختلف ہوتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے انسانی مزاج کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلے وہ سورتیں رکھی ہیں جو جامع اور مانع ہیں اور ان میں ہر قسم کے احکام پائے جاتے ہیں۔ اور یہ عام طور پر مدنی سورتیں ہیں۔ مکی سورتوں میں زیادہ تر فیضانِ عقائد کا ذکر ہے۔ ان میں ہر قسم کے احکام نہیں پائے جاتے۔ تو گویا پہلے مدنی اور مکی سورتوں کو لانے میں حکمت یہ ہے کہ لوگ ہر قسم کے احکام سے مانوس ہو جائیں۔

فضیلت سورۃ

حدیث پاک میں سورۃ بقرہ کے بہت سے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ ترمذی شریف کی روایت میں نبی علیہ السلام کا فرمان ہے۔ لَا تَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ مَقَابِرَ یعنی اپنے گھروں کو قبروں کی طرح سنان نہ بنالو۔ بلکہ وہاں نمازیں بھی پڑھا کرو۔ نیز یہ بھی فرمایا۔ وَإِنَّ الْبَيْتَ الَّذِي تَقْرَأُ الْبَقْرَةَ فِيهِ لَا يَدْخُلُهُ الشَّيْطَانُ یعنی جس گھر میں سورۃ بقرہ کی تلاوت ہوتی ہو۔ وہاں شیطان داخل نہیں ہوتا، مسلم شریف کی روایت میں اس طرح آتا ہے يُؤْتَى بِالْقُرْآنِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَأَهْلِيهِ الَّذِينَ كَانُوا يَعْمَلُونَ بِهِ تَقْدِمُهُ سُورَةُ الْبَقْرَةِ وَالْأَعْمُرَانِ یعنی قیامت کے روز قرآن پاک اور اس کے اہل کو لایا جائے گا۔ ان کے آگے سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران ہوگی۔

یہاں پر یہ بات یاد رہے کہ اہل قرآن سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن پاک پر عمل کرتے ہیں۔
 آج کل تو جھگڑا لومی اور پر دیزی وغیرہ اہل قرآن کلاتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ گمراہ اور منکرینِ قرآن ہیں۔
 ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں تَعْلَمُوا سُورَةَ الْبَقَرَةِ فَإِنْ أَخَذَهَا
 بَرَكَتُهُ يَعْنِي سُورَةَ بَقَرَةٍ سَيَكْفُرُ بِهَا كَيْفَ اس کا سیکھنا باعثِ برکت ہے۔ رَتَرَكَهَا حُسْرَةً
 اور اس کا ترک کرنا باعثِ حسرت ہوگا۔ نیز فرمایا لِكُلِّ شَيْءٍ سَنَامٌ وَسَنَامُ الْقُرْآنِ
 سُورَةُ الْبَقَرَةِ ہر چیز کی ایک کوہان یا بندی ہوتی ہے۔ اہل قرآن کی کوہان سورۃ بقرہ ہے
 یعنی یہ سورۃ قرآن پاک میں اس طرح نمایاں ہے جس طرح اونٹ کی پشت پر کوہان نمایاں ہوتی ہے
 فرمایا سورۃ بقرہ میں ایک ایسی آیت ہے هُی سَيِّدَةُ اَيِّ الْقُرْآنِ اَيَّةُ
الْكَرْسِيِّ یہ قرآن پاک کی تمام آیتوں کی سردار ہے۔ یعنی آیتہ الکرسی۔ گویا سب بڑی اور سب سے
 فضیلت والی آیت اسی سورۃ میں ہے۔ ایک اور روایت میں آتا ہے کہ سورۃ بقرہ فُطِطُ
 الْقُرْآنِ یعنی قرآن کا خیمہ ہے جس میں ہر چیز آجاتی ہے۔ فرمایا اَقْرَبُ وَالزَّهْرُ اَوْ مَن
 الْبَقَرَةُ وَالْعَمُرَانِ دو روشن سورتیں پڑھو۔ یعنی سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران۔ یہ قیامت
 کے روز اس طرح آئیں گی جس طرح دو بادل ہوتے ہیں۔ اور ان کے درمیان بڑی چمک ہوگی
 یہ سائبان کی طرح اوپر آئیں گی۔

مسند احمد کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ الْبَقَرَةُ سَنَامُ الْقُرْآنِ
 سورۃ بقرہ قرآن کریم کی کوہان ہے۔ اس کی ہر آیت کے ساتھ انٹی۔ انٹی فرشتے اترتے رہے
 ہیں۔ یعنی ہر آیت کے نزول کے وقت ملائکہ کا نزول ہوتا تھا۔ فرمایا اس کی اہمیت اللہ وَاِلٰه
اَزَاهُوهُ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ کو اللہ تعالیٰ نے عرش کے نیچے سے نکال کر سورۃ میں شامل کیا ہے
 اسی آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کا اسمِ اعظم بھی ہے۔

اس سورۃ مبارکہ میں مختصر طور پر بہت سے مضامین آجاتے ہیں۔ مثلاً اس میں اللہ تعالیٰ مضامین سورۃ

۱۔ منہ مجاہد ۲۲۸۔ ۲۔ منہ مجاہد ۲۲۸۔ ۳۔ منہ مجاہد ۲۲۸۔ ۴۔ منہ مجاہد ۲۲۸۔

۵۔ منہ مجاہد ۲۲۸۔ ۶۔ منہ مجاہد ۲۲۸۔ ۷۔ منہ مجاہد ۲۲۸۔ ۸۔ منہ مجاہد ۲۲۸۔

نے منعم عظیم لوگوں کے بجز اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ اور ان کے نتائج سے آگاہ کیا ہے اسی طرح گمراہ لوگوں کے اوصاف اور ان کی نشانیاں بیان کی ہیں۔ جن سے وہ پہچانے جاتے ہیں اس سورۃ مبارکہ میں توحید باری تعالیٰ اور رسالت کا ذکر دلائل عقلیہ اور نقلیہ کے ساتھ آیا ہے ختم نبوت کا بیان ہے۔ اور وحی کی ضرورت کو وضع کیا گیا ہے۔ انسان کے مکلف ہونے کا بیان ہے۔ اور پھر وحی الہی کی احتیاج کا ذکر ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر انسان اپنے تمام تر مسائل کو حل نہیں کر سکتے۔ انہیں زندگی کے ہر موڑ پر وحی الہی کی دستگیری کی ضرورت ہے۔

اس سورۃ میں عبرت حاصل کرنے کے لیے مختلف ذرائع کو بیان کیا گیا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور ان کے فضائل کا ذکر ہے۔ بنی اسرائیل کے اسلاف پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا بیان ہے۔ اور موجودہ بنی اسرائیل کی خباثتوں، شرارتوں، ان کے غدار اور ضد کا ذکر ہے۔ اس سورۃ میں قت ابراہیم کا ذکر ہے۔ بیت اللہ شریف کے کعبہ ہونے کا ذکر ہے۔ تہذیب، امداد اور تعلیم کے ارکان، تدبیر منزل اور سیاست من کا ذکر ہے۔ غیر اللہ کی نذر و نیاز کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس میں قوانین مملکت اور خلافت کبریٰ کے اصول بیان کیے گئے ہیں کہ امیر کیسا ہونا چاہیے۔ اور فوج کے لیے کیا قوانین ضروری ہیں۔

اس سورۃ مبارکہ میں اولیاء اللہ اور اولیاء الشیطان کی پہچان کرائی گئی ہے۔ سخاوت کی ترغیب دی گئی ہے۔ بخل کی مذمت بیان ہوئی ہے۔ سود کی حرمت اور تجارت کے قوانین کا بیان ہے۔ عبادت نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل ہیں۔ معاشرتی امور سے متعلق نکاح، طلاق، قس، ایلا وغیرہ کے احکام ہیں۔ دیوانی اور فوجداری مقدمات کا بیان ہے۔ عقوبات میں قصاص اور دیت کے احکام ہیں۔ اصلاح معاشرہ، جہاد، الفاق فی سبیل اللہ، غرض اس سورۃ مبارکہ میں سینکڑوں ہزاروں مضامین بیان ہوئے ہیں

اس سورۃ کا نام سورۃ بقرہ رکھا گیا ہے۔ بقرہ عام طور پر گائے کے لیے بولا جاتا ہے تاہم عربی زبان میں یہ لفظ گائے اور بیل دونوں کے لیے مشترک ہے۔ اگر وضاحت کرنی ضروری ہو تو بیل کے لیے ثور کا لفظ بھی بولا جاتا ہے۔ بہر حال اس سورۃ مبارکہ میں جس بقرہ کا ذکر ہے کہ وہ نہر ہوا مادہ ہو۔

نام اور کوائف

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ مردہ گوشت لگانے کی وجہ سے زندہ ہو گیا تھا یا خود بخود ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر خود بخود زندہ ہو گیا تو دوسرے سینکڑوں ہزاروں مردے خود بخود کیوں نہیں زندہ ہو جاتے۔ اور اگر وہ مردہ گائے کا گوشت لگانے کی وجہ سے زندہ ہوا تو گائیں بھی ہمارے ذبح ہوتی ہیں۔ مردوں کو زندہ کرنے کا یہ آسان نسخہ ہے۔ ہر مردے کو زندہ کرنے کے لیے ایسا کیا جاسکتا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کا وہ مردہ نہ تو خود بخود زندہ ہو گیا۔ اور نہ ہی گائے کا گوشت لگانے سے۔ بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ ہوا۔ جو صانع اور قادر مطلق ہے۔ لہذا اللہ رب العزت کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت مجید میں آتی ہے۔ اور یہ سورۃ مبارکہ کی سب سے اہم بات ہے۔

ثبوت نبوت اس سورۃ میں دوسری اہم بات نبوت کا ثبوت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے قاتل کا پتا لگانے کے لیے جو طریقہ بتایا، وہ کامیاب ہوا۔ لہذا موسیٰ علیہ السلام کی نبوت ثابت ہو گئی جب ایک نبی کی نبوت ثابت ہو گئی۔ تو تمام انبیاء علیہم السلام کی نبوت کا یقین ہو گیا۔ نیز یہاں پر یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ نبی کی بات کو بغیر تفتیش کے تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس میں حیل و حجت نہیں کرنی چاہیے۔ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کے بتائے گئے طریقے میں حچان بین شروع کر دی۔ کہ جس گائے کو ذبح کھرنے کے لیے کہا گیا ہے وہ کیسی ہونی چاہیے اور اس کا رنگ کیسا ہونا چاہیے، وغیرہ وغیرہ۔ اگر وہ لوگ اپنے نبی کے حکم کے مطابق فوراً عمل کرتے ہوئے گائے ذبح کر دیتے، تو مسئلہ فوراً حل ہو جاتا۔ انہوں نے اپنے اوپر جس قدر سختی کی، اُسی قدر قیدیں بڑھتی چلی گئیں۔

اس واقعہ میں تیسری اہم چیز استقامت ہے۔ انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے عقیدے عمل اور اخلاق پر قائم رہے۔ اگر استقامت میں لغزش آجائے گی۔ تو کئی قسم کے فساد پیدا ہو جائیں گے۔ بنی اسرائیل کے آدمی کے قاتل نے اس جرم کا ارتکاب اس لیے کیا تھا۔ تاکہ مقتول کو راستے سے ہٹا کر چچا کا سارا مال حاصل کر لے۔ گویا اُس نے استقامت کو چھوڑ دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ذلے ذلیل و بے سوا کر دیا۔ معلوم ہوا کہ استقامت بڑی چیز ہے اس کو چھوڑنے سے ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس واقعہ کی چوتھی بات مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ دین اور ایمان کے راستے میں کوشش

اور جدوجہد کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ جوانی کے عالم میں انسان کی عقل مغلوب ہوتی ہے۔ انسان پر خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس عمر میں اکثر لوگ مجاہدہ میں ناکام ہوتے ہیں۔ جب انسان پر بڑھاپا آجاتا ہے۔ تو ظاہری قوتیں کمزور ہو جاتے ہیں، اور دوسری طرف حالت انسان کے قلب و ذہن میں سختہ ہو چکی ہوتی ہے لہذا اس عمر میں بھی انسان مجاہدہ سے محروم رہ جاتا ہے۔ لہذا اس کی بڑی اہمیت اور بہت زیادہ ضرورت ہے۔

اس واقعہ کی پانچویں اہم چیز معاد یعنی حیات بعد الممات کا ثابت ہونا ہے۔ یہ پورا واقعہ معاد ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کَذٰلِكَ يُخَيِّ اللّٰهُ الْمَوْتٰی یعنی جس طرح اس مُرُتے کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کر دیا، اسی طرح معاد میں سب کو دوبارہ زندہ کرے گا۔

یہ تمام دین کے بنیادی اور اہم اصول ہیں۔ باقی چیزیں ان کے ضمن میں آتی ہیں اس ایک واقعہ میں خدا تعالیٰ نے دین کے بنیادی مسائل اور معارف سمجھائے ہیں۔ اس لیے اس سورۃ کا نام سورۃ بقرہ رکھا گیا ہے۔

اس درس میں سورۃ بقرہ کے فضائل اور اس کے مجموعی مضامین کا مختصر بیان ہوا۔ اللہ و درس میں انشاء اللہ کے تعلق بیان کیا جائے گا۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

الْعَمَّ ① ذَلِكِ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ②

تو عجب!۔۔۔ الْعَمَّ ① یہ کتاب منہیں شک اس میں۔ یہ راہنمائی کرتی ہے متقیوں کی ②

گزشتہ درس میں سورۃ بقرہ کی فضیلت، اس کے نام اور اس کے موضوعات کا اجمالی تذکرہ ہوا تھا۔ اس درس میں حروف مقطعات میں سے الف، لام، میم کے متعلق بیان ہوگا۔

اصولی طور پر یہ بات معلوم کر لینی چاہیے کہ قرآن کریم میں تین قسم کی آیات ہیں۔ پہلی قسم کی آیات محکمات ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی آیات کے الفاظ بھی معلوم ہیں اور ان کا مطلب اور مراد بھی معلوم ہے۔ گویا یہ آیات بالکل واضح ہیں۔ قرآن پاک کی اکثر آیتیں محکمات ہیں۔ آیات کی دوسری قسم متشابہات ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے الفاظ کا معنی

تو معلوم ہے۔ مگر ان کی حقیقت پوشیدہ ہے۔ مثلاً آیت کریمہ الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی میں رَحْمَن عَرْش اور استوائی کے معانی معلوم ہیں۔ مگر اس کی حقیقت انسانی ذہن میں نہیں آسکتی۔ وہ غامض اور دقیق ہے۔ گویا معنی تو معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر جلوہ گر ہے۔ مگر جلوہ گر ہونے کی کیفیت ذہن انسانی کے بس کی بات نہیں۔ ایسی آیات متشابہات کہلاتی ہیں۔

تیسری قسم کی آیات مقطعات کہلاتی ہیں۔ یہ مفرد حروف ہیں جو قرآن پاک کی انیس سو تینوں کے ابتداء میں آتے ہیں۔ سورۃ بقرہ بھی انہیں میں سے ہے۔ جو الْعَمَّ سے شروع ہوتی ہے۔ دوسرے مقامات پر ن۔ ح۔ ص۔ ق۔ ال۔ ی۔ ا۔ ط۔ وغیرہ کے حروف آتے ہیں۔ مقطعات کا مطلب یہ ہے کہ نہ ان کا معنی واضح ہے۔ اور نہ ان کی مراد معلوم ہے۔

محکمات۔ متشابہات
مقطعات

احکام خداوندی
لہذا حکمتیں

تاہم ہر قسم کی آیات کے احکام پر ایمان لازماً ضروری ہے۔ خواہ ان احکام کی حکمتیں واضح ہوں یا غیر واضح۔ مثلاً نماز پڑھنے میں حکمت یہ ہے کہ انسان اپنے مجبور کے سامنے تواضع کرے۔ اور اپنے منعم کا شکر ادا کرے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار کرتا ہے۔ جو کہ عہدیت کا تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور مناجات پیش کرنے کی حکمت بالکل واضح ہے۔ اسی طرح روزہ کا مقصد نفس کو دہانا شہوت کو مغلوب کرنا ہے۔ تاکہ انسان میں تقویٰ کی روح پیدا ہو سکے۔ بھوک اور پیاس سے خواہشات نفسانی پر غلبہ حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ بھی واضح حکمت ہے۔ زکوٰۃ کے متعلق شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس میں دو بڑی حکمتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ مساکین کی حاجت پوری کی جاتی ہے تاکہ کوئی غریب بھوکا پیاسا نہ رہے۔ اور دوسری یہ کہ انسان بخل کے مادہ سے پاک ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے مال سے زکوٰۃ نکالتا ہے گا اس میں بخل کی بجائے سخاوت کا وہ پیدا ہوگا۔ لہذا زکوٰۃ کی حکمت بھی واضح ہے۔

اب بعض احکام ایسے ہیں جن کی حکمتیں بڑی گہری ہیں۔ اور ہر آدمی انہیں نہیں سمجھ سکتا۔ مثلاً حج کے ارکان منجملہ ان کے بیت اللہ شریف کا طواف۔ منیٰ اور عرفات کا وقوف ہے۔ جہالت کی رہی ہے۔ ان احکام کی حکمتیں نامعنیٰ اور دقیق ہیں۔ مگر ان پر ایمان لانا اور اس کے مطابق عمل کرنا ہر مکلف کے لیے لازم ہے۔ اور جن احکام کی حکمت واضح نہیں۔ ان کے متعلق زیادہ کچھ نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ ان احکام کی ہر حالت میں تعمیل کرنی چاہیئے۔ خواہ وہ احکام آیات محکمات کے ہوں یا آیات متشابہات کے ہوں۔

حروف مقطعات
مغربی کتب پر

اسی طرح حروف مقطعات کے بارے میں بھی زیادہ کرید کرنے کا حکم نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام میں سے کوئی بھی ایسا معلوم نہیں ہوا جس نے حروف مقطعات کی کرید کی ہو۔ جس طرح حضور علیہ السلام نے فرما دیا صحابہؓ نے تسلیم کر لیا مگر بعض ذہین تحقیق پسند ہوتے ہیں۔ وہ معاملہ کی تہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن حروف کے معانی ہی معلوم نہیں۔ ان کے نازل کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ چنانچہ

دس نیکیاں عطا فرماتے ہیں۔ جو مومن ان حدوت کو پڑھے گا۔ سب سے نیکیاں حاصل ہوں گی یہی بہت بڑی غنیمت ہے۔ لہذا ان کے معانی تلاش کرنے میں کوشش نہ کرو۔

امام رازیؒ پچھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے بڑے عظیم مفسر قرآن گزے ہیں۔ جس صحنہ میں قرآن کی تفسیر میں امام ابن جریر طبریؒ اور چوتھی صدی میں ابو جبر جصاصؒ ہوئے ہیں اسی طرح آپ کا مقام تھا ابو جبر جصاصؒ معنی تھے۔ اور امام رازیؒ شافعی تھے۔ امام ابن جریرؒ خود مجتہد صاحب مذہب تھے۔ اور کسی کے مقلد نہیں تھے۔ ابو جبر جصاصؒ نے صرف احکام کی تفسیر کی ہے۔ یعنی قرآن پاک کی صرف ان آیات کی تفسیر لکھی ہے جن میں احکام بیان ہوئے ہیں۔ البتہ امام رازیؒ نے چھیستویں پارے تک مکمل تفسیر کی ہے۔ اس کے بعد آپ وفات پا گئے۔ چنانچہ بقیہ تفسیر آپ کے نہایت قابل شاگردوں نے کی۔ اس تفسیر کی آخری دو جلدیں امام رازیؒ کی اپنی تالیف نہیں۔ بلکہ آپ کے تلامذہ کی ہے۔ ان آخری جلدوں کا مقابلہ پہلی جلدوں کے ساتھ کرتے ہیں، تو کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ شرف عطا فرمایا۔

حدوت مقطعات کے متعلق امام رازیؒ کا قول یہ ہے کہ آلۃ سورۃ بقرہ کا دوسرا نام ہے۔ ایک نام بقرہ ہے۔ اور دوسرا آلۃ ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ آلۃ اور دیگر حدوت مقطعات کہ فی بعض آلۃ علق وغیرہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے پاک ہیں۔ امام رازیؒ نے ایک ہدایت ذکر کی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے چھ ہزار نام ہیں۔ اس نے اپنے تمام نام آسمانی کتابوں میں نازل فرمائے ہیں۔ سوائے ایک کے جو اس نے مخصوص کر لیا ہے۔ اور کسی کو نہیں بتایا۔ تو وہ فرماتے ہیں کہ آلۃ علی اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ جیسا کہ آلۃ کے متعلق امام ابن کثیرؒ نے لکھا ہے تَذَكِّرُنِي خَيْرًا مِنَ الرِّيحِ شَجَرًا ابَدًا وَخَيْرًا مِنْهُ لَوْ كُنْتُ عَالِمًا۔ کہ لڑائی جھوڑ دو۔ وہاں تِلَاخًا خَيْرًا قَبْلَ التَّقْدِيرِ۔

مقطعات
اسمائے الٰہی ہیں

۱۔ تفسیر کبیر ص ۲۰
۲۔ تفسیر ابن کثیر ص ۱۹

۱۔ تفسیر کبیر ص ۲۰
۲۔ تفسیر کبیر ص ۲۰

اس کے جواب میں کہتا ہے۔ کہ اب جب کہ نیزے کھٹک رہے ہیں۔ اب واسطہ پیش کرتا ہے۔ ح کا واسطہ پہلے کیوں نہ دیا تاکہ ہم لڑائی شروع نہ کرتے۔ اب ہم لڑائی نہیں چھوڑ سکتے اس مقولہ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ح جو حروف مقطعات میں سے ہے یہ اللہ کا نام ہے۔

بعض اس کی توجہ یوں کرتے ہیں کہ حروف مقطعات اللہ کا پورا نام نہیں بلکہ بعض اسماء کی طرف اشارات میں مثلاً الف کا اشارہ اس کے ذاتی نام اللہ کی طرف ہے۔ ل سے مراد رحمن ہے۔ اور اسی طرح لاء کا اشارہ کافی کی طرف ہے ل کا اشارہ اکم لطیف کی طرف ہے۔ اور ہ سے مراد مالک اور اکم مجید ہے۔

بعض علمائے کرام فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات قرآن پاک کے نام ہیں جیسے ح لیس۔ ا وغیرہ۔ حضرت ام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتب الفوز البکیر، خیر کثیر، اور ہوامع میں حروف مقطعات پر بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کشفی طہ پر یہ فہم دیا ہے۔ کہ جس سورۃ کی ابتداء میں یہ حروف آتے ہیں اس سورۃ کا خلاصہ اور عنوان ان حروف میں مذکور ہے۔ ان حروف سے سورۃ کے مضامین کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ الفاظ ایسے ہی ہیں۔ جیسے کسی شخص کے لیے مفتی، قاضی، امیر سلطان یا حاکم وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ یا اس طرح سمجھ لیں۔ جیسے تعلیمی ڈگری بی۔ اے۔ ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی، ڈاکٹر (ڈاکٹر آف لٹریچر) وغیرہ کے الفاظ ہوتے ہیں۔ انہی سے کسی کی شخصیت کی علمی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ بالکل اسی طرح حروف مقطعات کے ذریعے کسی سورۃ کا خلاصہ یا اس کی سرخی بیان کی جاتی ہے۔

مقطعات
اسم قرآنی ہیں

امام مہر دہلویؒ صدی کے بڑے صوفی، نحوی اور لغت و ادب کے امام تھے اپنی مشہور کتاب "کامل" ہے، وہ فرماتے ہیں کہ "ان فیصح و بیغ حروف مقطعات میں چیلنج ہے"

مقطعات
بہشت چیلنج

۱۔ تفسیر طبری ۲۔ تفسیر کبیر ۳۔

۴۔ تفسیر طبری ۵۔ تفسیر کبیر ۶۔

۷۔ تفسیر کبیر ۸۔

۹۔ الفوز البکیر ۱۰۔ مطبوعہ لاہور

کہ اے دنیا والو! یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے تم بھی اس جیسا کلام بنا کر لاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے انہی حروف میں قرآن پاک نازل کیا ہے۔ اگر تم اس کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے: فَاتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ ۚ تو اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لاؤ اگر تم بھی ایسا کر سکو تو مان لیں گے کہ قرآن بھی خدا تعالیٰ کا نازل کیا ہوا نہیں ہے۔

عربی زبان بڑی فصیح و بلیغ زبان ہے۔ نزول قرآن سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے عربی زبان کی ترقی شروع ہوئی اور اس عرصہ میں وہ اپنے کمال تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ عرب لوگ اس زبان کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ اسی لیے وہ غیر عربوں کو بھی یعنی گونگے کتے تھے عربی زبان کا شعر و ادب کا ذخیرہ کمال درجے کا ہے۔ ہمارے دروسوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ تو اسی ترقی یافتہ زبان میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک نازل فرمایا ہے "قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ" عربوں کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا اہم اور آساؤ بنایا تھا۔ انہی اہل زبان کے سامنے آکر کھینچنے کا چیلنج پیش کیا گیا۔ کہ اگر کوئی ہے تو اس جیسا کلام بنا کر لائے۔ مگر کوئی بھی اہل زبان اس چیلنج کا جواب نہ دے سکا۔

اہم انخسٹ اور مفسر تغیر خازن کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ حروف مقطعات قسم کے معنوں میں استعمال ہوتے ہوں۔

بعض فرماتے ہیں کہ ان حروف کو قرآن کے انقطاع کے لیے لایا گیا ہے۔

مثلاً سورۃ فاتحہ: غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ پر ختم ہوئی۔ تو دوسرا کلام شروع کرنے کے لیے آئے لایا گیا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے زمانے میں ہی بحث و تمحیص کرنے والے لوگ پیدا ہو گئے تھے۔ جو اس قسم کے معاملات میں تحقیق کرتے تھے۔ چنانچہ آپؓ سے آئمہ کا معنی دریافت کیا گیا۔ تو فرمایا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اَنَا اللَّهُ اعْلَمُ

یعنی میں تمہارا اللہ سب سے زیادہ جاننے والا ہوں۔ گویا آسے مراد اَنَا ل سے مراد اللہ اور م سے مراد اَعْلَم ہے۔ اسی طرح الْقَمَر سے مراد اَنَا اللہ اَفْجَس ہے یعنی میں تمہارا اللہ ہوں، جو تمہارے لیے ہر چیز تفصیل سے بیان کرتا ہوں۔ اَللّٰہُ کا مطلب ہے اَنَا اللہ اَرٰی میں تمہارا اللہ ہوں جو تمہاری ہر بات کو دیکھتا ہوں۔

امام ماوردیؒ
کی تحقیق

امام ماوردی صاحب احکام السلطانیہ پٹنہ زمانے کے بہت بڑے محقق ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اَللّٰہُ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اَلْعَرَبِکُمْ اور اس کی تفصیل ہے نَزَّلَ عَلَیْکُمُ الْکِتَابَ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر کتاب نازل کی ہے۔

بعض علماء کرام فرماتے ہیں: اَللّٰہُ کا معنی اَقْلٌ لَزِیْمٌ لِلْمُؤْمِنِیْنَ ذَلِکَ الْکِتَابُ یعنی ایمانداروں کے لیے اولین ضروری چیز یہ کتاب ہے۔ اس کے اندر غور و فکر کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہدایت کا منبع و مرکز یہی کتاب ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ آسے مراد اللہ ہے۔ ل سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہے اور م سے مراد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب جبرائیل علیہ السلام کے توسط سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی۔

شیخ ابن عربیؒ
کا قول

شیخ ابن عربیؒ اس کا معنی یہ کرتے ہیں کہ کل وجود خداوند تعالیٰ ہے۔ جبرائیل علیہ السلام درمیان میں ایک واسطہ ہے۔ جو اللہ سے فیض لے کر اُدھر پہنچاتا ہے۔ اور آخر الوجود حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان تک فیض پہنچانے کا واسطہ جبرائیل علیہ السلام ہیں۔

بعض فرماتے ہیں کہ اَللّٰہُ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے انسانیت کی تکمیل کے لیے ذَلِکَ الْکِتَابُ لَزِیْمٌ فِیْہِ اس عظیم کتاب کو نازل فرمایا۔

بعض فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے ہر ہر لفظ کی تلاوت کی جانی چاہیے تاکہ برکت اور ثواب حاصل ہو۔ خواہ اس کا مطلب سمجھیں آئے یا نہ آئے۔ تاہم ثواب تو ہر ایماندار کو حاصل ہوگا۔ بعض فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات کو نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کا ایک معجزہ ظاہر فرمایا ہے۔ حضور علیہ السلام تو اُمّی ہیں۔ آپ نے کوئی نوشتہ و خوانہ نہیں کی جب تک کوئی تعلیم حاصل نہ کر سکے، ایک اُمّی حروف تہجی کیسے پڑھ سکتا ہے۔ مگر پیغمبر آخر الزمان علیہ السلام کے اُمّی ہونے کے باوجود ان الفاظ کا پڑھنا ایک غیر معمولی معجزہ تھا۔ حالانکہ نہ آپ نے کسی مکتب میں داخلہ لیا۔ اور نہ کسی استاد سے پڑھا۔ لہذا اس معجزے کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ حروف مقطعات نازل فرمائے۔

اہم بیضاوی ساؤنچمدنی کے عظیم مفسر ہوئے ہیں۔ مختصر تفسیروں میں اہم صاحب کی تفسیر سب سے اہم ہے۔ آپ کا زمانہ مسلمانوں کی ترقی کا دور تھا۔ آپ اللہ کی تائید اس طرح کرتے ہیں کہ حرف الف حلق کے انتہائی آخری حصے سے نکلتا ہے۔ لام درمیان سے م ہونٹوں سے نکلتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ حروف آخر، اوسط اور ابتداء کی حصے سے ادا ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کے کلام کی ابتداء اوسط اور آخر بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہونی چاہیے۔ گویا اہم بیضاوی نے حروف اللہ کو اللہ کے ذکر کے ساتھ مربوط کیا ہے۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے کشفی اور ذوقی طور پر معلوم ہوا ہے کہ اللہ کا مطلب وہ غیر مادی فیض مجرب ہے۔ جو اس مادی اور متحیر مکان والے عالم میں آکر مقید ہو گیا ہے اور لوگوں کے ادب اور علوم وغیرہ کے مطابق ان کی سنگدلی سے متصادم ہے۔ یہ فیض مجرب اعمال فاسدہ، اقوال کاسدہ کی تذکیر کرتا ہے۔ اور بہ عادت اور اخلاق ردیہ کا رد کرتا ہے۔ یہ اللہ تشریح اور تحقیق قدسی پیش کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ساری سورۃ بقرہ میں اللہ کا یہی اجمال معنی نظر آتا ہے۔ اس سورۃ میں

۱۔ تفسیر درخورد ۲۲۔ بیضاوی ص ۹ ۲۔ تفسیر مظہری ص ۱۱۱ تفسیر غزیری قادی ص ۱۰۶

۳۔ تفسیر بیضاوی ص ۱۱ ۴۔ الفہم البکیر ص ۸۲ مطبوعہ کراچی

نزل مقطعات معجزہ
سورہ کائنات کی تعلیم

حضرت امام شاہ
ولی اللہ کا قول

لوگوں کی نگاہ دل کا مقابلہ، قوانین کی تشریح اور تحقیق اور بُرے اقوال و عبادت اور بُرے اخلاق کی اصلاح کے متعلق ہی مضامین پائے جاتے ہیں۔

بعض محققین فرماتے ہیں کہ الف کا اشارہ استقامت علی الشریعہ کی طرف ہے۔ اِنَّ
الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا یعنی شریعت پر استقامت اختیار کرنی
چاہیے۔ فرماتے ہیں کہ لام کا اشارہ مجاہدہ کی طرف ہے۔ یعنی وہ چیز جو ریاضت اور مجاہدہ کرنے
سے حاصل ہو۔ جیسے ”وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا“
یعنی جو لوگ ہماری طرف مجاہدہ کریں گے۔ ہم ضرور ان کو راہ بتلائیں گے۔ اسی طرح حرف میم میں
یہ اشارہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت موعظن ہونی چاہیے۔

مولانا مودودی صاحب
کا تفسیر

مودودی صاحب نے اپنی کتاب تفسیر تفسیر القرآن میں ایک نہایت ہی غلط بات لکھی
ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ الہ کا معنی پہلے زمانے میں معلوم تھا مگر بعد میں اسے لوگ بھول
گئے۔ اسکا مطلب یہ کہ کچھ لوگ ایسے معانی جانتے تھے بعد میں اسے لوگ بھول گئے۔ یہ تو بالکل ہی غلط بات ذکر کر دی
کہ کسی کو بھی اسکا معنی نہ آتا ہو۔ مغربیوں کو مہذبہ جو معانی بیان کیے ہیں وہ میں نے عرض کر دیے۔

مفسر فراہی
کا قول

مفسر قرآن فراہی کہتے ہیں کہ قدیم مصری زبان میں الف کو سر کی شکل میں لکھا جاتا تھا۔
بعض زبانوں میں حروف جانور یا درخت کی شکل میں لکھے جاتے تھے۔ ایسے الف کے دو معنی استعمال
ہوتے تھے۔ ایک معنی گائے ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس سورۃ کو گائے کے ساتھ مناسبت ہے
کیونکہ اس میں گائے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ الف کا دوسرا معنی اللہ وحدہ لا شریک ہے۔
تو فراہی لکھتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ یہ حروف اس محاورے کے مطابق استعمال کیے
گئے ہوں۔

حرف آخر

اہم جلال الدین سیوطی اور بہت سے مفسرین آخری بات یہ فرماتے ہیں گئے۔ اَللّٰهُ
اَعْلَمُ بِمُرَادِهِ کہ الہ ام دیگر حروف مقطعات کی مراد اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

اَمَّا بِذَلِكَ وَصَدَّقْنَا بِهْمِ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں
 ہمارے عقل ناقص ہے۔ لہذا یہ ضروری نہیں کہ ہم ان کے معافی ضروری معلوم کر سکیں۔ اس کا
 احسن طریقہ یہ ہے کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سونپ دینا چاہیے۔ کہ ان حدود سے
 اللہ تعالیٰ کی جو بھی مراد ہے، وہ برحق ہے۔ اور ہمارا اس پر ایمان ہے۔

اَمَّا وَصَدَّقْنَا

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

الجزء الاول

مع

عند المفسرين

الْعَمَّ ① ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ②
الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ
يُنْفِقُونَ ③ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمِمَّا
أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ④ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ⑤ أُولَٰئِكَ
عَلَىٰ هُدًى مِنْ رَبِّهِمْ ⑥ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ⑦

ترجمہ: ① اَلْعَمَّ یہ کتاب۔ نہیں شک اس میں۔ یہ رہنمائی کرتی
ہے متقینوں کی ② جو ایمان رکھتے ہیں غیب پر اور قائم کرتے ہیں نماز کو۔ اور
جو روزی ہم نے ان کو دے رکھی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں ③ اور
وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اُس چیز پر جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اور اُس چیز
پر جو آپ سے پہلے نازل کی گئی ہے اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں ④ یہی
لوگ ہیں ہدایت پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ہے اور یہی لوگ مراد کر پہنچنے
والے ہیں۔ ⑤

لفظ ذلک
کی حکمت

عربی میں ذلک اشارہ بعید کے لیے اور هذا اشارہ قریب کے لیے استعمال ہوتا ہے
یہاں پر گفتگو اس کتاب یعنی قرآن پاک کے لیے ہو رہی ہے۔ لہذا اہم اشارہ هذا
استعمال ہونا چاہیے تھا۔ یعنی یہ کتاب، نہ کہ ذلک یعنی وہ کتاب۔ اس اشکال کے متعلق مفسرین
کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر اشارہ بعید استعمال کرنے کا مقصد اس کتاب کی عظمت اور شان

کا اظہار ہے۔ لہذا ذَلِکَ الْکِتَابُ کا معنی یہ ہو گا۔ کہ یہ وہ کتاب ہے۔ جو اپنے کمال حقائق و دقائق، اسرار اور درستی کی جندی کی وجہ سے مخاطبین کے فہم سے غائب اور انسانی افکار کی توانائیوں سے بہت بلند ہے لہذا اس کے لیے ذَلِکَ کا اشارہ استعمال کیا گیا ہے۔

مفسرین کرام ایک دوسری وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ پہلی آسمانی کتابوں میں قرآن پاک کے متعلق پیش گوئیاں موجود تھیں۔ چنانچہ تورات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا تھا کہ میں تیرے بھائیوں میں سے تیرے جیسا ایک بنی برپا کروں گا۔ اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا۔ اور وہ کلام ہی وحی الہی قرآن پاک ہے۔ تو یہاں پر ذَلِکَ الْکِتَابُ کا معنی ہے کہ یہ وہی کتاب ہے۔ جس کی پیش گوئی پہلی کتابوں میں کی گئی تھی۔

یا اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جسے پہلے لوح محفوظ سے بیت العزت میں نقل کیا گیا۔ اور پھر وہاں سے تیس سال کے عرصہ میں بتدریج بنی علیہ السلام پر نازل کیا گیا یا وہ ہے کہ بیت العزت آسمانوں میں ایک مقام ہے۔ جہاں پر قرآن پاک اولیٰک وقت منتقل کیا گیا تھا۔

لفظ لا ریب
کا مضموم

لَا رِیْبَ فِیْہِ کا عام فہم معنی یہی ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں۔ مگر اس سے مراد یہ نہیں یعنی چاہیے کہ کوئی دوسرا شخص اس کلام میں شک و شبہ نہیں رکھتا۔ بلکہ بلاشبہ کفار و مشرکین قرآن پاک کی صداقت پر شک کرتے تھے۔ اسی لیے تو تیسرے رکوع میں ان لوگوں کی جیسلیج کیا۔ وَإِنْ کُنْتُمْ فِی رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یعنی اگر تمہیں اس چیز میں کوئی شک ہے۔ جو ہم نے اپنے بند پر اتاری ہے۔ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِہِ مِّنْ قَبْلِہِ مَ تَوَاسِیٰ اِیْکَ سُوْرَۃٍ ہِیَ بِنَا کَرَلَاؤَ۔ تمہاری قابلیت کا پتہ چل جائے گا۔ مطلب یہ کہ مشرکین کو لازم اس کلام میں شک کرتے تھے۔ تو یہاں پر لَا رِیْبَ کا معنی یہ ہے کہ واقعہ اور نفس الامر میں اس کلام میں شک و شبہ والی کوئی بات نہیں۔ اگر کوئی شک کرتا ہے۔ تو یہ اس کی اپنی غلطی اور دماغ کی خامی ہے۔ وہ شخص تعصب اور عناد کی وجہ سے شک کرتا ہے۔ ورنہ اس کتاب

میں تو کوئی غامی نہیں۔

حضرت شیخ المنہ
کی تفسیر

شیخ المنہ مولانا محمود الحسن فرماتے ہیں کہ کسی چیز کے بارے میں شک و شبہ کی دو وجوہات ہوتی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اُس چیز میں واقعی کوئی نقص ہوتا ہے جس کی وجہ سے شک پیدا ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُس چیز میں تو کوئی شک و شبہ یا نقص نہیں ہوتا مگر شک کرنے والے کے اپنے دماغ کی خرابی اور خلل کی وجہ سے اُسے وہ چیز مشکوک نظر آتی ہے ظاہر ہے کہ قرآن پاک کی ایک ایک آیت اس کا ایک ایک لفظ شک و شبہ سے پاک ہے۔ اس میں نہ کوئی کذب بیانی ہے اور نہ ہی کوئی خلاف واقعہ چیز ہے۔ یہ تو محض شک کرنے والے کے اپنے ذہن کا فتور ہے۔ جو اس کلام پاک میں شک کرتا ہے۔ مشرکوں اور منافقوں کے دماغ خراب تھے جو قرآن پاک پر اعتراض کرتے تھے، آج کل کے محدوں کے ذہن بھی پر اگندہ ہیں جو قرآن پاک کے احکام پر اعتراض کرتے ہیں۔ ورنہ قرآن پاک کی کوئی بات مشکوک نہیں۔ بلکہ یہ تو منبع رشد و ہدایت ہے۔

حضرت مولانا شیخ المنہ برصغیر کی جانی پہچانی شخصیت میں یہ میرٹھے پاس انہیں کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ آپسے، شاکی جیل میں اسیری کے دوران کیا تھا۔ تقریباً دو سو توں کا حاشیہ بھی لکھا تھا مگر زندگی کے یار پوسٹ ہو گئے۔ حاشیہ کا باقی بھر آپ کے شاگرد رشید شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے آپ ہی کی سب مشا انجام دیا۔ آپ کا کیا ہوا ترجمہ قرآن با محاورہ ہے۔ اور بلند ترین زبان میں سے ہے۔

قرآن پاک کے اردو ترجمے بہت سے بزرگوں نے کیے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلا ترجمہ شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کا ہے۔ یہ سب آسان لفظی ترجمہ ہے۔ اس کے ذریعے الفاظ کے معانی سمجھنا نہایت مشکل ہے۔

آپ کے بعد دوسرا محاورہ اردو ترجمہ شاہ عبد القادر دہلوی کا ہے۔ یہ بہترین با محاورہ ترجمہ ہے آج تک علماء اہل ترجمہ پیش نہیں کر سکے۔ اس کے بعد درجہ بدرجہ شیخ المنہ

سے ترجمہ قرآن کا مطبوعہ دار التبیان لاہور

علا صاحب درس حضرت مولانا صوفی عبد الحمید صاحب سوائی کے پاس دوران درس

کا ترجمہ پھر حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔ آپ نے قرآن پاک کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ فن تجوید کے متعلق اور پھر ربط کے بارے میں، اور اصول کے بارے میں آپ کی کتب موجود ہیں۔ آپ کی تفسیر علمی ہونے کی بنا پر ذرا مشکل ہے۔ تاہم یہ بلند پایہ اردو تفسیر ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے علماء کرام نے ترجمہ کیے ہیں یہ آپ کے پاس جو ترجمہ ہے۔ یہ مولانا احمد علی لاہوریؒ کا ہے۔ انہوں نے نہایت آسان اور عام فہم ترجمہ کیا ہے اور اس پر حاشیہ لکھا ہے۔

فرمایا یہ وہ کتاب مقدس ہے۔ جو شک و شبہ سے بالابے اِلهِ هٰذِي لِّلْمُتَّقِينَ
قرآن پاک متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔ یہاں پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے۔ کہ ہدایت تو کون سے لوگوں
کے لیے ہونی چاہیے تھی متقی تو پہلے ہی ہدایت یافتہ ہیں، ان کے لیے ہدایت ہونے کا کیا
معنی؟

اس ضمن میں شاہ عبدالقادرؒ اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ متقیین سے مراد
ہیں، بچکنے والے اور ڈرنے والے لوگ اور تقویٰ کی طرف جانے والے لوگ۔ یعنی جن میں ضد
اور مخالفت نہیں پایا جاتا۔ بلکہ وہ تقویٰ اختیار کرنے والے لوگ ہیں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں
کہ اس قرآن کو پڑھیں گے، تو ان میں تقویٰ پیدا ہوگا، یہ متقی بن جائیں گے، مقصد یہ کہ اگرچہ
آج یہ لوگ متقی نہ بھی ہوں، مگر اس قرآن پاک کی برکت سے آئندہ زندگی میں تقویٰ اختیار کر لیں گے۔
شاہ عبدالعزیزؒ اس کا معنی سمجھانے کے لیے ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ اگر کوئی بڑا
عقلمند، نوجوان، بڑے مضبوط جسم والا شخص ہو۔ تو اس کے متعلق کہتے ہیں کہ اس نوجوان نے
فلان ماں کا دودھ پیا ہے۔ دیکھو کتنا طاقتور ہے، گویا اس کی ماں کے دودھ میں وہ طاقت
اور تاثیر ہے۔ جس سے اس قسم کے کڑیل جوان پیدا ہوتے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ
هٰذِي لِّلْمُتَّقِينَ کا مطلب یہی ہے کہ اس قرآن پاک میں ایسی تاثیر ہے کہ جو اس سے

قریب ہوں گے۔ اس پر عمل کریں گے وہ متقی بن جائیں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کتاب صرف متقیوں کو ہدایت دیتی ہے۔ کیونکہ خود اسی میں دوسری جگہ **هٰذِي لِلْعٰلَمِيْنَ** بھی آیا ہے۔ کہ یہ تمام جہاں والوں کو ہدایت کا راستہ دکھاتی ہے۔

تقویٰ کی
تعریف

حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک میں حضرت ابی بن کعبؓ بڑے قاری تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ان سے پوچھا۔ حضرت تقویٰ کا کیا معنی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا **اَمَّا سَلَكَ طَرِيقًا ذَا شَوْكٍ** کیا آپ کو کبھی ایسے راستے پر چلنے کا اتفاق ہوا ہے جس میں ہر طرف کانٹے دار جھاڑ ہوں۔ تو انہوں نے جواب دیا ہاں! بہت دفعہ ایسے راستے پر چلنے کا اتفاق ہوا ہے تو حضرت ابی بن کعبؓ نے کہا۔ پھر آپ نے وہاں کیا کیا؟ حضرت عمرؓ نے کہا **شَمَوْتُ وَاجْتَهَدْتُ** میں نے دامن سمیٹ لیا اور پورنی کوشش کی کہ کانٹے میرے جسم کے کپڑوں میں نہ الجھ جائیں اور میں سلامتی سے ایسے راستے سے نکل گیا۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا **فَذَلِكَ التَّقْوٰی** تقویٰ اسی کو کہتے ہیں۔ کہ دنیا میں پیسے ہوتے کفر، شرک، گمراہی، بدعت اور دیگر خرابیوں سے انسان بچ کر نکل جائے۔ جو شخص ان چیزوں سے دامن بچ کر نکل گیا۔ وہی متقی ہے۔

حضرت حسن بصریؒ سے تقویٰ کا مطلب پوچھا گیا، تو فرمایا اللہ کے حکم کے سامنے کسی اور کا حکم نہ مانے اور یقین رکھے کہ تمام کام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ لہذا جس شخص کا اعتقاد اور عمل یہ ہوا وہ متقی ہے۔ کسی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے دریافت کیا کہ تقویٰ کس کو کہتے ہیں تو انہوں نے فرمایا **اَلَا تَتَوٰی نَفْسَكَ خَيْرًا مِّنْ اَحَدٍ**۔ یعنی تم اپنے نفس کو کسی دوسرے سے بہتر نہ سمجھو۔ تم یہی سمجھو کہ میں ہی کمزور ہوں اور میرا ہی قصور ہے جب تمہارے اندر یہ چیز پیدا ہو جائے تو متقی بن جاؤ گے۔ حضرت مجتہد الف ثانی کا قول ہے مجھے

برآں کس معرفت خدا علم است کہ خود را از کافر خرمگ بستر دانہ

یعنی جو شخص اپنے آپ کو انگریز کافر سے بھی بہتر سمجھتا ہے۔ اس پر خدا کی معرفت عرصہ ہے آپ نے بہت بڑی بات کہی ہے۔ کہ اپنے آپ کو انگریز کافر سے بھی بہتر نہ سمجھے۔ کیونکہ ہو

۱۔ تفسیر کبیر ص ۲۱

۲۔ تفسیر ابن کثیر ص ۵

۳۔ تفسیر مظہری ص ۱۵

بھیجے مگر آپ نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ کہتے تھے یہ رقم ان کو دوجن کا حق چھین رکھا ہے۔
مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ان کے تقویٰ کی بات تھی۔
خلیفہ عبدالملک بن مروان نے کسی حکیم سے پوچھا کہ بھائی! بتائی کون ہوتا ہے، تو اس حکیم نے جواب دیا متقی وہ ہوتا ہے
جو خدا کو مخلوق پر اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دے۔ وہ متقی ہوتا ہے۔

ایمان بالغیب

کتاب الہی کا ابتدائی تعارف کرنے کے بعد کہ یہ متقین کے لیے ذریعہ ہدایت ہے
ارشاد ربانی ہے کہ متقین وہ لوگ ہیں۔ اَلَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ جو غیب پر ایمان
رکھتے ہیں۔ غیب وہ چیز ہوتی ہے۔ جو ادراک، حواسِ ظاہرہ و باطنہ، عقل و فہم اور خیال کی دوسری
سے باہر ہو۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات ہیں۔ فرشتے ہیں۔ برزخ اور آخرت
کا دن ہے۔ اس میں آخرت کے تمام معاملات شامل ہیں۔ یہ سب غیب ہیں۔ اس کی تشریح
سورۃ بقرہ کی آخری آیات اَمَّنَ الرَّسُولُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ
كُلٌّ اَمَّنَ بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَكُتِبَ عَلَيْهِ وُصُوْلُهُ میں آچکی ہے۔ ان تمام
چیزوں پر ایمان ہونا چاہیے۔ البتہ غیب اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ بندوں کے لیے
سوائے وحی۔ الہام یا کشف وغیرہ کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کسی پر
الہام نہ کرے، تب تک کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ جب تک کسی نبی یا رسول پر وحی نہ کرے یا کشف
کے ذریعے کسی پر کوئی بات منکشف نہ کرے، اس وقت تک کوئی نہیں جان سکتا۔ اور جب کسی
کو کسی بات کی اطلاع دے دی جائے، یا کوئی چیز ظاہر کر دی جائے۔ تو وہ غیب نہیں رہتا۔ غیب
وہ ہوتا ہے۔ جو عقل و حواس یا کسی اور ذریعے سے منکشف نہ ہو۔ علم غیب اللہ تعالیٰ کی ذات کے
ساتھ مختص ہے۔ اسی کو عالم الغیب والشہادۃ کہا گیا ہے۔ جو بغیر کسی حواس، قوت یا آسے
کے جانتا ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ علم کا معنی ہوتا ہے۔ جاننا اور معرفت کا معنی ہے پہچاننا اور ایمان
کا معنی ہے ماننا۔ یہ الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہودی حق کو جانتے بھی ہیں اور پہچانتے بھی ہیں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق منقول ہے کہ کسی نے ان سے دریافت کیا کہ انسان متقی کس طرح ہو سکتا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ متقی وہ شخص ہو سکتا ہے جو اولاً اپنے دلی جذبات کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والا ہو۔
ثانیاً اپنی پوری طاقت کے ساتھ اللہ کے لیے عمل کرنے والا ہو۔

ثالثاً یہ کہ اپنے ابتداء جنس پر اسی طرح رحم کرنے والا ہو۔ جس طرح اپنے آپ پر رحم کرتا ہے۔
گویا جس طرح خود اپنے آپ کو ہر تکلیف سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی جذبہ جو مرد کے لیے بھی موجود ہو۔ جس شخص میں یہ تین علامتیں پائی جائیں گی وہ متقی بن جائے گا۔

محمد بن یوسف فرماتی ایک بزرگ ہوئے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سفیان ثوری سے پوچھا کہ کیا بات ہے جہاں جائیں آپ ہی کا چہرہ ہوتا ہے۔ لوگ آپ کے اس قدر مدح میں۔ حالانکہ میں نے تو آپ کو رات کے وقت سوتے ہوئے دیکھا ہے۔ یعنی آپ کو ساری رات عبادت کرتے ہوئے نہیں پایا ہے۔ آپ نے فرمایا چپ رہو۔ یہ بات تقویٰ پر مبنی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ تقویٰ عطا کرے، اُسے مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔

امام سفیان ثوریؒ نے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی طرح حکومت کے معتبوب ہے حتیٰ کہ منصور نے آپ کے لیے سزائے موت کا حکم جاری کر دیا کہ سفیان جہاں سے اُسے سولی پر لٹکا دو۔ وجہ یہ تھی کہ آپ حکومت کے غلط احکام پر تنقید کرتے تھے۔ انہیں ظلم سے منع کرتے تھے۔ ایک موقع پر ساتھیوں نے عرض کیا، حضرت! منصور ابراہیم آپ کو گرفتار کر لے گا۔ وہ آپ کے لیے سزائے موت کا حکم پہلے ہی جاری کر چکا ہے۔ لہذا آپ یہاں سے چلے جائیں۔ آپ نے خانہ کعبہ کا خلافت پکڑ کر دعا کی کہ اے پروردگار! اگر منصور مکے میں آجائے تو میں کعبہ سے بری ہو جاؤں گا۔ آپ نے ایسی سخت دعا کی کہ منصور راستے میں ہی ہلاک ہو گیا۔ آپ کو بادشاہ نے بڑا لالچ دیا۔ پچاس ہزار روپے بطور عطیہ

اسی طرح مسجدیں بنانا اور ان میں ضروریات فراہم کرنا، اور دینی مدارس کا قیام بھی مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ میں آتا ہے۔ کسی نالے پر پل تعمیر کرنا پانی کے لیے کنواں یا نل لگوانا، مسافر خانہ تعمیر کرنا۔ حج اور عمرہ خود کرنا یا کسی دوسرے کو کروانا۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد پر مال صرف کرنا، یہ سب مذات ہیں۔ جن پر خرچ کرنا اتفاق فی سبیل اللہ میں آتا ہے۔ اور باعث اجر و ثواب ہے۔ نیک کام کے لیے اخلاص کے ساتھ ایک پیسہ خرچ کرنے کا اجر دس گنا ملتا ہے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جہاد میں خرچ کرنا جہاں دشمن اور کافر دین کو توڑنا چاہتے ہوں۔ ان کے مقابلے کے لیے جو مال خرچ کیا جائے۔ اس کا ادنیٰ اسے ادنیٰ درجہ سات سو گنا ہے۔ نفقات واجبہ یعنی گھر کے ضروری اخراجات وہ بچوں کے لیے ہوں یا بیوی کے لیے، ان کو کر چا کر یا رشتہ داروں پر خرچ کیا جائے، یہ سب اتفاق فی سبیل اللہ میں آتا ہے اور مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ کا مصداق بنتا ہے۔

کتب سامی
پر ایمان

اس کے بعد فرمایا متقین وہ لوگ ہیں وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ یعنی آپ پر جو کتاب ہدایت اور جو احکام نازل ہوئے ہیں ان پر ایمان رکھتے ہیں وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ اور جو پہلے پیغمبروں پر وحی نازل ہوئی ہے۔ اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ پہلی کتابوں پر صرف ایمان رکھنا ضروری ہے۔ ان پر عمل کرنا ضروری نہیں، عمل ان احکام پر ہوگا۔ جو آخری کتاب قرآن پاک میں نازل ہوئے ہیں۔ قرآن پاک کے نزول اور حضور علیہ السلام کی شریعت کے نفاذ پر پہلے تمام احکام منسوخ ہو چکے ہیں۔ ان کا ترک کرنا ضروری ہے۔ ان پر عمل ضروری نہیں تاہم ان پر ایمان ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے جو کچھ نازل فرمایا وہ برحق ہے۔ یہ اجزائے ایمان میں سے ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ تمام آسمانی کتابیں برحق ہیں۔ تاہم قابل عمل احکام صرف قرآن پاک کے ہیں۔

ایمان بالآخرت

مُتَّقِينَ كِىْ اٰخِرَى صِفَتِ يَہِ بِيَانِ فَرَمٰى وَبِاٰخِرَةِ هُمْ يُوقِنُوْنَ وَہِ اٰخِرَتِ

مگر مانتے نہیں۔ وہ ایمان نہیں لاتے تھے۔ قرآن پاک کہتا ہے کہ یہودی نبی آخر الزماں کو
 "يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبَاءَهُمْ" اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی
 اولاد کو پہچانتے ہیں۔ مگر ایمان نہیں لاتے۔ ہاں! ایماندار اور پھر متقی وہ ہیں جو غیب پر ایمان
 رکھتے ہیں۔ طائفہ، بزرگ، آخرت وغیرہ تمام چیزیں غیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ
 چیزیں نبی علیہ السلام کو بذریعہ وحی بتلائی ہیں۔ لہذا متقی وہ ہیں جو ان سب پر ایمان رکھتے ہیں
 کہ یہ چیزیں برحق ہیں۔ اَمَّا وَحَكِّقْنَا

اقامت صلوٰۃ

متقین کی دوسری صفت ہے۔ اقامت صلوٰۃ فرمایا متقین وہ ہیں وَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ
 جو نماز کو قائم کرتے ہیں۔ یہاں پر یُقِيمُونَ الصَّلَاةَ یعنی نماز ادا کرتے ہیں۔ نہیں فرمایا۔
 بلکہ اقامت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو کہ بڑا گہرا لفظ ہے۔ اقامت کا مطلب یہ ہے کہ قیام
 رکوع، سجود، تلاوت، فرائض، سنن، واجبات اور مستحبات وغیرہ کو احسن طریقے سے ادا کیا
 جائے۔ جو لوگ ان تمام چیزوں کا خیال رکھتے ہیں اور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز
 ادا کرتے ہیں، اقامت صلوٰۃ کرنے والوں سے وہی لوگ مراد ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ
 نے اقامت صلوٰۃ کا معنی یہی کیا ہے کہ نماز کے تمام ارکان کو ٹھیک طور پر ادا کیا جائے۔

انفاق فی
 سبیل اللہ

ایمان بالغیب اور اقامت صلوٰۃ کے بعد متقین کی تیسری صفت یہ بیان فرمائی وَمِمَّا
 رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ یعنی متقین وہ لوگ ہیں جو ہماری دی ہوئی روزی سے خرچ کرتے ہیں
 خرچ کرنے سے مراد اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا ہے اور خرچ کی مختلف حالت میں سے پہلے نمبر
 پر زکوٰۃ ہے۔ دوسرا صدقہ فطر تیسرا قربانی چوتھا عام خیرات۔ اس کے بعد سائیں۔ محتاجوں۔
 یتیموں۔ کمزوروں۔ یتامیٰ اور یتیم خانوں کی حاجت روائی ہے۔ اس کے بعد وقف کی مدائی
 ہے۔ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے تو وہ اس کے نام پر وقف کر جائے تاکہ اس کے
 آخرت میں فائدہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے اپنی بہترین زمین کے متعلق حضور علیہ السلام سے عرض کیا
 کہ میں چاہتا ہوں کہ اس کا فائدہ مجھے آخرت میں پہنچے۔ اپنے فرمایا وقف کر دو۔ چنانچہ وہ وقف
 کر دی گئی۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ⑥ خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ⑦

ترجمہ: بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، ان کے لیے برابر ہے کہ آپ انکو

ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے ⑥ اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہے

ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ اور ان کے

لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ ⑦

ہدایت (اور گمراہی) کے اعتبار سے انسان تین گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں پہلا گروہ مومنین کا ہے۔ جو ہدایت کو ظاہر اور باطناً قبول کرتے ہیں اور اُسے اپناتے ہیں۔ یہ مومن متقی کہلاتے ہیں۔ سورۃ بقرہ کی پہلی چار آیتوں میں ان کا حال، ان کے اوصاف اور ان کا انجام بیان ہوا ہے۔ انسانوں کا دوسرا گروہ وہ ہے، جو ہدایت الہی کا ظاہر بھی انکار کرتے ہیں اور باطناً بھی انکار کرتے ہیں۔ یہ لوگ کسی طور پر ہدایت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، البتہ کافر کہلاتے ہیں۔ ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے انہیں لوگوں کا حال اور ان کا انجام بیان فرمایا ہے۔ ان کا تیسرا گروہ وہ زبان سے تو ہدایت ربانی کا اقرار کرتا ہے۔ مگر دل سے تسلیم نہیں کرتا۔ یہ لوگ منافق ہوتے ہیں۔ آئندہ تیسرے ۱۲ آیات میں انہی لوگوں کا حال بیان ہوا ہے۔

ان میں سے پہلا گروہ جو متقین اور مومنین کا گروہ ہے، وہ فلاح پانے والا گروہ ہے البتہ دوسرے دونوں گروہ ناکام ہیں۔ پھر ان میں سے کافروں کا حال مختصر طور پر بیان ہوا ہے۔ کیونکہ انہوں نے علی الاعلان ہدایت کو قبول نہیں کیا۔ اور کفر پر اڑے ہوئے ہیں۔ البتہ منافقین کا گروہ چونکہ زیادہ خطرناک ہے اس لیے اس گروہ کا حال زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ ان کی مثالیں بھی دی ہیں تشبیہات کے ساتھ بھی سمجھایا ہے، کیونکہ منافقین کا یہ گروہ

کے دن پر یقین رکھتے ہیں آخرت کے دن سے مراد قیامت کا دن یا دنیا کا آخری دن
 (LAST DAY OF THE WORLD) ہے۔ اسی لیے اس کو آخرت کہتے ہیں۔ اے
 دارالآخرت یا آخرت کا گھر بھی کہتے ہیں۔ گویا یہ بھی ایمان کے اجزاء میں سے ہے۔ اسی
 طرح فرشتے، آسمانی کتابیں، اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات اور توحید یہ سب ایمان
 کے اجزاء ہیں۔ تقدیر بھی ایمان ہی کا حصہ ہے۔ کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے یا آئندہ ہوگا
 اللہ تعالیٰ کے علم ارادے اور مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس پر بھی ایمان رکھنا ضروری ہے۔
 فرمایا جو لوگ مذکورہ صفات کے حاملین ہوں گے اُولَئِكَ عَلٰی هُدٰی
 مِّنْ رَبِّهِمْ وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدیت پر ہیں۔ وَاُولَئِكَ هُمُ
 الْمُفْلِحُونَ اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ فلاح کے معنی مراد کو پہنچنے والے ہیں
 تو مطلب یہ ہوا کہ قرآن کریم کے جس پروگرام کو لوگ نماز میں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ
 کہہ کر مانگتے ہیں وہ سارا پروگرام یہاں تک بتا دیا گیا ہے۔ جو لوگ اس پروگرام کو تسلیم کر کے اس
 پر عمل کریں گے۔ فلاح پائیں گے۔ اور جو قوم اس سے روگردانی کرے گی۔ وہ فلاح حاصل نہیں
 کر سکے گی۔ اگرچہ وہ دنیوی لحاظ سے جس قدر بھی سودہ حال ہو جائے۔ پروگرام کو واضح کر دیا گیا ہے
 یعنی ایمان، تقویٰ، انفاق فی سبیل اللہ۔ پھر اس کے بعد سابقہ کتابوں اور آخرت پر ایمان،
 اور پھر ان اصولوں پر استقامت ہی فلاح کا دار و مدار ہے۔ اسی کی وجہ سے دائمی عذاب
 سے نجات حاصل ہوگی اور آخرت میں اعلیٰ درجات نصیب ہوں گے۔

ہدیت یافتہ
 لوگ

کتاب ہے کہ انگریز کا فکری وقت ایمان لے آئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہو جائے۔
اور کفارِ انفس مومنا مومنا ہوتے ہوتے شیطان ہی بن جائے لہذا جب تک اپنے آپ کو اس سے
حضرت نہ سمجھو گے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں ہوگی۔ اگر یہ عامل نہ ہونی تو متقی کیسے بن سکتے ہو
(محمد الاسلام) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شجرہ مبارکہ میں ایک شعر آتا ہے۔

زمن دارد سگے نصرانیاں عار کہ او بے گناہ و من گنہگار
یعنی مجھ سے تو نصرانیوں کا کتا اچھا ہے۔ کیونکہ وہ گنہگار نہیں اور میں گنہگار ہوں عجزی
اور انکاری کا یہ معیار ہے۔ اور اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔

علمائے کرام فرماتے ہیں کہ تقویٰ کے تین درجے ہیں۔ پہلا یہ کہ انسان شرک کی تمام
اقسام سے پاک ہو۔ اگر ایسا ہوگا تو عذاب سے خلاصی پائے گا۔ ”وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ
التَّقْوَىٰ كَافٍ“ یعنی جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر تقویٰ کا کلمہ لازم کر دیا ہے۔

تقویٰ کے
تین درجات

تقویٰ کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ انسان کبیرہ گناہوں سے بچتا ہے اور چھوٹے گناہوں
پر صراحت کرے۔ اور تیسرا درجہ تقویٰ کا یہ ہے کہ انسان مشکوک اور شبہات والی باتوں سے
بچتا ہے۔ جو شخص تقویٰ کے ان تینوں درجات پر پورا اترے گا وہی کامل درجے کا متقی ہوگا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حسرت کے دن یعنی قیامت کے روز آواز آئے گی
کہ متقی لوگ کہاں ہیں متقی لوگ اٹھیں گے اور اللہ تعالیٰ کی تجلی کے سایے میں چلے جائیں گے۔

متقی کون ہیں؟

و تجلی ان پر ہر وقت سایہ فگن ہوگی اور کسی وقت ان سے علیحدہ نہیں ہوگی کسی نے حضرت معاذ بن جبلؓ
سے دریافت کیا کہ حضرت! متقی کون ہیں۔ تو آپؓ نے فرمایا کہ متقی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے
آپ کو انواعِ شرک سے محفوظ رکھا اور اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کرتے رہے۔ متقیوں کی عبادت
یہ ہے کہ اگر انہیں مصیبت آئے تو صبر کریں۔ اور خدا کے فیصلے پر راضی ہوں۔ اگر راحت
آئے تو خدا کی نعمت کا شکر ادا کریں قرآن پاک کے احکام کے سامنے ہمیشہ مطیع و فرمانبردار رہیں
یہی لوگ متقی ہیں۔

بڑا خطرناک کر دہ ہے۔

کفر کا معنی

عربی زبان میں کفر کا معنی کسی چیز کو چھپا دینا یعنی مخفی اور پوشیدہ کر دینا ہے۔ اسی لیے اہم بیضادنی کہتے ہیں کہ جس ڈوڈی کے اندر پھل بند ہوتا ہے۔ اُسے کافر کہتے ہیں۔ اودکان جوینج کو زمین میں چھپا دیتا ہے۔ اُسے کافر کہتے ہیں۔ جیسے سورۃ الحمدہ میں اَتَمَّ بَعْدَ كَعْمَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاُئُهُ گو یا کافر کا لفظ کسان پر بھی بولا گیا ہے۔ بادل اور اندھیرا جو سورج کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے۔ اس کو بھی کافر کہتے ہیں ۵

فِي لَيْلَةٍ كَفَرَ النَّجْمُومَ عَمَامَهَا

یعنی بادل اور اندھیرا ستاروں کو چھپا لیتا ہے۔ تو لغوی اعتبار سے اس کا معنی یہ ہو گا۔ جیسا کہ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں اِنَّ السَّيِّدِينَ سَكَّرُوا الْحَقَّ عَنْ دَابِّ شَكٍّ وَهَ لَوْكُ جَنُودٍ نَزَّحَتْ دَكِي حَسْبُ حَقِّ كُفَّارٍ دِيَا۔ مارک دالے اور دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں یعنی حق کو چھپا دیا۔ ظاہر ہی نہیں کیا۔

جب کفر کا اطلاق شریعت کی اصطلاح میں کیا جاتا ہے تو اس کا خاص معنوم ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جو چیز حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہو۔ شک و شبہ والی بات نہ ہو، اُس چیز کا منکر کافر کہلاتا ہے۔ اور یہ انکار کفر کہلاتا ہے۔ کسی ایک چیز کا انکار ہو یا تمام چیزوں کا۔

کفر کی مختلف اقسام

جس طرح شرک نفاق، الحاد، ارتداد، زندقہ، فسق، ایمان، توحید وغیرہ قرآن کی مختلف اصطلاحات ہیں۔ اور ان سب کا الگ الگ معنوم ہے اسی طرح کفر بھی ایک اصطلاح ہے اور اس کی مختلف اقسام ہیں۔ جو کہ مفسرین، محدثین، فقہاء اور علمائے بیان کی ہیں۔

کفر انکار

مبغض ان کے کفر انکار ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی شخص دل اور زبان دونوں سے شریعت کی قطعی چیز کا انکار کرے اِنَّ السَّيِّدِينَ كَفَرُوْا میں دل اور زبان دونوں سے انکار ہے۔ ایسا شخص حق کی بات کو جاننے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ لہذا یہ کفر انکار ہے

قرآن پاک میں کفر کی جس دوسری قسم کا ذکر آتا ہے۔ وہ کفر جود ہے۔ جحد کا معنی انکار ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ وَجَحْدُ وَاِبْهَاتِے ظاہر ہے۔ کفر جود کی تعریف یہ ہے کہ آدمی دل سے پہچانتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ بات سچی ہے۔ مگر وہ اس کا زبان سے اقرار نہیں کرتا۔ جیسا کہ فرعونوں کے متعلق فرمایا: وَجَحْدُ وَاِبْهَاتِے وَاسْتَقْنَتْہَا اَنْفُسُہُمْ ظُلْمًا وَّمُكَلُّوْا دِلَّہِمْ سَمٰجَہِے تھے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کا دین سچا ہے۔ مگر وہ اس کا انکار کرتے تھے یہ انکار ظلم اور تعدی کی بناء پر تھا۔ اس کو کفر جود کہا جاتا ہے۔ ابلیس کا کفر ہی ہے۔ کیونکہ وہ دل میں حق بات کو سمجھتا ہے۔ مگر اقرار کی بجائے انکار کرتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص بلعم بن باعور ہوا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے مرود ہوا تھا۔ اس کا ذکر سورۃ الاعراف میں موجود ہے۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کے زمانہ میں ایک بڑا حکیم شاعر امیہ بن ابی الصلت ہوا ہے۔ اس کا کفر بھی ایسا ہی تھا۔ اُس نے حق کو جانتے پہچانتے ہوئے قبول نہیں کیا تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں وحی نازل کی۔ مجھ پر کیوں نہیں کی۔ عربی زبان میں اس کا کلام موجود ہے۔ وہ شخص نبیؐ ابدی اور قیامت تک کا تصور رکھتا تھا۔ وہ توراۃ اور انجیل کا قاری اور ہدایت کا طلب گار تھا۔ مگر جب حضور علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو وہ حسد میں مبتلا ہو گیا۔ اور آپ کی رسالت کا انکار کر دیا۔ حالانکہ وہ دل سے برحق سمجھتا تھا۔ وہ اتنا قابل آدمی تھا کہ اس کے اشعار پڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ کہ یہ کوئی بڑا مومن آدمی ہو گا۔ حضور علیہ السلام نے اس کے متعلق فرمایا اَنْتَ مِمَّنْ اٰمَنَ لٰکَ وَ لَعَلَّ یُوْمِنُ قَلْبُکَ یعنی زبان تو اس کی مومنوں جیسی ہے مگر دل کافر ہے۔

بعد کے زمانہ میں ایک افانہ نویس انگریز برٹاؤنشا گذرا ہے۔ بڑا صاحب علم تھا، اسلام کو وہ بھی سچا سمجھتا تھا۔ مگر کمزورت سے اقرار نہیں کیا۔ یہی حال مسٹر گاندھی کا تھا۔ وہ اسلام کو سچا مذہب کہتا تھا۔ مگر دل سے تسلیم نہیں کیا۔ وہ عیسائیت اور ہندومت کو بھی سچے مذاہب ہی

سمجھتا تھا۔ ملائکہ سچا مذہب تو صرف اسلام ہی ہے۔ اِنَّ الْمَذِيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الرَّسُلَا فَرَّ
باقی سب ادیان باطل ہیں۔ یہی کفر مجرب ہے۔ کہ کسی چیز کو دل سے صمیم سمجھ کر پھر زبان سے
اس کا اقرار نہ کیا جائے۔

کفر کی تیسری قسم کفر عناد ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ دل سے پہچانتا بھی ہے۔ زبان

سے اقرار بھی کرتا ہے کہ یہ دین درست ہے۔ مگر قبول نہیں کرنا۔ اس کی مثال ابو طالب کا
کفر ہے۔ وہ حضرت علیؑ کے والد اور حضور علیہ السلام کے چچا تھے۔ وہ۔ مآحق۔ کہ میرا بھتیجا سچا ہے
صادق اور امین ہے۔ جو کہتا ہے۔ سچ ہے۔ مگر اس نے ایمان اور توحید کو قبول نہیں کیا۔

اس کا خاتمہ کفر پر ہی ہوا۔ وہ عجیب قسم کے دہم کا شکار تھا۔ محض اس ڈر سے اسلام قبول
نہیں کیا۔ کہ عورتیں ملاست کریں گی کہ موت کے ڈر سے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا۔ یہ کفر عناد ہے

کفر نفاق

کفر کی چوتھی قسم کفر نفاق ہے۔ اس کا ذکر اگلی آیتوں میں آ رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے
کہ انسان زبان سے اسلام کی سچائی کا اقرار کرتا ہے۔ کلمہ بھی پڑھتا ہے۔ نمازیں بھی ادا کرتا ہے
زکوٰۃ دیتا ہے۔ بسا اوقات جہاد میں بھی شریک ہوتا ہے۔ مگر دل سے تکذیب کرتا ہے یہ
کفر نفاق ہے۔ اور پھر نفاق بھی دو قسم سے ہے یعنی اعتقادی نفاق اور عملی نفاق۔ یہاں پر
جس نفاق کا ذکر ہوا ہے۔ یہ اعتقادی نفاق ہے کہ اعتقاد اول سے تسلیم نہیں کرتا عملی نفاق
کا ذکر بعد میں آئے گا۔ وہ اور چیز ہے۔

محدثین کرام فرماتے ہیں کہ یہ چاروں کفر خطرناک ہیں۔ ان میں سے کسی میں بھی مبتلا ہو
گیا۔ وہ اللہ کے ہاں کبھی نجات نہیں پاسکتا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذاب میں مبتلا ہوگا۔ یہ قطعی
بات ہے۔

کفر شک

اس کے علاوہ بھی کفر کی کئی قسمیں ہیں۔ منجملہ ان کے کفر شک ہے۔ قرآن پاک میں
بعض منافقوں کے بارے میں آتا ہے۔ فَهَمْ فِي رَيْبِهِمْ يَكْتُمُونَ دُونَ دُورِ
مَكْرَمٍ يَابِلُهُمْ فِي شَيْءٍ يَلْعَبُونَ یعنی ایسے لوگ شک میں ہی کھیل رہے ہیں۔

یہ کفر شک کہلاتا ہے۔

اسی طرح کفر کی ایک قسم کفر جہالت ہے۔ علم حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے ساری عمر جہالت میں گزر جاتی ہے۔ نہ علم ہوتا ہے اور نہ وہ راہِ راست پر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی جگہ جگہ پر مذمت بیان کی ہے: أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ "ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے یعنی علم نہیں رکھتے۔ دوسری جگہ فرمایا: هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ "کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟ مطلب یہ کہ برابر نہیں ہوتے۔ اس قسم کا کفر کفر جہالت ہے۔ جس میں اکثر لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔

کفر تاویل کو اتحادِ مہودِ مذہب بھی کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شی کو غلط مطلب پہنا دیا جائے۔ اصل مقصد کچھ اور ہو مگر تاویل کے ذریعے کچھ سے کچھ بنا دیا جائے مثلاً غلام احمد پروردگارِ پاک کی آیت أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ کا مطلب مرکزِ ملت یا سنٹرل گورنمنٹ مراد لیتا ہے کہ مرکزی حکومت کا حکم ماننا لازمی ہے۔ اسی طرح حج کا معنی اس نے عالمی کانفرنس کیا ہے۔ حالانکہ حج ایک عبادت کا نام ہے۔ اس کے ارکان ہیں، جن کو پورا کرنا ضروری ہے اس لیے محض عالمی کانگریس یا عالمی کانفرنس کا نام دینا بالکل غلط ہے۔ پروردگار نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ خدا کے حکوم ہونے کا مطلب اپنی فطرت کا محکوم ہونا ہے۔ یہ بھی کفر والا معنی ہے۔ اس نے ترجمہ القرآن میں لکھا ہے کہ اللہ کا معنی قانون ہے۔ جہاں بھی اللہ کا لفظ آیا ہے۔ اس سے مراد قانون ہے۔ گویا خدا تعالیٰ کی ذات یا ہستی نہیں ہے۔ اسی طرح اس نے حُورٍ عِينٍ کا معنی پاکیزہ فکر کیا ہے۔ گویا جنتوں سے مراد پاکیزہ فکر والے لوگ ہیں۔ حالانکہ حُورٍ عِينٍ کی اصطلاح کو تمام مسلمان سمجھتے ہیں کہ وہ عورتوں کی ایک پاکیزہ مخلوق ہے۔

غلام احمد قادیانی نے اپنی کتاب ازالہ اودھام میں مُتَمِّدٌ رِئُوسُ اللہ کے متعلق لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن میں میرا نام محمد بھی رکھا ہے اور رسول بھی۔ العیاذ باللہ۔ یہ کفر والا معنی ہے۔ اس سے پہلی آیت وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ کا معنی قادیانی یوں کرتے ہیں۔

بِالنَّبَوَةِ الْآخِرَةِ یعنی متقی وہ لوگ ہیں جو آخری نبوت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور آخری نبوت مرزا غلام احمد مرتد کی لیتے ہیں حالانکہ آخرت سے مراد دارالآخرت یا یوم آخرت ہے نہ یہ زمیوں کی تاویل کی مثال ہے۔ اسی طرح انہوں نے وَلَٰكِنْ رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمُ النَّبِيِّينَ کا معنی یہ کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے مہر لگانے والے ہیں۔ یعنی اب جو نبی آتے ہیں، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر سے آتے ہیں۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم مہر لگانے والا کہ دوسروں کو نبی بنا رہے ہیں (العیاذ باللہ)

الغرض کفر تاویل سے مراد یہ ہے کہ کوئی ایسا معنی کرنا جو نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو، نہ صحابہ کرام سے، نہ از سلف صالحین سے ثابت ہو، وہ کفر تاویل، از مذقہ الحاد میں شمار ہوگا۔

سرستہ احمد خاں نے بہشت کا معنی مسرت اور خوشی کیا ہے۔ دوزخ کو غم اور پریشانی سے تعبیر کیا ہے۔ خوشی اور مسرت اچھے اعمال کا صلہ ہوتی ہے۔ اور رنج و غم بُرے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک جنت اور دوزخ کسی خاص جگہ کا نام نہیں۔ یہ بھی کفر یہ معنی ہے۔ کفر کی ایک قسم عملی کفر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نعمت کی قدر دانی کی بجائے اس کی ناشکری کی جائے۔ کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، حضور! کفر سے کیا مراد ہے؟ فرمایا ناشکر گزاری اور نافرمانی۔ اکثر عورتیں اس قسم کے کفر میں مبتلا ہوتی ہیں۔ عورتوں کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے تَكْفُرُنَ الْعَشِيرَ یعنی تم خاوند کا کفر کرتی ہو۔ ناشکر گزاری کرتی ہو۔ یہی عملی کفر ہے۔ فرمایا کہ خاوند زمانہ بھر راحت و آرام مہیا کرتا ہے اگر ایک مرتبہ بھی تمہاری مرضی کے خلاف کوئی بات ہو جاتی ہے۔ ترک کرتی ہو، تیرے گھر آکر مجھے کبھی کبھی نصیب نہیں ہوا کفر من نعمت اکثر عورتوں کے مزاج میں داخل ہوتا ہے۔ یہ اعتقادی کفر نہیں بلکہ عملی کفر ہے۔

عملی کفر

محدثین اور فہمائے کرام عملی کفر کی دو قسمیں بتاتے ہیں۔ بعض عملی کفر ایمان کے بالکل منافی ہوتے

ہیں۔ اگر کوئی شخص ایسے کفر کا ارتکاب کرے تو ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ مثلاً کوئی بت کے سامنے بکھوڑیز ہو جائے، یا قرآن کریم کی توہین کا مرتکب ہو اُسے گندی جگر پھینک دے یا مثلاً کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دے یا کسی نبی کو قتل کئے تو ایسا آدمی ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔

عملی کفر کی دوسری قسم وہ ہے۔ جن وجہ سے انسان ایمان سے خارج نہیں ہوتا مثلاً کوئی شخص نماز کا تارک ہو، شراب پی لے، کسی کو قتل کر ڈالے، زنا کا مرتکب ہو یا کسی سے ناحق لڑائی کی۔ یہ سب کفر ہی کی قسم سے ہیں۔ مگر یہ ایمان کے منافی نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَرْجِعُوا بَعْدِي كُفَّارًا میرے بعد کفار کی طرح نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔ ان امور سے انسان اسلام سے تو باہر نہیں نکلتا۔ مگر کام کافروں والے ہیں۔ مومن کی شان نہیں کہ یہ کام کرے۔ قَاتِلُوا الْكُفْرَ مومن سے مقابلہ کفر ہے۔ مومن کو گالی دے، فسق کی بات کرے، ناحق لڑائی یہ سب کفر کی باتیں ہیں۔ کیونکہ کافر، مسلمان کی جان کا دشمن ہوتا ہے جب کہ مومن، مومن کی جان کا محافظ ہوتا ہے۔ فرمایا شَارِبُ الْخَمْرِ كَافِرٌ یعنی شراب پینے والا ایسا ہی ہے۔ جیسا بت پرستی کرنے والا۔ گویا شرابی کو بت پرست کے ساتھ تشبیہ دی۔ نَسَائِي شَرِيفٌ مِّنْ آلِي عِرَافًا اَوْ كَاهِنًا جو کاہن یا عراف کے پاس غیب کی خبریں پوچھنے کے لیے گیا فَتَدْ كُفْرًا اس نے کفر کیا۔ اس کی مزید تفصیل آتی ہے۔ کہ اگر نجومی کی بات کو بالکل سچا سمجھ رہا ہے تو اسلام سے خارج ہو گیا۔ اور اگر سچا سچا تو نہیں سمجھتا، ویسے ہی اس کی رائے لینا چاہتا ہے۔ تو یہ عملی کفر ہے۔ اسلام سے خارج تو نہیں ہوتا۔ مگر سخت گنہگار ہوتا ہے۔

کفر دہریت بھی اسی قبیل سے ہے۔ قرآن پاک میں اسی کفر کے متعلق مذکور ہے کہ بعض کافر یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ دَمَا يَهْدِيكَ اِلَّا الدَّهْرُ یعنی ہمیں زمانہ ہی ہدایت کرتا ہے ایسے لوگ زمانے کے تمام حادثات کو زمانے ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی ذات

کا اقرار نہیں کرتے کہ وہی ہر چیز کرنے والا ہے۔ بلکہ زمانے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ یہ کفر و ہریت کو لانا ہے۔
 اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاذُنُ قَوْمٍ مِّنْهُمْ مِّنْ يَّسْتَفْهِمُ مِمَّا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا كٰفِرًا ۚ
 ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ کہ کفار کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔
 اگر ایسا ہے تو پھر انہیں ایمان کی تبلیغ و دعوت سے کیا حاصل ؟

ایک اشکال اور
 اس کا جواب

مفسرین کرام وضاحت فرماتے ہیں کہ اس مقام پر لفظ سَوَاءٌ عَلَیْہِم مِمَّا یُتْلٰی عَلَیْہِم یعنی ان کفار کے لیے برابر ہے۔ خواہ آپ تبلیغ کریں یا نہ کریں۔ سَوَاءٌ عَلَیْکَ کے الفاظ انہیں آئے یعنی یہ نہیں فرمایا کہ ان کو تبلیغ کرنا یا نہ کرنا آپ کے لیے برابر ہے۔ یہ تو ان کے لیے برابر ہے۔ کہ انہیں کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ آپ کا تو فرض ہے کہ آپ فریضہ تبلیغ انجام دیتے ہیں۔ کوئی ماننے یا نہ ماننے۔ یہ اس کی اپنی صوابدید پر ہے۔ آپ کے لیے حکم یہی ہے "فَذٰکِرْہُمْ اِنْ نَّفَعَتْ الذِّکْرٰی" آپ نصیحت کرتے چلے جائیں، چاہے وہ انہیں فائدہ دے یا نہ دے۔ آپ کو اس تبلیغ کا ہر حالت میں اجر ملے گا۔

اسماء

درس نمبر ۲

البقرة ۲

(آیت ۷۶)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أُنذِرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ⑥ خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ⑦

ع

ترجمہ: بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، ان کے لیے برابر ہے کہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے ⑥ اللہ تعالیٰ نے ہر ٹکادی ہے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے ⑦

ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے اعتبار سے انسانوں کے دو سرگروہ گزشتہ پیرہ یعنی کفار کا ذکر کیا ہے۔ پہلے گروہ متعین کا بیان ہو چکا ہے۔ یہ دو سرگروہ کا بیان ہے اور دوسرے گروہ منافقین کا تذکرہ اگلے رکوع میں آئے گا۔ یہ دوسرا گروہ کفار کا ہے۔ جو ظاہر اور باطن اللہ تعالیٰ کی توحید کا انککار کرتے ہیں۔ اور ہدایت کو قبول نہیں کرتے۔ کفر کی تشریح اور اس کی مختلف اقسام گزشتہ درس میں مختصر بیان کر دی گئی تھیں۔

گزشتہ درس میں اس اشکال کا تذکرہ ہوا تھا کہ اگر کافروں نے ایمان ہی نہیں لانا خواہ انہیں ڈرایا جائے یا نہ ڈرایا جائے، تو پھر انہیں تبلیغ کرنے کا فائدہ کیا ہے۔ اس کا جواب بھی دیا گیا تھا کہ ڈرانا یا نہ ڈرانا کفار کے لیے برابر ہے۔ نہ کہ خود مبلغ کے لیے، کیونکہ مبلغ تو ہر حالت میں اجر کا مستحق ہے، خواہ کوئی ایمان لائے یا نہ لائے۔

دوسرا سوال یہاں پر یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد تو یہ ہے کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، کفار ایمان نہیں لائیں گے۔ حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ بہت سے کافر

ان آیات کے مصداق کون ہیں

اگرچہ ایمان نہیں لائے۔ مگر دوسرے بہت سے ایمان لائے۔ ابوسفیانؑ کافر ہی تو تھے۔
وہ ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے۔ ابوجہل جیسے بدترین دشمن کا بیٹا عکرمہؑ ایمان لایا۔
مشہور جبریل خالہ بن ولید بھی بڑی دیر کے بعد ایمان کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ تو اس کا
جواب یہ ہے۔ کہ یہاں پر کفار سے مراد وہ کفار ہیں۔ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے
کہ ان کی استعداد خراب ہے۔ ان کا خاتمہ کفر پر ہونے والا ہے۔ ان سکتبہ۔ شیبہ۔ ابولہب۔ ابو
ابوجہل جیسے کافر مراد ہیں۔ جن کا خاتمہ حالت کفر پر ہوا۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ ان آیات میں یہودیوں کی طرف اشارہ ہے۔ جب
قرآن کریم نازل ہوا تو انہیں اسلام کی دعوت پیش کی گئی۔ مگر وہ جانتے بوجھتے ہوئے ایمان نہ
لائے۔ اس لئے اکاد کا آدمی کے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ وہ کہتے تھے۔ کہ ہم پہلی کتابوں
پر ایمان لا چکے ہیں۔ لہذا ہمیں اس کتاب یعنی قرآن پاک پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں ہے
وہ انتہائی درجے کے متعصب لوگ تھے۔ یہ روش انہوں نے عباد کی وجہ سے اختیار کی۔
چنانچہ اس سورۃ مبارکہ میں کثرت سے یہود کا ذکر آئے گا۔ بلکہ اس سورۃ کا موضوع ہی یہود کی
اصلاح ہے۔ یہود کا ذکر یسیرۃ النبیؐ سے شروع ہو کر اختتام پارہ اود پھر
دوسرے پارے تک چلا گیا ہے۔

ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔
تو پھر انہیں اسلام کی دعوت دینے کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ بلکہ انہیں دعوت دینا تو خلاف انصاف
معلوم ہوتا ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔ کہ یہود کے بقیہ
کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے۔ کہ وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں
ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے وہ ایمان سے محروم رہیں گے۔ اس کی مثال ایسے
ہی ہے۔ جیسے کوئی ماہر ڈاکٹر یا طبیب کسی مریض کو دیکھ کر بتائے کہ اسے ٹی بی کا مریض لاحق
ہے۔ لہذا اب یہ یقین درجے عبور کر کے چوتھے درجے میں داخل ہو گیا ہے۔۔۔ مریض کی موت

طرف جانا چاہتا ہے۔ خدا اسی طرف کی توفیق دیتا ہے۔ توفیق تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ مگر ارادہ تو انسان کا ہوتا ہے۔ اور ارادے کی مدد تک انسان کو اختیار دیا گیا ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں اسے کسب کہتے ہیں۔ گویا ارادہ انسان کا اپنا ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ توفیق دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے **وَفَضَّلَهُ جَهَنَّمَ** آخر کار اس کو جہنم میں داخل کریں گے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اختیار کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک تندرست آدمی اپنے ارادے اور اختیار سے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اور دوسرا شخص بوش کا مریض ہے۔ اور اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر حرکت کرتا رہتا ہے۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگر کوئی تندرست آدمی اپنے ہاتھ سے کوئی نقصان کرے، کوئی بدن ترے کسی کو تھپڑ مارے تو وہ اس فعل کا ذمہ دار ہوگا۔ اور قابل گرفت ہوگا۔ برخلاف اس کے کسی بے شعشے والے آدمی سے غیر ارادی طور پر کوئی نقصان ہو جائے تو وہ قابل مواخذہ نہیں ہوگا۔ وہ تو بچارہ مجبور ہے۔ اس کے ہاتھ سے قرار گر کر کسی کی ہلاکت کا سبب بھی بن جائے، تو اس کے ذمے قصاص نہیں ہوگا بلکہ دیت ہوگی، معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو جو محدود اختیار دیا گیا ہے۔ اسی کو شریعت میں کسب کہا جاتا ہے چنانچہ جو شخص بقائم بوش و حواس اپنے ارادے سے صحیح راستے سے روگردانی کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ منہ کے طور پر اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دیتے ہیں اور آنکھوں پر پردہ حائل کر دیتے ہیں۔ مہر لگانے کا یہی مطلب ہے۔

دلوں کی سیاہی

مسلم شریعت کی روایت میں آتا ہے **لَعَسَ وَضَّ الْفِتْنُ عَلَى الْقُلُوبِ كَالْخَصِيرِ** **هُوَ ذَا عُوْدًا** دلوں پر فتنے وارد ہوتے ہیں جس طرح مٹکا تھا جوڑ کر چٹائی تیرا۔ سو جاتی ہے اسی طرح دلوں پر فتنے یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان گمراہ ہو جاتا ہے اور اس کے دل پر ٹھپہ لٹک جاتا ہے۔ یہ فتنے گمراہی کی باتیں ہیں جو ایک ایک کر کے انسان پر حملہ آور ہوتی رہتی ہیں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص ان فتنوں کو قبول کر جاتا ہے اس کا دل سیاہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ پورے دل پر سیاہ ہو جاتا ہے اور انسان اس شیخ

پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں نیکی کو نیکی نہیں سمجھتا اور بُرائی کو بُرائی نہیں جانتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے
 لٹے کو اٹا کر کے رکھ دیا جائے یعنی ہینڈ اوپر اور منہ نیچے کی طرف کر دیا جائے۔ تو اس میں کوئی
 چیز نہیں سما سکتی۔ اسی طرح انسان کا دل بھی اٹا ہو جاتا ہے۔ نیکی کی کوئی بات اس میں جگہ نہیں پاتی۔
 برخلاف اس کے جو شخص دل پر وارد ہونے والے فتنوں کو قبول نہیں کرتا، اس کا دل گنگھڑ
 کی طرح سفید ہو جاتا ہے۔ اُسے کوئی فتنہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

ایک دوسری حدیث میں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ جب بندہ پہلی مرتبہ گناہ کا ارتکاب
 کرتا ہے۔ تو اس کے دل پر سیاہ داغ پڑ جاتا ہے اگر بندہ توبہ کرے۔ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ کی معافی مانگ
 لے تو سیاہ داغ دھل جاتا ہے اور دل پھر سفید ہو جاتا ہے۔ اور اگر توبہ کرنے کی بجائے دوبارہ گناہ کا
 مرتکب ہوا تو سیاہ داغ بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح ہر گناہ کے ارتکاب پر دل کی سیاہی میں اضافہ
 ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اِحَاطَتْ
 بِہِ خَطِیئَتُہٗ" اس کے گناہوں نے اس کا احاطہ کر لیا ہے۔ اس کا دل معصیت، کفر اور
 شرک میں گھر گیا ہے۔ اسی حالت کے متعلق فرمایا "کَلَّامِلَ عِثْرَانِ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَا کَانَ لَیْسَ یُؤْنِ
 خَبْرًا" اُن لو! ان کے دل پر رنگ چڑھ گیا ہے۔ اور اس کی وجہ ان کا اپنا کیا دھڑ ہے۔ یہی وہ
 شیج ہے جس کے متعلق فرمایا "خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ" یعنی اللہ تعالیٰ نے بطور سزا
 ان کے دلوں پر مہر لگائی ہے۔

اعضائے زیر کے
 بائیں میں بازو پر
 ہونٹ

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے انسان کے تین اہم اعضاء یعنی دل، کان اور آنکھوں کا ذکر کیا
 ہے۔ دل محض گوشت کا ایک ٹھکانہ ہی نہیں بلکہ اس کو عقل قلب اور فواد سے بھی تعبیر کرتے ہیں
 حقیقت یہ ہے کہ سوچ کا تعلق دماغ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور قوت ارادہ کا تعلق قلب کے ساتھ
 ہوتا ہے۔ اسی قوت ارادی کو فواد کہا گیا ہے قرآن پاک میں موجود ہے "اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ
 وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْہُ مَسْکُوْرًا" یاد رکھو! کان، آنکھ اور دل سب کے متعلق ہوال
 ہو گا۔ یہ اعضا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہیں۔ انسانی جسم میں یہی چیزیں علم کے ذرائع ہیں۔ اگر یہ

الغرض! اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم نعمتیں انسان کو ودیعت کی ہیں۔ یہ اس کے لیے حصول علم کے ذرائع ہیں۔ جو شخص ان ذرائع کو ضائع کرتا ہے۔ اس کی مثال حسرت مولانا اشرف علی تھالوی نے یوں دی ہے۔ جیسے کوئی امیر کبیر کسی کی تنخواہ مقرر کر دے۔ کہ بجائی تم غریب ہو ہر ماہ یہ وظیفہ وصول کر لیا کرنا۔ وہ شخص ہر مہینے اپنا مشاہرہ وصول تو کرتا ہے۔ مگر کسی مصرف میں لانے کی بجائے اسے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔ یہ پانی میں ڈبو دیتا ہے۔ امیر دیتا رہتا ہے اور غریب ضائع کرتا رہتا ہے۔ آخر کار اس امیر کو کسنا پڑتا ہے۔ کہ یہ شخص کس قدر نمک حرام ہے۔ کہ میں نے اس پر رسم کرتے ہوئے اس کا وظیفہ مقرر کیا ہے۔ مگر یہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا چنانچہ اس کا وظیفہ بند کر دیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس شخص کو افسوس بلکہ احساس تک نہیں ہوتا کہ اس کی آمدنی ختم ہو گئی ہے۔ تو اس قسم کے شخص کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جائے گا کہ یہ بیوقوف سزا کا ہی مستحق ہے۔

عذاب عظیم
کی وعید

یہی حالت اس شخص کی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے دل عطا کیا۔ کان امد انھیں دیں مگر وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ ان کو بروئے کار نہیں لاتا۔ تو آخر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ نعمتیں سلب کر لی جائیں گی، اور ایسا شخص نمک حرام قرار پائے گا۔ وہی وہ حالت ہے۔ جسکے متعلق فرمایا کہ ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے لہذا ان کے لیے عذاب عظیم مقرر کر دیا گیا ہے۔ یہ اسی کے مستحق ہیں۔

ان کے ذرا
مرکز ایک ہے

یہاں پر جن تین اعضاء کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں قلوب جمع ہے۔ سمع واحد اور البصائر جمع کا صیغہ ہے۔ کہتے ہیں کہ قلب کی حالت تو ہر شخص کی الگ الگ ہے۔ لہذا بہت لوگوں کی وجہ سے اسے جمع فرمایا۔ ”وہ ان اگرچہ ہر انسان کے دو ہیں مگر ان دونوں کی سماعت اکٹھی ہوتی ہے۔ ان کا مرکز ایک ہے۔ لہذا اس کے لیے واحد کا صیغہ بولا۔ اور انھیں دونوں الگ الگ ہیں ان دونوں سے اکٹھا بھی کام لیا جاسکتا ہے۔ اور ایک کو بند کر کے کسی ایک سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ لہذا ان کے لیے جمع کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ پہلے دو اعضاء یعنی دل اور

کانوں کے متعلق فرمایا کہ ان پر پھپھہ دگا دیا گیا ہے۔ اور آنکھوں کے متعلق فرمایا کہ جو لوگ ان کو استعمال نہیں کرتے ان پر پردہ ڈال دیا ہے۔ ان کو کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ یہ کفر، شرک اور برائی کا پردہ ہے۔ جو آنکھوں پر پڑا ہوا ہے۔ صحیح بات نظر ہی نہیں آتی۔ جب کسی شخص کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔ تو ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ان کے لیے بہت بڑی سزا ہے۔ جو آگے چل کر انہیں ملے گی۔

ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے دوسری قسم کے گروہ انسانی کا حال بیان فرمایا۔ جنہوں نے ظاہراً اچھے باطن کفر کو اختیار کیا۔ اور ہدایت سے محروم ہے۔ ان کی سزا کا ذکر بھی اجمالاً کر دیا۔ اہل الفاظ کے ضمن میں وجوہات بھی ذکر کر دیے۔ ان کا حال محسنہ طوبہ پر بیان فرمایا ہے۔ اُس کے منافقین کا ذکر آئے گا۔ چونکہ یہ زیادہ خطرناک گروہ ہے۔ اس لیے ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ یہ تیسرا گروہ ہے

السم
در ششم

البقرة ۲

آیت ۱۲ تا ۱۴

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ
بِمُؤْمِنِينَ ۝۸ يُخَدِّعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يُخَدِّعُونَ
إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝۹ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ
فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۱۰ بِمَا كَانُوا
يَكْذِبُونَ ۝۱۱ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا
إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝۱۲ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِن
لَّا يَشْعُرُونَ ۝۱۳

ترجمہ: اور بعض لوگوں میں سے وہ ہیں، جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ
پر اور قیامت کے دن پر حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں ۝۸ وہ دھوکا دیتے ہیں
اللہ کو اور اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور حقیقت میں وہ نہیں دسوا کرتے مگر اپنی
جانوں کو، اور وہ سوچتے بھی نہیں ۝۹ ان کے دلوں میں بیماری ہے۔ اللہ تعالیٰ
نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب سے اس
وجہ سے کہ وہ مجھوٹ بولتے ہیں ۝۱۰ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں
فساد نہ کرو تو کہتے ہیں بیشک ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ۝۱۱ سنو!
بیشک یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں مگر یہ سمجھتے نہیں ۝۱۲

ہدایت کے اعتبار سے انسانوں کے تین گروہوں کا ذکر چکا ہے۔ پہلا گروہ وہ ہے
جو ظاہر اور باطن ہدایت کو قبول کرتے ہیں، وہ مومن و متقی کہلاتے ہیں۔ سورۃ بقرہ کی پہلی چار
آیتوں میں ان کا حال بیان ہوا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو ظاہر اور باطن ہدایت الٰہی کا انکار
کرتا ہے۔ وہ کافروں کا گروہ ہے۔ اگلی دو آیات میں ان کا حال بیان ہو چکا ہے اب ان
آیات میں تیسرے گروہ منافقین کا تذکرہ ہے جو ظاہر میں تو ہدایت کو تسلیم کرتے ہیں مگر ان

کے بطن میں کفر ہوتا ہے۔ اگلی تیرہ آیات میں منافقین کی خرابیاں، ان کی سازشوں اور چال بازیوں کا حال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مثالوں کے ذریعے سارا معاملہ سمجھایا ہے۔

منافقین کا گردہ قرآن کریم میں منافقین کا حال مختلف سورتوں میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ بعض سورتیں صرف منافقین کے نام پر ہیں مثلاً سورۃ منافقون۔ اسی طرح نزول کے اعتبار سے آخری سورۃ توبہ میں بھی منافقین کی سازشوں سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اور ان سے خبردار رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

امام ابو بکر جصاصؓ بہت بڑے مفسر قرآن ہوئے ہیں۔ امام یزید بن ہریرہؓ بھی بہت بڑے عالم گزشتے ہیں انہوں نے علوم عربیہ میں کامل نامی عظیم کتاب لکھی ہے۔ یہ دونوں حضرات فرماتے ہیں کہ نفاق کا اشتقاق نَافِقًا الْیَرُدُّج سے ہے جس کا معنی ہے جنگلی چوہے کا بل مشہور ہے کہ گوہ یا جنگلی چوہے کے چار بل (سوراخ) ہوتے ہیں جن کی وجہ سے یہ شکاری کو دھوکا دیتا ہے یہ کسی ایک سوراخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ شکاری اس کو کھوڑتے ہیں، تو وہ کسی دوسری طرف غائب ہو جاتا ہے۔ منافق کا حال بھی یہی ہے۔ یہ شرک کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ اور ایمان کو ظاہر کرتا ہے جنگلی چوہے کی طرح یہ بھی خدائے معنی دھوکے باز ہوتا ہے۔ شریعت میں منافق کی تعریف اس طرح کرتے ہیں لِمَنْ يُّظْهِرُ الْإِيْمَانَ وَيُخْفِي الْكُفْرَ جو ایمان کو ظاہر کرتا ہے۔ اور کفر کو چھپاتا ہے۔

اب منافق کی کئی قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کا منافق وہ ہے جو ایمان کو ظاہر کرتا ہے مگر باطن میں کفر بھرا ہوا ہے۔ اور وہ اس پر مطمئن ہے۔ دوسری قسم کا منافق وہ ہے جو ظاہری اور باطنی ہر لحاظ سے متنبہ رہتا ہے۔ وہ ظاہر اور باطنی شک میں ہوتا ہے ایسا منافق مَذْبُذِبٌ بَيْنَ بَيْنٍ ذَلِكْ کا مصداق ہوتا ہے۔ ان دونوں قسم کے منافقین کا نفاق شدید ہوتا ہے ان کا اعتقاد فاسد ہوتا ہے۔ اور اس مقام پر جن منافقین کا ذکر ہے۔ وہ یہی اعتقادی منافق ہیں۔ جن کے عقیدے میں کفر بھرا ہوا ہے۔

تیسری قسم کا منافق وہ ہے جو اخلاقی اور عملی منافق ہوتا ہے ایسا شخص اپنے گناہوں کی وجہ سے آخرت کے نقصان کو دنیا کے نقصان پر ترجیح دیتا ہے۔ اور دنیا کے نفع کو آخرت کے نفع پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ ایسے منافق ہوتے ہیں کہ اگرچہ ان میں ایمان موجود ہوتا ہے۔ مگر یہ لوگ آخرت کو دنیا پر ترجیح نہیں دے سکتے۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد سنئے وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ
الْآخِرِ بَعْضُ لَوْكٍ يٰلَیْہِمْ جَوَکَتَہِمْ کہ ہم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے
ہیں وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔ ایسے لوگ دھوکے باز ہیں۔
يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يٰۤاَللّٰهُ تَعَالٰی اور ایمانداروں کو دھوکا دیتے ہیں۔ مگر
حقیقت یہ ہے وَمَا يَخْدَعُوْنَ اَنْفُسَهُمْ کہ یہ اپنی جانوں کو دھوکا دے رہے
ہیں۔ یہ لوگ خدا تعالیٰ یا ایمان والوں کا کیا بگاڑیں گے۔ یہ تو اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ اور اپنا
سہی انجام خراب کر رہے ہیں۔ اور یہ سوچتے بھی نہیں وَمَا يَشْعُرُوْنَ یہ اتنا شعور بھی نہیں رکھتے
کہ خود اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ آخرت کو برباد کر رہے ہیں فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ انکے
دلوں میں بیماری ہے۔ اور یہ بیماری شک کی بیماری ہے۔ اکثر صحابہ کرام خصوصاً حضرت عبداللہ
بن مسعودؓ نے یہی معنی کیا ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں شک ہے۔

نفاق کی بیماری جسمانی بیماری نہیں بلکہ دین کی بیماری ہے۔ جس طرح اجمام کی بیماری
ہوتی ہیں۔ اسی طرح دین اور عقیدے کی بھی بیماریاں ہوتی ہیں۔ تو اس بیماری سے مراد عقیدے
کی بیماری ہے۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اعتدال کی حالت سے نکل جاتا ہے۔ وہ
بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جسم کے مختلف غصا اور اجزاء جب تک اعتدال پر قائم رہیں انسان
کی صحت درست رہتی ہے۔ اور جب یہ اعتدال خراب ہو جائے تو جسم بیمار ہو جاتا ہے۔ عقیدے
کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ جب آدمی اعتدال کا راستہ چھوڑ دیتا ہے۔ تو پھر بد عقیدگی، حسد،
کینہ، اور گنہوں کے ساتھ محبت کا راستہ کھل جاتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو انسانوں کو

نفاق دینی
بیماری ہے

فضیلت کی باتوں سے روکتی ہے۔ اور ابدی اور حقیقی زوال کا باعث بنتی ہے۔ اسی لیے عربی زبان میں مَرَضٌ کا لفظ نفاق پر بھی بولا جاتا ہے۔ کہنے اور حسد کو بھی نفاق کہتے ہیں۔ نفاق کا کام یہ ہے کہ خیر کو ظاہر کرتا ہے اور شر کو چھپاتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان عجمی کا کام کر رہا ہے۔ مگر باطن میں فتنہ پوشیدہ ہوتا ہے۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے دل کی بیماریوں کا پتہ چلتا ہے۔ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ ان کے دلوں میں بھی بیماری ہوتی ہے۔ اور یہ بیماری خونِ صفر اور غیرہ کی ظاہری بیماری نہیں ہوتی جو ظاہری جراثیم سے پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے محرک باطنی جراثیم یعنی گناہ ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑے گناہ شرک، کفر، نفاق، شک، تردد اور اتحاد وغیرہ ہیں۔ اور ان سے پیدا ہونے والی روحانی بیماریاں ہوتی ہیں۔

فرمایا فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو بڑھا دیا کیونکہ اللہ کی سنت اسی طرح جاری ہے کہ جب علاج نہیں کیا جاتا تو بیماری بڑھ جاتی ہے دیکھ لیجئے اسلام کو ترقی نصیب ہو رہی ہے۔ مگر منافقوں کی بیماری روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ان کے باطن میں پوشیدہ حسد اور کینہ، اسلام کی مخالفت اور بدعتیگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی کو فرمایا فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا اب اس بیماری کا نتیجہ یہ ہو گا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔ اور یہ سزا انہیں اس جرم کی پاداش میں ملے گی۔ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ زبان سے حق کا اقرار کرتے تھے۔ اہل ایمان کی رفاقت کا دم بھرتے تھے۔ مگر دل سے کفر کے ساتھ ہوتے تھے۔ گویا وہ زبان سے جھوٹ بولتے تھے۔ چنانچہ فرمایا ان کے اس جھوٹ کی وجہ سے انہیں سزا کا عذاب کا مزہ چکھنا ہو گا۔ یہ ان کے نفاق یا حسد یا کفر کی سزا ہے۔

فرمایا حقیقت یہ ہے کہ منافقین اپنے نفاق کی وجہ سے فساد فی الارض کے مرتکب ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں جب ان سے کہا جاتا ہے وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا

فساد فی الارض

پر بیعت کرتے ہیں، وہ گویا اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا: مَنْ يُطِيعِ
الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت
کی۔ کیونکہ رسول خدا کا نائب اور اس کا پیغام مخلوق تک پہنچانے والا ہوتا ہے۔ اور وہ تمام امور کی
رضا کے لیے انجام دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ کو دھوکا دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کے
رسول کو دھوکا دیتے ہیں۔

منافقین کا طریقہ واردت بھی وہی ہے۔ جو ایک عام دھوکا باز کا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں۔
کہ اس طریقہ سے ہم اپنے مفاد بھی حاصل کر لیں گے۔ اور ہمیں نقصان بھی نہیں پہنچے گا۔ اس طرح
ہم اس بد عقیدگی پر قائم رہ سکیں گے۔ گویا اسلام کا دعوے بھی کرتے ہیں۔ اور کفر کے پروگرام کو
بھی ساتھ ہی جاری رکھتے ہیں

حالانکہ یہ دو متضاد پروگرام ہیں اور کسی صورت میں ان کے درمیان ہم آہٹی پیدا نہیں ہو
سکتی۔ اسلام کا پروگرام نہایت ترقی یافتہ پروگرام ہے۔ جب کہ کفر انتہائی رجعت پسندانہ نظام
ہے۔ یہ دونوں اکٹھے نہیں چل سکتے۔

ایک طرف توحید، ایمان، اور تقویٰ کا پروگرام ہے۔ اور دوسری طرف کفر، شرک اور باطنی
بیماریوں کا نظام ہے۔ معاصی اور جنگ و جدل کا نظریہ رکھنے والے ہی لوگ فساد فی الارض کے
مرتکب ہوتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا اِنَّهُمْ الْمُنْفِقُونَ
اصل فساد ہی ہیں۔ جو زبان سے اسلام کا نام لیتے ہیں وَلٰكِنْ لَا يَتَعَرَّوْنَ مَكْرًا
یہ لوگ سمجھتے نہیں ان کا نفاق ظاہر ہو چکا ہے اور فساد ثابت ہو گیا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو آج کل کی حکومتیں بھی اسی نفاق کا شکار ہیں۔ یہ بھی حق و باطل کو
یکجا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ حالانکہ یہ ممکن نہیں۔ خود ہماری حکومت کا کیا حال ہے۔ اسلام
کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ اور یورپ کے غیر اسلامی پروگرام بھی ساتھ چل رہے ہیں انگریز کا قانون بھی
راج ہے۔ اور اسلامی قوانین بھی جاری کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ دونوں پروگرام اکٹھے
نہیں چل سکتے، صرف ایک نظام کو اپنانا ہو گا۔ ورنہ فساد فی الارض کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔
اسی طرح اسلام کے نظام تعلیم اور انگریزی تعلیم کو یکجا چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے ایک

حکومتی سطح
پر نفاق

نظام کا معنی ہی فساد ہے اور دوسرے کا ایمان، تو یہ اکٹھے کیسے ہو سکتے ہیں۔ جب تک تمام باطل نظاموں کو ختم کر کے صرف اسلامی نظام کو قائم نہیں کریں گے۔ کبھی فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔ میں نے یہ بات اشارہ کر دی ہے۔

عذابِ عظیم اور
عذابِ الیم
میں فرق

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سے قبل کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے بارے میں فرمایا: **وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ** اور منافقوں کے متعلق فرمایا: **وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ** یعنی کافروں کے لیے بڑا عذاب ہے۔ اور منافقوں کے لیے دردناک عذاب۔ اس کے متعلق شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں: کہ کافر مردود اور محروم ازلی ہے۔ اس کی استعداد تو ابتدا ہی سے خراب ہے۔ کافروں نے اپنی استعداد کو بگاڑ کر بالکل محرومی کی حالت اختیار کر لی ہے۔ لہذا ان کے لیے عذاب اول سے آخر تک بڑا ہی ہوگا۔

جہاں تک منافقین کا تعلق ہے۔ ان میں استعداد تو موجود تھی، مگر انہوں نے اس استعداد میں بگاڑ پیدا کر کے اپنے اندر خود محرومی پیدا کر لی۔ جب سزا کی قربت آئے گی، تو ان کو اس کا احساس ہوگا اور دکھ پیدا ہوگا۔ کہ افسوس ہمارے اندر استعداد تو موجود تھی مگر ہم نے اس کو نظر انداز کر دیا لہذا ان کو مولم عذاب ہوگا۔ یعنی جس قدر احساس ہوگا۔ اسی قدر تکلیف ہوگی۔

اس کے علاوہ مفسرین کرام ایک اور بات بھی بیان فرماتے ہیں۔ کہ کافروں نے تو ایمان کا ذائقہ چکھا ہی نہیں۔ وہ تو اول و آخر کافر ہی رہے۔ برخلاف اس کے منافقین نے اگرچہ دل سے حق کو قبول نہیں کیا، مگر زبان سے تو ایمان کا ذائقہ چکھا ہے۔ اور جو آدمی کسی چیز کا ذائقہ چکھ لیتا ہے۔ اس کا حکم اور ہوتا ہے۔ لہذا ان کے لیے عذاب الیم مقرر کیا گیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بکثرت پھل پیدا کرنے والے علاقے کے لوگ کسی ایسی جگہ جاتے ہیں۔ جہاں الے پھل نہیں ہوتے۔ تو انہیں احساس محرومی ہوتا ہے۔ اور بڑی تکلیف پہنچتی ہے۔ بڑا مشورہ واقعی ہے کہ ابدالی نے جب پانی پت کا مگر کر لیا۔ تو دلی کے بعض لوگوں نے کہا کہ آپ یہیں ٹھہر جائیں۔ تو انہوں نے یہ تاریخی جملہ کہا تھا: **ایں جانار قنہ حار کجاست** یعنی یہاں قنہ حار کا انار کہاں ہے۔

جو میں یہاں قیام کروں۔ وہ قندھاری انار کے ذائقے سے واقف تھا۔ اس لیے وہ وہاں ٹھہر کر اس
ذائقے سے محروم نہیں ہونا چاہتا ہے۔

منافقین کا نال بھی یہی ہوگا۔ چونکہ انہوں نے زبان سے ایمان کا ذائقہ چٹھا تھا۔ اس
لیے آخرت میں انہیں محرومی کا سخت احساس ہوگا۔ اور اس احساس کی وجہ سے ان کے دھڑ
رہ میں اعنافت ہوگا۔ اسی لیے اس کو عذاب الیم کما گیا ہے۔

الْعَمَّ

درس ہفتم

البقرہ - ۲۵۴

آیت ۱۲ تا ۱۶

وَإِذْ قِيلَ لَهُمُ امْنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ
 السُّفَهَاءُ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَكِنْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٣﴾ وَإِذْ
 لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا بِكُمْ وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شُيُطَانِهِمْ قَالُوا
 إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُتَهَيِّذُونَ ﴿١٤﴾ اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ
 وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١٥﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ
 اشْتَرُوا الضَّلَالََةَ بِالْأَمْدِ فَمَا رَیَحَتْ بِتِجَارَتِهِمْ وَمَا
 كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾

ترجمہ : اور جب ان سے کہا جاتا ہے۔ ایمان لاؤ اس طرح جس طرح لوگ
 لوگ ایمان لاتے ہیں تو کہتے ہیں۔ کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح بیوقوف لوگ
 ایمان لاتے ہیں۔ سنو! بیشک یہی لوگ بیوقوف ہیں، لیکن یہ جانتے نہیں ﴿۱۳﴾
 اور جب یہ مٹے ہیں ان لوگوں سے جو ایمان لاتے، تو کہتے ہیں، ہم بھی ایمان
 لاتے ہیں۔ اور جب یہ تنہا ہوتے ہیں۔ اپنے شیطانوں (سرداروں) کے پاس تو کہتے
 ہیں، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ بیشک ہم تو ہنسی کرتے ہیں ﴿۱۴﴾ اللہ ان کے ساتھ
 ہنسی کرتا ہے۔ اور مدت دیتا ہے ان کو ان کی سرکشی میں وہ سرگردان ہوئے ہیں ﴿۱۵﴾
 یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے خرید بے گمراہی کو ہدایت کے بدلے پس نہیں فائدہ دیا
 ان کو ان کی تجارت نے۔ اور انہیں تھے یہ لوگ ہدایت پانے والے ﴿۱۶﴾

ہدایت کے اعتبار سے قیہ اگر وہ منافقین کا ہے۔ کل بھی ان کا ذکر ہوا تھا۔ اور آج کی آیت
 میں بھی منافقین کا ہی ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کی خرابیوں کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا
 ہے۔ پہلی آیت میں آیا تھا کہ بعض لوگ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے
 ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے بیان کی نفی فرمادی ہے۔ کہ یہ لوگ مومن نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ

گذشتہ سے پیوستہ

اور ایمانداروں دونوں سے دغا بازی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو تو دھوکا نہیں دے سکتے اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو بھی ان کے دھوکے سے بچائے گا۔ کیونکہ ان کا دھوکا ان کی اپنی ہی جانوں پر ہے اور یہ ان باتوں کو سوچتے تک نہیں۔ ان کے دلوں میں شک، تردد اور نفاق کی بیماری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا ہے۔ اور ان کے لیے عذاب الیم ہے۔ کیونکہ یہ جھوٹ بولتے تھے ظاہر اسلام کرتے تھے مگر ان کے باطن میں کفر تھا۔ ان کی ایک اور بیماری فساد فی الارض تھی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو، تو اکڑ جاتے اور کہتے کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ہمیں کوئی فساد ہی کیسے کہہ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اسی لوگ فساد میں مگر یہ سمجھتے نہیں۔

حقیقی ایمان

اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی ایک اور غرابی کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ جب ان منافقوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی اُسی طرح ایمان لاؤ، جس طرح وہ لوگ ایمان لائے ہیں قَالُوا لَا تَزِدْنَا جواب میں کہتے ہیں الْثَّوْمِينَ كَمَا آمَنَ أَنْتُمْ کیا ہم جی اُسی طرح ایمان لائیں جس طرح یہ یوقوف ایمان لائے ہیں فَرَأَى أَنَّ أَنْفُسَهُمْ هُمُ الْثَّوْمُونَ سن لو! یوقوف خود وہی ہیں وَلَكِنْ لَا يَعْلَمُونَ مگر یہ جانتے نہیں۔ یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ منافقین تو بڑا ایمان کا انکار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ بظاہر تو وہ ایمان لا چکے تھے۔ تو پھر وہ یوں کیسے کہہ سکتے تھے کہ ہم یوقوفوں کی طرح کیسے ایمان لائیں۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ ایسی بات بڑا مسلمانوں کے سامنے نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنے خاص معتمد آدمیوں کے روبرو کرتے تھے جنہیں اپنا راز داں سمجھتے تھے کہ وہ ایسی بات کا بُرائی نہیں منائیں گے۔

اس مقام پر ایک اور بحث قابل غور ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں کہ جب ان سے کہا جاتا ہے۔ ایمان لاؤ، حالانکہ ایمان کا دعویٰ تو وہ پہلے ہی کر رہے ہیں۔ تو ایمان لانے کا مطلب یہ ہے۔ کہ محض زبانی طور پر ایمان نہ لاؤ بلکہ حقیقی اور صحیح ایمان لاؤ۔ جیسے حدیث مسلمان ایمان لائے ہیں۔ کیونکہ فلاح کا دار و مدار اُسی ایمان پر ہے۔ لذات فانیہ، شوائع نفسانیہ، ریاکاری، طلب جادو وغیرہ حقیقی ایمان کی بدولت ہی دفع ہوتی ہیں کسی بطل مقصد کے لیے خالی ایمان کا اظہار بہ گز مفید نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے فرمایا کہ حقیقی ایمان لاؤ۔ یعنی دل کی پوری تصدیق اور اخلاص کے ساتھ ایمان کو قبول

کرو۔ دوسرے مقام پر آئے یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا ۝ اے ایمان والو! ایمان لاؤ
یعنی محض زبانی ایمان کافی نہیں بلکہ حقیقی اور مخلصانہ ایمان اختیار کرو۔

اسی لیے منافقین سے کہا گیا ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح ایمان لاؤ۔ وہ دوسرے لوگ کون
ہیں؟ بلاشبہ وہ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ ہیں۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اخلاص کے ساتھ
ایمان لائے۔ ابن عساکرؒ جو بہت بڑے مؤرخ ہیں۔ انہوں نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن
عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آیت پاک کا مطلب یہ ہے کہ تم اس طرح ایمان لاؤ کَمَا
أَمَّنَ أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِيٌّ ۖ یعنی جس طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ،
حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ ایمان لائے ہیں، اس طریقے پر تم بھی ایمان لاؤ۔ ان کا ایمان خلوص اور
حقیقت پر مبنی ہے۔ ان کے معیار پر پورے اترو محض زبانی دعوے سے بات نہیں بنے گی تم تو
جھوٹے ہو وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ یہ لوگ قطعاً مومن نہیں ہیں۔

اسی سورۃ میں آگے چل کر یہودیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں فَبِأَنِ آمَنُوا
بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا ۖ اَلَا أَرَىٰ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۚ اے ایمان والو! تم نے جو ایمان لیا
آئیں۔ تو یہ بھی جانتے پا جائیں گے۔ یہاں سے معیار حق ہونے والی بات سمجھ میں آجاتی ہے۔
کہ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ خصوصاً خلفائے راشدینؓ معیار حق ہیں۔ یہ اصحاب کبار اگرچہ
نبی کی طرح معصوم تو نہیں ہیں۔ مگر امت کے لیے نمونہ ہیں۔ وہ اپنے اخلاص اور حقیقی ایمان کی
وجہ سے ان غریبوں سے محفوظ تھے۔ جو ایمان کے باوجود انسان کے اندہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور جن
کی وجہ سے آدمی ناکام ہو جاتا ہے معیار حق اسی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر قرآن پاک میں
فرمایا ہے لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۚ
شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اس کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں تاکہ جو جاؤ تم لوگوں کو بتانے والے
اور معلم اور اللہ کا رسول تمہیں بتانے والا ہے :

۱۔ تفسیر درمنثور ص ۳۲ بحوالہ ابن عساکر و تفسیر عزیزی فارسی پارہ ۱ ص ۱۰۸
۲۔ قرآن مجید ترجمہ شاہ عبدالقادر ص ۳۲ مطبوعہ مکتبہ کبیری

گویا اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کو فونے کی مجاہدت تیار کر کے ان سے خدمت اسلام کا کام لیا ہے۔ حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے متعلق یہ بھی فرمایا اَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللّٰهِ فِي الْأَرْضِ حَتَّىٰ يَمُوتَ الشَّاهِدُ كَوَاهِ بُو۔ یعنی جس کی اچھائی کی گواہی تم دو گے وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہوگا اور جس کی تم بُرائی کی گواہی دو گے وہ اللہ کے ہاں بھی بُرا ہوگا۔ اے صحابہ! تم اللہ کے گواہ ہو اور خصوصاً اے خلفائے راشدین! تم اللہ کے گواہ ہو۔ آپ کے یہ جملہ تین دفعہ فرمایا۔

ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے امیر المؤمنین عمر فاروقؓ کے متعلق فرمایا اِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلَىٰ لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبُہِ یعنی اللہ تعالیٰ نے عمرؓ کی زبان اور دل پر حق رکھ دیا ہے۔ یعنی وہ حق کے سوا کوئی بات نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کے قلب پر اللہ تعالیٰ نے حق رکھ دیا ہے، کیا وہ معیار حق نہ ہوگا؟

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت پہلے بیان ہو چکی ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جس طرح حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ اور ان کے ساتھی ایمان لائے ہیں۔ ان کا ایمان حقیقی ایمان ہے جو خلوص سے بھر پور ہے۔ ایسا ہی ایمان انسان کی فلاح کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

انسان اور
اس کا دل

النَّاسُ عِندَ اللّٰهِ اَنَاسٌ اُنْسُہِ مَآءٌ سَیِّئٌ۔ انسان اس لیے انسان ہے کہ اس میں الفت اور مانوس ہونے کا مادہ پایا جاتا ہے۔ عربی میں اے مَآءٌ سَیِّئٌ اَلْاِنْسَانُ اَلْاِنْسَانُ کہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے قلب کو قلب اس لیے کہتے ہیں کہ یہ اُٹا ہوتا ہے مَا الْقَلْبُ اِلَّا اَنَّهُ یَتَقَلَّبُ اَیْکَ تَرِیْہِ اِیْنِیْ وَضْعَہِ اَعْبَآءُہِ اُٹا ہوتا ہے۔ یعنی اس کا بیجا اوپر اور سر نیچے ہوتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ دل میں ہٹیاں آتی رہتی ہیں۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے خبر دے رکھی وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ یُحْوَیْ بَیْنَ الْمَدْرِ وَقَلْبِہِ اللّٰہُ تَعَالٰی انسان اور اس کے دل کے درمیان رکاوٹ ڈال دیتا ہے۔ اس لیے محتاط رہنا چاہیے۔ اسی غلطی پر خدا تعالیٰ دل بدل سکتا ہے۔ اسی لیے دعائیں بھی یا گیبے یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ اے دلوں کو پھٹنے والے اللہ کریم! ہمارے دلوں کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھ۔ بہ حال انسان

کو انسان اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے اندر انس کا مادہ ودیعت کیا گیا ہے۔

حقیقی انسان
کون ہیں؟

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی یہاں پر ایک نکتہ بیان فرماتے ہیں کہ اس مقام پر منافقوں کو کہا جاتا ہے کہ تم بھی اسی طرح ایمان لاؤ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کسلانے کے وہی لوگ مستحق ہیں جو حقیقی ایمان سے محروم ہیں۔ یہی لوگ انسانیت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں، اور انہی کی وجہ سے دنیا کا نظم درست رہتا ہے۔ جو لوگ حقیقی ایمان سے محروم ہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا اُولَٰئِكَ كَانُوا لِنَاۤمِ بَدَلًا هُمۡ اَضَلُّۤ اَمۡلًا یہ تو جانوروں کی مانند ہیں یا ان سے بھی بدتر۔ یہ انسان کسلانے کے حقدار نہیں ہیں۔ یہ لوگ جانوروں کی طرح کھانے پینے اور جنسی کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ لہذا حقیقی انسان وہ ہیں جو حقیقی ایمان کی دولت سے مالا مال ہیں۔

یوقوت کون ہیں؟

پہلے گزر چکا ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح اسے ایمان لاؤ۔ تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم یوقوتوں کی طرح ایمان لائیں حالانکہ حقیقت میں منافق ہی یوقوت ہیں۔ مگر انہیں علم نہیں۔ یہ لوگ ایمانداروں کو اس لیے یوقوت سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا کے نفع سوئے کو چھوڑ کر آخرت کی فکر کرتے ہیں۔ اس کو حاصل کرنے کی ٹمک و دد میں لگے رہتے ہیں۔ مگر وہ یوقوت یہ بات نہیں سمجھتے کہ عقل مند ہی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان نقصان سے بچ جائے اور فائدہ حاصل کرے ایماندار دنیا کے اس عارضی فائدے کی پروا نہ کرتے ہوئے آخرت کے ابدی فائدے کو حاصل کرتے ہیں۔ لہذا صحیح معنوں میں عقل مند سی ہیں اور منافق یوقوت ہیں۔ جو آخرت کو چھوڑ کر عینی حقیقی اور ابدی فائدہ کی بجائے دنیا کا عارضی اور فانی فائدہ تلاش کرتے ہیں۔ مگر اپنے آپ کو عقل مند سمجھتے ہیں۔ اور دوسروں کو یوقوت جانتے ہیں۔ اور اس طرح اس فریب سے دنیا کا مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفٰہَہُ حَقِیْقَتٌ مِّنۡ سِیِّئِیۡ یُّوقُوۡتٍ مِّنۡ لَّیۡسَ لَہُمۡ مَّغَرٌّ مَّۤا کَسَبُوۡۤا مٰکِرِیۡنَ حَقِیْقَتٌ حَالِ کُوۡنِہِیۡ جَانِتَہُ۔

منافقوں کی
دو ٹہنی پالیسی

اللہ تعالیٰ نے منافقوں کا پردہ فاش کرتے ہوئے فرمایا وَاِذَا لَقُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا

جب یہ ایمانداروں سے ملے ہیں تو خوشام کرتے ہیں قَالُوا آمَنَّا بِكَ کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لے آئے ہیں تاکہ دشمنان میں اپنی پارٹی کے آدمی سمجھیں مگر حقیقت یہ ہے وَلَاذَ أَخْلَوُا إِلَيْكَ شَبَّهْنَاهُمْ جب یہ اپنے شیطانوں کے پاس جاتے ہیں۔ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ ثُمَّ أَخْلَوْا مُتَهَيِّزُونَ یہ تو ہم مسلمانوں کا محض تمسخر اڑا رہے ہیں۔ تو یا محمد ان کی نہایت کا دعویٰ کر کے نہیں بے وقوف بنائے ہیں۔ یہاں پر شیاطین سے مراد منافقوں کے بڑے بڑے سردار اور سرغنہ ہیں جو نفاق کے پروگرام کے بانی تھے۔

بعض بول اعتراض کرتے ہیں کہ تبلیغی نقطہ نظر سے ان لوگوں کو بوقیوت یا شیطان کا لقب دینا کسی قدر زیادتی ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو یہ القاب اس وقت دیے گئے ہیں۔ جب تبلیغ کے تمام تقاضے پورے ہو چکے ہیں۔ اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اپنی کرتوتوں سے باز آنے والے نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تبلیغ کے ابتدائی دور میں اس قسم کے القاب دینا درست نہیں مگر اتمام محبت کے بعد ایسا کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ منافقین نے کہا تھا کہ مسلمانوں کا تمسخر اڑا رہے ہیں تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمُ اللَّهُ تَعَالَى ان کے ساتھ ہنسی کرتا ہے وَيُمِذُّهُمْ فِي ظُلُمَاتِهِمْ اور مہلت دیتا ہے، ان کی سرکشی میں کھینچ دیتا ہے وہ اندھے اور سرگردان ہو رہے ہیں۔ یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی کے ساتھ ہنسی کرنا، اس کا تمسخر اڑانا تو فعل عبث اور ناجائز ہے۔ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیسے ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام غیوب سے متبرک ہے۔ اس کے جواب میں بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ استہزاء نہیں بلکہ مشاکلت ہے۔ یعنی جو سلوک منافقین نے مسلمانوں کے ساتھ کیا، وہی ہی سلوک اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پسند کیا۔ اس قسم کی مثالیں دو سکرمحات پر بھی ملتی ہیں مثلاً جَزَاؤُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ بڑائی کی جزا بڑائی ہے ملائے جزا تو عدل کا نام ہے۔ اور عدل بڑائی نہیں ہوتی۔ تو یہاں پر بھی مراد یہی ہے کہ جیسا سوال ہے اس کا ہم شکل جواب ہے۔ یہی بات ہے وَمَكْرُؤًا مَكْرًا وَمَكْرُنَا مَكْرًا میں

استہزاء من اللہ
کا معنوم

بھی پائی جاتی ہے۔ یہ عربی زبان کی لطافت، بلاغت اور فصاحت ہے۔ اور اے مخالفت کئے ہیں اس طرز کلام کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ منافقین کے استنزار کا نقصان انہی کی طرف ہوتا ہے۔ اللہ خود ٹھٹھا نہیں کرتا بلکہ منافقین کے تمسخر کا خطرہ خود ان کی طرف ہوتا ہے۔ وہ نہ کو کیا ضرر پہنچائیں گے۔ بنی علیہ السلام اور مومنین کو اللہ تعالیٰ ان کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ مومنین کو منافقین کی چالوں سے آگاہ کر دے گا، تاکہ وہ ان سے ضرر نہ لیں **اللَّهُ يَكْتُمُ رِجْزَهُمْ** کا یہی مطلب ہے۔ استنزار منجانب اللہ کا ایک اور مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقین کے ساتھ دیا ہی معاملہ کرتا ہے۔ جیسا ٹھٹھا مذاق کرنے والوں کے ساتھ ہونا چاہیے چونکہ منافقین محض زبانی دعوے کی بنا پر جماعت المسلمین میں شریک ہوتے ہیں اور مفاد حاصل کرتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ بھی کہتا ہے۔ **يَعْنِيهِمْ** نواہیا کرنے دو۔ وہ نمازیں پڑھیں، عہدہ دیں، جہاد میں شرکت کریں۔ مگر ان کا کوئی عمل فیسبوں نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ دل سے تو ایمان لائے نہیں لہذا ان کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوگا جو مذاق کرنے والے کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یہ بھی گویا ان کے ساتھ ایک قسم کا تمسخر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن منافقین دوزخ کے گڑھے میں پہنچ جائیں گے۔ تو جنت کا دروازہ کھولا جائے گا۔ گویا انہیں جنت میں جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ جنتی ان منافقوں کی طرف دیکھیں گے، تو وہ محسوس کریں گے کہ واقعی نہیں جنت میں داخلے کی اجازت مل گئی ہے۔ چنانچہ وہ دروازہ جنت کے دروازے پر پہنچیں گے مگر اتنے میں دروازہ بند ہو جائے گا۔ اور منافق نامہ دروازہ جائیں گے۔ **اللَّهُ يَكْتُمُ رِجْزَهُمْ** کی یہ بھی ایک صورت ہے۔ یہ لوگ اس دنیا میں اس قسم کی چالاکی کر رہے ہیں، تو کل قیامت کے دن ان کے ساتھ بھی تمسخر ہوگا۔

گائے کا واقعہ اس سورۃ میں آ رہا ہے۔ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہمارا آدمی قتل ہو گیا۔ مگر قاتل کا پتہ نہیں چلتا تو موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا کہ گائے ذبح کریں، تو اس

موقع پر ان لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا، کیا آپ ہم سے ساتھ ٹھٹھا کرتے ہیں۔ تو آپ نے جواب دیا، اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں تم سے ٹھٹھا کر کے جابروں میں شمار ہو جاؤں۔ خدا کے بندو! میں تو اللہ کا حکم تم کو سنا رہا ہوں کہ گائے ذبح کرو۔ اس کے گوشت کا سڑا مرے پر مارو۔ تو قاتل کا پتہ چل جائے گا۔ میں تم سے ٹھٹھا نہیں کر رہا ہوں۔

الغرض! فرمایا، اللہ تعالیٰ ان کی سرکشی میں ان کو مہلت دیتا ہے۔ اور وہ اندھے ہو رہے ہیں یہاں پر یَعْمَهُوْنَ سے مراد دل کا اندھا ہونا ہے۔ جیسا کہ سورۃ حج میں ہے، کہ دیکھو ظاہری آنکھیں اکثر اندھی نہیں ہوتیں تَقْصَى الْقُلُوْبُ الشَّيْءَ فِي الصُّدُوْرِ وہ دل اندھے ہوتے ہیں۔ جو سینوں میں موجود ہیں۔ نہ وہ سمجھ بات کو دیکھتے ہیں نہ اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے پہلی آیت میں کافروں کے دلوں پر مہر لگانے کا بھی ذکر آیا ہے۔ آگے ان کی مثالیں بھی آ رہی ہیں۔

فَرِیَ اُولَٰئِكَ الَّذِیْنَ اَشْتَرُوا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی مِیْسِیْ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لیا ہے گمراہی کو ہدایت کے بدلے میں۔ ظاہر میں انہوں نے زبان سے یہی کہا تھا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ مگر افسوس کہ اس ہدایت کو چھوڑ کر انہوں نے باطن کی بے عقیدگی اور گمراہی کو اختیار کیا فَعَايَیْحَتْ رِجْبَارِ تَتْمُمُ اِیْسِ ان کی تجارت نے ان کو کوئی فائدہ نہ دیا وَهَآ کَانُوْا مُهْتَدِیْنَ اور نہیں تھے وہ ہدایت یافتہ۔

ہدایت کے
بدلے گمراہی

یہ تجارت کا لفظ بھی بڑا معنی خیز ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ جب انسان کو دنیا میں بھیجتا ہے۔ تو عمر اور تمام اسباب دیکر بھیجتا ہے۔ کہ یہ تمہاری پونجی ہے۔ اس کے ساتھ اعمال غریہ ور۔ اس سے تمہیں آخرت کی دائمی زندگی میں فائدہ پہنچے گا۔ عمر کی یہ پونجی برف کی مانند ہے۔ اوپر سے بھادروں کی تیش پڑے۔ ہی ہے۔ اور یہ برف چلتی جا رہی ہے۔ اگر اس کے پھٹنے سے پہلے اس سے قیمتی اشیاء ایمان اور اعمال صالحہ خرید لو گے۔ تو یہ عمر

کی پونجی ٹھکانے لگے گی۔ اور تم ہمیشہ کے لیے راحت پاؤ گے۔ اور اگر تم نے عمر عزیز کے
 بے لے کفر، شرک، بدعتیہ گی، معاصی اور لہو و لعب خریدا، تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خلتے میں مبتلا
 ہو جاؤ گے۔ اسی لیے فرمایا کہ منافقین کی تجارت نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ اس کی ایک
 اور مثال ایسی ہے کہ انسان تریاق کے بے زہر ملاہل خریہ سے۔ اگر تریاق حاصل کر لیا تو ہر قسم
 کی تکلیف سے بچ جائے گا۔ زندگی آسودہ ہو جائے گی۔ اور اگر وہ انوار سے اس نے زہر کو پسند
 کیا۔ تو تباہ ہو جائے گا۔ اس قسم کی تجارت نے کوئی نفع نہ دیا۔ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ اور یہ
 لوگ ہدایت یافتہ نہ تھے۔ بلکہ ابدی خسارے میں مبتلا ہوئے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی بعض خرابیاں بیان فرمائی ہیں۔ اگلی آیات میں
 مثال کے ذریعے ان کی مزید خرابیاں اور ان کا انجام بیان فرمایا۔

الْمَآءِ
دس شتم ۵

البقرة ۲
آیت ۱۸۱

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْفَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ
مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٍ لَّ
يُبْصِرُونَ ﴿۱۸﴾ صُمْرًا بَكْمَ عُمَىٰ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿۱۹﴾

ترجمہ: ان منافقوں کی مثال اُس شخص جیسی ہے جس نے آگ جلائی۔ جب

آگ نے اس کے — آس پاس کو روشن کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی روشنی

زائل کر دی اور اُن کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ بھی نہیں دیکھتے ﴿۱۹﴾ وہ برے

گوشتی اور انہی میں پس وہ نہیں لوٹیں گے ﴿۱۸﴾

گزشتہ سے پورے

بدبختی اور شقاوت کے لحاظ سے درسر اگر وہ منافقین کا ہے اللہ تعالیٰ نے منافقین کا حال
بیان فرمایا ہے۔ کہ ان کا کام جھوٹ بولنا، فریب دینا، زمین میں فساد کرنا ہے وہ ایمانداروں کو
بیوقوف کہتے تھے۔ اور اپنے آپ کو اصلاح کرنے والے سمجھتے تھے۔ جب انہیں حقیقی مومنوں
کی طرح ایمان لانے کی دعوت دی جاتی تو کہتے کہ ہم بے وقوفوں کی طرح کیوں ایمان لائیں۔
مسلمانوں کی جماعت کے دبدبہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے۔ تاکہ اُن کی جان و مال محفوظ رہے۔ اور
اُن کے حقوق کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ مگر جب اپنے سرداروں کے پاس جاتے تو کہتے کہ ہم تمہارے
ساتھ ہیں۔ ہم تو مسلمانوں کے ساتھ تمسخر اور ہنسی کرتے ہیں حقیقت میں ہم اُن کے ساتھ نہیں
ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کی ایک نشانی یہ بھی بتائی کہ انہوں نے ہدایت کے بارے میں
گمراہی کو خرید لیا۔ اور اس تجارت نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ بلکہ ایسے لوگ ابدی نقصان میں
بتلا رہے۔

کتب آسمانی
اور اشعار

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے منافقین کی دو مثالیں بیان فرمائی ہیں جن سے منافقوں کے حالات
پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ کسی مسئلہ میں مثال بیان کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ معاملہ واضح اور قریب الغم
ہو جائے جو چیز فامض اور باریک ہوئے واضح کر دیا جائے۔ ایسی مثالیں تمام آسمانی کتب میں بیان

کی گئی ہیں۔ توراۃ، زبور اور انجیل میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے صحیفہ اور دیگر قلم آسانی صحیفوں میں مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ خود قرآن پاک میں ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ جن سے بات کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کا اپنا بیان ہے: **وَقُلْنَا اِذْ مَتَّالٍ نَّضْرِيْهُنَّ لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَاۗ اِلَّا الْعَالَمُوْنَ** یعنی ہماری ان مثالوں سے اہل علم ہی صحیح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور مقصد کو پالیتے ہیں۔

شیخ ابو جراح ابن العربی مابین نے تفسیر احکام القرآن مکمل کی ہے۔ آپ کی تفسیر میں تین چار کتابیں ہیں۔ حدیث کی شروح، فتویٰ، نواہد و دروس علوم و فنون میں صبی بے شمار کتابیں ہیں وہ فرماتے ہیں کہ صرف سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار مثالیں بیان کی ہیں۔ گویا قرآن کریم، دیگر آسمانی کتب اور قلم حکماء کے کلام میں مثالیں موجود ہیں۔ حضرت لقمانؑ ان کی طرف منسوب کتب، نیز ہر زبان کے فصیح و بلیغ لوگوں کے کلام میں مثالیں پائی جاتی ہیں۔

تفاسیر
احکام القرآن

احکام القرآن کے نام سے بہت سے مفسرین نے کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں قرآن پاک کی صرف انہیں آیات کی تفسیر و تشریح کی گئی ہے۔ جن میں حلال و حرام کے احکام بیان ہوئے ان میں سے اہم کتاب ابو جراح حصاص رازیؒ کی احکام القرآن ہے۔ دوسرے مفسرین ابو جراح ابن العربیؒ اندلسیؒ ہیں۔ آپ کی احکام القرآن مابین مسک کے مطابق ہے۔ اسی طرح کشف و تصوف کے بہت بڑے اہم شیخ ابن عربیؒ کی تفسیر احکام القرآن ہے۔ اس میں زیادہ تر تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ امام جلال الدین سیوطیؒ نے بھی ایک چھوٹی سی تفسیر لکھی ہے جس کا نام **الکلیلی فی استنباط التذیید** ہے۔ اس میں قرآن کریم کی ان آیات کی مختلف تفسیر ہے۔ جن سے احکام مستنبط ہوتے ہیں۔ آپ فرائد اور دسویں صدی کے حافظ الحدیث ہوئے ہیں۔ عمر بھی کوئی زیادہ نہیں پائی۔ اٹھ سال کی عمر میں وفات پائی مگر پانچ سو تین برس کے مصنف ہیں، آپ کے بعد کوئی حافظ الحدیث نہیں ہوا۔ حافظ الحدیث وہ بلند پایہ ہو سکتی ہوتی ہے۔ جسے ایک لاکھ حدیث جمع سند زبانی یاد ہو۔

آپ کے بعد بڑے بڑے محدثین ہوئے ہیں۔ مگر حافظ الحدیث کوئی نہیں ہوا۔ البتہ

چنانچہ ان منافقوں نے بھی اپنی فطری استعداد کے مطابق اپنے اندر ایمان کی شمع روشن کی۔ اور پیغمبر علیہ السلام کی صحبت اختیار کی ان لوگوں نے اہل ایمان کی رفاقت بھی حاصل کی۔ اور زبان سے اقرار کیا اَمَّنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ چاہیے تو یہ تھا کہ ایمان کی اس روشنی سے اُن پر تمام حقائق روشن ہو جاتے۔ مگر انہوں نے تو صحیح معنوں میں ایمان قبول ہی نہیں کیا تھا۔ محض وقتی مفاد حاصل کرنے کی خاطر ایمان کا دعویٰ کیا تھا۔ اگر وہ دل سے نورِ ایمان کی آگ کو روشن کرتے۔ تو ان میں اَلْمَاغِثِ النَّهْيِ کا جذبہ پیدا ہوتا۔ اور ان کے دل میں ذکرِ الہی کا شوق پیدا ہوتا۔ اُن کے دل بھی توحیدِ خالص سے منور ہو جاتے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ تو وقتی طور پر ایمان کا اعلان کر کے اپنے مال و جان کی حفاظت چاہتے تھے۔ کیونکہ اسلام کا قانون یہ ہے هُنَّ قَالَتْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فَتَدْعُكُمْ مِنْ مِّمَّنْ مَالَهُ وَنَفْسَهُ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے زبان سے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا اقرار کر لیا اس کا جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ ہو گئی۔ اسی سے یہ منافقین اپنی فطری صلاحیت کو برعکس کار لائے ہوئے زبانی ایمان لے آئے۔ ان کا یہ ایمان لانا گویا جھگل کے اندھیرے میں آگ جلانے کے مترادف تھا۔

فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ جَبَّ اُسْ اَگ نے آگ جلاتے والے شخص کے ارد گرد کو روشن کر دیا۔ اُسے محفوظ و بہت گرو و پیش کا پتہ چل گیا۔ تو پھر کیا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اُس آگ کو بجھا دیا۔ یہاں پر اَطْفَأَهَا اللّٰهُ مضمون ہے۔ اس طرح کہ موت طاری ہو گئی۔ جب وہ آگ بجھ گئی جس کی روشنی میں یہ لوگ اپنی جان و مال کی حفاظت کر رہے تھے۔ تو پھر ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُورِهِمُ اللہ تعالیٰ ان کی روشنی کو لے گیا۔ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ اور انہیں بے پناہ اندھیروں میں چھوڑ دیا۔ پھر اُن کی حالت یہ ہو گئی کہ لَا يُبْصِرُونَ کچھ بھی دیکھ نہیں سکتے۔ روشنی تو عارضی تھی جب وہ منقطع ہو گئی۔ تو وہ اپنی اختیار کردہ راہوں کے انتہاء اندھیروں میں گم ہو گئے۔

اس مقام پر جن اندھیوں کا ذکر ہے۔ اور جن میں منافقین سرگردان ہیں اُن کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اور وہ ساری کی ساری منافقین کی جماعت پر صادق آتی ہیں۔

اندھیروں کی
مختلف قسمیں

سب سے پہلا اندھیرا کفر کا ہے۔ یہ لوگ صرف زبان سے ایمان کا اقرار کرتے تھے مگر ان کے دِل میں کفر کا اندھیرا بھرا ہوا تھا۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے: **اللَّهُ قَوْلُ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ** یعنی اللہ تعالیٰ ایمانداروں کا دل اور کار ساز ہے وہ انہیں اندھیروں سے نکال کر ایمان اور ہدایت کی روشنی کی طرف لاتا ہے جس کی وجہ سے دل میں روشنی اور بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ روشنی آگے چل کر حقیقی روشنی میں تبدیل ہو جائے گی۔

فرمایا دوسرا اندھیرا جو منافقین میں پایا جاتا ہے۔ وہ مکرو فریب کا اندھیرا ہے۔ **يُخَذِّعُونَ اللَّهَ وَلَ الَّذِينَ آمَنُوا** یہ وہی دھوکے اور فریب کا اندھیرا ہے۔ جو وہ اہل ایمان کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔

اسی طرح تیسرا اندھیرا دوسرا گویا انفرادی ہے۔ جیسا فرمایا **يَمَّا كَانُوا يَكْذِبُونَ** یہ کہتے ہیں ہم مومن ہیں۔ حالانکہ یہ صریح محبوب بول رہے ہیں۔ یہ لوگ ہرگز مومن نہیں۔ ان کے دل میں کفر چا ہوا ہے۔ لہذا یہ ایمان کے دعوے میں مہوٹے ہیں۔

منافقین کا چوتھا اندھیرا طعن و تشنیع کا اندھیرا ہے۔ یہ لوگ اہل ایمان کو احمق اور بیوقوف کہتے تھے۔ حالانکہ ایمان والے آخرت کے طلبگار ہیں۔ انہوں نے دنیا کو چھوڑ کر آخرت کو اختیار کیا ہے مگر منافق ان کو بیوقوفی کا طعن دیتے ہیں۔ یہ ان کا چوتھا اندھیرا ہے۔

جہالت دو قسم کی ہے۔ جہل بسیط اور جہل مرکب۔ کوئی شخص کسی چیز سے ناواقف ہو یہ جہل بسیط ہے۔ جب بھی ایسا شخص متعلقہ چیز سے واقفیت حاصل کرے گا۔ وہ اس جہل سے نکل جائے گا۔ دوسری قسم کا جہل جہل مرکب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان غلط بات کو صحیح سمجھنے لگے۔ بڑے عقیدے کو اچھا خیال کرے۔ یہ بہت خطرناک جہت ہے کیونکہ اس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ ایسا شخص نہ غلط کو غلط سمجھے گا اور نہ وہ اس جہالت سے نکلے گا۔

منافقین کا پانچواں اندھیرا یہی جہل مرکب ہے۔ وہ اپنے دھوکے اور فریب کو بڑا اچھا سمجھ رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو دھوکا دے رہے ہیں۔ حالانکہ وہ پانچویں قسم کے اس اندھیرے میں مبتلا ہیں۔

یہاں اندھیرا معاصی اور شہوات کا اندھیرا ہے۔ اطاعت و روشنی ہے اور معاصی اندھیرا ہے جن خواہشات کی تکمیل میں یہ لوگ سرگردان ہیں۔ وہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ ساتواں اندھیرا قبر کا اندھیرا ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ اِنَّ هٰذِهِ الْقُبُورَ مَمْلُوءَةٌ ظُلُمَةً عَلٰی اَهْلِهَا یہ قبریں اپنے مکینوں کے لیے اندھیروں سے بھری پڑی ہیں۔ ہاں جو شخص اپنے دل میں نورِ ایمان رکھتا ہوگا۔ اس کو وہاں بھی روشنی میسر ہوگی۔ جس نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر نماز پڑھی اس کی قبر میں روشنی ہوگی۔ ایمان والوں کے دل سے روشنی کی لٹ نکلتی گی، نیز ان کے اعمال صالحہ کی روشنی انہیں حاصل ہوگی۔

بخاری شریف کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے اَلظُّلُمَةُ ظُلُمَاتٌ يُّوَفُّ الْقِيَمَةَ اس دنیا میں کسی پر کیا گیا ظلم قیامت کے دن اندھیروں کی شکل میں سامنے آئے گا۔ یہ قبر میں جا کر پتہ پتہ چلے گا۔ کہ ظلم کا اندھیرا کس قدر شدید ہے۔ پل صراط سے گزرتے وقت حشر کے میدان میں ادھر دوزخ کی گہرائیوں میں اندھیروں کا احساس ہوگا۔ الغرض! یہ تمام اندھیرے ہیں جو منافقین پر وارد ہوں گے۔ ادھر یہ لوگ غضب الہی کا شکار ہوں گے۔

ان لوگوں کی بد نصیبی کی حالت یہ ہے کہ صَلٰةٌ یہ ہرے ہیں۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو اس قدر خراب کر لیا ہے۔ کہ صحیح بات کو سننے کے لیے تیار نہیں۔ یہ لوگ اس بد بختی کی بنا پر بِسُكْمٍ یعنی گونگے ہیں۔ ان کی زبان سے کبھی کبھی بات نہیں نکلتی۔ دھوکے فریب اور جھوٹ کے سوا ان کی زبان پر کچھ نہیں آتا۔ پھر یہ بھی ہے۔ کہ یہ لوگ حسن و قبح میں، اچھائی اور برائی میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے یہ لوگ عُمٰی یعنی اندھے بھی ہیں۔ ان کی ظاہری آنکھیں تو موجود ہیں۔ مگر ان کے دل اندھے ہیں۔ جو حق و باطل میں فرق نہیں کر سکتے۔ ایمان و شرک، سنت اور بدعت ان کے نزدیک برابر ہیں۔ ان کے نزدیک ان میں کوئی امتیاز نہیں۔

فرمایا یہ لوگ کفر و شرک اور معاصی میں اس قدر آگے نکل چکے ہیں۔ فَلَسَّمْ لَا يَرْجِعُوْنَ کہ اب ان کے نیکی کی طرف واپس ہٹ آنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ نے پچھلے منافقوں کا یہ حال بیان فرما دیا۔

لَا يَرْجِعُونَ کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو شخص مر گیا اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ کہ
 واپس آ کر کوئی نئی کمائی کر لے گا۔ انسان جو اعمال دنیوی زندگی میں کما گیا۔ ان میں تغیر تبدیل نہیں ہو سکے
 گا۔ دنیا میں تو کئی چیزیں منسوخ بھی کر دی جاتی ہیں مگر آخرت میں پہنچ کر دنیا میں کیسے گئے اعمال میں
 کوئی رد و بدل نہیں ہو سکے گا اللہ تعالیٰ کا قول ہے: "وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِفَةً فِي
 عُقْبَتِهِ" ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لٹکا دیا جاتا ہے اور پھر مرنے کے بعد وُخْرِجُ
 لَهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ كِتَابًا قیامت کے دن ہم نکال کر سامنے کر دیں گے۔ کہ یہ تیرا اعمال
 نامہ ہے۔ لو خود پڑھ لو۔ لطف یہ ہے کہ پڑھنے کی صلاحیت بھی اُس وقت دیا ہو جائے گی
 اللہ تعالیٰ فرمائیں گے لو خود پڑھ لو الغرض فہم لَا يَرْجِعُونَ کا مطلب یہی ہے کہ یہ
 پلٹ کر نہ ہدایت کی طرف آ سکتے ہیں۔ اور نہ ہی دنیا کی طرف آ سکتے ہیں۔ اور نہ ہی کوئی کمائی
 کر سکیں گے۔ یہ اُن منافقوں کا حال ہے جن کے دل کفنہ میں راسخ ہو چکے ہیں۔

الْعَمَّ

الْحَقَّة ۲

درس نہم ۱

(آیت ۲۰: ۱۹)

أَوْ كَصَيْبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿۱۹﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشْأَوْفِيَةٌ إِذَا ظَلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُومًا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۰﴾

۲

ترجمہ: یا ان کی مثال آسمان کی طرف سے اترنے والی اس بارش کی ہے۔ جس میں تاریکیاں گہرائی اور بجلی کی چمک ہے۔ یہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈالتے ہیں۔ بادل کی کڑک سے موت کے ڈر سے۔ اور اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرنے والا ہے ﴿۱۹﴾ قریب ہے کذبلی ان کی آنکھوں کو اچک لے۔ جب وہ ان کے لیے روشنی کرتا ہے۔ تو اس میں چلتے ہیں۔ اور جب ان پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کے کانوں اور آنکھوں کو لے جائے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ﴿۲۰﴾

گزشتہ پورے

اللہ تعالیٰ نے منافقین کی برائی میں دو مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ پہلی مثال گزشتہ درس میں گزرتی ہے کہ منافقوں کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے جنگل میں آگ جلائی ہو۔ اور جب اُس نے ارد گرد کو روشن کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی روشنی کو لے گیا۔ اور آگ کو بجھا دیا۔ منافقین کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ کسی چیز کو نہیں دیکھتے وہ ہرے گونگے اور اندھے ہیں پس وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

یہ پہلی قسم کے وہ منافق ہیں جو اپنے نفاق میں پختہ ہیں اور جبل مرکب میں مبتلا ہیں۔ ان کی اصلاح کی کوئی امید باقی نہیں رہی کیونکہ وہ غلط بات کو صحیح سمجھ رہے ہیں۔ ایسے لوگ محض چال بازی اور فریب کاری کی بنا پر کلمہ اسلام پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ

اور قیامت پر ایمان لے آئے ہیں۔ حالانکہ ان کے اندر ایمان کا شائبہ تک نہیں۔

منافقوں کی
دوسری مثال

دوسری مثال اللہ تعالیٰ نے ان منافقین کی بیان کی ہے، جن کا کفر مسخ نہیں ہے، بلکہ وہ لوگ متردّد ہیں۔ ان کا رجحان کبھی اسلام کی طرف ہوتا ہے، اور کبھی باطل عقیدے کی طرف تو ایسے لوگوں کی تشبیہ اللہ تعالیٰ نے بارش کے ساتھ دی ہے۔ جس طرح بارش کے نتیجے میں بہت سی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، اسی طرح ظہورِ اسلام کے ساتھ منافقین کے لیے بھی کئی ایک چیزیں پیدا ہوئی ہیں۔ ترسیاں پر اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر فرمایا ہے، اور ان متردّد قسم کے لوگوں کے متعلق فرمایا کہ ان کی طرف سے بالکل ایسی نہیں ہے، بلکہ ہو سکتا ہے، کہ کسی وقت ان کے ذہن میں صحیح چیز آجائے، اور یہ نفاق سے باز آجائیں۔

حدیث پاک میں آتا ہے، کہ اعتقادی منافق کفر ہی کی ایک قبیل سے ہے، بلکہ کفار میں سے بھی بدترین قسم کا کافر ہے۔

اعتقادی اور
عملی منافق

منافق کی ایک اور قسم عملی منافق ہے، ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، یہ ایسے لوگ ہیں، کہ دل میں نورِ ایمان موجود ہے، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، پیغمبرِ علیہ السلام کی رسالت اور قیامت پر ایمان ہے، مگر ظہر اور باطن میں مطابقت نہیں پائی جاتی حضور علیہ السلام نے عملی منافق کی بہت سی نشانیاں بتائی ہیں مثلاً اِذَا اَوْثُمْنَ خَانَ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرتا ہے۔ اِذَا خَاَصَمَ فَجَرَ جب کسی سے جھگڑا کرتا ہے، تو گالی گھوج پر اُتر آتا ہے، اور اِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ جب وعدہ کرتا ہے، تو خلاف ورزی کرتا ہے ایسا شخص اعتقادی نہیں بلکہ عملی منافق ہے، اللہ تعالیٰ کے عاید کردہ فرائض نماز، روزہ وغیرہ کو فسر ض بکھتے ہوئے انہیں بھانسیں لاتا، ایسے عملی منافقوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔

مسند احمد کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ الْقُلُوبُ اَرْبَعَةٌ یعنی دل چار قسم کے ہوتے ہیں، پہلی قسم کے متعلق فرمایا قَلْبٌ اَجْرَدٌ ایسا دل جو صاف و شفاف ہو، فرمایا اس کی مثال روشن چراغ جیسی ہے، جس میں کسی قسم کی کوئی خرابی نہ ہو۔

دل کی
چار قسمیں

دوسرا دل اعلیٰ ہے۔ جو غلاف میں بند کر دیا گیا ہو اور پھر اوپر سے دھاگے کے ساتھ
باندھ دیا گیا ہو۔ فرمایا تیسری قسم کا دل معکوس ہے یعنی اونڈھا ہے۔ اس کا سر نیچے اور منہ اوپر
ہے۔ اور چوتھی قسم کا دل مصنع ہے۔ یعنی دو پہلو والا دل۔

پہلی قسم کے دل کے متعلق فرمایا کہ صاف و شفاف دل مومن کا دل ہے جس میں فداکاری
بالکل صاف اور واضح ہے۔ اس میں کوئی خرابی یا کسی قسم کی ملامت نہیں ہوتی۔ غلاف میں بند دل کے
متعلق فرمایا۔ یہ کافر کا دل ہے امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کسی
پرندے کو ایسے بجرے میں بند کر دیا گیا ہو جس میں کوئی سوراخ نہ ہو۔ ایسا دل کافر، مشرک یا دہریے
کا ہوتا ہے۔ جس میں سے باہر دیکھنے کے لیے سونے کے برابر بھی سوراخ نہ ہو کہ وہ اپنے خول سے
باہر حق کی بات کو دیکھ سکے۔ فرمایا اونڈھا دل منافق کا دل ہے۔ جس نے ایمان کو پہچان تو لیا ہے
مگر قبول نہیں کیا۔ محض اپنے بچاؤ کی خاطر کوئی فریب کاری کی ہے۔ مگر ہے پکا منافق۔ دو پہلو دار
دل، تو وہ ایسا ہے جس میں ایمان بھی ہے اور نفاق بھی۔ یہ عملی منافق ہے۔ جسے کسی حد تک یقین
بھی ہوتا ہے۔ اور کبھی متردد بھی ہوتا ہے۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا ایمان کی مثال کَمَثَلِ الْبُقْلَةِ يُغَدِّهَا لَمَكَاوُ
الطَّيِّبِ اُس پوٹے کی ہے جسے پاکیزہ پانی سیراب کرتا ہو۔ پوٹے کا بیج اچھا ہو، اُس کی
آبیاری بھی صاف پانی سے ہو، تو ظاہر ہے کہ اُس کی نشوونما بھی اچھی ہوگی۔ نیز فرمایا کہ منافق کی
مثال انسانی جسم میں پیدا ہونے والے پھوڑے کی ہے۔ ایک طرف سے پیپ آتی ہے۔
تو دوسری طرف سے خون کا دورہ ہوتا ہے۔ گویا پھوڑے کی غذا خون اور پیپ ہوتی ہے۔ ان
میں سے جس چیز کا غلبہ ہوگا، تو مریض ہلاک ہو جائے گا۔ اور اگر خون غالب آگیا۔ تو صحت یابی
ہو جائے گی۔ منافق میں دونوں قسم کے مادے پائے جاتے ہیں۔

دل کے حالات بہت مختلف ہوتے۔ یہ کبھی یکساں نہیں ہوتے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ
بڑے پائے کے بزرگ ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ قلب پر چھ قسم کی حالتیں وارد ہوتی ہیں۔

یعنی حیات اور موت۔ صحت اور بیماری، بیداری اور غیہ، فرماتے ہیں کہ قلب کی حیات ہدایت کی مرہون منت ہے۔ اگر ہدایت نصیب ہو گئی ہے تو سمجھ لیں کہ دل زندہ ہے۔ اور قلب کی موت گمراہی سے واقع ہوتی ہے۔ فرمایا مَوْتُهُ الْخَلَلَةُ دِل کی موت کا سبب گمراہی ہے۔ کسی قسم کی گمراہی دل میں پیدا ہو جائے۔ سمجھ لیں کہ دل مردہ ہو گیا، اس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی۔

قلب کی صحت طہارت اور صفائی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور طہارت کا حصول ایمان اور توحید کی بدولت ہے۔ کہ ایمان کے بغیر طہارت نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس کے برخلاف قلب میں بیماری، کہ مدت گزرتے تعلقات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے: **يُؤْخَذُ لَآ يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿٨٨﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ** اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول نقل کیا ہے۔ انہوں نے قیامت کے تذکرہ میں فرمایا۔ اُس دن نہ مال کسی کام آئے گا۔ اور نہ اولاد مفید ہوگی، ہاں! جو قلب سلیم لے کر پہنچ گیا، اُس کو فائدہ ہوگا۔ اور قلب سلیم وہی ہے جس میں طہارت، پاکیزگی اور نور ایمان ہوگا۔

فرمایا دل کی بیداری ذکر الہی میں ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہتا ہے اس کا دل بیدار ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا مَثَلُ الَّذِي يَذْكُرُ رَبَّهُ وَالَّذِي لَا يَذْكُرُ مَثَلُ الْحَيِّ وَالْمَيِّتِ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے اور نہ کرنے والے کی مثال زندہ اور مردہ کی ہے۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہے تو سمجھ لو کہ اس کے دل پر غفلت کی غینہ طاری ہے قرآن میں جگہ جگہ آپ پڑھتے ہیں کہ اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ اور غافلوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

فرمایا منافق کی مثال ایسی ہے **اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ جِئَ سَمَانًا** سے بارش آتی ہے۔ صیب کا معنی زور سے برسنے والی بارش ہے اور عربی زبان میں سماء آسمان کو بھی کہتے ہیں، فضاء کو بھی اور یہ لفظ بادل پر بھی بولا جاتا ہے، اسی طرح عربی زبان کے اعتبار سے چھت

بارش کی مثال

کو بھی سارے کہتے ہیں۔ تاہم اس مقام پر سارے مراد بادل ہیں۔ کیونکہ بارش بادلوں میں سے برستی ہے ہو سکتی ہے اس کا تعلق آسمان سے بھی ہو۔ جس کو عام انسان اور سائنس دان نہیں سمجھ سکتے تاہم بظاہر بارش کا تعلق بادلوں کے ساتھ ہے۔ اس لیے یہاں پر آسمان کا لفظ فرمایا۔

فرمایا فِيهِ ظُلُمَاتٌ اس میں اندھیرے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بارش کے دوران بادل چھائے ہوئے ہیں اور سورج غائب ہوتا ہے، اور کسی قدر اندھیرا ہوتا ہے۔ اور اگر ایسا رات کے وقت ہوا تو تاریکی اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ سائے تک نظر نہیں آتے۔ جب قرآن پاک نازل ہوا۔ تو اس وقت ہر طرف کفر و شرک کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اندھیروں کے علاوہ فرمایا وَكَعْدٌ اس میں گرج بھی ہوئی ہے۔ فرشتے بادلوں کو ہلک کر لاتے ہیں۔ تو ان کے لئے گرج پیدا ہوتی ہے۔ اسے دھڑ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرے معنی میں کفر و شرک پر وعید کو بھی دھڑ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فرمایا وَبَرْقٌ بارش میں اکثر اوقات بجلی بھی چمکتی ہے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ بادل آہیں میں رگڑ کھاتے ہیں۔ تو بجلی پیدا ہوتی ہے۔ نیز اس کا معنی یہ بھی ہے کہ قرآن پاک میں بڑے واضح دلائل موجود ہیں جن سے حق و باطل میں تمیز ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ دلائل بمنزلہ برق کے ہیں۔

منافقین کی
بے بسی

فرمایا منافقوں کی حالت یہ ہے کہ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ اپنی انگلیاں کڑک کے خوف سے اپنے کانوں میں ڈالتے ہیں۔ جب بارش کے دوران بجلی چمکتی ہے۔ اور بادلوں میں گرج پیدا ہوتی ہے۔ تو دہشت کے مائے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ حَذَرَ الْعَذَابِ کہ کہیں ہلاک نہ ہو جائیں۔ موت کے ڈر سے کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ موت سے بھاگ نہیں سکتے۔ کیونکہ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ اللہ تعالیٰ کافروں کو ہر طرف سے گھیرنے والا ہے۔ وہ پکڑنا چاہے گا تو فوراً گرفت کر لے گا۔ منافقین کا خوف دُور انہیں اللہ کی گرفت سے بچا نہیں سکتا۔

فریاد یکاہ الذوق یخطف ابصارہم قریب ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ناراضگی کی وجہ سے ان کی آنکھوں کو اچکے لے۔ اور وہ اندھے ہو کر رہ جائیں۔ کَلَمًا اَصْنَاءَ لَهُمْ مَشْوَافِیہ جب بجلی کی چمک پیدا ہوتی ہے۔ تو اس کی روشنی میں تھوڑی دور چلتے ہیں وَاِذَا اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ قَلَمُوا اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے۔ تو ٹھہر جاتے ہیں۔ اہم جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کفر و شرک کا ذکر فرمایا ہے اور یہ اندھیروں کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے کان، آنکھیں، بصارت، قلب اور حواس عطا کئے۔ یہ سب اس کے انعام ہیں۔ اور ہدایت حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔ یہ منافقین کس خیال میں پھرتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی عطا کردہ نعمتیں چھین نہیں سکتا بلکہ فرمایا وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمِیْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ اَکْر اللّٰہ تعالیٰ چاہے تو ان کی سماعت اور بصارت ہی زائل کر دے۔ یہ لوگ باطنی طور پر تو اندھے ہی ہیں۔ اللہ چاہے تو ظاہری طور پر بھی ان کی مبنائی ضائع ہو جائے اور قوت شنوائی سلب ہو جائے۔ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں اس لیے عطا کی ہیں کہ ان کے ذریعے ہدایت قبول کریں اپنے لیے کمال حاصل کریں تاکہ آئندہ زندگی میں ان کے کام آسکے۔ مگر یہ ان ذرائع کو غلط طرہ پر استعمال کر رہے ہیں۔ ان سے صحیح طور پر استفادہ نہیں ہو رہے ہیں۔ لہذا یہ اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنا عطا کیا ہوا انعام واپس لے سکتا ہے۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ ان ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے ہدایت کا راستہ اختیار کریں۔ تاکہ انہیں فلاح نصیب ہو۔

النَّاسِ

البقرة ۲

درس دہم

(آیت ۲۱ تا ۲۳)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ
 قَبْلِكُمْ لَكُمْ تَشْقُونَ ﴿٢١﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ
 فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بَنَاءً ۖ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ
 بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا
 وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٢﴾

قر مجید: اے لوگو! عبادت کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا ہے۔ اور
 ان لوگوں کو جو تم سے پہلے گئے ہیں، تاکہ تم بھی جاؤ۔ ﴿۲۱﴾ وہی رب جس نے تمہارے
 لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا ہے۔ اور آسمان کی طرف سے پانی اتارا ہے۔
 پھر اس پانی کے ذریعے پھلوں سے تمہارے لیے روزی نکال ہے۔ پس نہ ٹھہراؤ اللہ
 کے لیے شریک، اور تم جانتے ہو۔ ﴿۲۲﴾

دوسرے رکوع کے اختتام تک اللہ تعالیٰ نے تین قسم کے انسانوں کا ذکر فرمایا ہے۔ سورۃ البقرہ
 کی ابتدائی چار آیتوں میں ایمان والوں کا ذکر کیا ہے اور ان کے اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ اگلی
 دو آیتوں میں ظاہر اور باطن انکار کرنے والے کفار کا حال اور ان کا انجام بیان ہوا ہے۔ اس کے
 بعد تیسرے آیت میں منافقین کا حال تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ان کی چال بازی۔ دھوکا بازی
 فریب کاری، ریشہ دوانی، ظاہر و باطن میں تغاوت، فساد فی الارض اور غلط عقیدے کا رد ہے۔
 پھر اس کی وضاحت و مثالوں کے ذریعے کی گئی ہے۔ ایک آگ کی مثال اور دوسری پانی کی۔
 منافقین کا انجام بھی بیان ہوا ہے اور تمہید بھی کی گئی ہے۔

اب تیسرا رکوع شروع ہو رہا ہے۔ یہاں سے تمام انسانوں کو خطاب ہے۔ حضرت
 عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں جہاں بھی يَا أَيُّهَا النَّاسُ سے خطاب ہے

دہاں روئے سخن اہل مکہ کی طرف ہے۔ کیونکہ نزول قرآن کے زمانہ میں اکثر و بیشتر وہی لوگ کفر میں مبتلا تھے۔ اور جہاں پر **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ ان سے مراد اہل مدینہ ہیں۔ کہ انہوں نے برضا و رغبت ایمان قبول کیا۔ اور اسلام کی مرکزیت کے لیے پیغمبر قربانیاں دیں۔ تو یہاں پر **يَا أَيُّهَا النَّاسُ** کے مخاطب دنیا کی تمام اقوام اور تمام بنی نوع انسان ہیں۔ جو لوگ اس وقت موجود تھے، ان سے براہ راست خطاب ہے۔ اور جو بعد میں آئے ہوں گے۔ ان سے انہیں اہل ایمان کے واسطے سے مخاطب کیا گیا ہے۔ قرآن پاک کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **لَا تُنْذِرُ كَثِيرًا**۔ تاکہ میں اس قرآن پاک کے ذریعے تمہیں بھی تمہارے خطرناک انجام سے آگاہ کر دوں۔ اور جن لوگوں تک یہ قرآن پہنچے گا انہیں بھی متنبہ کر دوں، مگر میں سب کو ان کے بُرے انجام سے ڈرا رہا ہوں۔

اس رکوع میں قرآن کریم کے چار اہم اور عمدہ مضامین کا تذکرہ ہے۔ سب سے پہلے توحید کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لائے بغیر نجات کا کوئی راستہ نہیں، لہذا اس کے بغیر جنت کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ قرآن پاک کا دوسرا اہم مضمون رسالت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مد کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ تیسرا مضمون خود قرآن کریم کی حقانیت اور اس کا وحی الہی ہونا ہے۔ جسے قرآن پاک میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے۔ انسان کو زندگی کے ہر موڑ پر ہدایت اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اور اس کا واحد ذریعہ وحی الہی ہے۔ کیونکہ یہاں پر انسانی عقل و شعور کام نہیں کر سکتے۔ انسان ہمیشہ علم کی روشنی میں ترقی کرتا ہے اور ذرائع علم میں سب سے اہم، قطعی اور آخری ذریعہ وحی الہی ہے۔

اس رکوع میں چوتھے اہم مضمون معاد کا ذکر ہے۔ قیامت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ کیونکہ اچھے اور بُرے نتیجے کا دار و مدار روز قیامت پر ہے۔ اس روز تمام چیزیں اپنی اصلی حالت میں ظہور ہوں گی۔ نیکی اور بدی میں امتیاز ہوگا۔ اور انسان اس کے نتیجے میں ذمہ داری سے دوچار ہوگا۔ لہذا یہ اہم مضمون بھی بیان ہوا ہے۔

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو توحید پر کاربند ہونے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ**۔ اے انسانو! اپنے رب

کی عبادت کرو۔ توحید فی العبادت وَتَحْدُثُ اپنے رب کو وحدہ لا شریک مانو۔ اور اس کی عبادت کرو۔ کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ گویا اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے توحید جیسی سب سے اہم انسانی ذمہ داری کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ اس سلسلے میں اکثر لوگ غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ عبادت کا مضمون يَا اَللّٰهُ نَعْبُدُكَ میں ذکر کر دیا گیا تھا۔ کہ عبادت حقیقت میں اپنے ظاہر و باطن کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مصروف کرنا ہے۔ اور اس خاص عقیدے اور تصور کے ساتھ کرنا ہے کہ پوری کائنات اور اس کے تمام اسباب پر اُسی مالک الملک کا تسلط ہے۔ ہر قسم کا نفع و نقصان اُسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وہ علیم کل۔ قادر مطلق اور مختار مطلق ہے۔ اس ہستی کا تصور کرتے ہوئے اس کے سامنے انتہائی عاجزی کے اظہار کو عبادت کہتے ہیں۔ عبادت کی ادائیگی بدن۔ زبان۔ دل۔ مال اور افعال سے ہوتی ہے۔ اور اس تصور کے ساتھ عبادت صرف خدا تعالیٰ کی ہی ہو سکتی ہے۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ کی چند صفات بیان کر کے اس ہستی کی پہچان کرائی گئی ہے جس کی عبادت مطلوب ہے۔ فَرِیَا اَعْبُدُوْا رَبَّكُمْ یعنی اپنے رب کی عبادت کرو۔ اور رب خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔ وہی انسان کو پالنے والا ہے۔ انسانی زندگی کی ترقی اور بقا کے تمام اسباب پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے۔ انسانی وجود سے باہر جتنی بھی نعمتیں ہیں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت خَلَقَ بیان کی گئی ہے۔ اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ اِنَاسًا کو سب سے پہلے اور سب سے بڑی نعمت جو میرا آئی ہے، وہ اس کا وجود ہے۔ اسی لیے فرمایا اُس ذات کی عبادت کرو۔ جس نے تم کو پیدا کیا۔ خالق اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔ اَللّٰهُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ گویا تمہارا خالق بھی وہی ہے۔ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ اور تم سے پہلے قوموں کا خالق بھی وہی ہے۔

اہم غزالی نے حدیث پاک کے حوالے سے لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات میں غور و فکر معرفت الہی

کرنا استدعا سے باہر ہے۔ کیونکہ لَا فِكْرَةَ فِي التَّوْبَةِ رَبِّ کی ذات میں فکر نہیں ہو سکتی۔ کہ یہاں تک عقل و شعور کی رسائی نہیں ہے۔ اَللّٰهُ تَعَالٰی کی پہچان اس کی پیدا کردہ اشیاء میں غور و فکر سے حاصل ہوتی ہے۔ جب اس کی صفات سمجھ میں آجاتی ہیں۔ تو اس کی ذات کی معرفت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے حکم یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی مصنوعات میں غور و فکر کرنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی صفت، اس کی قدرت، اس کا علم، اس کی رحمت اور اس کی ربوبیت سب کچھ سمجھ میں آئے گا۔ اور اس طرح خود اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے گی۔

حضور علیہ السلام نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو مین کا گورنر بنا کر بھیجا تو فرمایا: تم ایک ایسی قوم کے پاس جاؤ، جو اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ میں سب سے پہلے توحید و رسالت کی دعوت دینا شہادۃً اَنَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ یعنی سب سے پہلے اس بات کی دعوت دینا کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک ہے۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بڑے رسول ہیں۔ آپ نے فرمایا: فَاذْهَبْهُمْ عَرَفُوْا ذٰلِكَ جب وہ اس کو پہچان لیں تو پھر انہیں نماز، روزہ اور دیگر احکام کا حکم دینا۔ گویا سب سے پہلے معرفت الہی اس کے بعد رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے اللہ باقی باتیں بعد میں بتاتا۔

اللہ تعالیٰ نے یہود کے متعلق قرآن پاک میں فرمایا ہے: "وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهِ" انہوں نے تو خدا کے مرتبے کو بھی نہیں پہچانا ہے۔ جس طرح کہ پہچاننے کا حق ہے اگرچہ یہ لوگ اہل کتاب اور صاحب علم ہیں۔ بڑے بڑے فلاسفہ ہیں، مگر رب کی صفت کو نہیں پہچان سکے۔ اگر اس کی صفت کو پہچان لیتے تو پھر شرک کا ارتکاب نہ کرتے۔ عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا نہ کہتے۔ مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ کا خطاب نہ دیتے اور حضرت مریم علیہا السلام کو مادر خدا نہ کہتے۔ غرضیکہ بندے اور خدا کو ایک نہ کر دیتے۔ انہیں تو پہچان ہی نہیں ہو سکی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں پہچان کرائی ہے۔ کہ جب اللہ کی صفت کو پہچان لو گے تو اس کی عبادت ہوگی۔ اور اگر اس کی معرفت

ہی حاصل نہیں ہوئی۔ کہ وہ کن صفات کا مالک ہے۔ تو عبادت کس کی کر دے۔

فرمایا يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ سے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو الَّذِي خَلَقَكُمْ وہ رب جس نے تم کو وجود کی نعمت بخشی۔ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ اور جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ تاکہ تم بچ جاؤ۔ لَعَلَّ ترس جی کے لیے ہوتا ہے اور ترس جی کا معنی ہے امید۔ لیکن اہم جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں: کہ قرآن پاک میں لَعَلَّ کا لفظ تحقیق کے لیے آتا ہے۔ تاکہ تم بڑے انجام اور کفر شرک سے بچ جاؤ۔ تَتَّقُونَ یعنی متقی بن جاؤ۔ اس رب کی پہچان کرنے کے بعد اس کی عبادت کرو۔ خَلَقَكُمْ میں صفت ایجاد کا تذکرہ ہے۔ کہ اُس نے انسان کو عدم اور نیستی سے پیدا کیا ہے۔ جس کے متعلق فرمایا لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّا ذُكِّرُوا کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ اُسے عدم سے وجود میں لایا۔ لہذا اپنے رب کی عبادت کرو۔ جس نے وجود جیسی نعمت عطا کی۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی عبادت سے متعلق احادیث میں بہت سے احکام موجود ہیں۔ ترمذی شریف اور منہ احمد میں یہ روایت موجود ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ لوگوں کو ان باتوں کی تبلیغ کرو۔ سب سے پہلی بات یہ کہو کہ اِنَّ تَعْبُدُوْهُ وَاَنْتُمْ كُوْدٌ بِدْ شَيْئًا اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ کیونکہ اس کی مثال ایسی ہے كَمَثَلِ رَجُلٍ اِشْتَرٰى عَبْدًا کہ کوئی شخص غلام خریدے۔ وہ یہ یا سونا چاندی غلام خریدنے پر خرچ کرے۔ پھر اس غلام کو کام پر لگا دے۔ اور غلام مزدوری کر کے جو معاوضہ حاصل کرے وہ اپنے مالک کی بجائے کسی دوسرے شخص کو دے دے۔ فرمایا يَتَّكِفُوْنَ اِنَّ يَتَّكِفُوْنَ عَبْدًا كَذٰلِكَ اس قسم کے غلام سے کون راضی ہو سکتا ہے۔ کہ اس کا مالک وہ ہے۔ اُس کی خوراک یا لباس اور رہائش کا بندہ دست دو کرتا ہے۔ مگر غلام دن بھر کی کان مالک کی بجائے دوسروں کو دے آتا ہے۔ فرمایا مشرک کا حال بھی یہی ہے کہ تمام نعمتیں اور ان کے اسباب اللہ تعالیٰ نے میاں کیے ہیں۔ مگر وہ تعظیم غیز کی کرتا ہے۔ یہ مشرک اس ملک حرام غلام

کی طرح ہے۔ جو اپنی کمائی دوسروں کے گھر میں ڈال آتا ہے۔

الغرض فرمایا رب تعالیٰ کی پہچان نشانیوں سے ہوتی ہے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ کی دو صفات بیان ہوئی ہیں۔ ایک ربوبیت اور دوسری خالقیت اگر انسان غور و فکر کر کے ان صفات کو پہچان لیں گے۔ کہ یہ صفات خدا تعالیٰ کے ساتھ ہی خاص ہیں۔ تو پھر وہ عبادت بھی اُسی ہی کی کریں گے۔

ہارون الرشید نے ام الماک صاحبہ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کے وجود پر کوئی دلیل بتلائیں۔ انہوں نے فرمایا کہ انسان کی مختلف بولیاں، مختلف آوازیں، مختلف لہجے اور مختلف نغمے خود خدا تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل ہیں۔ دنیا میں چار ہزار مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں کیا یہ وجود الہی پر کچھ کم دلیل ہے۔

وجود الہی پر دلائل

اہل سنت کے چار اماموں میں سے ام ابوحنیفہ اور ام ماک بڑے ام ہیں۔ ام شافعی اور ام احمد ان کے شاگرد ہیں۔ یا شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ پھر ان بڑے امروں میں سے ام ابوحنیفہ ام اعظم ہیں۔ ان کا مرتبہ زیادہ ہے۔ کیونکہ انہوں نے تقریباً آٹھ صحابہ کرامؓ کی زیارت کی ہے۔ یہ سعادت کسی دوسرے ام کو حاصل نہیں۔ آپ صحابہ کرامؓ کے زمانے سے قریب تر ہیں۔ آپ کی ولادت شہر میں ہوئی جب کہ عیساؑ بکرلم شہر تک دنیا میں موجود ہے۔ انیس ام اعظم کا واقعہ ہے کہ دہریوں اور زندقوں کی ایک جماعت آپ کے مناظرہ کرنے کے لیے حاضر ہوئی۔ ان کا دعوئے تھا کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی وجود یا ہستی نہیں ہے بلکہ کائنات کا یہ نظام خود بخود چل رہا ہے۔ جب انہوں نے ام صاحبہ سے گفتگو کرنا چاہی تو آپ نے فرمایا اِنِّیْ مُفَكِّرٌ فِیْ اُمُورٍ میں ایک معاملہ میں غور و فکر کر رہا ہوں۔ اور بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ مجھے بتلایا گیا ہے کہ سامان سے بھری ہوئی ایک کشتی خود بخود دریا میں چل رہی ہے۔ اس کو چلانے والا کوئی ملاح اس میں نہیں ہے۔ مگر یہ پانی کی موجوں کو چیرتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ اور واپس آرہی ہے۔ وہ کسے لگے۔ یہ کس قدر بے عقلی کی بات ہے۔ بھلا

کون تعلق نہ کہہ سکتا ہے۔ کہ کشتی بغیر کسی چلانے والے کے خود بخود چل رہی ہے۔ یہ جن کرامات صحت فرمانے لگے۔ وَجَعَلَكُمْ تَمْرًا فَرَسًا ہے۔ کہ جب ایک معمولی کشتی چلانے والے کے بغیر چل نہیں سکتی۔ تو تمام کائنات، عالم سفلی اور عالم علوی اور جو کچھ ان کے اندر ہے۔ کیا یہ نظام خود بخود چل رہا ہے۔ کوئی اس کا محرک نہیں ہے۔ اس حاضر جوابی سے تمام دہریے تائب ہو گئے اور اہم صحت کے ہاتھ پر ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے۔

کسی نے اہم شافعی سے عرض کیا کہ حسرت! وجود الہی پر کوئی دلیل لائیں۔ اتفاق کی بات کہ سامنے تو ت کا درخت تھا۔ اہم صاحب فرمانے لگے۔ یہ تو ت کا درخت خدا تعالیٰ کے وجود پر دلیل ہے۔ دیکھو اس درخت کے پتوں کا ذائقہ، مزہ اور بویاں ہے۔ مگر ریشم کا کپڑا اس پتے کو کھا کر ریشم نکالتا ہے۔ شہد کی مکھی اس سے شہد حاصل کرتی ہے۔ بکری کھائے تو مینگیاں نکالتی ہے۔ اور ہرن کھائے تو کستوری پیدا ہوتی ہے۔ بتاؤ یہ خدا تعالیٰ کا کام نہیں تو اس کا کام ہے۔ پار مختلف چیزیں ایک ہی پتہ کھاتی ہیں اور ان سے مختلف چیزیں نکلتی ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کی قدرت تامہ کا شاہکار ہے۔ کہ پاروں چیزیں کو الگ الگ پیدا کرتا ہے۔

اہم احمد سے بھی کسی نے یہی سوال کیا۔ فرمانے لگے کہ انڈیا قلعہ کی مانند ہے۔ اوپر سے سفید اور چکن اور اندر سے سونے کی طرح زرد ہے۔ یہ اچانک پھٹتا ہے۔ تو اس سے برقع و عیہ حیوان نکلتا ہے۔ یہ خوبصورت جانور کون نکالتا ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی قدرت کے سوا اور کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان ہی مصنوعات پر غور کرنے سے اس کی قدرت، حکمت، خالقیت اور ربوبیت کے رموز و کجھ میں آتے ہیں۔ لہذا اگر خدا تعالیٰ کی صفت سمجھ میں آگئی۔ تو پھر عبادت بھی ٹھکانے لگے گی۔

فَرَمَا الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ فَرَأَتْهُ حَسَنَةً فِي زَمَنِ كَوْنِهَا
تمہارے لیے فرشتے بنایا۔ زمین کی ساخت اس طرح کی ہے کہ نہ دلال کی طرح نرم اور نہ

بہتر کی طرح سخت۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا معتدل بنایا ہے۔ کہ انسان اپنی تمام ضروریات
 اسی سے پوری کرتا ہے۔ اسی پر چلتے پھرتے ہیں۔ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ مکان بناتے
 ہیں، غرض زمین کو کمال درجے کا فرش بنایا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی توحید کے قوی دلائل موجود ہیں۔ سب سے پہلے خدا تعالیٰ جو مدافع اور قادر ہے۔ اس کی صفات کا ذکر ہے۔ کہ اس کے مشابہ کوئی چیز نہیں۔ نہ اس کوئی نہ یعنی مقابل یا شریک ہے اور نہ اس کی کوئی مثل ہے۔ وہ ایسی اعلیٰ ذات ہے جسے کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی۔

دلائل توحید کے تعلق فرمایا کہ آسمان کی بندی پر غور کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بغیر ستون کے قائم کیا ہے۔ اس بات کا اشارہ سورۃ رعد میں کیا گیا ہے: بَعَثْنَا سِدْرًا دَهَبًا۔ اے تم بغیر ستونوں کے دیکھ رہے ہو۔ دنیا میں کوئی چھت بغیر ستون کے کھڑی نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ جس نے آسمان جیسی عظیم الشان چھت کو کھڑا کیا ہوا ہے۔ لطف یہ ہے کہ جب سے اے قائم کیا ہے۔ اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں آیا۔ جب تک چاہے آسمان کو اسی حالت میں قائم رکھے گا۔ اور جب چاہے گا۔ اُسے توڑ پھوڑ دے گا۔ اور یہ درہم بہم ہو جائے گا۔ اسی بات کو دوسری جگہ یوں بیان کیا وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَفًّا مَحْفُوظًا وَهُوَ عَنْ يَمِينِهِا مُعَسَّرٌ مُّسَوِّنٌ دیکھو! ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا ہے۔ مگر لوگ ہماری ان نشانیوں سے اعراض کرتے ہیں۔ ان میں غور و فکر نہیں کرتے۔

دلائل توحید کے سلسلے میں زمین کو دوسری دلیل کے طور پر پیش کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اے کیسا ثبات بخشا ہے۔ اہم البوکر جصاص فرماتے ہیں: کہ زمین کے اوپر بھی ہوا ہے اور نیچے بھی ہوا ہے۔ اور اے فضا میں بغیر کسی سائے کے قائم کر رکھا ہے۔ جاسخبر: اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی دلیل ہے۔ لفظ خلق کی تشریح کل (گنہ شدہ) میں بیان کر دی تھی۔ کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ یعنی وہ ذات جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔ پھر فرمایا اَسْرِبْ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْمَرْصَدَ فَرَاثًا جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا۔ فرش۔ بستر۔ درمی چٹائی وغیرہ کو کہتے ہیں جس پر انسان آرام کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو فرش کے ساتھ اسی طرح تعبیر کیا ہے۔

جیسا پاڑوں کے متعلق فرمایا: **وَالْجِبَالُ أَوْتَادٌ** یعنی پہاڑوں کو کیل بنایا اور سورج کے متعلق آتا ہے: **وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا** سورج کو اللہ تعالیٰ نے چراغ بنایا۔

اہم البرجہ جصاص فرماتے ہیں: کہ اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں فرشتہ پر نہیں سوؤں گا۔ اور وہ زمین پر سو جائے۔ تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو بھی فرشتہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عرف عام میں فرشتہ پارہائی، درمی، قالین یا چٹائی کو کہتے ہیں۔ زمین کو نہیں کہتے۔ اس لیے قسم نہیں ٹوٹے گی۔

اسی طرح اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں چراغ کی روشنی میں نہیں بیٹھوں گا۔ یا نہیں پڑھوں گا اور وہ سورج کی روشنی میں بیٹھ کر پڑھے، تو بھی اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ حالانکہ سورج کو بھی اللہ تعالیٰ نے چراغ کہلایا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ عرف عام میں چراغ کا لفظ دیے بالائین پڑھنا جاتا ہے۔ سورج پر نہیں بولا جاتا۔ لہذا سورج کی روشنی میں اس کے لیے پڑھنا مباح ہوگا۔

ابو الحسین قدوری فرماتے ہیں: کہ اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔ مگر وہ پھلی کھائے، تو اس کی قسم قائم ہے گی۔ حالانکہ پھلی بھی گوشت ہی کی ایک قسم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے خود اسے **لَحْمًا حَرِیًّا** یعنی تازہ گوشت فرمایا ہے۔ یہاں بھی وہی اصول کارفرما ہے۔ عرف عام میں گوشت کا اطلاق گائے بھینس یا بھیڑ، بکری وغیرہ کے گوشت پر ہوتا ہے۔ پھلی پر نہیں ہوتا۔

قرآن پاک کی اولین دعوت اللہ **وَخُذْهُ لَاشْرِیْکَ** کی عبادت ہے۔ اس مسئلہ میں تمام آسمانی کتب متفق ہیں کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی کی جائے۔ قرآن پاک جس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم دیتا ہے۔ اسی طرح غیر اللہ کی عبادت سے منع بھی کرتا ہے۔ اس آیت میں فرمایا کہ اپنے رب کی عبادت کرو۔ تو عبادت کو ربوبیت پر مرتب فرمایا۔ گویا ربوبیت عبادت کی علت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت اسی لیے کرو کہ وہ رب ہے۔ اگلی آیت میں ربوبیت کی تشریح بیان کر دی گئی ہے کہ اس نے تم پر ایسے ایسے انعام کئے ہیں لہذا اس کی عبادت ضروری ہے۔ ربوبیت

کے سلسلہ میں سب سے پہلے صفت خلق کا ذکر ہے۔ اور پھر ظاہری، باطنی، علمی، اور عملی ہر قسم کے انعام کا بیان ہے۔ اس ضمن میں قرآن پاک بھی ایک بہت بڑا انعام ہے۔ اس کے چار عمدہ مضامین یعنی توحید، رسالت، قرآن کی حقانیت اور معاد کا ذکر ہو چکا ہے۔

عبادت کے وقت صرف
ذات باری تعالیٰ ہے

فرمایا اُس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا۔ جب انسان اپنے باپے میں خود کرتے گا تو اُسے معلوم ہو گا کہ پہلے وہ موجود نہیں تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُسے پیدا کیا۔ نہ صرف اُسے بلکہ اُس کے آباؤ اجداد کو بھی پیدا فرمایا "وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ" تم سے پہلے تمام لوگوں کا خالق ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ خالق وہ ہے باقی سب مخلوق ہیں۔ عاجز اور محتاج ہیں۔ انسان اس قدر بے بس ہے کہ اُس کے جسم کی کھال کا کوئی حصہ اتر جائے تو ساری مخلوق مل کر بھی اُسے وہ کھال مہیا نہیں کر سکتی۔ اس سلسلے میں نہ جنات کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ فرشتے۔ نہ نیک انسان کسی کام آسکتے ہیں۔ اور نہ بد انسان یا کسی دوسری مخلوق میں کوئی بھی عبادت کا ستم نہیں۔ مگر یا کسی چیز میں ایسی صلاحیت موجود نہیں جسکی بنا پر اس کی عبادت کی جائے۔ لہذا عبادت صرف اسی ذات اقدس کی ہو سکتی ہے۔ جو واجب الوجود ہے۔ یعنی جس کا وجود خود بخود ہے جو خالق۔ رب، علیم کل، قادر مطلق، مختار کل اور نفع و نقصان کا مالک ہے۔ جو ازلی و ابدی ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ باقی ہر چیز حادث اور فانی ہے۔ "كُلُّ شَيْءٍ هَكَالَآءِ اِلَّا وَجْهَهُ" ہر چیز بافعل بطلک ہے۔ یا فنا ہو جائے گی۔ دوام اور بقا صرف اس ذات اقدس کے لیے ہے۔ جو محسن اور منعم ہے۔ جو سمیع و بصیر ہے لہذا عبادت بھی اسی کی ہو سکتی ہے۔

فرمایا عبادت کرنے کا فائدہ یہ ہو گا "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" تاکہ تم خدا کی پکڑ اور اس کے عذاب سے بچ جاؤ۔ تقویٰ بچاؤ کو کہتے ہیں کہ اگر اس کی عبادت کرتے رہو گے تو بچ جاؤ گے ورنہ اس کی گرفت میں آ جاؤ گے۔ عبادت الہی کو لازم پکڑ دے گا تو دنیا میں بُرائی سے بچ جاؤ گے۔ اور آخرت میں عذاب سے محفوظ رہو گے۔

زمین کے فوائد

الَّذِينَ جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ ضَرْأًا وہی قادر مطلق اور مہربان خدا تعالیٰ جس نے زمین کو تمہارے لیے فرش کے طور پر بنایا۔ ایسا فرش جو زچتر کی طرح سخت ہے اور نہ پانی کی طرح بالکل نرم یہ ہوا کی طرح لطیف بھی نہیں بلکہ بالطبع اس کو خشک بنایا۔ تاکہ یہ

دوسری چیزوں کے ساتھ مل کر سفید مرکب بن سکے۔ اور لوگوں کے کاروبار ٹھیک طور پر چل سکیں۔
 اس زمین میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی بے شمار نشانیاں ودیعت کی ہیں۔ کرۂ ارض کے مختلف
 حصوں کی زمین مختلف ہے۔ یہ بھی ایک نعمت خداوندی ہے "وَفِي الْأَرْضِ قِطْعٌ مُّتَعَادِلٌ" زمین
 کے ٹکڑے الگ الگ ہیں۔ رنگت کے اعتبار سے کوئی حصہ سفید ہے۔ اور کوئی حصہ سیاہ ہے۔
 "وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيَضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُمْ" کہیں سرخ گھاٹیاں
 ہیں اور کہیں سیاہ پتھر ہیں۔ وضع قطع میں واضح اختلافات ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے زمین میں روئیدگی کی صلاحیت بھی رکھی ہے۔ قرآن پاک میں دوسری جگہ آتا
 ہے "وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدَاجِ" قسم ہے زمین کی جو بھٹ کر پودے اور نباتات کو باہر
 نکالتی ہے پانی کو اپنے اندر مہذب کر کے محفوظ رکھتی ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی
 اتارتا ہے۔ اور دو سر مقام پر فرمایا "فَسَلَّكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ" پھر اس کو زمین میں
 نالیوں اور چشموں کی شکل میں چلاتا ہے۔ ضرورت کے وقت چشمے یا نہریں جاری ہو جاتی ہیں۔
 یا کنویں کھود کر پانی حاصل کیا جاتا ہے۔ جس سے انسان، جانور اور کھیتیاں یکساں طور پر مستفید ہوتے
 ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے زمین میں کرم و سخاوت کا وہ مادہ رکھا ہے۔ کہ اس میں ایک دانہ پھینکو۔
 یہ سٹودانے لڑائے گی۔ اس پر خود قرآن شاہد ہے۔

زمین میں انسان ہر روز موت و حیات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک جگہ فرمایا "وَإِنَّا
 لَهُمُ الْأَرْضُ مِنَ الْمَيِّتَةِ" اَحْيَيْتُهَا دیکھتے نہیں کہ زمین بالکل مردہ یعنی خشک
 ہوتی ہے۔ پھر اس کو ہم زندہ کر دیتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ لوگ ہر موسم میں کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ
 کی قدرت اور قیامت کا نقشہ انسان کی نگاہ میں ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے زمین
 میں مختلف قسم کے جانور پھیل دیئے "وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ" جنہیں انسان شمار
 تک نہیں کر سکتا۔ پھر دیکھو! اللہ تعالیٰ نے زمین کے مختلف طبقات میں مختلف قسم کے پتھر رکھ
 دیئے ہیں بڑے بڑے قیمتی اور معمولی سے معمولی ہر قسم کے پتھر انسانی ضروریات کے لیے موجود ہیں۔
 زمین کی افادیت کے متعلق مزید فرمایا "خَلَقَ لَكُمْ مَتَّافِي الْأَرْضِ جَمِيعًا"
 اے انسانو! تمہارے ہی فائدے کے لیے زمین کی ساری چیزوں کو پیدا کیا۔ ذرا غور کرو۔ پتھروں

میں عقیق اور یا قوت بھی ہے۔ اور زمرہ اور ہیرا بھی۔ نفیس مرمر اور سنگ خارا بھی ہے۔ بٹک مرغ بھی ہے اور ساق بھی ہے۔ پھر یہ کہ زمین میں اللہ تعالیٰ نے وسیع کانیں رکھ دی ہیں۔ کہیں سونے کی کان ہے۔ اور کہیں چاندی کی کہیں سے تانبا نکل رہا ہے۔ اور کہیں سے لوہا کہیں سے پٹرول برآمد ہو رہا ہے۔ اور کہیں سے کسی اور تیل کے چٹنے اُبل رہے ہیں۔ صنعت معرفت کا سارا درود مرا نہیں کانوں پر ہے۔ اگر زمین یہ چیزیں میاں کرے۔ تو تمام کارخانے بند ہو جائیں اور پوری دنیا افراق فری کا شکار ہو جائے۔

یہ بڑے بڑے پہاڑ اور سلسلہ ہائے کوہا زمین پر ہی قائم ہیں۔ جن کے ساتھ انسان کے بے شمار فوائد وابستہ ہیں۔ سورۃ حجر میں فرمایا، اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو اس لیے پیدا کیا تاکہ تمہاری زمین کا توازن قائم رہے۔ اور یہ مضطرب نہ ہونے پائے۔

فرمایا اُس رب کی عبادت کرو جس نے آسمان کو چھت بنایا وَالسَّمَاءَ بَنَّا بِمَاءٍ یَّسْرِیہ بھی خدا تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ دیکھو! روشنی کے لیے مہتاب اور آفتاب کو آسمان میں ہی رکھا ہے۔ اس میں ستارے اور سیارے بھی ٹکائے ہیں۔ قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے اعمال کے صعود کی جگہ آسمان ہے۔ اور ادھر سے نزول وحی کا مقام بھی آسمان ہے فرمایا وہی رب وَإِنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً جس نے آسمان سے پانی اتارا اور جس کے نتیجے میں فَنَآخُذُجْ بِمِنْ السَّمَرَاتِ بِذِقَاتِهَا یعنی پانی کے ذریعے زمین سے پھلوں کو نکالا جو تمہارے لیے روزی کا سامان ہیں۔ اگر آسمان سے پانی نازل نہ ہو۔ تو کھیتی باڑی نہ ہو سکے۔ درخت سوکھ جائیں۔ اور نہ کوئی فصل پیدا ہو اور نہ کوئی پھل۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اُسی رب کی عبادت کرو جس نے پانی اتار کر یہ تمام نعمتیں تمہارے استفادہ کے لیے پیدا فرمائیں۔

آسمان اور پانی
کی نعمت

یہ سب نعمتیں ذکر کرنے کے بعد فرمایا فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اُشْدًا جب یہ تمام انعامات اللہ تعالیٰ نے عطا کیے ہیں۔ تو پھر اُس کے لیے بُد نہ ٹھہراؤ، اس کا شریک نہ بناؤ۔ نہ کاغظی معنی ہے۔ مثل المساویٰ مگر اصطلاحاً نہ اس کو کہتے ہیں۔ جو ذات اور جوہر میں شریک ہو۔ جبریر کا شعر ہے۔

لفظ نہ کا معنی

اَتَيْنَا تَجْعَلُونَ اِلٰى يَنْدُ وَهَلْ تَيْمٌ لِّذِي حَبِ نَبِيْدُ
 تم نبی تیم کو میرا شریک بناتے ہو، حالانکہ بنی تیم تو کسی شریف آدمی کے شریک نہیں بن سکتے
 وہ تو کھینے آدمی ہیں۔

ایک مذہب ہے اور ایک شہیرہ ہے۔ شہیرہ یا مشاہیر اُس چیز کو کہتے ہیں۔ جو کیفیت میں
 برابر ہو جیسے گرمی، سردی، بھتی، زمی وغیرہ۔ اسی طرح جو چیز طول، عرض اور عمق میں برابر ہو۔
 اُسے مشکل کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا اللہ تعالیٰ کے لیے شریک مت ٹھراؤ، کیونکہ خدا تعالیٰ
 کے سوا واجب الوجود کوئی نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی عظیم کل اور قادر مطلق نہیں۔ یہ ایسی صفات ہیں
 جن میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔ مگر تم جہالت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا نہ ٹھراتے ہو۔
 آج دنیا میں خدا تعالیٰ کے مقابل اور شریک ٹھرانے والے بی شمار مجوسی موجود ہیں۔ شنی
 مذہب والے دو خدا مانتے ہیں۔ ایک نیچی کا در سر بہی کا۔ ایک کا نام یزدان رکھا ہے۔ اور
 دوسرے کا نام اہرمین۔ اُن کے نزدیک ایک شر کا خدا ہے۔ اور دوسرا خیر کا۔ نور کا خدا ہے
 اور ظلمات کا اور ہے۔ حالانکہ سورۃ انعام میں پڑھیں گے: حَبَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّوْرِ
 یعنی ظلمت اور نور اُسی وعدہ لا شریک لہ کے پیدا کردہ ہیں۔ اس میں کوئی اس کا شریک نہیں
 اور یہ وہی ذات ہے جس نے خود نہیں بھی پیدا کیا ہے۔

بعض لوگ ستاروں میں مستقل تاثیر کے قائل ہیں۔ ایسے لوگ نیک بختی اور بد بختی اور ترقی و
 تنزل کو ستاروں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ صابی فرقہ کے لوگ ہیں۔ جو ستاروں کو اللہ تعالیٰ
 کا نہ ٹھراتے ہیں۔

بعض لوگ اصحابِ قسور سے حاجتیں طلب کرتے ہیں۔ اور اس طریقے سے خدا کا نہ
 ٹھراتے ہیں۔ بعض لوگ پیروں کو ہر حالت میں مستجاب الدعوات سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ
 خدا چاہے راضی ہو یا ناراض پیر ہر حالت میں سفارش کریں گے۔ آج کل پیر پرست لوگوں کا یہی عقیدہ
 ہے۔ کہ پیر کا دامن پکڑ لیا ہے۔ بس پار ہو جائیں گے۔ کسی نیکی بھی کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ اس
 قسم کی سفارش کو قرآن پاک نے جبری سفارش سے تعبیر کیا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ وَلَا يَشْفَعُونَ
 اِلَّا لِمَنْ اَرَادَ اللّٰهُ تَعَالٰی كے ہاں کوئی جبری سفارش نہیں ہوگی۔ سفارش کی اجازت اُسے

ہوگی جس سے خدا تعالیٰ راضی ہوگا۔ اور جس کا عقیدہ خدا تعالیٰ کو پسند ہوگا۔ چونکہ کفر و شرک اللہ تعالیٰ کے ہاں مردود عقائد ہیں۔ لہذا کسی مشرک کی سفارش ممکن نہیں ہے۔ یہ نہ ٹھہرانے کی مختلف صورتیں ہیں۔

شرک فی اثبت بعض لوگ مشیت میں شرک کرتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے ایک شخص نے کہا مَا شَاءَ اللّٰهُ وَمَا شِئْتُ تَوَاقُّوْا اَجْعَلُ حَتّٰی لِلّٰهِ نِدَاً کیا تم نے مجھے خدا کے ساتھ شریک ٹھہرایا ہے۔ قُلْ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ کہو، جو صرف اللہ تعالیٰ چاہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے۔ وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ تم اس وقت تک نہیں چاہ سکتے، جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے۔ البتہ بعض روایات میں یوں آیا ہے کہ کہو مَا شَاءَ اللّٰهُ تَوَاقُّوْا چاہے۔ اس کے بعد جو تمہارا ارادہ ہے اس کے مطابق عمل کرو، شرک سے بچ جاؤ گے۔

شرک فی العادۃ شاہ اسماعیل شیعہ اور دوسرے علمائے کرام فرماتے ہیں کہ شرک عبادت میں بھی ہوتا ہے۔ اور عادت میں بھی ہوتا ہے۔ شرک فی العادۃ کی مثال زنا کا دھاگا ہے۔ جو بندہ ناجوسی اپنے جسم کے ساتھ باندھتے ہیں۔ عیسائی صلیب باندھتے ہیں۔ یہ بھی شرک فی العادۃ ہے۔ حضور علیہ السلام نے صلیب کو کفر کی نشانی بتایا ہے۔ اسی لیے فرمایا اَطْرَحُ عَنْكَ هَذَا الْوُثْنُ اُسے اتار دو، یہ بُت ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب مسیح علیہ السلام دوبارہ تشریف لائیں گے تو صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے۔ صلیب کی شکستگی اس لیے ہوگی کہ یہ کفر کی نشانی ہے۔ اور وہ بھی نبی کے نام پر۔ اور خنزیر کو قتل کریں گے۔ کہ عیسائیوں نے اُسے بکری کی طرح حلال قرار دے لیا ہے۔ حالانکہ یہ کسی نبی کی شریعت میں حلال نہیں ٹھہرا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جتنے پیغمبر آئے ہیں۔ سب کی شریعتوں میں خنزیر حرام ہی رہا ہے۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر ص ۵۴، اور منثور ص ۳۵، ۲۔ تقویۃ الایمان ص ۹۱، ۳۔ ترمذی ص ۴۴

۴۔ بخاری ص ۴۹، ۵۔ حجتہ اللہ البالغہ ص ۱۸

بعض لوگ نیچے کے سر پر چوٹی رکھ کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ چوٹی فلاں بزرگ یا فلاں خواجہ کی رکھی ہے۔ اگر یہ چوٹی نہ رکھتے تو کچھ مر جانا۔ یہ صریح اور جلی شرک ہے۔ بعض لوگ محوسیوں کے نوروز یا عیسائیوں کے بڑے دن کی تعظیم بجا کر شرک کرتے ہیں۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ ایسے مواقع پر جو تحفہ میں پھول، بار، ڈالی یا کوئی اور بہرہ پیش کریں اور تعظیم کریں تو شرک میں مبتلا ہو جائے گا۔ بعض مشائخ نے کفر تک کا فتویٰ لگایا ہے۔

کچھ لوگوں کے اندر مذہب بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ غیر اللہ کے تقرب کے لیے مذہب و نیاز دیتے ہیں۔ ہم ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں کہ قبروں اور زیارتوں پر کس کس طرح اور کس کس نام کے عرس منعقد ہو رہے ہیں۔ یہ سب بدعت اور بعض شکلوں میں شرک ہے۔ بعض لوگ غیر اللہ کی قسم اٹھا کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور کچھ غیر اللہ کے نام پر نیچے کا نام رکھ کر شرک کرتے ہیں۔ جیسے عبدالمصطفیٰ، حالانکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ عبد اللہ یا عبد الرحمن وغیرہ نام رکھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی جائے۔

بعض لوگ استعانت طلب کر لے میں شرک کرتے ہیں معنی غائبانہ طور پر مافوق الاسباب قبروں والے بندگوں اور اولیاء سے مدد چاہتے ہیں۔ یہ سب شرک ہے ”وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ“ خدا تعالیٰ کی ذات ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ اُس سے مدد طلب کر دو۔ تم غائبوں کے آگے ہاتھ بھیلنا ہے ہو۔ جن کا کوئی اختیار نہیں۔ ان کو تو یہ بھی علم نہیں کہ تم کس تکلیف میں مبتلا ہو۔ چہ جائیکہ ان کے آگے دست سوال دراز کرو۔

بعض لوگ جانور ذبح کر کے وقت بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَکْبَرُ کے ساتھ کچھ اور اضافہ کر کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جیسے بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاسْمِ مُحَمَّدٍ بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاسْمِ فَلَانٍ یعنی فلاں بزرگ یا فلاں پیر کے نام پر۔ ایسی صورت میں جانور سرے سے مُردار ہو گیا۔ فقہائے کرام نے اسے بسم اللہ میں شرک قرار دیا ہے۔

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو شیگوں لے کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں حضور علیہ السلام

لے فرمایا اَلطَّيْرَةُ شُرَكَاءُ شُكُونِ يَنَا شُرَكَاءُ کی بات ہے۔ بعض لوگ غیب کی خبریں معلوم کرنے کی وجہ سے شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کابن، سناسی، نجومی، دست شناس یا جادو کے پاس جا کر پوچھتے ہیں۔ اور ایمان کو ضائع کر لیتے ہیں۔ اس قسم کی خبروں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اپنی جیب سے پیسے دیکھ کر شرک خریدنے کے مترادف ہے۔

بعض لوگ تعویذ گنڈے کی شکل میں شرک کرتے ہیں۔ تعویذ گنڈے کرنے والے اکثر غلط کار لوگ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے کلام یا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق پڑھ کر دم کرے یا کچھ کرے، تو جائز ہے۔ وگرنہ یہ لوگ ٹوٹے جن کے ساتھ طرح طرح کی شرائط وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ سب شرکیہ یا بدعت اور معصیت کی باتیں ہیں۔

بعض لوگ غیر اللہ کو غائبانہ طور پر پکار کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جیسے یا شیخ عبد القادر جیلانی شکیث اللہ یہ مذاکا شرک ہے۔ اور پھر ان سے حاجتیں بھی طلب کرتے ہیں۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید تقویۃ الایمان میں لکھتے ہیں کہ دیکھو! ایسے لوگ کتنی غلط بات کرتے ہیں کہ بندے کو اصل ٹھہرا دیا۔ اور خدا تعالیٰ کو واسطہ بنا دیا۔ اگر اس کا الٹ کر دیتا تو درست تھا یعنی یا اللہ شکیثاً للشیخ عبد القادر جیلانی۔ اے مولا کریم! شیخ عبد القادر جیلانی کے واسطے اور ان کے طفیل سے میرا یہ کام کر دے۔ مگر اس شخص نے شیخ عبد القادر جیلانی کو مستحق بنا کر اللہ تعالیٰ کو واسطہ کے طور پر پیش کیا۔ اور اس کے ساتھ توہین کا بھی مرتکب ہوا۔ غیر سے امداد طلب کر کے کفر میں مبتلا ہوا۔

شرک جلی کے بعد شرک خفی کا ذکر بھی ہو جائے۔ شرک خفی ریا

شرک خفی

میں پایا جاتا ہے۔ یا بعض دوسری اعتقادی صورتوں میں ہوتا ہے۔ چونکہ اس قسم کا شرک خفیف ہوتا ہے۔ اس لیے اس سے بچنے کے لیے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ امام ابن کثیرؒ اور امام رازنیؒ نے اس کی مثال دی ہے کہ بعض وَاللّٰهِ وَحَيَاتِكَ اللّٰہ کی قسم اور تیری زندگی کی قسم یا میری زندگی کی قسم یا بعض لوگ اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ اگر رات کو یہ کتا نہ ہوتا تو ہم لٹ جاتے۔ یہ بطعن

مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ خَالِقِ كِ مَعْصِيَتِ كَرْتِ هَوْنِ، اس كِ نافرمانى كرتے هونے۔ مَخْلُوقِ كِ اطاعت
 ندها نهنى هے۔ اىسا كرنا شرك كے مترادف هے۔ ان كِ اطاعت مطلق نهنى هے۔ بلكه بنى كِ
 اطاعت مطلق هے۔ كيونكه بنى اهنى جانب سے حكم نهنى ديتا۔ بلكه وه مبنجاب اللہ هوتا هے۔ باقى
 لوگ چونكه اهنى طرف سے حكم ديتے هين، سى ليے ان كے حكم كو جانچنا هوكا۔ صحيح حكم كِ اطاعت
 هوكى۔ اور خلاف شرع غلط بات كو ٹھكرا ديا جائے كا۔

اسى ليے فرمايا فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُونَ اللہ تعالى كے
 ليے بَدَنَ مُطَهَّرًا۔ اور تم جانته هوكه خدا تعالى كے سوا كوئى مستحق عبادت نهنى۔ كوئى نافع اور ضد
 نهنى۔ كوئى خالق اور قاهر مطلق نهنى۔ جب يه تمام صفات اللہ تعالى كى هين۔ تو پھر اس كى عبادت
 اور اس كى صفات ميں غيروں كو كيوں شريك منته هوكه توحيد قرآن پاك كا بنيادى مسله هے۔
 اللہ تعالى نے ان دو آيتوں ميں يه مسله سمجھا ديا هے۔ اس كے بعد دوسرے مضامين هوں گے۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ
 مِّمَّنْ مِثْلِهِ ۚ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِمَّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ
 صَادِقِينَ ﴿٢٢﴾ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَأْزَنُوا
 النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ
 ﴿٢٣﴾ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ
 جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ
 ثَمَرَةٍ رِزْقًا قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ
 مُتَشَابِهًا وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا
 خَالِدُونَ ﴿٢٤﴾

ترجمہ: اور اگر تم اس چیز سے شک میں ہو جس کو ہم نے نازل کیا ہے پتہ بندے
 (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر پس لاؤ تم ایک سورۃ اس کے مانند اور بلاؤ اپنے
 مددگاروں کو اللہ تعالیٰ کے سوا اگر تم سچے ہو ﴿۲۲﴾ پھر اگر تم نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر
 سکو گے پس پچو اس آگ سے جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے جو کفر کرنے والوں
 کے لیے تیار کی گئی ہے ﴿۲۳﴾ اور آپ خود بخبریٰ سنادیں ان لوگوں کو جو ایمان لائے
 اور جنہوں نے اچھے عمل کیے کہ بیشک ان کے لیے باغات ہیں جن کے سامنے
 نہریں بہتی ہیں جب بھی وہ ان بہتوں میں پھلوں سے روزی دیے جائیں گے
 تو کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے روزی دی گئی اور وہ اس
 میں دیے جائیں گے ایک درخت کے مشابہ پھل اور ان کے لیے ان بہتوں
 میں پاکیزہ عیویاں ہوں گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ﴿۲۴﴾

سورۃ کے ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کا جواب

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِیْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ . پیر انسانوں کے قین گردہ بیان فرماتے . پہلا مومنین . متقین کا گردہ . اور اس کے اوصاف بیان فرماتے . اس کے بعد دوسرے گردہ کفار کا ذکر کیا جو ظاہراً اور باطناً اللہ تعالیٰ کی توحید اس کے دین اور قیامت کے منکر ہیں اس کے بعد تیسرے آیات میں منافقین کا حال ذکر کیا . جو سب سے زیادہ خطرناک گردہ ہے ان کی علامات کارنامے اور ان کی ذہنیت کا بیان ہوا . اس کے بعد مشاؤون کے ذریعے ہر دو قسم کے منافقوں کی نشاندہی کی . جو کفر میں پختے ہو چکے ہیں یا پھر ابھی متردد ہیں . اور پھر ان کے بڑے انجام کا بھی ذکر فرمایا .

سورۃ بقرہ دوسو چھیالیس آیات کی سب سے لمبی سورۃ ہے . مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے مکی زندگی میں جس قدر سورتیں نازل ہوئیں اور ان میں جتنی تعلیم دی گئی . سب کا خلاصہ اس سورۃ میں آگیا ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت سے احکام اس میں آگئے ہیں . بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے نظام کو مکمل طور پر اس میں بیان فرمادیا ہے . چنانچہ سب سے پہلی بنیادی تعلیم جس پر تمام کتب آسمانی متفق ہیں اس کا حکم دیا کہ ”یٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ“ یعنی عبادت خالق اللہ تعالیٰ ہی کی کرنا . اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں . اس کے بعد معرفت الہی پر زور دیا کہ اللہ تعالیٰ کی پہچان ضروری ہے . اس کے بغیر عبادت بھی کسی کی کار آمد نہیں . مشرکین اور یہود و نصاریٰ اگرچہ خدا تعالیٰ کو مانتے تھے . مگر صحیح پہچانتے نہیں تھے . اسی لیے وہ ناکام ہوئے . فرمایا اللہ تعالیٰ کی پہچان اس کی ذات سے نہیں ہو سکتی . کیونکہ وہ انسانی عقل و فکر سے بلند ہے ، وہ ہر ایک کسی کی رسائی نہیں . اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جو عالم جبروت سے تعلق رکھتی ہیں . ان کا پہچانا بھی بڑا مشکل ہے . اللہ تعالیٰ کی صفت کی پہچان اس کی مخلوق اور اس کی مصنوعات میں غور کرنے سے ہوتی ہے . جب کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کو پہچان لیتا ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو بھی پہچان لیتا ہے . اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان صفات کا ذکر کیا ”رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ“ تمہارا رب وہ ہے . جس نے تمہیں پیدا کیا . اس کے سوا کوئی خالق ہے نہ قابل مطلق ہے اور نہ عظیم کل ہے . عبادت کے لائق وہی ذات ہے . جو ان صفات کی مالک ہے .

پھر اللہ تعالیٰ نے ربوبیت اور خالقیت کو بیان کیا . کہ دیکھو ! اللہ تعالیٰ نے کس طرح زمین کو تمہارے لیے بچھونا اور فرش بنا دیا . اور آسمان کو چھت کی مانند کھڑا کر دیا . آسمان سے پانی اتار کر پھلوں کے

ذریعے تمہاری روزی کا سامان مہیا کر دیا۔ لہذا عبادت صرف اسی کی کر دو۔ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ
اَنْدَادًا کسی چیز میں بھی خدا کا شریک نہ بناؤ۔ تم جانتے ہو کہ خدا کے سوا دوسرا کوئی کچھ بھی نہیں
کر سکتا۔ سائے محتج اور اس کی عاجز مخلوق میں، خواہ وہ انسان ہوں۔ جن ہوں یا فرشتے۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی ان آیات میں چار عمدہ مضامین کا ذکر کیا۔
یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کہ یہ بنیادی مسئلہ ہے۔ اس کے بعد رسالت ہے۔ کہ نبی پر ایمان لائے بغیر
اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کے اوامر اور نواہی کا علم نہیں ہو سکتا۔ بڑے بڑے یونانی علماء و محض
اس لیے گمراہ ہوئے کہ انہوں نے نبیوں کی اتباع کی ضرورت کو محسوس نہ کیا۔ وہ تو کہتے تھے کہ
یہ تو جاہل لوگوں کے لیے ضروری ہے۔ ہم تو بڑے عقلمند ہیں۔ تیسرا مضمون خود قرآن پاک کی
صداقت ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ اور چوتھا مضمون قیامت
پر ایمان ہے۔ نیک و بد اعمال کی جزا و سزا قیامت پر منحصر ہے۔ لہذا اس پر بھی ایمان لانا ضروری ہے

ان حالات میں قرآن پاک اور پیغمبر علیہ السلام کا اٹھا تذکرہ فرمایا ہے وَ اِنْ كُنْتُمْ
فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا اگر تمہیں اس چیز کے بارے میں شک ہے۔ جو ہم
نے اپنے بندے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے۔ کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے۔
گویا اس کلام الہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے نبی کی نبوت کی تصدیق مطلوب ہے۔ نبی دعویٰ کرتا
ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا فرستادہ ہوں۔ تو اس کی تصدیق کے لیے کسی معجزہ کا ہونا ضروری ہے۔
احادیث میں حضور علیہ السلام کے تین ہزار سے زیادہ معجزات کا ذکر آتا ہے۔ مگر قرآن پاک حضور
علیہ السلام کا خصوصی معجزہ ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو کوئی نہ کوئی خصوصی معجزہ عطا
فرمایا ہے۔ پھر جس کی قسمت میں عطا رہا وہ ایمان لے آیا۔ فرمایا میرا خصوصی معجزہ وحی الہی ہے۔ جس
کے ذریعے قرآن پاک جیسا بی مثال معجزہ عطا ہوا۔ اسی لیے آپ نے ارشاد فرمایا اَرْجُوا اَنْ اَكُوْنَ
اَكْثَرُهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ یعنی مجھے امید ہے کہ قیامت کے روز سب سے زیادہ
پیروکار میرے ہوں گے۔ کیونکہ میرا خصوصی معجزہ پایدار اور دائمی ہے باقی پیغمبروں کے معجزات عارضی تھے

قرآن پاک
خاص معجزہ ہے

جو وقت کے ساتھ ختم ہو گئے۔ مگر میرا معجزہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا لافنی کا معجزہ حضرت صلح علیہ السلام کی اونٹنی کا معجزہ عارضی معجزات تھے۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ختم ہو گئے مگر حضور علیہ السلام کا معجزہ ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔

عبد با عزت
لفظ ہے

اس آیت میں حضور علیہ السلام کے لیے عبد کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو کہ بڑا با عزت لفظ ہے۔ نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا کسی پیغمبر کی عبدیت کا اظہار اس کی بہت بڑی صفت ہے کیونکہ کامل درجے کی عبدیت انبیاء کرام علیہم السلام میں ہوتی ہے۔ اور پھر تمام نبیوں میں حضور علیہ السلام اکمل ترین بندے ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ قرب نصیب ہے۔ قرآن پاک میں جہاں بھی عبد کا لفظ آیا، وہاں پر خاص انعام کا ذکر ہے۔ جیسے سُبْحَنَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ دوسری جگہ فرمایا "نَزَّلَ الْفُرْقَانِ عَلَىٰ عَبْدِهِ" ایک اور جگہ ارشاد ہے "فَاَوْسَجْنَا إِلَىٰ عَبْدِهِ مَآ أَوْسَجْنَا" الغرض یہ عبد کا لفظ نہایت اعلیٰ مقام کا حامل ہے نماز میں جب تک کوئی اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ نہ کہے۔ اس کی نماز کامل ہی نہیں ہوتی۔ تمام انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں۔ نہ تو خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ نہ اوتار ہیں اور نہ خدا نے ان میں طویل کیا ہے۔ زمان میں الوہیت کی صفت پائی جاتی ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے اس کے عبد یعنی بندے ہیں۔ معبود صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

بعض لوگ جہالت کی وجہ سے غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ انبیاء علیہم السلام بشر یا انسان نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان ہونا فخر کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنِّیْ خَلَقْتُ الْاِنْسَانَ مِنْ طِیْنٍ میں تو مٹی سے انسان جیسی برگزیدہ کشتی کو پیدا کرنے والا ہوں۔ بشر ہونا کوئی بے عزتی کی بات نہیں ہے۔ خاص طور پر عبدیت تو بہت اعلیٰ صفت ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ عطا کرے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اندر تو عبدیت والی بات ہی نہیں پائی جاتی۔ ہماری عبدیت کی حالت خراب ہے۔ ہم گندے انسان ہیں۔ جو گناہوں سے آلودہ ہیں۔ جنہیں عبدیت کا مقام حاصل ہے وہ تو پاکیزہ نفوس ہیں جو ہر وقت خدا تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت میں مشغول رہتے ہیں۔

قرآن پاک
بطور چینیج

خود قرآن پاک اس بات کا گواہ ہے کہ مشرکین اسے خدا تعالیٰ کا کلام ماننے کے لیے

تیار نہ تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خیال کے رد کے طور پر قرآن پاک میں تین قسم کی آیات نازل فرمائیں۔ اولاً سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد فرمایا کہ یہ قرآن پاک کسی انسان کا وضع کردہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ انسان کے بس کی بات ہے۔ بلکہ لَہِیْنِ اجْتَمَعَتْ اِلَٰہُہٗ وَ الْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِہٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُہُمْ لِبَعْضٍ ظَہِیْرًا یعنی تمام انسان اور تمام جن مل کر بھی اس قرآن پاک کی مثل لانا چاہیں تو نہیں لائے۔ اگرچہ یہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔ گویا یہ ساری مخلوق عاجز ہے۔ اس بات سے کہ قرآن پاک جیسا کوئی کلام پیش کر سکیں۔ دوسری جگہ فرمایا کہ اگر تمہیں اس کلام پاک کے منجانبہ ہونے میں کسی قسم کا شک ہے یعنی یہ کہ یہ انسانی کلام ہے تو فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوْرٍ مِّثْلِہٖ تو اس جیسی دس سورتیں ہی بنا کر لے آؤ خواہ چھوٹی چھوٹی ہی ہوں۔ پتا چل جائے گا کہ واقعی یہ خدا تعالیٰ کا کلام نہیں ہے۔ بلکہ کوئی انسان بھی ایسی چیز پیش کر سکتا ہے۔ مگر کوئی بھی اس چیلنج کا جواب نہ دے سکا۔ اب تیسرے نمبر پر آیت پاک میں آخری چیلنج دیا جا رہا ہے۔ کہ اگر تم کو اس کلام پاک میں شک ہے۔ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِہٖؕ تو اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لے آؤ چاہے وہ تین آیات کی چھوٹی سورۃ ہی کیوں نہ ہو۔

امام ابو بکر جصاصؒ چوتھی صدی ہجری میں ہوئے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کے اس چیلنج کو صدیاں گزر جانے کے باوجود کسی نے اس کا جواب دینے کی جرأت نہیں کی۔ اور اگر مسلمہ کذاب جیسے کسی شخص نے حماقت کی تو اسے منہ کی کھانی پڑی۔ اس کے ہم عصر کافروں نے اس کے منہ پر ہتھوک دیا تھا۔ کہ تم پر لعنت ہو۔ کیا تمہارا وضع کردہ کلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو نیا لے کلام کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ قرآن پاک کا یہ اعجاز چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود قائم و دائم ہے۔ اور آج تک کوئی ایک سورۃ بھی بنا کر پیش نہیں کر سکا۔

عام مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ چیلنج قرآن پاک کی نصاحت و بلاغت کے لحاظ

سے ہے۔ اہم البوجہ جصاص بھی انہیں مفسرین میں شامل ہیں۔ جو فرماتے ہیں کہ قرآن پاک ایسا فصیح و بلیغ کلام ہے کہ اس جیسی فصاحت و بلاغت آج تک کوئی دوسرا کلام پیش نہیں کر سکا۔ مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ چیلنج فصاحت و بلاغت تک ہی محدود ہے تو پھر یہ خطہ عرب تک ہی محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ جہاں عربی زبان بولی جاتی ہے۔ کیونکہ قرآن پاک عربی زبان میں نازل ہوا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ چیلنج صرف عربوں کے لیے نہیں بلکہ تمام اقوام عالم کے لیے ہے۔ اگر اس چیلنج کو بین الاقوامی چیلنج تسلیم کیا جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ فصاحت و بلاغت کے علاوہ نہ کوئی دوسرا کلام اس جیسا ہے نہ اس میں دیے ہوئے نظام جیسا کوئی نظام دیا جاسکتا ہے۔ اور نہ ہی اس جیسا کوئی دوسرا دستور پیش کیا جاسکتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ماحول جیسی اجتماعیت کوئی دوسرا قانون پیش نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ سابقہ کتب آسمانی اور صحیفے بھی ایسا اجتماعی نظام نہیں دے سکتے۔ جیسا قرآن پاک نے عطا کیا۔ اسی لیے فرمایا کوئی ایک سورۃ لا کر دکھاؤ۔ جو قرآن جیسی جامعیت پیدا کر سکے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی برصغیر کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ صرف سوڑہ سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے صراطِ ستقیم کی طرف راہنمائی فرمائی۔ اور آپ کچھ مدت چھوڑ کر اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے والد محترم شیخ حبیب اللہ حضرت سندھیؒ کے دوست تھے اور آپ کے ساتھ ہی اسلام لائے۔ رشتے کے لحاظ سے حضرت مولانا سندھیؒ حضرت مولانا لاہوریؒ کے خسر تھے۔ تو مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ دنیا بھر کی اقوام اگر انصاف کی نظر سے دیکھیں تو ان پر واضح ہو جائے گا کہ جو پروگرام اور نظام عدل اسلام اور قرآن پاک نے پیش کیا ہے۔ دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔ خواہ وہ ہندو ہوں یا عیسائی یا یہودی۔ انہیں حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ اسلام جیسا اعلیٰ مضبوط اور غیر تغیر پذیر قانون کہیں سے نہیں مل سکا۔ اہم شافعی فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کی چھٹی سی سورۃ ”وَالْعَصْرُ“ اتنی جامع سورۃ ہے کہ ساری کائنات کی ہدایت کے لیے یہی کافی ہے۔ بشرطیکہ بنی نوع انسان اس

پر غور و فکر کر کے اس سے رہنمائی طلب کریں۔

الغرض! فرمایا اگر ہمارے نازل کردہ کلام میں تمہیں کوئی شک ہے تو اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لاؤ۔ صرف یہی نہیں بلکہ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِمَّنْ دُونِ اللَّهِ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ اور اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ کے علاوہ اپنے گواہ بھی بلاؤ۔ یعنی خود بھی آجاؤ اور اپنے دیگر مددگار اور حمایتی بھی بلاؤ۔ مگر تم اس کلام جیسی ایک سورۃ بھی پیش نہیں کر سکو گے۔ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام نہیں ہے تو اس چیلنج کو قبول کرو۔ یہ قرآن پاک عربی زبان میں ہے۔ یہ تمہاری مادری زبان ہے۔ حضور علیہ السلام نے اسی تمہارے ماحول سے عربی زبان سیکھی ہے۔ آپ مکے میں رہے ہیں۔ یاد یا رہی بخیریں۔ یہ اسی علاقے کی زبان ہے اگر حضور علیہ السلام خود کلام بنا سکتے ہیں۔ تو پھر تم بھی کوئی سورۃ بنا کر دکھاؤ۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں عربی زبان اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ اس انتہا پر پہنچنے کے بعد تنزل کی ہی توقع کی جاسکتی ہے۔ مگر کسی شاعر نے قرآن پاک کی مثل لانے کی جرأت نہیں کی۔ جو بھی قرآن پاک کی کوئی آیت سننا تھا۔ دم بخود رہ جاتا تھا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کے بھائی حضرت امیرؓ کہتے تھے کہ میں شاعروں کا کلام بھی جانتا ہوں اور ساعروں کا بھی۔ اور کامیوں کا بھی۔ میں نے کلام النبیؐ کا ان سب کلاموں کے ساتھ موازنہ کیا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی قرآن پاک کا مقابل نہیں۔ خدا کا کلام تمام کلاموں سے منفرد اور ممتاز ہے۔

منکرین قرآن
کی سزا

قرآن پاک نے چیلنج پیش کرنے کے بعد پھر خود ہی اس کا جواب دیا فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا پس اگر تم نہ کر سکو اور تم نہ کر سکو گے۔ گویا پیشگوئی بھی کر دی کہ تم اس کلام کی مثل ہرگز پیش نہیں کر سکو گے۔ تو پھر خبردار فرمایا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُكِدَتْ لِلنَّاسِ آگ سے بچو۔ اور وہاں اللہ تعالیٰ نے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ گویا دوزخ کی آگ میں اس کلام کے مکذبین خود کفار جلیں گے۔ اور پتھر جلانے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوئلے سے جلانی گئی آگ سخت ہوتی ہے۔ اسی طرح پتھر سے جلنے والی آگ شدید تر

ہوگی۔ یا پھر سے مراد وہ پتھر کے بُت ہیں جن کی پروا کی جاتی تھی۔ وہ بھی دوزخ کی آگ میں جلائے جائیں گے۔ فرمایا یہ ایسی آگ ہے اُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ جو کفار کے لیے تیار کی گئی ہے۔ کفار لوگ اسی آگ کا ایندھن بنیں گے۔

ایمانداروں کے
لیے بشارت

اس مقام پر بھی اللہ تعالیٰ نے تہ سب و ترغیب کو ساتھ ساتھ بیان فرمایا ہے۔ کفار کا انجام کا انجام بیان کرنے کے بعد ایمانداروں کے لیے بشارت سنائی زَكَّيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ آپ ان لوگوں کو خوشخبری سنادیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کی رسالت پر ایمان وئے۔ کلام الہی کو سچا کلام تسلیم کیا۔ قیامت کو برحق جانا اور پھر اس کے ساتھ ثنائت کام بھی انجام دیے یعنی نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ جیسے فرائض پورے کئے۔ صدقہ و خیرات کیا۔ حلال و حرام میں امتیاز روا رکھا۔ کہ اِنَّ لَهُمْ جَنَّتٍ عَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔

پھلوں میں
مشابہت

فَرَايَا كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا حَبَّ وہ ان بشتوں میں پھلوں سے روزی دیے جائیں گے قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ تو کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے دی گئی وَاَتُوا بِهَا مُتَشَابِهًا اور وہ اس میں دیے جائیں گے ایک دوسرے کے مشابہ پھل مقصد یہ کہ ایک دفعہ جنتیوں کو پھل پیش کیے جانے کے بعد جب دوسری دفعہ ان سے ملے جلتے پھل دیے جائیں گے، تو جنتی لوگ کہیں گے کہ یہ وہی پھل ہیں جو ہمیں اس سے پہلے دے گئے تھے۔ مگر جب وہ انہیں کھائیں گے۔ تو ان کا ذائقہ پہلے پھلوں سے بالکل مختلف ہو گا۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ جنت کے پھل دنیا کے پھلوں سے مشابہ ہوں گے اور جنتی انہیں دیکھ کر دنیا کے پھلوں پر قیاس کریں گے مگر ان دونوں قسم کے پھلوں میں ذائقے کے اعتبار سے بڑا تفاوت ہو گا۔

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ پھلوں میں مشابہت کی ایک اور توجیہ یہ ہے کہ فطرت سلیمہ رکھنے والے اس دنیا میں جب یہی اور اطاعت کے کام کرتے تھے

تو انہیں لذت محسوس ہوتی تھی۔ اس کے نتیجے میں جب بہشت میں انہیں پھسل دیے جائیں گے تو وہ لوگ کہیں گے کہ ان میں وہی لذت پائی جاتی ہے۔ جو دنیا میں نیکی کرتے وقت حاصل ہوتی تھی۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ جنت کی زمین خالی ہے سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَوْلَا إِذًا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ کہنا اس خالی زمین میں درخت لگانے کے مترادف ہے۔ جب کوئی مومن دل کی گمراہیوں سے الگ ہو کر اللہ کے لئے ایک درخت لگا دیا جاتا ہے۔ جب اس درخت کا پھل انہیں میسر ہوگا۔ تو وہ کہیں گے کہ اس کا ذائقہ تو بالکل وہی ہے جیسا ذائقہ ہمیں دنیا میں نیکی کی توفیق پر حاصل ہوتا تھا۔ اسی نیکی کے صلے میں آج ہمیں جنت میں یہ نعمتیں حاصل ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا میں آرام و راحت کا جو بھی تصور کیا جاسکتا ہے۔ وہ سب جنت میں حاصل ہوگا۔ خواہ وہ لباس کی صورت میں ہو خوراک کی صورت میں ہو یا اعلیٰ مقام کی صورت میں۔ ہر چیز وہاں حاصل ہوگی اور اسی کو پھلوں کی مشابہت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پاکیزہ بیویاں

جنتیوں کے ایک اور انعام کے متعلق فرمایا وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ اور ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ ان مادی نعمتوں کے علاوہ دوسرے مقام پر روحانی نعمتوں کا بھی ذکر ہے۔ فرمایا وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهُیْ اَنْفُسُكُمْ اس میں تمہارے لیے ہر وہ چیز ہوگی جس کے لیے تمہارا جی چاہے گا۔ جنت کی نعمتوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ زخم ہونے والی ہونگی۔ دنیا میں کسی چیز کے میسر آجانے کے بعد بھی ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے۔ کہ یہ کیسی وقت چھین بھی سکتی ہے۔ یا ختم ہو سکتی ہے۔ مگر جنت کی نعمتیں دائمی ہوں گی۔ ان کے لیے زوال کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا اسی لیے فرمایا کہ جنتی لوگ کسی محدود عرصے کے لیے جنت کی نعمتوں سے مستغنیہ نہیں ہوں گے۔ بَلْكَ دَهُنٌ فِيْهَا خَالِدٌ وَّنْ اور وہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہیں رہیں گے۔ اور ان کے انعامات میں اضافہ ہی ہوتا ہے گا۔

ان آیات میں قرآن پاک پر ایمان لانے والوں کا انجام بھی بیان فرما دیا اور اس کی تکذیب کرنے والوں کے حشر سے بھی اللہ تعالیٰ نے آگاہ کر دیا۔

الْم

البقرة ۲

(آیت ۲۶-۲۷)

درس سیزدهم ۱۳

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا
فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَأَمَّا
الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا يُضِلُّ
بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ
﴿٣١﴾ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ
مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَئِكَ
مُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٣٢﴾

ترجمہ : • بیشک اللہ تعالیٰ نہیں شرما، اس بات سے کہ بیان کرے مثال ٹھہر
کی یا اس سے بڑی۔ بہر حال جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان
کے رب کی طرف سے اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، پس وہ کہتے ہیں۔ کیا ارادہ
کیا اللہ تعالیٰ نے اس مثال کے ساتھ؟ اللہ تعالیٰ ٹھہرا کر ہے اس کے سبب سے
بہتوں کو اور ہدایت دیتا ہے اس کے سبب سے بہتوں کو۔ اور نہیں ٹھہرا کر تا
اس کے سبب سے مگر فاسقوں کو ﴿۳۱﴾ وہ جو ٹوڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ
کے عہد کو اس کو مضبوط کرنے کے بعد اور قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کو
اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اور زمین میں فساد کرتے ہیں۔ یہی لوگ
نقصان اٹھانے والے ہیں۔ ﴿۳۲﴾

گذشتہ پیرستہ پچھلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حقانیت، صداقت اور اس کے منزل
من اللہ ہونے اور حضور علیہ السلام کی رسالت کا ذکر کیا تھا۔ اس سے پہلے توحید اور رد شرک
کے متعلق بیان تھا۔ لوگوں کے اس خیال کی تردید تھی کہ یہ قرآن خدا تعالیٰ کا کلام نہیں۔
بلکہ پیغمبر علیہ السلام کا اپنا وضع کردہ ہے۔ اور پھر اس ضمن قرآن پاک کے چیلنج کا ذکر تھا۔ کہ اگر

تمیں اس کے منزل من اللہ ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ ہے۔ تو اس جیسی ایک ہی سورت بنا کر لاؤ۔ اس کے ساتھ پیش گوئی کر دی گئی تھی۔ کہ قیامت تک تم اس قرآن کی مثل نہیں لاسو گے لہذا یاد رکھو کہ جب ایسا کلام پیش کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ تو پھر اس کلام سے انکار کا نتیجہ یہ ہو گا۔ کہ تم ایسی دوزخ میں ڈالے جاؤ گے۔ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ اس کے ساتھ ایمان والوں کو بشارت بھی۔ کہ آخرت میں وہ کامیاب ہوں گے۔ اور ان کا انجام ثنایت اچھا ہو گا۔

حقیر چیزوں کی مثالیں

کفار قرآن پاک کے متعلق یہ اعتراض پیش کرتے تھے۔ کہ اس میں بعض چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزوں کا ذکر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے کلام کے شایان شان نہیں۔ کہیں مکھی کا ذکر ہے۔ اور کیس مکڑی کا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ اُس کا کلام بھی بہت اعلیٰ باتوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ ایک عام محاورہ ہے کَلَامُ الْمُلُوكِ مُلُوكُ الْكَلِمِ یعنی بادشاہوں کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات بلند و برتر ہے۔ اسی طرح اس کا کلام بھی اعلیٰ و ارفع ہونا چاہیے۔ اس میں مکھی۔ بچھر جیسی ادنیٰ چیزوں کا ذکر نہیں ہونا چاہیے۔

اس اعتراض کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٰ اَنْ يَّفْزَرَ بِ
مَثَلٍ مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا یعنی اللہ تعالیٰ کی شان اور عظمت کے یہ ہرگز منافی نہیں کہ وہ بچھر یا اس سے کسی بڑی چیز کی مثال بیان فرمائے۔ کیونکہ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کی مثالیں انسانوں کے سمجھانے کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔ یہ تو بعض لوگوں کی عقل یا انکے عرف کی کمزوری کی دلیل ہے۔ کہ وہ بعض حقیر چیزوں کا تذکرہ مناسب نہیں سمجھتے۔ مگر حکمت کے اصول کے تحت ایسی چیزوں کے بیان کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ ہی کسی سے خوفزدہ ہو کر یا کسی کو خوش کرنے کے لیے کسی چیز کا بیان روکا جاسکتا ہے۔ حقیر چیزوں میں بڑے مفید پہلو بھی ہوتے ہیں قرآن پاک میں مکھیوں اور مکڑی کا ذکر ہے۔ اور ان کی مثال سے کہ بڑی مفید باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ لہذا ایسی مثالوں کے ترک کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

اس قسم کی مثالیں اکثر علماء کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ خود عرب کہتے ہیں مَا الْبَقُوْ
وَشَعْمُهُ یعنی کیا بچھر اور کیا اس کی چربی۔ اسی طرح مَا الْجُرَادُ وَطَعْمُهُ یعنی کیا

اُمّی اور کیا اس کا گوشت وغیرہ حضور علیہ السلام نے بھی تعظیم حقیقت کے لیے مثال بیان فرمائی ہے۔
مسند احمد، ابن ماجہ اور ترمذی شریف میں یہ الفاظ موجود ہیں لَوْ كَانَتِ السَّمَاوَاتُ تَزْنُ عِنْدَ اللَّهِ
جَنَاحَ بَعُوضَةٍ مَا سَقَى كَافِرًا مِنْهَا قَطْرَةً أَبَدًا یعنی اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیا کی
قدر و قیمت ایک مچھر کے پر کے برابر ہوتی تو کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی عطا نہ دیتے۔
کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کا نافرمان ہے۔ یہ مچھر کی مثال آپ نے اس لیے بیان فرمائی کہ ساری دنیا کی قیمت
اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنی بھی نہیں جتنی مچھر کے ایک پر کی ہوتی ہے۔ اسی لیے لو کفار اس دنیا
میں آرام و عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ کچھ نہیں۔ آخرت میں حساب
کا حساب کتاب پیش ہو گا۔ تو سخت سزا میں مبتلا ہوں گے۔

مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اُمّ سلیمؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ دریافت
کیا اور تمبیہ کے طور پر عرض کیا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَكْتُمُ خَيْرًا مِّنَ الْحَقِّ یعنی اللہ تعالیٰ تو حق بات سے
نہیں شرمیتے۔ میں آپ سے مسئلہ دریافت کرنا چاہتی ہوں۔ کیا عورت کو بدخوابی ہو جائے تو اس پر
غسل واجب ہوتا ہے یا نہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا نَعَمْ يَا اُمّ سُلَيْمٍ اِذَا رَأَيْتِ
الْمَاءَ اَمَّا حَيْثُ مَادَهُ خَارِجٌ يُّوَجَّعُ اَوْ اَمَّا حَيْثُ يُّوَجَّعُ اَوْ اَمَّا حَيْثُ يُّوَجَّعُ اَوْ اَمَّا حَيْثُ يُّوَجَّعُ
اسی طرح عورت کو بھی بدخوابی ہوتی ہے۔ الغرض اس حدیث میں بھی یہی الفاظ آتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ
حق بات کو ظاہر کرنے سے نہیں شرماتا۔

حیا کی مختلف قسمیں

حیا انسان کی اُس انحراری اور شکنجی کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے کوئی شخص قبیح امور سے
باز آجاتا ہے۔ حیا انسانوں سے بھی ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ سے بھی ہوتی ہے۔ اسی لیے جب کوئی
شخص بُرائی کا ارادہ کرتا ہے۔ تو وہ چھپ کر کرتا ہے۔ کیونکہ اُسے انسانوں سے حیا آتی ہے کہ اگر
وہ دیکھ لیں گے تو کیا ہو گا۔ خدا تعالیٰ اگرچہ نظر نہیں آتا۔ مگر جب یہ یقین ہو جائے کہ اُس کی نظر سے
کوئی فعل پوشیدہ نہیں ہے۔ تو پھر ذرہ بھر بھی خوف خدا رکھنے والا شخص فعل قبیح کے ارتکاب کے
وقت اللہ تعالیٰ سے حیا کرے گا۔ اگرچہ کوئی دوسرا انسان اس کو نہ دیکھ رہا ہو۔

حیا کی ایک قسم حیا عبودیت ہے۔ ایک عابد و زاہد اپنی تمام قوی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف کرنے کے باوجود یہی سمجھتا ہے کہ وہ اس کی عبادت کا حق ادا نہیں کر سکا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر حسبہ انعامات کئے ہیں۔ اگر وہ ساری عمر بھی عبادت میں لگا دے یعنی پیدائش کے وقت ہی اللہ تعالیٰ اس کو فہم عطا کرے اور سجدے میں گر جائے اور ساری عمر اسی ایک سجدہ میں گزار دے۔ اور وہیں اس کی موت آجائے۔ تو وہ بارگاہ رب العزت میں عرض کرے گا کہ مولا کریم! میں تیری عبادت کا حق ادا نہیں کر سکا۔ حیا عبودیت اسی چیز کا نام ہے۔

حیا خود اپنے نفس سے بھی ہوتی ہے۔ جب اُسے کوئی شخص میٹھنے والا نہ ہو تو بعض اوقات انسان خود اپنے جی میں شرم محسوس کرنے لگتا ہے کہ میں کیڑا باہوں اور کبے دھوکا دے رہا ہوں۔ یہ نفس کی حیا ہے۔

حیا کی ایک قسم حیا کرم ہے۔ خود حضور بنی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ ہے کہ آپ نے بعض صحابہ کو کھانے پر بلایا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد وہ لوگ وہیں بیٹھ کر بات چیت کرنے لگے۔ یہ چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار گذرتی۔ مگر آپ نے حیا کرم کی وجہ سے انہیں زبان مبارک سے کچھ نہ کہا۔ بلکہ اٹھ کر باہر چلے گئے تاکہ یہ لوگ بھی چلے جائیں۔ مگر وہ بیٹھے بے لود باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ حضور علیہ السلام پھر تشریف لے آئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیات نازل فرمائیں۔ کہ جب بنی علیہ السلام کے گھر پر کھانا کھانے کے لیے جاتے ہو، تو وہاں بیٹھ کر بات چیت میں وقت نہ گزارو۔ اللہ تعالیٰ کا نبی تو حیا کرم کی وجہ سے تمہیں نہیں کہتا۔ مگر تم خود ہی احساس کرو۔ اور کھانا کھا کر واپس چلے جایا کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔

ہدایت و گمراہی

فرمایا جب اللہ تعالیٰ اس قسم کی مثالیں بیان فرماتے ہیں تو مومن اور کافر پر ان کے مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ایماندار لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ چھوٹی چھوٹی مثالیں بے معنی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔ ان کا بیان کرنا حکمت کے منافی نہیں۔ لہٰذا وہ اس سے بڑا نہیں مناتے وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا جن لوگوں نے کفر کیا فَيَقُولُونَ پس وہ کہتے ہیں مَا ذَا الَّذِي أَدَّ اللہ بھلا أَمْ شَاءَ اللہ تعالیٰ نے اس مثال کے ساتھ کیا ارادہ کیا ہے۔ وہ لوگ طعن کرتے ہیں۔

اور بطور استنزاء اور تحقیر کے کہتے ہیں کہ ایسی معمولی چیزوں کی مثال بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کو کیا ملے
 ہوا۔ اگر مثال ہی بیان کرنا تھی تو کسی اعلیٰ چیز کی بیان کی ہوتی۔ مکھی اور بھڑکھڑ کی مثال کی کیا حیثیت ہے۔
 اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس مثال کو معمولی چیز نہ سمجھو۔ کیونکہ يُضِلُّ بِهِ
كَثِيرًا اللہ تعالیٰ اسی مثال کے ذریعے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے۔ ایسی بات بعض
 لوگوں کے ذہن میں نہیں بیٹھتی۔ جس کی وجہ سے وہ طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں۔ حالانکہ
 نہ تو وہ حکمت کے اصولوں سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں کلام کی حقیقت کا علم ہوتا
 ہے۔ لہذا فضول اعتراض پیش کرتے ہیں اور گمراہ ہو جاتے ہیں۔ فرمایا ایسی مثالیں صرف گمراہ
 ہی نہیں کرتیں بلکہ وَيُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا اللہ تعالیٰ انہیں مثالوں کے ذریعے ہدایت بھی دیتا
 ہے۔ جو لوگ مثال کے ذریعے بات کو آسانی سے سمجھ جاتے ہیں، وہ حقیقت کو پہانتے ہیں۔ لہذا ہدایت
 ہو جاتے ہیں۔ فرمایا أَهْمُ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ یعنی گمراہ وہی لوگ ہوتے ہیں
 جو فاسق ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کرتے ہیں۔ کوئی ایمانداروں منصف مزاج
 اور حق کا طالب گمراہ نہیں ہوتا۔

فاسق کا معنی

فاسق کا معنی خروج یا باہر نکلنا ہے۔ عربی میں کہتے ہیں فَسَقَ الرُّطْبَةُ عَنْ قَشْرِهَا مِل
 اپنے پھلکے سے باہر آگیا یا کہتے ہیں فَسَقَتِ النَّوَّةُ مِنَ الشَّجَرَةِ ٹھٹھلی کھجور سے باہر نکل گئی۔ اسی
 اصطلاح میں فاسق اس شخص کو کہتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے باہر نکل جاتا ہے۔ شریعت
 کے عرف میں فاسق دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے پہلے معنی میں فاسق اس شخص کو کہتے ہیں۔ جس کے
 دل میں ایمان موجود ہے۔ مگر وہ اطاعت کی بجائے صغیرہ یا کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایسا
 شخص ممکن ہے۔ اور اس کے متعلق امید ہے کہ اُسے آخرت میں شفاعت نصیب ہو جائے گی۔
 اور وہ نجات پا جائے گا۔ کیونکہ بہر حال وہ مسلمان ہے۔ مگر نافرمان ہے وہ نماز کو فرض سمجھتا ہے
 مگر پڑھتا نہیں۔ زکوٰۃ کو فرض جان کر ادا نہیں کرتا۔ گویا نیکی کو صحیح سمجھتے ہوئے اس کی طرف مائل
 نہیں ہوتا۔ شریعت کی اصطلاح میں فاسق کہلاتا ہے۔ دوسری قسم کا فاسق وہ ہے۔ جو کفر میں
 مد سے بڑھ جائے۔ سرکش ہو جائے۔ جیسا کہ اعتقادی منافقوں یا سخت کافروں کے متعلق فرمایا
أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ان یہودیوں کو فاسق کہا گیا ہے۔ جو بڑے سرکش، ضدی

اور نافرمان ہیں اور کفر میں بڑے پتختے ہیں۔ فاسق کے یہ دونوں معنی قرآن پاک میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس مقام پر بطور تشریح یوں کہہ سکتے ہیں کہ فاسق وہ ہیں جو قرآن پاک کی بیانی کردہ مثالوں سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ مقصد یہ کہ جو شخص قرآن کے پروگرام کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ فاسق ہے۔ قرآن پاک کا پروگرام یہ ہے کہ: **الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿۳﴾** وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ﴿۴﴾“ نیز قرآن پاک کا پروگرام یہ ہے: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ ظَنُّوا أَنَّهُ قَائِمٌ**“ مگر جو شخص اس کے خلاف کرے گا۔ وہ فاسقوں کی فہرست میں رکھا جائے گا۔

یہودی منافقین
کی عمدگی

آگے اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی تشریح کرتے ہوئے ان کی تین بڑی خصلتوں کا ذکر کیا ہے پہلی بات یہ ہے کہ **الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ**۔ فاسق وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑتے ہیں اس کو پختہ کرنے کے بعد۔ اگر وہ اشخاص منافق ہیں تو وہ زبان سے اقرار کرتے ہیں کہ: **أَمَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ** ہم اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لائے ہیں۔ مگر یہ عہد کو پورا نہیں کرتے۔ عملی طور پر ان کا ایمان اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہے اور نہ آخرت کے دن پر۔ اور اگر فاسقوں سے مراد یہودی ہیں۔ تو ان سے تو پہلی کتابوں میں عہد لیا گیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نبیوں پر ایمان لائیں گے۔ اور خاص طور پر نبی اکرمؐ پر ایمان لائیں گے۔ اس کا ساتھ دیں گے اور اس کی نصرت کریں گے۔ نیز یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر جو ہدایت نازل فرمائی ہے۔ اُسے چھپائیں گے نہیں۔ بلکہ ظاہر کریں گے۔ مگر ان لوگوں نے اس عہد کو توڑ دیا۔ گویا فاسقوں کی پہلی خصلت یہ بیان فرمائی کہ وہ عہد کرنے کے بعد اُس کو توڑتے ہیں عمدگی لوگوں کا دوسرا گروہ معاند کافر ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق فرمایا: **سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أُنذِرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ**۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اُس عہد کو توڑا۔ جو نازل میں ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا تھا: **أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ** کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ سب نے بیک زبان ہو کر کہا تھا: **بَلَىٰ** اے مولا کریم! کیوں نہیں بیشک تو ہمارا رب ہے۔ اس عہد کی یاد دہانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف رسول بھیجے۔

متغیر بندے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ ایمان نہ لائیں۔ اسی لیے تو وہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں۔ کیونکہ اس میں مکھی اور چھڑ جیسی حقیر چیزوں کی مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ یہی وہ پلنگہ ہے جس کی بدولت وہ لوگوں کو ایمان سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ اور اسی کو فساد فی الارض سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اہم بیضادئی فرماتے ہیں کہ کفر، شرک اور شرائع کو خراب کرنا۔ اللہ تعالیٰ کے قوانین کی خلاف ورزی کرنا فساد فی الارض ہے۔ زمین و آسمان کی اصلاح اطاعت سے ہوتی ہے۔ کفر، شرک اور معاصی کی وجہ سے اسیں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمام قسم کی قبیح رسوم بھی فساد فی الارض کے قبیل سے ہی ہیں۔ شرک، بدعت، مانج گانا، عریانی اور فحاشی یہ سب قبیح رسوم ہیں۔ قبروں پر عرس منانا، قبر پرستی کو رواج دینا یہ بھی انہیں رسوم میں سے ہے۔ اور فساد فی الارض ہے۔ تیسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ منافق لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا جمعی کی بجائے اُس کے غضب کو دعوت دیتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کی ہر خواہش پوری ہو جائے۔ ان کے کسی فعل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ اور وہ اپنی من مانی کرتے رہیں۔ الغرض عمدہ شکنی، قطع رحمی، اور فساد فی الارض یہ تین بڑی خصلتیں ہیں جو فاسقوں یا منافقوں میں پائی جاتی ہیں اور جن سے اجتناب کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

فاسقوں کی علامات بیان کرنے کے بعد فرمایا اُولَٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ فاسقین کی پہلی یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں۔ ناکام دنیا مرد ہونے والے ہیں۔ یہ لوگ اپنی خصلتوں کی وجہ سے دنیا میں بھی ناکام ہیں۔ کیونکہ فساد فی الارض کی بدولت دنیا میں امن و سکون پیدا نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہ طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا رہیں گے اور آخرت میں ہمیشہ کے لیے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑیگا۔ اسی لیے فرمایا خَسِرَالْ دُنْيَا وَالْآخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ یہ دنیا اور آخرت بڑے مجاہد کی ناکامی ہے۔ اور یہی بہت بڑی ناکامی ہے۔ ابتدائے سورۃ میں متقین کے متعلق فرمایا تَعْمَدُ اُولَٰئِكَ عَلٰی هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ذٰلِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ یعنی یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں اور یہی کامیاب ہیں۔ اس مقام پر فاسقین کے متعلق فرمایا اُولَٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ یہی لوگ ناکام ہیں۔

الْمَدَّ

البقرة ۲

درس چہارم ۱۴

(آیت ۲۸ تا ۲۹)

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ
 يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٨﴾
 هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ
 اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَهُوَ
 بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٢٩﴾

ترجمہ : کس طرح تم کفر کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ، حالانکہ تم بے جان
 پس اللہ تعالیٰ نے تم کو زندگی بخشی۔ پھر وہ تم پر موت طاری کرتا ہے۔ پھر وہ تم کو مبراہ
 زندہ کرے گا۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹے جاؤ گے ﴿۲۸﴾ اللہ تعالیٰ وہی ہے
 جس نے پیدا کیا ہے۔ تمہارے لیے جو کچھ زمین میں ہے سب۔ پھر وہ متوجہ ہوا آسمان
 کی طرف۔ پس برابر کر دیا ان کو سات آسمان۔ امدہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۲۹﴾

اس سے پہلی آیات میں ان لوگوں کا رد فرمایا۔ جو قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے کا
 انکار کرتے تھے۔ کیونکہ اس کلام میں کچھ مکھی جیسی حقیر چیزوں کا بیان ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ
 کی ذات اعلیٰ دارفع ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کچھ یا اس سے
 بھی کم تر چیز کی مثال بیان کرنے سے نہیں شرماتا۔ کیونکہ اس کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں
 ہوتی۔ بعض اوقات ادنیٰ چیزوں میں بھی اہم باتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے ایسی کسی چیز کے بیان سے
 اجتناب کرنا خلاف حکمت ہوتا ہے۔ معترضین کا اس قسم کا اعتراض ان کی نا سمجھی کی دلیل
 ہے۔ البتہ ایمان والے خوب سمجھتے ہیں کہ قرآن پاک ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔
 نا سمجھ لوگ کہتے ہیں کہ ایسی حقیر چیز کی مثال بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کو کیا مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ
 نے فرمایا ایسی ہی مثال کے ذریعے وہ بہتوں کو ہدایت سے نواز رہا ہے۔ اور بہتوں کو گمراہ کر دیتا ہے
 مگر گمراہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو منافقان ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی تین خصلتیں بیان فرمائیں۔ کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد و پیمان کو توڑتے ہیں۔ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ یہ لوگ انہیں توڑتے ہیں۔ اور یہ لوگ زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ فرمایا یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ گویا قرآن کریم کا انکار، معاد کا انکار، راستہ کا انکار یا خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا اور اس کی صفات کا انکار سب کا مالِ رانجا کا ایک ہی ہے۔ ان سب باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ورنہ انسان کافر ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک چیز کا انکار بھی اللہ تعالیٰ کے انکار کے مترادف ہے۔

اللہ تعالیٰ کے
ساتھ کفر

اس مقام پر اللہ تعالیٰ اپنی بعض نعمتوں کا ذکر کر کے انسان کو مخاطب فرماتے ہیں، کہ کیفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ یہ انعام پانے کے باوجود تم اللہ تعالیٰ کی ذات کا کیسے انکار کرتے ہو۔ تمہارا انکار محض جہالت، ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر ہے ورنہ اس کے حق میں تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا، وَمَنْ يَتَدْعُ مَعَ اللّٰهِ الْاِخْرٰى لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهَا فَاِنَّهَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِۦٓ يَعْنِيْ جَوْشَنُ اللّٰهِ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارتا ہے۔ یعنی شرک کرتا ہے۔ اُس کے پاس ایسا کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور اس کا حساب تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ یہی بات یہاں پر بیان کی گئی ہے کہ تمہارے پاس کفر کرنے کی کون سی دلیل ہے کیفَ تَكْفُرُونَ تمہارے لیے کفر کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ میں نہ صرف خدا تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے کا بیان ہے۔ بلکہ اس میں ایمان لانے کی دوسری چیزیں بھی شامل ہیں۔ یعنی تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان کیوں نہیں لاتے اس کے کلام کا کیسے انکار کرتے ہو۔ اس کے بھیجے ہوئے رسولوں کو کیوں نہیں مانتے۔ اور معاد پر تمہارا ایمان کیوں نہیں ہے۔ گویا کیفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ میں وہ تمام چیزیں آگئیں جن کا کفار انکار کرتے تھے۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ کیفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ کا تعلق گزشتہ آیت یَآٰتٰہَا النَّاسُ اَعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَ کُمْ کے ساتھ ہے

وہاں پر بھی بعض انعامات کا ذکر فرمایا کہ اُس پر وہ دگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا۔ تمہارے لیے زمین و آسمان کو پیدا کیا، پھر آسمان سے بھی پانی نازل کر کے زمین کو سیراب کیا اور تمہارے لیے پھل پیدا کیے۔ اس مقام پر موت و حیات اور زمین سے پیدا ہونے والی نعمتوں کا ذکر کر کے ایک دوسرے انداز سے بیان ہو رہا ہے کہ ان نعمتوں کے ہوتے ہوئے تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کس طرح کفر کرتے ہو۔

بر خلاف اس کے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو مانتا ہے۔ اور اُسی کی عبادت کرتا ہے۔ اس کے سامنے معرفت الہی کی لاکھوں کروڑوں عقلی اور نقلی دلیلیں موجود ہیں۔ اُس کے اُس پاس آسمانی کتابیں موجود ہیں، جو اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ان کے ذمے فرض ہے۔ حضورِ عمیرہ السلام نے فرمایا: **حَقُّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ اَنْ يُعْبُدُوْا اللّٰهَ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا** یعنی اللہ تعالیٰ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ الہی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہریں۔

ام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص سپاڑ کی چوٹی پر زندگی بسر کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اُسے عقل و شعور عطا کیا جو اس سے لڑا جاتا ہے۔ وہ زمین و آسمان کے نظام کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اور اس کے باوجود وہ کفر کرتا ہے۔ تو پھر اُجلے گا۔ اُسے معافی نہیں مل سکتی۔ کیونکہ مشاہدہ قدرت کو دیکھنے کے باوجود اگر وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لایا تو اس کی بے نصیبی ہے۔ گویا عقلی طور پر بھی اللہ تعالیٰ کو پہچانا واجب ہے۔ ایک شخص عملاً نماز نہیں پڑھتا یا روزہ نہیں رکھتا مگر اللہ تعالیٰ کی وحدت پر ایمان ہے۔ تو اُس کی بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر کفر کرنے کی صورت میں وہ قابلِ گرفت ہو گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے تمہیں عقل دی، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بخشی۔ تمہارے ارد گرد نشانیاں پھیلادیں۔ اس کے باوجود تم نے ایمان کی بجائے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ لہذا تمہارا معاملہ ناقابلِ معافی ہے۔

اسی لیے فرمایا کہ تم ان تمام دلائل کے باوجود کیف تکفروا؟ **يَا اللّٰهُ تَعَالٰی**

موت و شہادت
الہی میں ہے

کے کفر کرتے ہو۔ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا حَالًا ثُمَّ بَعَثْنَا بَعْثًا لِّكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْجَوْنَ۔ فَحْيَا كُمْ ہاں پس اللہ تعالیٰ نے تم کو زندگی بخشی۔ مطلب یہ کہ تم اپنے باپوں کی پشتوں میں بالکل بے جان چیز تھے۔ پھر اس نے تمہیں ماؤں کے رحم میں قطرہ آب یا لطف کی شکل میں منتقل کیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمہیں زندگی بخشی اور تمہیں وجود جیسی نعمت عطا کی۔ گویا تمہیں نستی سے ہستی میں تبدیل کیا۔ اس کے بعد پھر ایک وقت آیا آئے گا۔ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ پھر وہ تم پر موت طاری کرے گا۔ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ پھر قیامت کے دن تم کو زندہ کرے گا۔ دیکھو یہ سب تصرف خدا تعالیٰ کا ہے۔ جو یہ کہتا ہے۔ موت بھی وہی طاری کرتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ کوئی مستغرق نہیں۔ نہ کوئی کچھ دے سکتا ہے۔ نہ کوئی چھین سکتا ہے۔ اسی بات کو سورۃ واقع میں اس طرح بیان فرمایا کہ دیکھو تم کیسے بے بس ہو۔ جب ہمارے کارندے آتے ہیں۔ تو کون ہے جو انہیں روک سکے بڑے بڑے بادشاہ اور بڑے بڑے طاقتور عاجز آجاتے ہیں۔ لہذا معلوم ہوا کہ تمام چیزوں کا تصرف خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ مستغرق فی الامور وہی ہے۔ اور ایک ایماندار کا عقیدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جاندار بنایا۔ وہی موت طاری کرتا ہے۔ اس کے بعد پھر زندہ کرے گا۔

فرمایا موت و حیات کی اس کشمکش کے بعد انسان کو یونہی نہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ بلکہ وہ انسانی اعمال کا محاسب بھی کریگا ثُمَّ إِلَيْهِ تَرْجَعُونَ پھر اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی اور تم سے پوچھا جائے گا کہ میں نے تم کو وجود کی نعمت دی۔ تمہاری پرورش کی اور تمہاری ضروریات و آسائش کے تمام سامان مہیا کیے۔ تمہارے جسم میں ہدایت کی مثیری نصب کی۔ علم حاصل کرنے کے لیے حواس ظاہرہ باطنہ سے نوازا۔ قوت متخیلہ عطا کی۔ غور و فکر کے ذرائع بخشے۔ قوت حافظہ دی۔ جوڑ توڑ کرنے کی طاقت بخشی۔ اس کے علاوہ بہت بڑی مہربانی یہ فرمائی کہ راہنمائی کے لیے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کیا۔ رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ انہیں بشیر اور منذر بنایا اور دوسری جگہ فرمایا وَرَاسَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ ان کے ساتھ کتابیں نازل فرمائیں۔ وحی نازل کی شریعت دے کر بھیجا لیقوم الناس بالقسط تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قائم رہیں۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ یہ شرک تو بہت بڑا ظلم ہے۔ اور کفر سے بڑا اور کوئی ظلم نہیں وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ سب سے

بڑے ظالم تو کافر ہیں۔ یہ تمام ہدایت ہے کہ محبت پوری کر دی۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ انہیں کوئی سمجھانے والا نہیں آیا: لَيْسَ يَكُونُ لِلنَّاسِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ

میت دفن کرنے کے آداب

مشکوٰۃ میں حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے: لَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرَّبُكُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ إِلَّا قَدْ أَمَرْتُكُمْ بِهِ یعنی جو چیز جنت سے قریب کرنے والی اور دوزخ سے بچانے والی ہے وہ سب میں نے تمہیں بتا دی ہے۔ اب تمہارے پاس انکار کی کیا دلیل ہے۔ موت و حیات اور تصرفات کے بنیادی عقائد بیان ہو گئے ہیں جن کی قرآن پاک میں تعلیم دی گئی ہے

فرمایا میت کو دفن کرتے وقت یوں کہو بِسْمِ اللّٰهِ وَحَلٰی مِلَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اور اسی طرح قبر پر مٹی ڈالتے وقت یہ آیت پڑھنی چاہیے: مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيْهَا نُفِئُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰی مگر لوگ اس کی بجائے زور سے کلمہ شریف پڑھنے لگتے ہیں۔ کلمہ طیبہ بے شک افضل الذکر ہے۔ مگر اس مقام پر وہی کچھ کہنا چاہے جسکی تعلیم دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا بھی فرمان ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ اسی میں اس کو لوٹائیں گے۔ اور پھر اسی میں سے دوبارہ زندہ کر گئے ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ کا یہی مطلب ہے۔

تمام چیزیں انسان کے لیے ہیں

انسان کی موت و حیات کا تذکرہ کرنے کے بعد دیگر انعامات کا اجماعی خاکہ پیش کیا ہوا اَلَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ اللہ تعالیٰ نے زمین میں جو کچھ بھی پیدا کیا ہے۔ وہ سب تمہارے فائدے کے لیے ہے۔ غذا، لباس، پانی، ہوا، نباتات، خوشبو، آلات، نیک بختی اور کماں حاصل کرنے کے ذرائع سب انسانی مفاد کے واسطے ہیں۔ بعض چیزیں براہ راست انسانی مفاد میں ہیں۔ اور بعض بالواسطہ۔ حتیٰ کہ موزی جائز بھی تمہارے فائدے کے لیے ہیں۔ بعض اوقات زہریلے جانوروں کا زہر بھی تریاق کا کام دیتا ہے۔ کسی موسم میں انسان کچھوں سے

تنگ آجاتا ہے۔ مگر یہ بھی فائدے سے خالی نہیں۔ یہ خلافت کے ڈھیر جو بیماری کا باعث بنتے ہیں، انہیں مکھیاں ہی چاٹ جاتی ہیں یہ تو انسان پر احسان کرتی ہیں۔ کہ خلافت کے خاتمے کا سبب بنتی ہیں۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز انسان کے فائدے کے لیے پیدا کی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی تخیق والی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی کو ہفتے کے دن پیدا کیا۔ اور جمعہ کے روز نماز عصر کے بعد آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔ یہ سب چیزیں پہلے پیدا کر دی گئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ نوع انسانی کی مصلحت فرشتوں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے انسان کی تخلیق سے کروڑوں سال پہلے فرشتوں کو پیدا کیا۔ ان میں جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام اور ملا اعلیٰ کے دو سر فرشتے ہیں۔ ان میں مقرب فرشتے بھی ہیں ان میں ملا سافل کے فرشتے اور فضائی اور ہوائی فرشتے بھی ہیں۔ یہ سب کے سب انسان کی مصلحت کے لیے ہیں۔ تاکہ انسان درجہ کمال تک پہنچ سکے۔

موت انسان
عبرت ہے

اللہ تعالیٰ نے موت کو پیدا کیا اور یہ ایک بڑی خطرناک چیز ہے۔ مگر اس میں بھی انسان کے لیے عبرت کا سامان موجود ہے۔ یہ بھی فائدے سے خالی نہیں۔ شیخ سعدیؒ نے اس کی وضاحت ایک مثال کے ذریعے کی ہے۔ ————— بادشاہ نذیر
خوش گیموں میں مصروف تھے۔ بادشاہ کہنے لگا۔ کاش کہ اگر میں موت نہ بولے، چہ خوش بودے، یعنی اگر یہ موت نہ ہوتی۔ تو کیا اچھا ہوتا۔ ہماری بادشاہت ہمیشہ قائم رہتی۔ نہ موت وارد ہوتی اور نہ بادشاہت کا خاتمہ ہوتا۔ وزیر بڑا دانا آدمی تھا کہنے لگا۔ اگر موت نہ بولے اس سلطنت ترا کے برے یعنی اگر موت نہ ہوتی تو یہ سلطنت تم تک کیسے پہنچتی۔ یہ موت ہی ہے جس کے ذریعے یہ بادشاہت تم تک پہنچی ہے۔ ورنہ یہ تمہارے آباؤ اجداد تک ہی محدود رہتی۔ آگے نہ چلتی۔ مقصد یہ کہ موت جیسی چیز بھی انسان کے لیے مفید ہے۔ کہ اس سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔

اس مقام پر فقہائے کرام اور محدثین ایک اور مسئلہ بیان کرتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ اشیا میں اصل چیز اباحت ہے۔ خَلَقَ نَكْمَةً مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا یعنی زمین کی تمام چیزیں تمہارے

لیے پیدا کیں۔ اصلاً تمام چیزیں مباح یعنی جائز ہیں۔ البتہ جس چیز کے متعلق حرمت کی دلیل آئے گی صرف وہی حرام ہوگی۔ باقی سب جائز بھی جائز رہے گی۔ ہر قسم کے جانور اور ہر قسم کے پھل انسان کے لیے مباح ہیں۔ مگر جہاں حکم آگیا کہ خنزیر حرام ہے۔ مردار حرام ہے۔ یا فلاں قسم کا جانور حرام ہے تو وہ حرمت کے زمرہ میں آگیا۔ باقی سب جائز ٹھہرے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی وضع ہی ایسی رکھی ہے کہ انہیں انسان کے فائدے کے لیے بنایا ہے۔ البتہ جس چیز کو حرام قرار دیا ہے۔ اس میں ضرر کوئی روحانی یا جسمانی قباحیت ہوگی۔ جس کی وجہ سے اُسے ناجائز قرار دیا گیا ہے وہ سب چیزیں مباح ہیں۔

میاں پر ایک دوسرے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اباحت کے اس اصول کو من و عن تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر چیز ہر حالت میں مباح قرار پائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہے ہر چیز کے لیے کوئی نہ کوئی ضابطہ مقرر کیا گیا ہے۔ مثلاً ہر چیز کا ہر شخص مالک نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قبضہ اور ملک کا قانون مقرر کیا ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی حدود میں رہ کر کسی چیز کا قبضہ یا مالک ہو گا۔ کسی صاحب جائیداد کی موت کے بعد ہر شخص اس کی جائیداد کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ اس جائیداد پر قبضہ کس کا ہے۔ وراثت کے طور پر اس کا کون حقدار ہے۔ عطیہ کے طور پر کسی کو ملی ہے یا نہیں۔ یا کسی اور قانون کے تحت اس کا کون حقدار ہے یہ سب قانون شریعت میں موجود ہیں۔ اور انہیں کے مطابق حقوق کا تعین ہو گا۔ ہر شخص حقدار نہیں ہو سکتا اسی طرح ایک عورت صرف ایک آدمی کے نکاح میں آ سکتی ہے۔ اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ بجز اس کے کہ خاوند کی وفات یا طلاق کی صورت میں وہ عورت کسی دوسرے شخص کے نکاح میں جا سکتی ہے لہذا اباحت کے اس کلیے کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

آسمانوں کی تخلیق

زمین کی تمام اشیاء کی تخلیق کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا کہ اے انسان! میں نے تمہارے لیے صرف زمین کی چیزیں ہی پیدا نہیں کیں۔ بلکہ ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ پھر اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ پس برابر کر دیا ان کو سات آسمان۔ یعنی تہ در تہ سات آسمان پیدا فرمائے۔ اور زمین سے آسمان تک اور ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اتنے دبیز آسمان پیدا کئے ہیں۔ یونانی فطیات کے ماہرین آسمانوں کی تعداد نو بتاتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی اعتراض نہیں۔ سات

آسمانوں کے ساتھ عرش اور کرسی کو شامل کر لیں۔ تو فوج جاتے ہیں۔ کیونکہ عرش الہی ہے۔ اور کرسی الہی ہے۔ وہ آسمانوں سے بھی وسیع تر ہیں اور ذاتِ خداوندی ان تمام چیزوں سے دراز اور ہے۔

خدا تعالیٰ کی تجلی عرش پر واقع ہوتی ہے۔ امام شاہ ولی اللہؒ اُسے تجلی عظیم نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس تجلی سے اول سارے عرش رنگین ہوتا ہے۔ پھر تمام کائنات رنگین ہوتی ہے اس کے نیچے تمام اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تمام مراحل طے کرنے کے بعد وہ تجلی اس پلٹ جاتی ہے۔

فرمایا: ”وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ“ یعنی وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ اُس کے علاوہ ہر چیز کو جاننے والا اور کوئی نہیں۔ لہذا عبادت بھی اُسی کی کرنی چاہیے۔ جو عظیم کل اور قادر مطلق ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ جو قادر ہے۔ جو خالق اور رب ہے۔ اُس کے علاوہ اور بھی کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ غرضیکہ فتنے کو جنت والا وہی ہے نہ جہنم صرف خدا تعالیٰ کہتا ہے نہ جبرائیل علیہ السلام اور دیگر فرشتوں کا۔ نہ نبیوں کا نہ ولیوں کا۔ اس لیے معبودِ برحق بھی صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پہچان کی یہ صفات جس طرح قرآن پاک میں بیان ہوئی ہیں۔ اسی طرح توراۃ اور انجیل میں بیان ہوئی ہیں۔ مگر لوگوں نے دین کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے حقیقت یہ ہے۔ کہ نافع اور ضار بھی وہی ذات ہے۔ خدا تعالیٰ کے سوا غائبانہ طور پر نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہے۔ اور نہ نقصان۔ نہ کوئی فریاد سن سکتا ہے۔ اور نہ کوئی جرمی بنا سکتا ہے۔ نہ کسی کو تفصیل سے علم ہے۔ کہ کسی کو کیا تکلیف یا پریشانی ہے۔ کیونکہ عظیم کل صرف ذاتِ خداوندی ہے۔ اس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

عبادت الہی
لازم ہے

”كَيْفَ تَكْفُرُونَ“ سے لے کر ”وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ“ تک دو آیات کا تعلق ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا“ کے ساتھ ہے۔ یعنی اے لوگو! تم اپنے رب کی عبادت کرو۔ کہ یہ تمہارے لیے لازمی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں وجود کی نعمت بخشی۔ زندہ کر دیا۔ پھر موت کا طاری کرنا اور دوبارہ زندہ کرنا اُسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ پھر اُس نے تمہیں زمین کی تمام نعمتیں مہیا کیں۔ دوسری جگہ فرمایا۔ کہ زمین کی تمام ہڈیاں اور پھل پیدا کئے۔ اُسے

الانسان مَتَّاءَ لَكُمْ وَلَا فَعَامِكُمْ" یہ سب چیزیں تمہارے اور تمہارے ہوشیوں کے فائدے کے لیے ہیں۔ یہ ہوشی بھی تمہاری ہی خدمت کے لیے پیدا کئے گئے ہیں۔ ان پر سواری کرتے ہو۔ ان سے کھیتی باڑی میں مدد دیتے ہو۔ اور پھر ان کا گوشت بھی کھاتے ہو۔ یہ سب چیزیں تمہاری خاطر پیدا کی ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے: خَلَقَ الْكَذِبَ... لَكُمْ وَخُلِقْتُمْ لِلْآخِرَةِ لے انسان! یہ ساری دنیا ترے لیے پیدا کی ہے۔ اور تو آخرت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تم اس کی معرفت حاصل کرو۔ اور اُسی کی عبادت کرو۔ وَمَخْلَقَتُ الْجَزَّ وَالْإِذْسَ إِذْ يُنْعَبُ دُنِ قرآن پاک شامہ ہے کہ انسانوں اور جنوں کی تخلیق محض عبادت الہی کے لیے ہوئی۔

قرآن پاک میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے زمین کا مادہ پیدا کیا۔ آسمان دھان (دھول) کی شکل میں تھا۔ پھر اس کو برابر کر دیا۔ زمین کا پھیلاؤ اس کے بعد عمل میں آیا۔ وَالْأَرْضُ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ دَحْهًا زمین کا مادہ کثیف ہے۔ اہم شاہ ولی اللہؒ تغبیات الیہ میں فرماتے ہیں: کہ جس طرح زمین مختلف عناصر کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح آسمان بھی کئی عناصر پر مشتمل ہے مگر آسمان کے عناصر زمین کی نسبت لطیف ہیں۔ اسی لیے وہاں شفافیت نظر آ رہی ہے۔ اور کوئی چیز جس قدر لطیف ہوگی، اسی قدر طاقتور ہوگی۔ دیکھئے روح لطیف چیز ہے۔ اس لیے اس میں قوت بھی زیادہ ہے۔ اور مقنی کوئی چیز کثیف ہوتی ہے۔ اتنی ہی کمزور اور ضعیف ہوتی ہے۔ الْغَرَضُ فَرَايَا وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ہر چیز کا جاننے والا خدا تعالیٰ ہے لہذا عبادت بھی اُسی کی ہونی چاہیے۔

اللّٰہ

البقرة

درس پانزدہم

(آیت ۲۰)

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ۚ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَیُخْسِفُ نَبْعًا بِجَمْدٍ ۚ وَنَقْدَسُ لَكَ لَكَ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۰﴾

ترجمہ: اور اس وقت کہ خیال میں لاؤ جب تیرے رب نے فرشتوں سے

فرمایا: تحقیق میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے عرض کیا

کیا زمین میں ایسوں کو بنائے گا جو اس میں فساد کریں گے۔ اور خون بہائیں گے اور

ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ تیری تعریف کے ساتھ اور تیری تزیین کرتے

ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ﴿۲۰﴾

اس سے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے چار بنیادی مسائل یعنی توحید، رسالت، ایمان بالقرآن اور معاد (قیامت) کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کے بعد قرآن و رسالت میں شک کرنے والے لوگوں کا رد فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفات کمال کا ذکر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن بے شمار انعامات کا بھی تذکرہ فرمایا۔ جو اُس نے بنی نوع انسان پر کئے۔ ان میں خصوصاً مادی انعامات کا بیان تھا۔ جس میں انسان کا اپنا وجود، زمین و آسمان کی تخلیق، زمین میں پیدا ہونے والی تمام چیزیں شامل ہیں۔ بالخصوص زمین سے نکلنے والے پانی کا ذکر تھا۔ جس سے انسان فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی سے نباتت پیدا ہوتے ہیں جو انسان کی روزی کا ذریعہ ہے۔

مادی انعامات کے تذکرہ کے بعد اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اُن روحانی اور نفسانی نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔ جو اس نے انسان کو عطا فرمائیں۔ چنانچہ اس مقام پر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور خلافت ارضی کو بیان فرمایا گیا۔ تخلیق آدم ایک بنیادی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی خلافت آدم علیہ السلام کو عطا کی اور پھر یہ خلافت بنی نوع انسان میں ودیعت کر کے خلافت ارضی کے مند کو واضح کر دیا۔ مگر اس رکوع کا موضوع خلافت ارضی ہے۔

قرآن پاک کی آیات مبارکہ اور احادیث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جو لوگ دنیا کی زندگی کے بعد حشر و نشر کی منازل طے کر کے جنت میں پہنچیں گے۔ ان میں سے ہر شخص بادشاہ ہوگا۔ اس دنیا میں تو بادشاہی کروڑوں میں سے ایک کو نصیب ہوتی ہے۔ مگر جنت کے ہر باشندے کا اعزاز دنیا کے بادشاہ سے کہیں زیادہ ہوگا۔ ہر جنتی کو آرام و راحت کے لیے الے سلمان میسر ہوں گے۔ جو دنیا کے کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں جنت میں ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ بھی حاصل ہو جائے۔

تخلیق الہی سے
قبل کے ادوار

اس رکوع میں تخلیق آدم کا ذکر ہے، مگر پہلے کے ادوار کو ہم نہیں جانتے۔ کسی کو خواب میں بھی معلوم نہیں ہوا۔ کہ آدم علیہ السلام سے پہلے کتنے دور گزر چکے ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب "تغیبات الہیہ" میں بیان کیا ہے۔ اور شاہ اسماعیل شہید

نے بھی اپنی کتاب "بعثات" میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ کسی حکیم انسان کا کمال یہ ہے۔ کہ وہ صرف آدم علیہ السلام کے دور ہی کو ابتداء سے انتہا تک سمجھ لے۔ چہ جائیکہ کوئی شخص اس دور سے پہلے کے ادوار کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ حضرت مجتہد دالغ ثانیؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان کے بعد امجد خود شاہ ولی اللہؒ اس امت کے آخری دور کے حکمہ میں سے ہیں۔ البتہ ان پہلے بڑے بڑے حکماء گزشتہ ہیں جنہوں نے قرآن پاک کی تفاسیر اور تاریخ کی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں امام ابن کثیرؒ بڑے پائے کے محدث، مفسر اور تاریخ دان ہوئے ہیں۔ آپ امام ابن تیمیہؒ کے شاگرد تھے آپ کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری ہے۔ آپ کی تفسیر کی مشہور کتاب ابن کثیرؒ ہے آپ نے بخاری شریف کی شرح اور اصول حدیث پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ آپ کی تاریخ کی کتب البدایہ والنہایہ سنایت مستند کتاب ہے۔ جو چودہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے ابتداء سے لے کر اپنے دور تک تمام زمانوں کی تاریخ لکھی ہے۔ یہ کتاب آپ نے روایت کے اعتبار سے ترتیب دی ہے۔ صحیح اور غلط روایت کی پڑتال کی ہے۔ اگرچہ ابن خلدونؒ اور ابن جریرؒ جیسے بڑے مؤرخوں نے تاریخ کی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ سینکڑوں اور ہزاروں تاریخ کی کتب موجود ہیں۔ مگر ان سے مستند ترین کتاب امام ابن کثیرؒ کی ہے۔

اس کتاب کی پہلی جلد میں امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے

اس زمین پر کسی دور گزر چکے تھے۔ مثلاً ایک قوم یا افراد کو جن کئے تھے، اس کے بعد جن کا دور گزرا۔ اور پھر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے دو ہزار سال قبل اس دنیا میں جنات کا دور دورہ تھا۔ انہوں نے زمین میں فساد برپا کیے۔ جس طرح آج کل کی دنیا میں قتل و غارت گری ایک عام معمول ہے اس طرح اُس دور کے جنات میں بھی جنگ و جدل عام تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جنات کی سرکوبی کے لیے فرشتوں کو بھیجا۔ چنانچہ اسوں نے جنات کو مار مار کر پیادوں اور جزیروں میں بھگا دیا اور اس زمین کو صاف کیا۔ اس واقعہ کے دو ہزار سال بعد آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔

جنات کا ذکر تو قرآن پاک میں بیشتر مقامات پر آیا ہے۔ تاہم جن اور جن کے ادوار کا علم تاریخی روایات سے ہوتا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ موجودہ دور سے پہلے کتنے دور گزر چکے ہیں۔ حکماء نے اپنی اپنی تحقیق کے مطابق اپنی کتابوں میں ان ادوار کا ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں، فرشتوں، جنات اور شیاطین کو مختلف مادوں سے پیدا فرمایا۔ پھر ان مادوں کے عناصر بھی مختلف ہیں۔ فرشتے ایک خاص ذریعہ مادے سے پیدا کئے گئے ہیں۔ پھر ان فرشتوں کے مختلف درجات ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ فرشتوں میں سب سے اعلیٰ درجہ ملا اعلیٰ کا ہے۔ یہ عالمین عرش فرشتے ہیں۔ درجہ نمبر پر حَافِظِ حَوْلِ الْعَرْشِ والے فرشتے ہیں۔ یہ سب خطیرۃ القدس کے فرشتے ہیں۔ پھر آسمانوں کے فرشتے پھر فضائی فرشتے، اس کے بعد ہوائی فرشتے اور ارضی فرشتے ہیں جو زمین پر موجود ہوتے ہیں۔ یہ مائفل کے فرشتے ہیں۔

حجۃ اللہ الباقیہ میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اول درجے کے فرشتوں کا مادہ تخلیق اُس آگ کی مانند ہے جو دوران سفر طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ظاہر ہوئی۔ آپ اپنی زوجہ کے ہمراہ جا رہے تھے۔ بھیڑ بکریاں ساتھ تھیں۔ رات کا اندھیرا تھا۔ بیوی حاملہ تھی۔ اُن کو در ذرہ شروع ہو گیا موسیٰ علیہ السلام کو دُور سے آگ نظر آئی۔ آپ اُس طرف گئے۔ تودہ آگ ایک درخت سے نکل رہی

تھی۔ جو درخت کے پتوں کو جلانے کی بجائے انہیں سرسبز و شاداب کر رہی تھی۔ آگ جس قدر بھڑکنی تھی وہ درخت کی شاخوں اور پتوں میں شادابی آتی تھی۔ یہ واقعہ کس قدر قرآن پاک میں موجود ہے۔ بعض تصریحات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ آگ نہیں تھی بلکہ حجاب نوری یا ماری تھا۔ الغرض! فرشتوں کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے مادے سے کی۔ پھر اس میں مقدس رو میں ڈالیں۔ جس طرح انسانوں اور جنوں میں رو میں موجود ہیں۔ اسی طرح فرشتوں میں بھی رو میں ہیں۔

جنات اور شیاطین

جنات کے مادہ تخلیق کے متعلق قرآن پاک میں موجود ہے: وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارٍ یعنی جنات کا مادہ تخلیق آگ اور ہوا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ شیاطین کا مادہ تخلیق سنایت گندا اور غلیظ ہوتا ہے۔ بالکل سدا اس کی مانند کہ جب وہ زیادہ مقدار میں ہوتا ہے۔ تو اس سے بخار اور بواٹھتی ہے۔ تو گویا جنات اور شیاطین کا مادہ آگ اور ہوا ہے۔ اس میں گیس برقی ہے۔ اور تپش کا مادہ بھی ہوتا ہے۔

انسان کا مادہ تخلیق

انسان کا مادہ تخلیق خاک ہے۔ دنیا میں جتنے بھی خارجی عناصر پائے جاتے ہیں۔ وہ سب آدم کے وجود میں موجود ہیں۔ تخلیق انسانی کے متعلق قرآن پاک میں آتے ہیں خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ الْإِنْسَانِ كَالْعَصْرِ والی مٹی سے پیدا کیا۔ دو صکر مقامات پر تراب اور طین کا لفظ بھی آتا ہے۔ الغرض! انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔ اور یہ تخلیق باقی تخلیقات کی نسبت پیچیدہ ہے۔ اس میں تمام عناصر پائے جاتے ہیں۔

اس مقام پر تخلیق انسانی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً یعنی اس بات پر غور کرو کہ جب تیرے پروردگار نے فرشتوں کے سامنے فرمایا کہ تحقیق میں میں میں خلیفہ بنانے والا ہوں گویا آدم کی تخلیق اس واسطے ہوئی کہ اُسے دنیا میں خلیفہ مقرر کیا جائے۔ لہذا آدم کی تخلیق مستقل تخلیق نہیں بلکہ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں خلافت کا ایک اہم ترین مسئلہ بھی سمجھا دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا: يٰۤاٰدُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْاَرْضِ یعنی اے داؤد! ہم نے آپ کو دنیا میں خلیفہ بنایا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام
خلیفۃ اللہ ہیں

قرآن پاک میں خلیفہ دوسمعی میں آتا ہے۔ پہلا معنی وہی ہے جو آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ میں آپ کو اپنا خلیفہ یعنی نائب بنانے والا ہوں۔ خَلَفَ يَخْلُفُ دوسرے کے پیچھے آنے والے یعنی نیابت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں یہ بھی آتا ہے هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنْ خَلْفِكُمْ فِي الْأَرْضِ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ذات ہے جس نے تمہیں ایک دوسرے کا جانشین یا خلیفہ بنایا جس طرح بیٹا اپنے باپ کا جانشین ہوتا ہے۔

خلیفہ کا دوسرا معنی جو اس مقام پر واضح ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنا خلیفہ یعنی نیابت انجام دینے والا پیدا کیا۔ انسان کے علاوہ باقی بے شمار مخلوقات بھی اس زمین پر پیدا کی گئی ہیں۔ مگر خلافت کا حق اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت انسان کو دیا ہے۔ اور اس سے بھی مراد یہ ہے کہ زمین اور ساری کائنات کی اصل بادشاہت تو اللہ تعالیٰ کی ہے۔ آدم علیہ السلام کو صرف نیابت تفویض ہوئی ہے۔ گویا انسان دنیا میں خلافت اپنی مرضی سے انجام نہیں دے گا۔ بلکہ حکم تو اللہ تعالیٰ کا ہو گا۔ اور انسان اس حکم کو نافذ کرنے کا ذمہ دار ہو گا۔ سورۃ نور میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام اور صحابہ کرام سے جس خلافت کا وعدہ فرمایا اور جس کو پورا فرمایا وہ یہی خلافت ہے: رَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ

منہ خلافت
معنوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ نظام، نظم خلافت ہے۔ دین میں ملوکیت اور ڈکیتروشی کی کوئی حیثیت نہیں۔ انسان تو اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا نظام نافذ کرنے والا ادارہ ہے۔ اس کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ کہ جس قسم کے احکام چاہے نافذ کرے بلکہ اُسے احکام اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل کرنا ہوں گے۔

مسلمانوں کے تمام فرقے اس بات پر متفق ہیں کہ خلیفہ منتخب ہونا چاہیئے۔ صرف ایک خارجی درہ ایسا ہے جو کہتا ہے کہ حکومت اللہ ہی کی ہے۔ کوئی اس کا خلیفہ نہیں ہے۔ یہ انارکسٹ لوگ ہیں جو خلافت کو تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق ہی بطور خلیفہ کے کی ہے۔ اس معاملہ میں شیعہ مذہب بھی باطل ہے۔ کہ اس کے پیروکار خلیفہ یا حاکم (امام) کو محسوم اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر شدہ مانتے ہیں۔ یہ نظریہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ خلیفہ کو

منتخب کرنے والے عام لوگ ہیں۔ اور وہی اسے معزول بھی کر سکتے ہیں۔

اس مسئلہ میں اہل سنت والجماعت کا نظریہ بالکل واضح ہے کہ خلیفہ کا انتخاب واجب ہے اس کو مخصوص اور مقرر نہیں کیا گیا۔ بلکہ جماعت المسلمین پر چھوڑا گیا ہے کہ وہ اپنے میں سے بہتر شخص کو اس منصب پر فائز کر لیں۔ خلیفہ کے بغیر نظام ارضی کا چلانا درست نہیں ہے صحابہ کرامؓ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کی وفات پر مسئلہ خلافت آپ کے دفن سے پہلے طے کر لیا گیا۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اگر مسئلہ خلافت طے نہ کیا جاتا تو امت کے اختلافات کا ختم ہونا ممکن نہ تھا۔ خود حضور علیہ السلام کے دفن کے متعلق اختلاف رائے پیدا ہوا۔ کسی کی رائے یہ تھی کہ آپ کا جہد اطہر بیت المقدس لے جایا جائے۔ کوئی مکہ معظمہ لے جانے کے حق میں تھا۔ تو اس کا فیصلہ بھی حضور علیہ السلام کے جلسہ نبی حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کیا۔ انہوں نے کہا اے کہ اس معاملہ میں جھگڑا نہ کرو۔ میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا تھا کہ جس جگہ پر آپ کا وصال مبارک ہوا۔ اُسی جگہ پر آپ کو دفن کیا جائے گا۔ اس طرح یہ اہم معاملہ طے ہو گیا۔ تاہم یہ واضح ہے کہ قرآن پاک یا حضور نبی کریم علیہ السلام نے کسی کا نام لے کر خلافت کا فیصلہ نہیں کیا۔ بلکہ یہ کام جماعت المسلمین پر چھوڑا کہ جس کو مناسب سمجھیں، خلیفہ مقرر کر لیں۔ البتہ نبی علیہ السلام نے اشارتاً یہ بات سمجھا دی **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ وَالْمُؤْمِنُونَ إِنَّمَا أَبَا بَكْرٍ** یعنی میرے بعد اللہ تعالیٰ بھی انکار کرے گا اور مومن بھی انکار کریں گے کہ خلیفہ ابو بکرؓ کے سوا کوئی نہیں ہونا چاہیے۔

انتخاب خلیفہ کا ایک طریقہ تو یہ ہو گیا کہ عامۃ المسلمین جس کو چاہیں اپنے میں سے خلیفہ منتخب کر لیں جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے انتخاب ہوا۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے ذرائع بھی ہیں۔ جو امت میں ملتے ہیں مثلاً حضرت ابو بکرؓ نے اپنے آخری ایام میں حضرت عمرؓ کا انتخاب بطور خلیفہ خود کر دیا تھا۔ آپ نے ایک خط لکھ دیا تھا کہ لوگوں کے سامنے پڑھو دینا۔ یہ گویا خلافت کا پروانہ تھا۔ حضرت عمرؓ

۱۔ شامل ترمذی ص ۶۰ ۲۔ شامل مع ترمذی ص ۶۰، مطبع نور محمد کراچی

۳۔ مسلم ص ۲۴۳ ۴۔ البدایہ والنہایہ ص ۱۸

امت میں بہترین آدمی تھے۔ ان کا انتخاب اس طرح عمل میں آیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے بعد خلافت کا فیصلہ کرنے کے لیے چھ آدمیوں کی شورعی قائم کی اور فرمایا کہ میرے بعد خلافت کا فیصلہ یہ لوگ کریں گے۔ یہ چھ آدمی وہ تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہونے وقت ان سے بڑے راضی تھے۔ چنانچہ ان حضرات نے حضرت عثمان غنیؓ کو خلیفہ منتخب کیا۔

خلافت پر فائز ہونے کی ایک چوتھی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص خود بخود غلبہ پا کر حکومت حاصل کرے۔ کہتے ہیں کہ ایسا شخص بھی قابل اطاعت ہے۔ ہاں اگر وہ شریعت کے احکام جاری کرنے میں کوتاہی کرے۔ تو اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اس کے احکام نافذ کرنے کے لیے خلیفہ بنایا۔ اور پھر یہ خلافت آپ کی نسل میں باقی رکھی کہ خلافت کا حق بنی نوع انسان کو حاصل ہے۔ یہ حق کسی اور مخلوق کو نہیں پہنچتا۔
الغرض! جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنا نائب مقرر کرنے کا ارادہ فرمایا تو "قَالَ لَا اتَّخِذُ فِيهَا مَنْ يَفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ"۔ یعنی فرشتوں نے کھائے مولا کریم تو دنیا میں ایسی ہستی کو اپنا خلیفہ مقرر کرنا چاہتا ہے جو زمین میں فساد کریں گے۔ اور خون بہائیں گے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ فرشتوں کا یہ جواب کئی وجوہات کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ اولیٰ یہ کہ خود اللہ تعالیٰ نے یہ بات انیس الہام کی ہو جس کی بنا پر انہوں نے یہ رائے دی۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتوں نے جنات کے حالات پر قیاس کیا۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ جنات نے زمین پر فتنہ و فساد برپا کیا۔ لہٰذا انہوں نے گمان کیا کہ آدم کی اولاد بھی ایسا ہی کرے گی۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ فرشتوں نے خلیفہ کے لفظ سے یہ قیاس کیا کہ خلیفہ جب زمین پر حکومت کی باگ ڈور سنبھالے گا۔ تو وہاں پر لازماً فتنہ و فساد اور خونریزی بھی ہوگی۔ لہٰذا انہوں نے اللہ تعالیٰ کو یہ جواب دیا۔ تاہم زیادہ تر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ فرشتوں کا یہ گمان جنات کے حالات کی بنا پر تھا۔

اس گمان کے اظہار کے ساتھ ساتھ فرشتوں نے بارگاہ رب العزت میں یہ بھی عرض کیا وَخَرَجُوا

نَسِجُ جَمْدِكَ مَوْلَايُم: اس فتنہ و فساد برپا کرنے والی مخلوق کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں تیری حمد کے ساتھ۔ وَنَقْدُ سُلْكَ اور تیری پاکیزگی بھی بیان کرتے ہیں۔ لہذا ہم اس کام کے لیے کافی ہیں۔

تحمید کا معنی یہ کہ خوبی کی تمام باتیں اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ اور تنزیہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات ہر قسم کے نقائص اور عیوب سے پاک ہے۔ وہ ہر قسم کی کمزوریوں اور نقائص والی چیزوں سے مبرا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ تمام شہریوں سے پاک ہے۔

فرشتوں کا یہ جواب سُن کر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قَالَ اِنِّي اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ اے فرشتو! تم اس راز کو نہیں جانتے۔ صرف میں ہی جانتا ہوں کہ میں نے آدم میں کس قدر کمال اور شرف و ولایت کیا ہے۔

الْقَمَرُ

البقرة

درس شانزدہم ۱۶

(آیت ۲۱ تا ۲۴)

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَكِ
فَقَالَ أَسْمُوْنِي بِأَسْمَاءٍ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۱﴾
قَالُوا سُبْحَنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ
الْحَكِيمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَاءِهِمْ فَلَمَّا
أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَاءِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ
غَيْبَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ
تَكْتُمُونَ ﴿۳۳﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سائے نام سکھائیے۔ پھر پیش کیا ان
کو فرشتوں پر۔ پس کہا مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو ﴿۳۱﴾ انہوں نے
کہا پاک ہے تیری ذات۔ نہیں ہے ہمارے پاس علم مگر وہ جو تو نے ہم کو سکھایا ہے۔
بیشک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے ﴿۳۲﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم!
بتلائیے ان کو ان چیزوں کے نام پس جب اُس نے ان کو ان چیزوں کے نام
بتلا دیے تو فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمینوں
کی پوشیدہ چیزوں کو۔ اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو۔ اور جس کو
تم چھپاتے ہو۔ ﴿۳۳﴾

اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع ان کو حدیث اختیار کرنے اور اپنے خالق کی عبادت کرنے
کا حکم دیا ہے۔ اور اس کی پہچان کے سلسلے میں اُس کی صفات و کمالات کا ذکر ہوا۔ اللہ تعالیٰ
نے ان انعامات کا ذکر فرمایا جو اُس نے نسل انسانی پر کیے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام
کی تخلیق کا ذکر کیا "وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَكِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً"۔
اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے تذکرہ کیا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں تو فرشتوں

نے جواب میں کہا: اَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا؟ کیا تو زمین میں ایسی ہستی کو بنائے گا جو فساد کریگی اور خون بہائے گی۔ حالانکہ ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں۔ تیری حمد کے ساتھ۔ اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ "یعنی بیشک میں جانتا ہوں، جو تم نہیں جانتے۔"

خلافت کے متعلق بھی پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ خلافت نیابت کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ان کی اولاد کو بطور خلیفہ فرمایا ہے۔ تاکہ وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کی نیابت کے فرائض انجام دے سکیں، مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر شرعی قانون انسان کے ذریعے نافذ فرمایا ہے۔ اور انکو اپنی احکام یعنی وہ احکام جو انسانوں سے متعلق نہیں ہیں وہ قدرت کے مقرر کردہ دوسرے کارندے انجام دیتے ہیں۔

تخلیق آدم پر فرشتوں کا گمان کرنا کہ یہ زمین پر فتنہ و فساد برپا کرے گا۔ اس کا بیان بھی ہو چکا۔ فرشتوں نے خیال کیا کہ خلیفہ کی ضرورت ہی ایسی جگہ پڑتی ہے۔ جہاں قتل و غارت اور خوریزی ہوگی۔ لہذا انہوں نے ایسا گمان کیا۔ یا پھر یہ وجہ تھی کہ انہوں نے انسانوں کو جنوں پر قیاس کیا۔ جو اس نسل سے پہلے اس زمین پر فتنہ و فساد برپا کر چکے تھے۔

آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے درمیان سوال و جواب ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے کی حکمت کے اظہار کے لیے فرمایا: وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سب نام سکھائیے۔ ان ناموں سے کیا مراد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے کون سے نام آدم علیہ السلام کو سکھائے۔ اس سلسلے میں مفسرین کرام کے کئی اقوال ہیں۔ تفسیر البسود اور مذک عربی زبان کی چار چار جلدوں کی مختصر تفسیریں ہیں۔ ان کے مؤلفین حنفی اہم تھے۔ وہ اور بعض دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ سے مراد تمام انواع و اجناس کے نام ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے سکھائے۔ اس سے مراد ہر فرد کا نام سکھانا نہیں۔ کیونکہ ہر فرد اور جہز کا تعلق غیب سے ہے۔ اور اسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا۔ انواع و اجناس

آدم علیہ السلام کو
کئی چیزوں کے
نام سکھائے گئے

آدم علیہ السلام کو تمام ضروری اشیاء کے نام سکھانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آزمایا۔ چنانچہ وہ تمام چیزیں فرشتوں کے سامنے پیش کر دیں ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اور فرشتوں کو حکم دیا اِنْبِئُوْنِيْ بِاَسْمَاءِ هٰۤؤُلَآءِ مجھے ان تمام چیزوں کے نام بتاؤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم سچے ہو۔ یعنی اے فرشتو! تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ انہی مخلوق کے پیدا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ تم میری تسبیح و تقدیس بیان کرنے کے لیے کافی ہو۔ اور یہ مخلوق تو دنیا میں خوریزی کرے گی مگر تم نہیں جانتے کہ انہی کون سے کمالات کا محل ہو گا۔ مجھ ان کے علم و فہم کا کمال سب سے اعلیٰ ہے۔ جو اے دیا گیا ہے۔ اور خلیفہ کے لیے ان چیزوں کی مابیت اور حقیقت کا جاننا بھی ضروری ہے۔ جن پر اُس نے احکام کا نفاذ کرنا ہے۔ مثلاً اگر خلیفہ کو شراب کی خاصیت کا ہی علم نہ ہو کہ یہ کس طرح انسانی عقل کو مآوٹ کرتی ہے۔ اور یہ کن نقصانات کی وجہ سے ام الحماضٹ کسلائی ہے۔ تو خلیفہ شراب کے رسیا کو سزا کیسے دے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تمام ضروری چیزوں کے نام، ان کی حقیقت اور مابیت سے آدم علیہ السلام کو آگاہ کر دیا۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کا پورا پورا حق ادا کر سکے۔

فرشتے اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے۔ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ كُنْ لَّغٰی مَوْلَاکَ رَیْمٌ تیری ذات پاک ہے لا علم لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ہمیں اعتراف ہے کہ ہمیں ان چیزوں کے اسماء ان کی خاصیت اور مابیت کا علم نہیں ہے۔ ہم اس معاملہ میں عاجز ہیں۔ ہمارا علم تو اسی قدر ہے جس قدر تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ اس کے علاوہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بتلادیا تھا کہ آدم میں ہمیت اور ملکیت دونوں خواص ہوں گے۔ مگر فرشتوں کی نگاہ صرف ہمیت تک ہی پہنچی۔ آدم کی ملکیت تک نہ گئی۔ چنانچہ اس کمال کو واضح کرنے کے لیے علمی صلاحیت پیش کی۔ تب فرشتوں نے عاجزی کا اظہار کیا۔ کہ ہمارے پاس یہ کمال نہیں ہے۔

ہیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے عطا کیا۔ ہاں جس ہستی کے پاس علم و فہم کا یہ خزانہ ہو گا۔ خلافت کے لائق وہی ہوگی۔ اور وہی ہستی قانون خداوندی کو نافذ کر سکے گی۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک علم فرشتوں کو عطا ہی نہیں کیا تو ان کے امتحان کا کیا مطلب؟ اگر آدم علیہ السلام کی طرح فرشتوں کو بھی وہ علم سکھلایا جاتا تو وہ بھی جواب دے دیتے۔ اس کے جواب میں مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو اس کی تعلیم فرشتوں کی موجودگی میں ہی دی گئی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو ان چیزوں کی ضرورت تھی۔ لہذا انہوں نے ان کے نام ذہن میں محفوظ کر لیے مگر فرشتوں کو چونکہ ایسی چیزوں کی ضرورت ہی نہ تھی لہذا انہوں نے یہ نام ذہن نشین نہ کرنے کی کوشش ہی نہ کی۔

اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی استاد پوری کلاس کے سامنے پچھلے سبق کی پوری پوری وضاحت کر دے۔ مگر بتا رہا ہے کہ امتحان کے وقت بعض طالب علم ٹھیک ٹھیک جواب دیتے ہیں۔ مگر بعض کو کچھ یاد نہیں ہوتا۔ حالانکہ استاد نے سب کو بیک وقت ایک ہی پچھر دیا تھا۔ یہی حال آدم علیہ السلام اور فرشتوں کا ہوا۔ آدم علیہ السلام نے حسب حال بھولنے کی بناء پر ان چیزوں کے نام یاد کر لیے اور بوقت امتحان بتا دیے مگر فرشتے اس سبق کو ضبط نہ کر سکے لہذا انہوں نے امتحان کے وقت عاجزی کا اظہار کر دیا۔

افترض! جب فرشتے اس امتحان میں ناکام ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے قَالَ يٰٰآدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاسْمٰیْہُمْ فرمایا اے آدم! ان کو ان چیزوں کے نام بتا دے۔ چنانچہ اَنْبَاہُمْ بِاسْمٰیْہُمْ جب آدم علیہ السلام نے ان کو ان چیزوں کے نام بتا دیے کہ یہ بٹریا ہے۔ اس میں سالن پکایا جاتا ہے۔ یہ تو اسے اس پر دہائی پکائی جاتی ہے۔ یہ فلاں چیز ہے۔ یہ فلاں چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس قدر امتحانی سوال کیے۔ آدم علیہ السلام نے فر فر جواب دے دیے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ یٰٰمٰی نَبِیِّیْنَ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا اِنِّیْ اَعْلَمُ غِیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالدُّنْیَا فِیْہِمْ کہ میں آسمان و زمین کی پوشیدہ چیزوں کو جاننے والا ہوں۔

آدم علیہ السلام
کی کامیابی

یہاں آسمان و زمین کے غیوب کا تعلق مخلوق کے اعتبار سے ہے۔ ذکر اللہ تعالیٰ کے لیے
 بھی کوئی چیز غائب ہے۔ اس کے لیے تو کوئی چیز بھی پس پردہ نہیں۔ البتہ مخلوق کے لیے
 بعض چیزیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور بعض پوشیدہ۔ دوسری جگہ ہے ”وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ
 مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ“ تیرے رب کے تو ایک ذرہ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ اس پر تو ہر چیز عیاں ہے۔
 اللہ تعالیٰ کے ساتھ عالم الغیب والشہادۃ اس لیے بولا جاتا ہے۔ کہ وہ ہر چیز کو جانتا
 ہے۔ جو مخلوق کے اعتبار سے پوشیدہ ہے یا ظاہر ہے۔ یہاں پر بھی اِنِّیْ عَلَّمَ غَيْبِ
 السَّمَوٰتِ وَالْاَرْضِ کا مطلب یہی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں زمین و آسمان کی تمام
 چیزوں کو جانتا ہوں، جو مخلوق یعنی انسان، جن اور فرشتوں کے اعتبار سے خواہ پوشیدہ ہیں یا
 ظاہر ہیں۔ حتیٰ کہ آدم علیہ السلام کی صلاحیت اور ان کے کمال کو بھی جانتا ہوں۔ اے فرشتو! تمہاری
 نظر تو آدم علیہ السلام کی ہیئت تک ہی پہنچی ہے اور اسی سے تم نے اندازہ لگایا ہے۔ کہ یہ
 فتنہ دغا دہرے گا۔ اور خونیازی کا مرتکب ہوگا۔ یا تم نے جات پر قیاس کر کے کہہ دیا ہے
 کہ آدم زمین میں لڑائی سمجھوٹے کا موجب بنے گا۔ تمہاری نظر اس کے کمال تک پہنچ جاتی تو یہ
 گمان نہ کرتے۔

ہو سکتا ہے کہ فرشتوں کے دل میں یہ بات آئی ہو کہ اے مولا کریم! ہم تیری تسبیح و تقدیس
 بیان کرنے والے ہیں لہذا اگر زمین میں نیابت کی ضرورت ہے۔ تو ہم حاضر ہیں۔
 اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ہر اُس چیز کو جانتا ہوں جس کو تم ظاہر کرتے ہو یا چھپاتے
 ہو۔ اے فرشتو! شاید تمہارا خیال ہو کہ جو صلاحیت ہم میں پائی جاتی ہے۔ وہ آدم میں نہ پائی جاتی ہو۔
 مگر یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے آدم میں وہ کمال رکھ دیا ہے۔ جہاں تک تمہاری رسائی نہیں ہے۔
 لہذا نیابت کا حقدار آدم علیہ السلام ہی ہے۔ اسی لیے فرمایا ”وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ
 تَكْتُمُونَ“ اے فرشتو! میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔
 اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی بزرگی اور فضیلت کو عملی طور پر فرشتوں کے سامنے پیش
 کیا ہے۔ چنانچہ اگلی آیات میں فرشتوں کو سجدہ کے حکم کا بیان ہے۔

الْمَ

الْبَقِيَّةُ -

درس ہفتم ۱

(آیت ۲۴ تا ۲۹)

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا اِلَّا اِبْلٰسَ
 اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۴ وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ
 اَسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ
 شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الصّٰمِيْنَ
 ۝۲۵ فَازْلٰهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا
 فِيْهِ ۝ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ
 فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝۲۶

ترجمہ :- اور اس بات کو اپنے دھیان میں لاؤ جب کہا ہم نے فرشتوں سے
 سجدہ کرو آدم کے لیے پس سجدہ کیا انہوں نے۔ مگر ابلیس نے انکار کیا اور تکبر
 کیا اور وہ کفر کرنے والوں میں سے تھا ۝۲۴ اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری
 بیوی جنت میں رہو۔ اور تم دونوں اس میں سے وسعت اور کشادگی سے کھاؤ۔
 جہاں سے بھی چاہو۔ اور تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا، پس ہو جاؤ گے
 تم دونوں ظلم کرنے والوں میں سے ۝۲۵ پس پھلایا اُن دونوں کو شیطن نے
 اُس سے۔ پس اُن کو اُس نعمت سے نکالاجس کے اندر وہ تھے اور ہم نے کہا اتر
 جاؤ بعض تمہارے بعض کے لیے دشمن ہیں۔ اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا

ہے۔ اور ایک مدت تک فائدہ اٹھانے کی بات ہے ۝۲۶

فرشتوں کی
 سجدہ دینی
 حضرت آدم علیہ السلام کو خلافت عطا کرنے پر فرشتوں کو آپ کی نصیحت کا علم ہو
 گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کی تعظیم فرمائی۔ تاکہ ان کی نیابت واضح ہو جائے۔
 تو فرشتوں کو حکم ہوا۔ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ کہ آدم علیہ السلام کے
 لیے سجدہ کرو اِلَّا اِبْلٰسَ مگر ابلیس نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔

مفسرین کرام نے اس مسئلہ میں بڑی بحث کی ہے۔ کہ جو سجدہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے
 آدم علیہ السلام کے لیے کرایا، وہ کس قسم کا سجدہ تھا۔ انتہائی درجے کی عاجزی، تذلل اور تواضع
 کے ساتھ پیشانی کو زمین پر رکھ دینا سجدہ کہلاتا ہے۔ اور اس کی مختلف قسمیں ہیں مثلاً اگر پیشانی
 معبودِ حق کے حق کو ادا کرنے کے لیے جھکا کر ہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا ایسا کونسا ہر دور اور ہر
 شریعت میں حرام، باطل، کفر اور شرک رہا ہے۔ اور ایسے سجدہ کو سجدہ عبادت کہتے ہیں۔ البتہ
 سجدہ تحیہ و تحکیم جو محض عزت و اعزاز کے لیے کیا جائے۔ یا جو سلام کے وقت کیا جائے۔ یا
 سجدہ پہلی شریعتوں میں رواجاً۔ مگر ہماری شریعت میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کو یہ سجدہ
 کرنا بھی عرام قرار دیا گیا ہے۔ جو سجدہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام سے رو برد کیا۔ یہ سجدہ تعظیمی تھا
 یہ سجدہ عبادت نہ تھا۔ جو ہر شریعت میں حرام رہا ہے۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ سجدہ عبادت اور سجدہ تعظیمی کے درمیان فرق صرف نیت سے ہی
 ممکن ہے۔ اگر بوقت سجدہ نیت یہ ہے کہ یہ وہی سجدہ ہے جو حق تعالیٰ کے سامنے ہوا ہے
 تو پھر ایسا سجدہ غیر اللہ کے سامنے کفر اور شرک ہوگا۔ اور اگر سجدہ محض تعظیم و تحیہ کے لیے ہے
 تو یہ پہلی امتوں میں جائز تھا۔ جیسے یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کا یوسف علیہ السلام کو سجدہ یا فرشتوں
 کا آدم علیہ السلام کو سجدہ۔ مگر ہماری شریعت میں ہر قسم کا سجدہ ناجائز ہے۔ خواہ وہ تعظیمی ہو یا بلاتی
 ہو۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی غیر کے سامنے سجدہ منع ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں حضور
 علیہ السلام کا فرمان ہے لَوْ كُنْتُ أَهْرَاحِدًا لَّارْتُ الْمَرْأَةُ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا
 یعنی اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کے سامنے سجدہ کرے
 کہ اللہ تعالیٰ نے خاوند کا بڑا حق رکھا ہے۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے لَّا يَصْلَحُ
 لِبَشَرٍ أَنْ يَسْجُدَ لِبَشَرٍ یعنی کسی انسان کے لیے لائق نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو
 سجدہ کرے۔ ایک صحابی نے حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضرت! ہم باہر

۱۔ تفسیر عزیزی فارسی پارہ ۱۴، تفسیر ابن کثیر ص ۱۶، ۲۔ حجة اللہ ابالغہ ص ۶۶

۳۔ ترمذی ص ۱۸۷، ۴۔ منہاج احمد ص ۱۵۹

خدا تعالیٰ کے
 اس جواب پر قسم
 سجدہ حرام ہے

جا کر دیکھتے ہیں کہ دہاں کے لوگ اپنے بادشاہوں کو سجدہ کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ تو باطل ہیں۔ اور آپ نبی برحق ہیں۔ تو ہم آپ کے سامنے کیوں سجدہ نہ کریں۔ حضور علیہ السلام نے منع فرما دیا اور کہا کہ دیکھو بھائی! جب میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ تو کیا تم میری قبر پر سجدہ کر دو گے۔ تو اس شخص نے کہا حضور! ہم ایسا نہیں کریں گے۔ آپ نے فرمایا جس طرح میری قبر پر سجدہ حرام ہے۔ اسی طرح میرے سامنے سجدہ گونا آج بھی حرام ہے خواہ تعظیم ہی کیوں نہ ہو۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں: کہ اگر کسی نے قبر کو سجدہ کیا تو اس کو کفر اور شرک تو نہیں کہیں گے مگر اس کے حرام ہونے میں سب کا اتفاق ہے۔ اور اگر اس سجدے مراد وہی سجدہ ہے جو بندے اپنے رب کے سامنے کرتے ہیں۔ تو ایسا کرنے والا کافر اور مرتد ہو جائے گا۔ اور اگر محض تعظیم کے لیے قبر بادشاہ یا استاد کے سامنے کیا ہے۔ تو تمام صحیحہ کرام، ائمہ دین، علمائے کرام اور سلف صالحین کا متفقہ فتویٰ ہے کہ اس کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں۔ اگرچہ کفر کے درجے تک نہیں پہنچتا۔

فرشتوں کے سجدہ کی بعض وجوہات

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں: کہ حضرت آدم علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کو سجدہ بمنزلہ قبلہ کے تھا۔ یعنی حقیقت میں سجدہ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا گیا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام محض جہت تھے۔ جن کی طرف منہ کر کے سجدہ کیا گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ ہم آج بھی قبلہ کی طرف منہ کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریزہ ہوتے ہیں۔ اور اس سے مراد قبلہ کو سجدہ کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ سجدہ تو اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح فرشتوں نے بھی آدم علیہ السلام کی طرف منہ محض قبلہ ہونے کی حیثیت سے کیا تھا۔ سجدہ آدم علیہ السلام کو نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہی تھا۔

بعض فرماتے ہیں کہ لا اِذْمَ کَانَ سَبْحِیْہِ یعنی حکم یہ تھا کہ حق تعالیٰ کو سجدہ کرو۔ آدم علیہ السلام کی وجہ اور سبب سے۔ اور بعض فقہائے کرام فرماتے ہیں: کہ اس سجدہ میں دونوں باتیں

۱۔ بوداؤد مجاہد ۲۹۱ ۲۔ بیان القرآن ۳۔ ابن کثیر ۴۔ دہ منثور ۵۔

۶۔ تفسیر مظہری ۷۔ ابن کثیر ۸۔ معالم التنزیل ۹۔

پائی جاتی ہیں۔ یعنی سجدہ و عبادت تو اللہ تعالیٰ کے لیے تھا۔ اور تعظیم و تکریم آدم علیہ السلام کے لیے تھی۔
گویا یہ خلافت کا تعظیمی سجدہ تھا۔

سجدہ خلافت یا سجدہ تعظیمی میں سجدہ الیر بالذات ہوتا ہے۔ حضرت مولانا نواز قوی فرماتے ہیں کہ سجدہ عبادت میں سجدہ الیر بالذات ہوتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا عبید اللہ ندوی مفسر قرآن کی ترجمانی یہ ہے کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی اس زبردست تجلی کو سجدہ کیا تھا۔ جو آدم علیہ السلام کے قلب پر پڑ رہی تھی۔ یہی ترجمہ مولانا نواز قوی نے خانہ کعبہ کے متعلق اس وقت کی تھی جب ایک ہندو دیانند سہریتی نے اعتراض پیش کیا تھا۔ اس کا کنایہ تھا کہ اگر ہندو پتھر کی مورتیوں کے سامنے سجدہ کرتا ہے۔ تو مسلمان بھی پتھروں سے بنی ہوئی دیواروں والے مکان یعنی خانہ کعبہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ پھر ہندو ائمہ سلمان میں فرق کیا ہوا؟ اس کے جواب میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے فرمایا تھا کہ سلمان اس مکان کو سجدہ نہیں کرتے بلکہ اس تجلی الہی کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ جو اس گھر پر پڑتی ہے۔ چونکہ یہ تجلی عظیم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ لہذا مسلمان پتھر کی دیواروں کو سجدہ نہیں کرتے بلکہ خدا تعالیٰ کو کرتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر کسی وقت خدا نخواستہ بیت اللہ شریف کی دیواریں منہدم بھی ہو جائیں اور بظاہر وہاں کوئی چیز باقی نہ رہے تو بھی مسلمان اسی جہت میں سجدہ ریز ہوں گے۔ برخلاف اس کے ہندو اسی طرف سجدہ کریں گے۔ جس طرف ان کا بت رکھا ہوا ہوگا۔ لہذا معلوم ہوا کہ بت کے سامنے سجدہ کرنا دو مختلف چیزیں ہیں۔

ابن عباس کا ۵۶

الغرض! جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا تو فسجّدوا سب نے سجدہ کیا۔ اِلَّا ابلیس سوائے ابلیس کے۔ یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سجدہ کرنے کا حکم تو فرشتوں کو دیا تھا۔ وَاذْقُنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ السُّجْدَ وَاَمَّا ابلیس کے انکار کا کیا مطلب؟ تو مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ سجدے کا حکم نہ صرف ملائکہ کو تھا، بلکہ جنات کو بھی تھا۔ اور ابلیس جنات میں سے ہے۔ بلکہ ابوالجنات تھا۔ اور جب کسی بڑے کو کوئی حکم دیا جاتا ہے۔ تو

اس کے ماتحت واسے خود بخود اس حکم کے پابند ہو جاتے ہیں۔ سورۃ اعراف میں ابلیس کے متعلق آتا ہے کہ جب اس نے سجدہ نہ کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے دریافت کیا مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ جب میں نے تمہیں حکم دیا تو تو نے سجدہ کیوں نہ کیا؟ معلوم ہوا کہ سجدہ کرنے کا حکم ابلیس کو بھی ہوا تھا۔ اور نسلی طور پر یہ جنات میں سے تھا۔ جیسا کہ سورۃ کہف میں کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهِ وہ جنوں میں سے تھا۔ پس اپنے رب کے حکم سے باہر ہو گیا۔ مقصد یہ کہ سجدہ کا حکم فرشتوں اور جنات دونوں النواع کو ہوا تھا۔ فرشتے آدم علیہ السلام کے سامنے سر بسجود ہو گئے۔ مگر ابلیس اور اس کی قوم نے انکار کیا۔

حضرت یحییٰٰ مینیریؒ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ اور بڑے پائے کے عالم اور بزرگ تھے انہوں نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے کہ ابلیس نے سات لاکھ سال اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تھی۔ مگر ایک حکم کی سرکشی پر مردود ہو گیا۔ اور اتنے لمبے عرصے کی عبادت برباد ہو گئی۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ محدث ابن ابی الدنیل نے اپنی کتاب مکایہ الشیطان میں ایک ہدایت بیان کی ہے۔ مکایہ الشیطان کا مطلب ہے۔ شیطان کی مکاریاں۔ تردہ فرماتے ہیں کہ کسی موقع پر ابلیس کی ملاقات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہو گئی۔ ابلیس نے عرض کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے پاس میری سفارش کریں۔ وہ میری توبہ قبول کرے۔ موسیٰ علیہ السلام نے سفارش کا وعدہ کیا۔ اور دعا میں مشغول ہو گئے۔ اُدھر سے خدا تعالیٰ کا حکم ہوا کہ میں ابلیس کی توبہ اس شرط پر قبول کرنے کو تیار ہوں کہ وہ آدم علیہ السلام کی قبر کو سجدہ کرے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے ابلیس کو یہ شرط پیش کی تو کہنے لگا کہ زندگی میں تو میں نے آدم کو سجدہ کیا اب اُس کی قبر کو سجدہ کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ ابلیس اپنی بات پر پکا تھا۔ اس نے انکار کیا۔ اَبٰی وَاَسْتَكْبَرُ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِیْنَ نہ صرف انکار کیا بلکہ تکبر بھی کیا۔ اور تھا انکار کرنے والوں میں۔

یہاں پر ایک اور مسئلہ بھی سمجھ لیں۔ آپ کے مشاہدہ میں بھی شاید آیا ہو کہ آجکل کے بعض

مرد پست پیروں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ مشرک کا فعل ہے۔ اگر نیت عبادت کی تھی۔ تو سجدہ کرنے والا کافر ہو گیا۔ اور اگر عبادت کی نیت نہ تھی تھی، محض تعظیم مقصود تھی۔ تو اس کے حرام ہونے میں کسی عالم کو کسی بزرگ کو اختلاف نہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ بھی شرک ہے۔ اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اور جو ایسا کرتا ہے اس کو روکنا چاہیے۔

حسد ولین
کن مہ

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ ابن منذر نے عبادۃ بن ابی امیہ سے ایک روایت بیان کی ہے کہ اس کائنات میں سب سے پیداگنا و حسد تھا۔ جو ابلیس نے آدم علیہ السلام پر کیا۔ اور کہا "أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ فُيَسَّسَ اس سے بہتر ہوں۔ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ" مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔ لہذا میں اس سے افضل ہوں۔ میں کیوں اس کو سجدہ کروں۔ یہی ابلیس کی بھول تھی کہ اس نے اپنی شخصیت کی طرف دیکھا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم پر نگاہ نہ ڈالی۔ لہذا مردود و بھڑا۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو کوئی بھی خدا تعالیٰ کے حکم کا انکار کرے گا۔ وہ ابلیس کی طرح کافر ہو جائے گا۔ ابلیس نے حسد کی وجہ سے آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا۔ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ اور اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ کفر کرنے والا تھا۔

حضرت آدم علیہ السلام
اور حضرت حوا جنت میں

انکار ابلیس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ ۖ اْكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الْكَافِرِينَ۔ اور تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ حضرت حوا کی تخلیق کے متعلق در سکر مقام پر فرمایا خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا۔ آدم علیہ السلام کی وحشت کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں کی پسلیوں سے اُن کا جوڑا پیدا فرمایا۔ اور آپ جنت حوٹ سے مانوس ہو گئے۔ اس لیے فرمایا کہ تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا اور تم اس میں سے کٹ دگی کے ساتھ کھاؤ۔ جہاں سے چاہو۔

اس جنت کے متعلق بھی مختلف روایتیں ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جنت زمین پر تھی۔ مگر صحیح قول یہ ہے کہ جس جنت میں آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو بسنے کا حکم ہوا۔ ۶۰ عالم بالا میں جَنَّةُ الْمَأْوَىٰ ہے جس کا ذکر قرآن پاک کے در سکر مقامات پر آیا ہے۔ سورۃ نجم

میں موجود ہے عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی جو کہ سِدْرۃ الْمُنْتَهٰی کے قریب ہے عِنْدَ هَاجَتِهٖ
الْمَاوٰی یہ عالم بالا ہی کے متعلق ہے۔

شجر ممنوعہ

جنت میں سکونت اختیار کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور حوا کو یہ حکم بھی دیا۔
کہ جہاں سے جتنا بھی چاہے کھاؤ مگر وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ اس درخت کے قریب
نہ جانا۔ اگر ایسا کرو گے فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِیْنَ تو ظلم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ
گے۔ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمادی۔

یہ کون سا درخت تھا جس کی مقاربت سے منع فرمایا گیا۔ اس کے متعلق مفسرین کرام کے
کئی اقوال ہیں۔ بعض اے کھجور کا درخت بتاتے ہیں بعض انجیر کا اور بعض انجور کا۔ بائبل کی
روایت کے مطابق یہ نیکی اور بدی کی پہچان کا درخت تھا۔ اور بعض نے یہ توجیہ کی ہے کہ
آدم علیہ السلام اور حوا کے ملاپ یعنی مباشرت کو درخت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس لحاظ
سے پیدا ہونے والی اولاد کو بھیل کہا گیا ہے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ شجر ممنوعہ گندم کا درخت تھا۔ مگر یہاں یہ اعتراض وارد
ہوتا ہے کہ گندم کا درخت نہیں بلکہ چھوٹا سا پودا ہوتا ہے۔ مفسرین نے اس اعتراض کا جواب بھی
دیا ہے، فرماتے ہیں کہ شاعر لوگ لطفے کی زبان میں کہتے ہیں۔

۔ بخور نان جواری گر جوار اللہ می خواہی کہ گندم کرد آدم را بگردن از جنت الماوی
اگر اللہ نعلے کا قرب چاہتے ہو۔ تو جوار کی روٹی کھاؤ۔ جو قد سے ٹھنڈی ہوتی ہے۔ گندم گرم
ہوتی ہے۔ اگر اس کی روٹی کھاؤ گے تو اس نے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوا دیا۔ مولانا رومی
بھی فرماتے ہیں ۔ ایں عشق نیست ایں فساد گندم است۔ یہ عشق نہیں ہے
بلکہ گندم کی گرمی کا اثر ہے۔ اور یہ اسی کا برپا کردہ فاد ہے۔ غرضیکہ گندم کے اس درخت
کو دنیا کے گندم کے درخت پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔

ابن ابی داؤد نے خود اپنا مشاہدہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے مصر میں آنا بڑے شکرہ دیکھا۔ جسے

دو بکڑے کر کے بڑی شکل سے اونٹ پر لاد گیا۔ اگر اس دنیا میں آنا بڑا سنگڑہ ہو سکتا ہے۔ تو جنت میں گندم کا درخت آنا بڑا کیوں نہیں ہو سکتا۔ ام ابوداؤد نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ انہوں نے دس بالست لبا کھیرا دیکھا ہے۔ یہ ترکی قسم کا کھیر جو موسم گرما میں ہوتا ہے۔ اور بڑے شوق سے ٹھیا جاتا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزل کے وقت امار کے دانے سننے بڑے بڑے ہوں گے۔ کہ ایک دانے کے نصف خول سے آنا بڑا خیمہ بن سکیگا۔ جس کے نیچے دس بیس آدمی ٹھہر سکیں۔ بہر حال یہ اعتراض معقول نہیں ہے۔ کہ گندم کا پودا ہوتا ہے۔ درخت نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ جنت میں گندم کا بہت بڑا درخت ہو۔ جس کے قریب جانے یا پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا۔

شیطانی دوسرے اللہ تعالیٰ کے حکم سے آدم علیہ السلام اور حضرت عوا جنت میں رہنے لگے۔ وہ بچوں کی طرح معصوم تھے۔ ابھی ان میں ہیبت کا مادہ نہیں ابھرا تھا۔ کہ شیطان نے آہستہ آہستہ دوسرے ڈان شروع کیا۔ فَازَلَّهُمُ بِالشَّيْطَانِ عَنكَ ان دونوں کو شیطان نے پھسلا دیا۔ دوسری جگہ آتا ہے: فَذُوسَ لَهْمَ الشَّيْطَانِ شیطان نے دونوں میں دوسرے ڈالا۔ کس چیز کے متعلق دوسرے ڈالا۔ اس میں مختلف اقوال ہیں بعض کہتے ہیں کہ درخت کا پھل کھانے کے متعلق دوسرے ڈان۔ دوسری جگہ موجود ہے کہ شیطان نے کہا کہ اس کو کھا لو گے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں رہ جاؤ گے۔ اور کسی قسم کا خطرہ لاحق نہ ہو گا۔

بعض کہتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ دوسرے دل کے اندر ہی ڈالا جائے۔ کوئی فعل سرزد کرنے سے بھی دوسرے انداز ہی ہوتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ شیطان ایک جنیہ کو چپڑا کر لیا۔ اور جنت کے دروازے پر اس سے مباشرت کی جسے آدم علیہ السلام دیکھ رہے تھے۔ تو ان کے دل میں بھی ویسا ہی خیال پیدا ہوا۔ انہوں نے حضرت حوا کے ساتھ مقاربت کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنت کا لباس اڑ گیا۔ اور وہ دونوں برہنہ ہو گئے۔

شیطان کی دوسرے اندازی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دوسرے اندازی نے فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ
 ان دونوں کو اس جگہ یعنی جنت سے نکال دیا جس کے اندر وہ تھے۔ وَقُلْنَا اهْبِطُوا اور
 ہم نے کہا اَنْزِلُوا بعض بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ بعض تمہارے بعض کے دشمن ہیں۔ شیطان تمہارا
 دشمن ہے اور تم اس کے دشمن ہو۔ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مَسَقَرٌ اور زمین میں تمہارے
 لیے ٹھکانا ہے۔ اب تمہاری رہائش زمین پر ہوگی۔ وَمَتَاعٌ اِلٰی حِينٍ اور ایک مدت
 تمہارا مَتَاعٌ اٹھانا ہے۔ یعنی تمہاری اصل رہائش گاہ زمین ہی ہوگی۔ البتہ اگر زمین کو چھوڑ
 کر کہیں فضاؤں یا مہندروں میں جاؤ گے تو وہ عارضی قیام گاہ ہوگا۔ مستقل قیام زمین پر ہی کرو گے
 آج کے دور میں جو پراپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ ہم زمین پر مستقل طور پر نہیں رہیں گے۔ بد چاند،
 مریخ یا دوسرے سیاروں میں چلے جائیں گے۔ تو یہ محض شیطانی پراپیگنڈا ہے۔ چاند ہماری زمین سے
 قریب ترین سیارہ ہے۔ اور اس کا فاصلہ اڑھائی لاکھ میل ہے۔ مریخ تو یہاں سے پچاس کروڑ
 میل دور ہے۔ اور دوسرے سیدے اس سے بھی دور ہیں۔ فرض کر لیا کہ چاند پر رہائش کا بندوبست
 ہو جاتا ہے۔ وہاں ہوٹل قائم ہو جاتے ہیں۔ تو سائنس دانوں کا اپنا اندازہ یہ ہے کہ ایک پونڈ
 غذا کو چاند پر پہنچانے کے لیے تیس ہزار پونڈ خرچ ہوں گے۔ وہاں پہنچنے کا خصوصی لباس چار لاکھ
 روپے میں تیار ہوگا۔ یہ لباس تو راستے میں ہی جل جائے گا۔

زمین ہی اصل
 ٹھکانا ہے

چاند پر تو ایسی لباس پہنا ہوگا۔ وہاں کی گرمی
 کی مقدار تقریباً چالیس ہزار سنی ڈگری ہے۔ جہاں پر پانی تو کھاتا نہ بھی پھٹنے لگتا ہے۔ پتہ کے
 ایک طرف گرمی ہے۔ اور دوسری طرف اتنی سردی ہے جس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔
 لہذا ایسی جگہ پر رہنے کے لیے اتنا قیمتی لباس تیار کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے۔ خوراک اور لباس
 پر اتنی رقم کون خرچ کر کے رہائش پذیر ہوگا۔ اگر کوئی وہاں پہنچے گا بھی۔ تو اس کا قیام
 بالکل عارضی ہوگا۔ آخر کار اُسے زمین پر ہی آنا پڑے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ تمہارا اصل ٹھکانا زمین
 ہی ہوگا۔ دوسری جگہ فرمایا مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيْهَا نُعِيدُكُمْ
وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ كَأَنَّا اُخْرٰی اے انسان! ہم نے تمہیں اسی
 زمین سے پیدا کیا۔ اسی میں لوٹائیں گے۔ اور پھر قیامت کو دوسری مرتبہ اسی سے نکالیں

گئے۔ اسی لیے یہاں پر فرمایا کہ اے آدم اور حوا تم یہاں سے زمین پر اتر جاؤ۔ ایک خاص
 مدت تک وہی تمہارا ٹھکانا ہوگی۔

البقرة

آیت ۲۹، ۳۰

درس شہزادہ محمد

فَتَلَقَّى آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ
الرَّحِيمُ ۝ (۳۷) قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ
مِنْهُ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
يَحْزَنُونَ ۝ (۳۸) وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ
أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (۳۹)

۳۷

ترجمہ: پس آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا آدم کی طرف مہربانی کے ساتھ۔ بے شک وہ رجوع کرنے والا ہے۔ مہربان ہے (۳۷) ہم نے کہا تم سب زمین پر اتر جاؤ۔ پس جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت کی پس جس نے میری ہدایت کی پیروی کی۔ اُن پر کوئی خوف نہیں ہوگا۔ اور نہ وہ غم کھائیں گے (۳۸) اور جنہوں نے کفر کیا۔ اور جاری آیتوں کو جھٹلایا۔ وہ دوزخ واس ہیں۔ اس میں ہمیشہ رہیں گے (۳۹)

کثرت پختہ

جب حضرت آدم علیہ السلام نے اس درخت کا پھل کھایا جس سے انہیں منع کیا گیا تھا۔ تو ان سے انعام و اکرام لے لئے گئے۔ اور انہیں حکم ہوا کہ زمین پر اتر جاؤ۔ بعض تمہارے بعض کے دشمن ہیں۔ اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے۔ اور تمہیں ایک وقت تک فائدہ اٹھانا ہوگا۔ اب آدم علیہ السلام کو بڑی پریشانی ہوئی کہ انہیں زمین پر اترنے کا حکم مل گیا ہے۔ بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام آئے اور آدم علیہ السلام کے سر سے قلع اتار لیا۔ اور اُن کے جسم سے بہشت کا لباس بھی اتار لیا اور انہیں برہنہ کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے ستر اٹھانے کے لیے جنت کے درخت کے پتے استعمال کیے۔ کیونکہ دوسروں کے سامنے ستر کا کھن خلافِ فطرت ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام
کی توبہ

اس کے بعد کیا ہوا۔ فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ پس آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے۔ تعلق کا معنی پانا یا سیکھنا ہے۔ ان کلمات کا اللہ تعالیٰ نے الہام کیا یا آدم علیہ السلام کے دل میں ڈالا۔ ان کلمات کے ساتھ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کی۔ جیسا کہ سورۃ اعراف میں آتا ہے: قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا سَاءً وَإِنْ لَمْ نَغْفِرْ لَكَ وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ یعنی اے پروردگار! بیشک ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ اگر تو ہمیں بخشا نہیں کرے گا۔ اور ہم پر رحم نہیں کرے گا۔ تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ حدیث میں ان دعائے کلمات کا ذکر ہے۔ جن کے ذریعے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی نتیجہ یہ ہوا کہ فَتَابَ عَلَيْهِ اللّٰهُ تعالیٰ نے رجوع کیا۔ آدم علیہ السلام کی طرف مہربانی کے ساتھ تَابَ کا معنی رجوع کرنا ہے۔ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے۔ تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا اپنی مہربانی کے ساتھ۔ اور جب اس لفظ کو بندے کی طرف منسوب کیا جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ بندے نے رجوع کیا اپنی عاجزی کے اعتراف کے ساتھ اور بُرائی کے ترک کرنے کے ساتھ۔ گویا توبہ کی صفت کا تعلق خالق اور مخلوق دونوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں تَوَلَّوْا إِلَى اللَّهِ تَوَلَّوْا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ گناہوں کو چھوڑ دو۔ اور عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ اس سے معافی مانگو۔ اِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ بے شک وہ رجوع کرنے والا بڑا مہربان ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی لغزش کو معاف کر دیا۔

اہم بیہقی نے اپنی مشہور کتاب شعب الایمان میں روایت بیان کی ہے کہ اپنی لغزش پر آدم علیہ السلام اس قدر رئے کہ لَوْ رَزَنَ دُمُوعُ اَدَمَ بِجَمِیْعِ دُمُوعٍ وَلَکِنَّہُ لَرَجَحَ دُمُوعُهُ عَلٰی جَمِیْعِ دُمُوعٍ وَلَکِنَّہُ یعنی آدم علیہ السلام نے جس قدر آنسو بہائے اگر ان کے مقابلہ ان کی قیامت تک آنے والی ساری اولاد کے ساتھ کیا جائے۔ تو آدم علیہ السلام کے آنسو غالب آجائیں۔ اور بیہقی میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ روایت بھی مروی ہے۔

سزایہ دی۔ کہ گوشت کھن سڑنا شروع ہو گیا۔ آج کل گرمی کے موسم میں تو ایک دو دن سے زیادہ گوشت نہیں رہ سکتا۔ بدبو آنے لگتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر بنی اسرائیل اپنے نبی کے حکم کی پاسداری کرتے۔ گوشت کو ذخیرہ نہ کرتے تو یہ بھی خراب نہ ہوتا۔ خواہ کتنی ہی سڑ سڑا رہتا۔

”دوسری بات آپ کے یہ فرمانی لَوْلَا حَوَّاءُ لَمْ تَخْنُ اُنْثٰی زَوْجَهَا۔ یعنی اگر حوا اپنے خاوند کی خیانت نہ کرتی۔ تو دنیا کی کوئی عورت اپنے خاوند کے ساتھ خائن نہ ہوتی۔ حوا کی خیانت یہ تھی کہ انہوں نے آدم علیہ السلام کو درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی تھی۔

بہر حال جب آدم علیہ السلام نے پھل کھایا۔ اور برہنہ ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا۔ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِیْعًا۔ سب زمین پر اتر جاؤ۔ یہ حکم شیطان، آدم علیہ السلام اور حوا سب کے لیے تھے۔ تو بہت قبول ہو گئی۔ مگر زمین پر اتر جانے کا حکم صادر ہو گیا۔

بائبل اور بعض تاریخی روایات میں مور اور سانپ کا ذکر بھی آتا ہے کہ وہ بھی آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلانے میں معاون ہوئے تھے۔ اور یہ شیطان سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں داخل ہو گیا تھا۔ مگر یہ روایت درست نہیں میں مجموعہ بات یہی ہے کہ شیطان نے جنت کے باہر دوسرا انداز ہی کی تھی۔ اس نے دروازے سے باہر جہیہ سے مباشرت کی تھی۔ جسے آدم علیہ السلام دیکھ رہے تھے۔ اور اس کی بات بھی سُن رہے تھے۔ اسی بات سے آپ کو دوسرا پیدا ہوا۔ اور آپ نے وہ کام کر لیا۔ جس سے منع کیا گیا تھا۔ لہذا آپ کو زمین پر ترنے کا حکم ہو گیا۔

آدم علیہ السلام
اور حوا
کی بات

آدم علیہ السلام نے چل کھایا ہوا تھا۔ اُوپر زمین پر اتار گیا۔ آپ کو بول و براز کی حاجت ہوئی۔ پیٹ میں درد پیدا ہوا۔ آپ پریشان ہو گئے کہ اس سے پہلے یہ تکلیف کبھی نہیں ہوئی تھی۔ آپ کی پریشانی دیکھ کر جبرائیل علیہ السلام آئے۔ اور آپ کو بتایا کہ اس تکلیف سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس طریقے سے فراغت حاصل کریں۔ آپ نے ایسا ہی کیا۔ تو براز سے بدبو آنے لگی۔ آپ کو اور پریشانی ہوئی۔ رونے لگے کہ یہ کیا مصیبت ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ

سترون تک ملتے ہے۔ اس واقعہ کو بن ابی الدنیا نے روایت کیا ہے۔ اور امام دارقطنی نے بھی کتاب الافراد میں حضرت عمرؓ سے بیان کیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو اس وقت بھیجا جب حضرت حوا کو حیض کی حالت ہوئی جنت میں تو ہر طرح کی پاکیزگی حاصل تھی۔ زمین پر اگر یہ پریشانی لاحق ہوگئی۔ مائی حوا نے جبرائیل علیہ السلام کو آواز دی۔ کہ دیکھو یہ کیا معاملہ ہے مجھے وقفہ وقفہ سے خون آرہا ہے۔ جبرائیل علیہ السلام نے کہا۔ اے حوا! یہ بات تم پر اور تمہاری بیٹا پر ہمیشہ کے لیے مسلط ہے گی۔

بخاری اور مسلم کی روایت میں آتا ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کو ایام حج میں حیض کی حالت لاحق ہوگئی۔ آپ نے احرام باندھا ہوا تھا۔ حیض آنے پر سخت افسردہ ہوئیں اور رونے لگیں۔ حضور علیہ السلام تشریف لائے۔ تو آپ سے بیان کیا۔ آپ نے فرمایا۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ہَذَا شَيْءٌ كَتَبَهُ اللَّهُ عَلَى بَنَاتِ آدَمَ يَأْتِيهِنَّ بِهِنَّ جَسَدُهُنَّ لَمْ يَلِدْنَ وَلَمْ يَمُوتْنَ وَلَهُنَّ مِثْلُ حَاجَةِ الْحَبْلِ لَمْ يَكُنَّ حَائِضَاتٍ۔

الغرض! جبرائیل علیہ السلام نے حوا کو یہی کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری بیٹیوں پر یہ چیز لازم کر دی ہے۔ یہ تمہارے گناہوں کا کفارہ بنتے گا۔ اور تمہارے لیے پاکیزگی کا ذریعہ ہوگا۔ اس کی وجہ سے عورت جسمانی طور پر صحت حاصل کرتی ہے۔ اور اگر نیک بخت ہے۔ تو باطنی طور پر بھی اس کو طہارت نصیب ہوگی۔

جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر اترے۔ تو بعض روایات کے مطابق قیس قسم کے پھلوں کے بیج ان کے ساتھ آئے۔ بعض دوسری روایات میں ہزار قسم کا ذکر آتا ہے جن میں روایات میں خوشبو آتا رہتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ خوشبو جنت کا تختہ ہے اگر کوئی پھول یا کلمہ پیش کرے۔ تو اس کو دوزخ میں کرنا پڑے۔ فَإِنَّهُ خَرَجَ مِنَ الْجَنَّةِ کیونکہ یہ جنت سے آئی ہوئی ہے۔

جنت کے تختے

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ منہ ن چھٹا درجہ سمجھو بھی آدم علیہ السلام کے ساتھ نازل ہوا تاکہ دنیا میں کام کاج کر سکیں۔ حجر اسود بھی جنت سے اترتا ہے۔ پتے اسس اور جبل ابو قیس پر رکھا گیا۔ یہ درودھ کی طرح سفید تھا۔ اور رات کو سو ج کی طرح چمکتا تھا۔ اہمہ آہستہ انسانوں کے گناہوں کی تیرکیوں نے اس پتھر کو سیاہ کر دیا۔

حضرت آدم علیہ السلام
درجہ نازل

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ آدم علیہ السلام ہندوستان کی سرزمین شرق الهند میں اترے تھے۔ چنانچہ سبکہ المرجان فی آثار ہندوستان کے مصنف لکھتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کا نزول شرق الهند میں اور حضرت نوحؑ کا نزول جہدہ میں ہوا۔ جہدہ یا غنی معنی دارو یا نانی ہے۔ غالباً اسی مناسبت سے اس مقام کا نام جہدہ مشہور ہو گیا۔ صاحب سبکہ المرجان برے پائے کے فتنہ اور عالم تھے۔ اور امام شاہ ولی اللہؒ کے ہم عصر تھے۔

بعض نبیاء
جبرائیل
پیستے

حضرت آدم علیہ السلام کھیتی باڑی کرتے تھے۔ اور کپڑے بننے کا کام بھی آپ ہی سے شروع ہوا۔ واسیم اور اشرفیاں بھی حضرت آدم علیہ السلام نے بنائیں۔ دیگر انبیاء عیسیم السلام میں سے حضرت نوح علیہ السلام بخاری معنی بڑھتی ہوا کرتے تھے۔ حضرت ادریس علیہ السلام درزی کا کام کرتے تھے۔ حضرت ہود اور صالح علیہما السلام تاجرتے تھے۔ حضرت ابراہیم اور لوط علیہما السلام نے کھیتی باڑی کا پیشہ اختیار کیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام مویشی پالتے تھے۔ اور ان کا دودھ اور اون وغیرہ فروخت کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیشہ گھربانی تھا۔ داؤد علیہ السلام زرہ بناتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام روئے زمین کی فطرت سلطنت کے بادشاہ ہونے کے باوجود اپنی گذراوقات کے لیے گڑیاں اور زبیلیں بناتے تھے۔

توبہ کی قبولیت

اہم جمعی نے شعب الایمان میں روایت نقل کی ہے کہ جب آدم علیہ السلام سے عرش سرزد ہوئی تو وہ بہت ناہم ہوئے۔ انہوں نے عرش پر نگاہ کی۔ تو وہاں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا پایا۔ آپ نے خیال کیا کہ جس شخصیت کا نام اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ لکھا

سے تغیر عزیزی مہرؑ سے بن کیشہ مہرؑ سے تغیر عزیزی مہرؑ

سے تغیر عزیزی مہرؑ

ہوا ہے۔ یہ ضرور کوئی عظیم شخصیت ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ معافی مانگی۔
 اَسْأَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ اِلَّا عَفَرْتَ لِي۔ اے اللہ! میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طفیل سے دعا کرتا ہوں کہ میری لغزش کو معاف فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم! تمہیں کیا علم کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ مولا کریم! میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ تیرے نام کے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نام لکھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم! تیری اولاد میں یہ آخری نبی ہوں گے۔ اور میری پوری مخلوق میں ان کی فضیلت کو کوئی نہیں پہنچے گا۔ اگرچہ یہ روایات ضعیف ہیں بعض نے ان کو موضوع بھی کہا ہے۔ تاہم تشریح کی خاطر ان کو قبول کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی لغزش کو معاف کر دیا۔ یہی سچی کہلاو یہ روایات طبرانی، حاکم اور ابونعیم میں بھی موجود ہیں۔ اور روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو دنیا میں ابوالبشر کی کنیت سے پکارا جاتا ہے۔ اور قیامت کے دن حضور علیہ السلام کی طرف نسبت کرتے ہو ابو محمد کی کنیت سے پکارا جائے گا۔ گویا آپ کو ابوالبشر اور ابو محمد دونوں اعزاز حاصل ہیں۔

بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ قیامت کے روز جب اول آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے تو کہیں گے کہ اے آدم! انت ابوالبشر آپ تمام نسل انسانی کے جد امجد ہیں۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ حساب کتاب شروع کریں۔ حضرت آدم علیہ السلام انکار کر دیں گے اور کہیں گے کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ حضرت ابوذر غفاری کی روایت میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کیا آدم علیہ السلام خدا تعالیٰ کے نبی تھے۔ فرمایا ہاں۔ نَبِيًّا رَّسُولًا كَلَّمَهُ اللَّهُ اَبْنِي تَحِيًّا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ سے کلام کیا۔ آپ پر وحی نازل ہوئی تھی۔ اَوَّلُ الْاَنْبِيَاءِ اَدَمُ اور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

تو بہ ایک ایسا عمل ہے جس سے ان کی سابقہ کوتاہیوں کی معافی ہو جاتی ہے۔ حضور علیہ السلام

تو بہ کی تین شرطیں

کافران ہے التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ یعنی گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے۔ جیسا اس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ مگر توبہ کی قبولیت کے لیے بعض شرائط بھی ہیں۔ اگر ان شرائط کے ساتھ توبہ کی ہے تو قبول ہوگی ورنہ نہیں۔ توبہ میں تین چیزیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی علم مال اور عمل۔

علم سے مراد یہ ہے کہ آدمی جانتا ہے کہ میں نے واقعی یہ غلط کام کیا ہے۔ اور اس کے ارتکاب پر گناہ اور اس کے ضرر کا احساس ہوتا ہے۔ حال کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس غلط کام کو ترک کر دے۔ اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرے یہ عمل ہے۔ اس ضمن میں مذمت کا ذکر بھی آتا ہے التَّوَّابُ الشَّدِيدُ اور اگر کچھ فرائض رو گئے ہوں تو ان کو ادا کیا جائے۔ کوئی حقوق تلف ہوئے ہوں۔ تو ان کو پورا کیا جائے۔ تب انسان کی توبہ قبول ہوتی ہے۔

امام دارقطنی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت بیان کی ہے جس میں آدم علیہ السلام سے متعلق مختلف باتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی وفات پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے مسجد خیمت میں (جو کہ مٹی میں واقع ہے) حضرت آدمؑ کی نماز جنازہ پڑھی اور چار تجسیریں کیں۔ فرشتوں کی ایک جماعت بھی آپ کے ساتھ تھی۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کو لحد میں دفن کیا گیا۔ اور ان کی قبر کو بان دار بنائی گئی۔ جیسا کہ عام طور پر آج کل بنائی جاتی ہے۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ آدم علیہ السلام نے ہندوستان کی سرزمین سے چلیں حج پیدل کیے۔

ان آیات میں اِهْبِطُوا یعنی اتر جاؤ کا لفظ دو دفعہ آیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ پہلی دفعہ اللہ تعالیٰ نے اتر جانے کا حکم دیا تھا۔ مگر جب اس حکم کی فوری تعمیل نہ ہوئی۔ تو دوبارہ سخت آڑ ڈر ہوا کہ فوراً زمین میں اتر جاؤ۔

یہاں پر یہ ختمہ قابل غور ہے کہ زمین پر اترنے کا حکم کسی سزا کے طور پر نہیں تھا۔ بلکہ اس

زمین پر اتارنے کی حکمت

۱۔ ابن ماجہ ص ۲۸۵ فیض القدیر، شرح جامع صغیر ص ۲۸۵

۲۔ تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۹۶، ۳۔ درمنثور ص ۵۶ تفسیر عزیزی ص ۱۹۶، ۴۔ ابن کثیر ص ۸۲

اتباع ہے۔ قرآن پاک میں نیتات کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے۔ اور ہدایت کا لفظ بھی آیا ہے۔ نیتات وہ ہوتے ہیں جو بالکل واضح اور بے بہہ ہوں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ماننا۔ نیتات میں سے ہے۔ اسی طرح سبب و شکر کرنا اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا نیتات میں۔ ہدایت وہ چیز ہوتی ہے جس کی تعلیم کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً شعار اللہ کی تعظیم احکام شرع میں اس کا ضرورت پڑتی ہے۔ یہ چیزیں تعلیم کے بغیر حاصل نہیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ کتابیں انبیاء علیہم السلام وغیرہ ہدایت میں شامل ہیں۔ اسی لیے فرمایا جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی۔ ان پر رحمت ہوگی۔ اور نہ وہ ٹھیکین ہوں گے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا اور جنہوں نے کفر کیا۔ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا اور ہماری آیات کو جھٹلایا۔ الْبَلَاءُ أَصْعَبُ النَّارِ وہ دوزخ والے ہیں ہُمْ فِيهَا خَالِدُونَ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ انسان کی سعادت اور شقاوت کا دار و مدار ایمان اور کفر پر ہے۔ یہ ہدایت و نہایت پر ہے۔ اور پھر یہ بت کہ اِنَّمَا دُعَاءُ الْاَعْمَالُ بِالْاُخْوَانِ تَعْمَلُ اعمال کا دار و مدار غلتے پر ہے۔ جس کا ایمان پر خاتمہ ہو گیا۔ یعنی جو ایمان کی دولت ساتھ لے گیا۔ وہ نیک ہے۔ اور جس کا خاتمہ کفر پر ہوا۔ وہ کافر ہو گیا۔ اب تو ان یہ بت۔ کہ یہ کتاب دفعہ جنت سے نکلنے کے بعد اب دوبارہ داخلہ ایمان اور نیک کی بناء پر ہوگا۔ اس کے اخیر جنت میں دوبارہ داخلے کی کوئی صورت نہیں۔

خلافتِ ارضی عمومی نعمت ہے۔ جو آدم علیہ السلام اور اس کی اولاد کو نصیب ہوئی۔ یہ خلافت بنی اسرائیل میں اسے ہمک قائم رہی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ نعمت چھین لی اور بنی اسرائیل کو حاصل ہو گئی۔ یہاں پر بنی اسرائیل کی ان غلامیوں کا ذکر ہو گا۔ جن کی وجہ سے اس عزت و شرافت اور فضیلت کو محروم ہو گئے۔

اسرائیل یعقوب علیہ السلام کا نام ہے۔ ان دونوں خاندانوں یعنی بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کے بعد ائمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ جن کا وطن مالوت موجودہ بغداد سے ستر میل دور بابل شہر تھا۔ آپ کی پیدائش کے وقت بابل بہت بڑا شہر اور تہذیب کا مرکز تھا۔ یہ چالیس مربع میل میں پھیلا ہوا تھا۔ اور بہت بڑی سلطنت کا پایہ تخت تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہاں سے ہجرت کی جیسا کہ فرمایا: *إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي*، یہ مہاجرے رستے شام پہنچے۔ کچھ عرصہ وہاں قیام فرمایا اور پھر حجاز گئے اور مکہ مکرمہ بھی گئے۔ آپ، اسلام لائے تھے۔ پھر شامی پھر حجازی ہوئے۔ ان دنوں میں فلسطین کو کنعان کہتے تھے۔ اور یہ شام ہی کے ماتحت تھا۔ بعد میں اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی ہاجرہ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام تولد ہوئے۔ آپ کے بارہ فرزند تھے۔ پھر ان کے آگے بے شمار قبیلے ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری بیوی آپ کی چچا زاد حضرت سارہ بنہ تھیں۔ جن کا ذکر قرآن پاک میں بھی آتا ہے۔ آپ کے بطن سے حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اور پھر ان سے حضرت یعقوب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عظیم نبی ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی میں ہی بشارت سنادی تھی: *وَمَنْ ذَا الَّذِي يَحْقُوقُ يُعْقُوبَ* یعنی مگر ذرا اسحاق علیہ السلام سے ان کے بیٹے یعقوب علیہ السلام ہوں گے۔ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے ہوئے: *إِسْحَاقَ عَشْرَةَ أَسْبَاطًا أُمَمًا* سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ یہ اسی بات کی طرف اشارہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک تیسری بیوی قطورہ بھی تھیں جس کی اولاد بنی قطورہ کہلاتی ہے

مگر انہیں زیادہ شہرت حاصل ہے نہ ہوتی۔

واقعہ اس طرح ہے کہ حضرت اسحق علیہ السلام کے دو بیٹے یعنی عیص اور یعقوب جبرائیل نے
 تھے۔ البتہ عیص ذرا پہلے پیدا ہوئے اور یعقوب علیہ السلام بعد میں۔ یعقوب کا لفظی معنی پیچھے آنے
 والے کے ہیں۔ خدا کی قدرت کہ اسحق علیہ السلام کو عیص کے ساتھ زیادہ محبت تھی۔ اور ان کی بیوی کو
 یعقوب علیہ السلام زیادہ پیارے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام زیادہ صحت مند اور مضبوط جسم کے
 مالک تھے اور حضرت اسحق علیہ السلام نے انہیں یہ فریضہ سونپ رکھا تھا کہ وہ دروازے پر
 موجود رہیں۔ جب تک میں عبادت میں مصروف رہوں۔ کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ دیں
 تاکہ عبادت میں فصل واقع نہ ہو۔ ایک موقع پر انسانی شکل میں فرشتہ آیا اور اندر جانا چاہا۔ مگر
 یعقوب علیہ السلام نے روکا۔ جب اسحاق علیہ السلام باہر آئے تو دیکھ کر یعقوب علیہ السلام فرشتے
 کے ساتھ الجھ رہے ہیں۔ تو انہوں نے تحسین فرمائی کہ واقعی تم نے اپنی ڈیوٹی پوری پوری داک
 ہے۔ فرشتے نے آپ کا نام دریافت کیا تو انہیں یعقوب بتایا گیا۔ اس نے کہا اس کا نام اسرائیل
 ہے۔ سریانی یا عبرانی زبان میں اسرائیل کا معنی بندہ اور ایل کا معنی اللہ ہے۔ گویا فرشتے نے
 یعقوب علیہ السلام کا نام اسرائیل یعنی اللہ تعالیٰ کا بندہ رکھا۔ جو کہ عبد اللہ کے مترادف ہے
 یہی اس سے آپ کا نام اسرائیل مشہور ہوا۔ اور آپ کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی۔ چونکہ حضرت
 اسحق علیہ السلام کی محبت عیص کے ساتھ زیادہ تھی۔ اس لیے انہوں نے عیص سے فرمایا۔
 کہ میں آخری وقت میں تیرے لیے خصوصی دعا کروں گا۔ جب ماں کو پتا چلا تو اس نے چاہا
 کہ یہ دعا یعقوب علیہ السلام کے حق میں ہو۔ چنانچہ اس نے یعقوب علیہ السلام کو عیص کا پاس
 پینا کر ان کے باپ کے پاس بھیج دیا۔ اور ساتھ نصیحت کی کہ باپ کے سامنے آہستہ بولن
 تاکہ وہ تمہیں پہچان نہ سکیں۔ چونکہ اس وقت حسرت اسحق علیہ السلام کی نظر کمزور ہو چکی تھی۔
 وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو عیص سمجھے اور ان کے حق میں دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تمہاری
 اولاد میں نبوت کو جاری رکھے۔ یہ خصوصی دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام

سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ بنی اور رسول اس خانہ ان میں معزز ہے۔
 کچھ عرصہ بعد عیسیٰ نے باب کو یاد دلایا کہ آپ نے میرے حق میں دعا کا وعدہ فرمایا تھا۔ تو انوں
 نے کہا کہ وہ دعا تو میں نے کر دی ہے۔ عیسیٰ نے کہا کہ وہ دعا تو آپ نے یعقوب علیہ السلام کے
 کے حق میں فرمائی ہے۔ تو انوں نے کہا کہ مجاہد تو اس کے لیے ہو گئی۔ تمہارے لیے دعا ہے
 کہ اللہ تعالیٰ تمہارے خانہ میں بادشاہت قائم رکھے۔ چنانچہ آپ کی دعا سے بادشاہت کا
 زیادہ تر سلسلہ عیسیٰ کی اولاد میں ہی رہا۔

جب حضرت اسحاق علیہ السلام اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ تو ان کے سائے مال و باب
 پر عیسیٰ نے قبضہ کر لیا اور یعقوب علیہ السلام کو کچھ نہ ملا۔ اسی مال و دولت کی وجہ سے لوگوں کا
 رجوع بھی عیسیٰ کی طرف ہو گیا۔ اور یعقوب علیہ السلام نادار ہونے کی وجہ سے کسی شمار میں نہ آتے
 تھے۔ ان کے ماموں کسی دوسری جگہ مقیم تھے۔ اور بڑے مالدار تھے۔ ماں نے مشورہ دیا کہ
 ان کے پاس چلے جاؤ۔ ان کے پاس مال و دولت بھی ہے۔ اور اس کی بیٹی بھی ہے جس کے
 ساتھ وہ تمہارا نکاح بھی کر دے گا۔ چنانچہ آپ اپنے لایان نامی ماموں کے پاس پہنچے۔ وہ
 آپ کو دیکھ کر بڑا خوش ہو۔ اور کہا کہ اپنے جانی کی بہنوں سے دل برداشتہ نہ ہونا۔ میں تمہاری
 ہر طرح سے مدد کروں گا۔ چنانچہ اُس نے اپنے سائے مال و باب کا مقدمہ حضرت یعقوب علیہ السلام
 کو بنا دیا۔ اور اپنی بیٹی کا نکاح بھی کر دیا۔

اس بیوی سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو پیار بیٹے عطا کئے۔ اور اس کے بعد بیوی کا انتقال ہو
 گیا۔ ماموں نے آپ پر مزید احسان کیا کہ دوسری بیٹی کا نکاح کر دیا۔ اس سے دو فرزند پیدا ہوئے
 اور وہ بھی فرستے ہو گئے۔ اس کے بعد ماموں نے تیسری لڑکی آپ کے نکاح میں شے دی۔ اس
 سے ایک لڑکی اور دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اس کے بعد وہ بھی اللہ تعالیٰ کو پیاری ہو گئی۔ پھر
 ماموں نے اپنی چوتھی لڑکی انیس کا نکاح کر دیا۔ اس وقت تک حضرت یعقوب علیہ السلام کی عمر
 چالیس برس ہو چکی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا فرمائی۔ اور حکم دیا کہ اس مقدمہ کو چھوڑ

کہ کنعان چلے جاؤ۔ اور وہاں پر تبلیغ کا فریضہ انجام دو۔ جب ماموں کو پتا چلا۔ تو اس نے کہا کہ تمہاری جدائی سے تکلیف تو ضرور ہوگی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی رضا ہر چیز پر مقدم ہے۔ چنانچہ اپنے بخوشی حضرت یعقوب علیہ السلام کو کنعان چلے جانے کی اجازت دے دی۔ اور بیوی بچوں کو بھی ساتھ بھیج دیا۔ اور اُن کی خدمت کے طور پر پانچ سو گھوڑے، پانچ سو اونٹ، پانچ سو گائے پانچ سو خچر، پانچ سو بھیڑیں اور بہت سا دیگر سامان ہمراہ کر دیا۔

کنعان پہنچ کر آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ وہاں پر آپ کی چوتھی بیوی راحیل کے بطن سے دو بیٹے یوسف اور بن یامین پیدا ہوئے۔ یوسف علیہ السلام ابھی دو سال کے تھے۔ کہ راحیل بھی فوت ہو گئی۔ جب ماموں کو پتا چلا۔ تو اس نے اپنی پانچویں بیٹی بھی نکاح میں دے دی۔ اور اسے یعقوب علیہ السلام کے نکاح میں بھیج دیا۔ تاکہ بچوں کی پرورش ہو سکے۔ اس طرح یعقوب علیہ السلام کے کل بارہ بیٹے ہوئے۔ جن سے آگے بارہ خاندان نامور میں آئے۔

اللہ تعالیٰ نے عیص کو بھی اس فضیلت سے محروم نہ رکھا۔ جیسا حضرت یعقوب علیہ السلام کنعان کی طرف آئے تھے۔ تو راستہ میں عیص نے بھی آپ کا استقبال کیا۔ اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت کے ذریعے مجھ پر فضیلت بخشی ہے۔ آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میرے خاندان میں بھی نبوت جاری فرمائے۔ آپ نے دعا فرمائی۔ تو وحی نے خبر دی کہ اللہ تعالیٰ عیص کے خاندان میں ایک بنی الوب علیہ السلام کو پیدا فرمائے گا۔ اور ایک عظیم المرتبت بادشاہ ذوالقرنین بھی آپ کے ہی خاندان میں ہوگا۔ چنانچہ آگے چل کر ایسا ہی ہوا۔

ان آیات میں ان انعامات کا تذکرہ ہے۔ جو اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل پر کیے۔ يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓءِیْلُ اذْكُرُوْا اِنْعَمٰیۤ اِلَیَّ اَلَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ لَے بنی اسرائیل! میرے ان انعامات کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیے۔ ان میں سے دو بنیادی انعام تھے۔ یعنی اس قوم میں انبیاء علیہم السلام مبعوث کیے اور بادشاہت بھی عطا کی۔ سورۃ مائدہ

بنی اسرائیل پر
انعامات

میں موجود ہے۔ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَاۗءَ وَجَعَلَكُمْ مَّلُوْكَادَ اللّٰہ تعالٰے نے
 کتنا عظیم احسان اس قوم پر کیا۔ اُس وقت اس کے برابر دنیا بھر میں کوئی دوسری قوم نہیں
 تھی۔ ان کو عزت اور شہرت حاصل تھی۔ مگر آہستہ آہستہ ان میں بگاڑ پیدا ہونے لگا جتنی
 کہ مسیح علیہ السلام کے زمانے تک ان کی ذلت انتہاء کو پہنچ گئی۔ انجیل اور تورات میں ان کی کتابوں
 سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان میں بہت زیادہ خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ ہزاروں سال گزرنے
 کے بعد جب نزول قرآن کا زمانہ آیا۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اللہ تعالٰے
 کا آخری پیغام اور شریعت نازل ہوئے۔ اس وقت بھی بے شمار خرابیوں کے باوجود یہی لوگ
 صاحب علم سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ قرآن پاک نے اس مقام پر بنی اسرائیل کو ہی دعوتِ فخر
 دی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو جنہیں تم اپنی خرابی کی وجہ سے کھو چکے ہو۔ لہذا اب
 یہی راہِ راست پر آ جاؤ۔ بنی آخر الزمان پر ایمان لے آؤ۔ اور خدا تعالیٰ کے آخری پیغام کو
 تسلیم کر لو۔ تو تمہاری چینی ہوئی غلت واپس آ سکتی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں کر دگے۔ اپنی بے مروتی
 پر قائم رہو گے۔ تو تمہارے حصے میں ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ اگلے رکوع
 میں ذکر آئے گا۔ کہ بنی اسرائیل میں کس طرح خرابیاں پیدا ہوئیں۔

اللّٰہ تعالٰے نے انعامات کا ذکر کر دینے کے بعد فرمایا وَ اَوْفُوا۟ بِعَهْدِيۡ اَے
 بنی اسرائیل میرے عہد کو پورا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے یہ عہد تو لیا تھا۔ کہ میری اطاعت
 کرنا۔ انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کرنا۔ اور فرائض کو پورا کرنا۔ فرمایا اس کے بعد میں اَوْفُوا۟
 بِعَهْدِكُمْ میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔ تمہارا عہد یہ ہے۔ کہ تمہارے کُناہ معاف کر کے
 تمہیں بخش دوں گا۔ اور جنت تک پہنچا دوں گا۔ تمام بنی نفع انسان نے جو عہد اللہ تعالٰے سے
 کیا ہوا ہے۔ آگے اُس کے مطلب یعنی میثاق کا ذکر بھی آئے گا۔ بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ وہ
 میثاق بھی پورا کرو۔ الَّذِیۡ وَ اٰتٰکُمْ مِّلَّةَ جُوْثَمَ لَہٗ پختہ عہد کیا ہوا ہے۔ اللہ تعالٰے نے
 بنی اسرائیل سے کہا تھا۔ کہ صحیح دین اور سچی بات کو مست چھپانا۔ مکرانوں نے کیا کیا۔ فَتَبَدُّوْا
 وَ کَذٰۤبُوْا ظُھُوْرَہُمْ اس عہد کو پس پشت ڈال دیا۔ نزول قرآن کے وقت تک بنی اسرائیل
 میں تیرہ اور کتان حق کی بیماری اپنے عروج پر تھی۔ یہ لوگ توراۃ، انجیل اور دیگر کتب میں موجود

آخری نبی علیہ السلام کے متعلق پیش گوئیوں کو چھپاتے تھے۔ اور اس حد میں مبتلا تھے کہ نبی آخر الزماں بنی اسرائیل کی بجائے بنی امیہ میں کیوں آیا ہے۔ یہ لوگ صاحب علم ہونے کے باوجود مقصوب تھے۔ مشرکین نے تو ایمان قبول کر لیا مگر یہ لوگ اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔ **مِیَاکَ وَلَکِزْ کَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فِیْقُوْنَ**، یعنی ان کی اکثریت منافرانوں کی ہے۔ جب کہ نہایت ہی قلیل تعداد راہِ راست پر آئی ہے۔ چنانچہ ان میں سے حضرت عبداللہ بن سلام جیسے چند حق پرستوں نے اسلام کی دعوت قبول کی۔ الغرض فرمایا تم میرا غمہ پورا کرو۔ میں تمہارا غمہ پورا کروں گا۔ **وَإِنَّا یَٰ فَارِھَبُوْنَ** اور خاص مجھ ہی سے ڈرو۔ میں ہی تمہارا خالق اور مالک ہوں۔ میں نے تم پر پست بھی انعم کیے۔ آئندہ بھی کروں گا۔ بشرطیکہ تم مجھ سے ڈر کر یہ حق راستے پر آ جاؤ۔

ایمان بالقرآن

بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: **وَاصْبِرُوا بِمَا أُنْزِلَتْ** اور جو چیز میں نے نازل کی ہے۔ اس پر ایمان لاؤ۔ اور یہ چیز مَصْدَقًا لِّمَا مَعَكُمْ اس چیز کی تصدیق کرتی ہے۔ جو تمہارے پاس موجود ہے۔ یعنی تورات اور دیگر سابقہ کتب میں یہ خبر یہ دے رہی ہے کہ قرآن پاک سابقہ کتب کی ہر چھوٹی بڑی چیز کی تصدیق نہیں کرتا۔ بلکہ اصولی طور پر بعض اہم باتوں کی تصدیق کرتا ہے۔ جس طرح ہر نبی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ سابقہ نبی کی تصدیق کرے۔ مگر اس کی شریعت اور احکام کی من و عن تصدیق نہیں کرتا۔ کیونکہ سابقہ دوسری پہلے نبی کی بعض چیزیں منسوخ کر دیتا ہے۔ اسی طرح قرآن پاک بھی سابقہ کتب کی تصدیق کرتا ہے۔ لہذا تم اس قرآن پاک کو یقینیت کلام الہی تسلیم کر لو۔ اور اس پر عمل پیر ہو جاؤ۔ **وَلَا تَكُونُوا دُونَ کَافِرٍ مُّبِیْنٍ** اور نہ مومن قرآن پاک کے اولین مشرکین بن جاؤ۔

قرآن پاک کا نزول مکہ مکرمہ میں شروع ہوا۔ اور سب سے پہلے انکار کرنے والے کفار۔ مکہ سے تھے۔ پھر جب حضور علیہ السلام ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں یہود نے اس کا انکار کیا۔ تو اس لحاظ سے قرآن پاک کے اولین مشرکین کفار مکہ میں رہے کہ یہود مدینہ۔ مگر یہاں بنی اسرائیل کو خطاب ہو رہا ہے کہ تم اولین مکہ بن بن جاؤ۔ مفسرین کرام اس کی توجیہ یہ بیان کرتے ہیں

سنئے والوں کے پاس تو کوئی کتاب نہیں تھی۔ کتاب یعنی تورات تو مہیشہ کے یو دسکے پاس تھی۔ لہذا اہل کتاب میں سے اولین کافرین یہی لوگ تھے۔ اسی لیے ان کو کہا گیا کہ تم اولین مسخرین میں سے نہ ہو جانا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اسرائیلی بیان فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل سے کما گیا کہ اگر تم موجودہ نسل والے نہ ہو گے تو تمہارے بعد آنے والی نسلیں بھی تمہاری روش پر عمل کرنا شروع کریں گی۔ اس سے ان سے بچنے کے لیے ان کی نسلوں کی عمر ابھی کے ذمہ دار بھی تم ہی تھے۔ اس لیے اولین مسخرین نہ بن جاؤ۔

پھر فرمایا وَلَا تَشْتَرُوا بِإِيسَىٰ نَفْسًا قَلِيلًا ۖ اور مت خریدو میری آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت۔ تھوڑی قیمت سے مراد دنیا کا حقیر مال ہے۔ جیسا کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ دنیا کی چار چیزیں ایسی ہیں جن کے پیچھے لوگ مرتے ہیں۔ یعنی کھانا پینا پینا اور نکاح کرنا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کھانے کا، بنجم کنگی اور پینے کا، انجملہ بول ہے۔ اچھے سے اچھا لباس بھی کچھ عمر بعد بھٹ جاتا ہے۔ اور اُسے پھینک دیا جاتا ہے۔ رہا نکاح۔ تو اس کی وجہ سے انسان طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہوتا اور اذیتیں برداشت کرتا ہے۔ یہ چاروں چیزیں عقیدے کو فاسد اور دین کو بگاڑنے والی ہیں۔ مگر لوگ ان حقیر اشیاء کے حصول کے لیے قیمتی اور اعلیٰ چیز یعنی ایمان کو خراب کر لیتے ہیں۔

فرمایا وَآيَاتِي فَإِنَّهُمْ كَافِرُونَ اور مجھ ہی سے ڈرو۔ آخرت کی خبر لو۔ دنیا کے پیچھے مت پڑو۔ آخرت میں میرے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔ حساب و کتاب ہو گا۔ اور پھر تمہیں اپنے کئے کی جزا یا سزا بھگتنی ہو گی۔ لہذا مجھ سے ڈرتے رہو۔

وَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىَٰ بِأَلْبَابٍ ۖ اور حق کو باطل کے ساتھ غلط مطنہ کر دو۔ وَتُكْفَمُوا ۖ اَلْهَوَىَٰ اور نہ ہی حق کو چھپاؤ۔ یہ بنی اسرائیل کی عام عادت تھی کہ وہ اپنی کتاب میں موجود سچی بات چھپا لیتے تھے۔ آگے آئے گا کہ یہ لوگ قرآن پاک اور بنی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح پیپنتے تھے جس طرح اپنی اولاد کو پیپنتے تھے مگر پھر بھی انکار کرتے تھے۔ یہ

یہ لوگ واضح علامات کو بگاڑ کر پیش کرتے تھے۔ اور ان میں تحریف کے مرتکب ہوتے تھے۔ یہ عیسائی اور یہودی تحریف میں ٹٹے ہر ہیں۔ خود عیسائیوں کے بڑے بڑے پادریوں نے تسلیم کیا ہے کہ انجیل میں تین ہزار تحریضیں چھپی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جہاں اس قدر تحریف کا عمل آرمایا گیا ہو۔ وہاں کس قدر بگاڑ پیدا ہوگا۔ اور جس کتاب کے ساتھ سلوک ہوا ہو۔ اس کا کیا سے کیا بن گیا ہوگا۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ جس طرح بنی اسرائیل میں بگاڑ پیدا ہوا۔ اسی طرح آپ کی امت میں بھی پیدا ہوگا۔ آج کے دور میں دیکھ لیں کہ بد قماش قسم کے علماء محض دنیوی مفاد کی خاطر کس طرح غلط فتوے جاری کرتے ہیں۔ یہ چیز کتمان حق سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اسی قسم کے لوگ امراء اور بادشاہوں کو خوش کرنے کے لیے غلط فتوے دیتے ہیں۔ مقصد ہوتا ہے۔ کہ حاکم وقت راضی ہو جائے۔ تو اپنی عیش ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ظالم بادشاہ اور فاسق امراء آخرت سے بے خوف ہو کر کمزور طبقے پر ظلم و جور کے پیار توڑتے ہیں۔ یہ لوگ علماء کو کے فتوے کی آڑ لے کر اپنی من مانی خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہی حال وزیروں اور دیگر دفتری اہلکاروں کا ہے۔ قانون کی آڑ میں عوام کے حق غصب کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: **وَكَيْلٌ لِّمَنْ لَا يَنْفَعُهُمْ وَحِدٌ مِّنَ الْوَيْلِ** جو کسی چیز کو نہیں جانتا۔ اس کے لیے ایک بار ہلاکت ہے مگر وکیل لِمَنْ يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَعْمَلُ سَبْعَ مِّنَ الْوَيْلِ جو جاننے کے باوجود اس پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔ اس پر سات بار ہلاکت ہے۔ مقصد یہ کہ کتمان حق کرنے والے دنیا پرست لوگ حق بات کو جاننے کے باوجود اس کو چھپاتے ہیں۔ اور حق پر عمل نہیں کرتے۔ لہذا یہ سات گنا سزا کے مستحق ہیں۔

پیردوں، گمراہی نشینوں اور علمائے سوراہا حال دیکھ لیں۔ انہیں ذرا نفس کا کوئی خیال نہیں کہ پورے ہوسے ہیں یا نہیں۔ مگر مستحبات اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو سینے سے لگائے

بیٹھے ہیں۔ جنہیں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ لوگ ملک پہ کافر کی حکومت برداشت کر لیں گے
جیسا کہ پیروں اور علماء سورسے انگریز کی حمایت کی۔ ملحد یہ اپنے خود ساختہ عقیدے کے خلاف
کوئی چیز برداشت کرنے کے لیے کبھی تیار نہ ہوں گے۔ ایسے ہی لوگ کمان حق کے مرتجب
ہو رہے ہیں۔

آج کل دین کے ساتھ کیا سوچ ہو رہا ہے۔ نہ کسی کو فرائض کی پروا ہے۔ اور نہ واجبات
کی معمولی معمولی باتوں کو نشانہ بنا کر ان کی تسمیر ہو رہی ہے۔ پراپیگنڈا جاری ہے۔ تفرقہ بازی
کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ اور پھر کالی گلوچ تک نسبت پہنچتی ہے۔ یہ سب کیا ہے بنی اسرائیل
کے شیوہ کو اپنایا جا رہا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا جو بیماریاں بنی اسرائیل میں پائی باقی
تھیں۔ اے میری امت۔ تم میں بھی وہی بیماریاں خود کرا آئیں گی حَذُّوَالنَّعْلَ بِالنَّعْلِ
جس طرح ایک جوتا دوسرے کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی طرح میری امت کی خرابیاں بنی اسرائیل
کی خرابیوں کے مشابہ ہوں گی۔

فرمایا حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ حق کو چھپاؤ۔ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ اور تم جانتے
ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ غرضیکہ اس مقام پر بنی اسرائیل کی خرابیوں کا اجمالاً بیان ہوا ہے۔ اگلے
رکوعات میں تفصیل کے ساتھ ایک ایک خرابی کی نشان دہی ہوگی۔ آج بھی یہ خطاب موجودہ
دور کے بنی اسرائیل کے لیے موجود ہے۔ ان کے بڑوں کی خرابیوں کو ان کے سامنے رکھا
جا رہا ہے۔ اور جو خرابیاں ان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ ان کی نشان دہی بھی ہو رہی ہے۔ گویا یہ
دعوت الی القرآن ہے کہ ”اٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتُ“ جس چیز کو میں نے نازل کیا ہے
یعنی قرآن پاک آؤ آج بھی اس پر ایمان لے آؤ تو فلاح پا جاؤ گے۔ قرآن پاک پہلی کتابوں کی
تصدیق کرنے والا ہے۔ اور آخری نوشتہ اور صحیفہ ہے۔ اس پر ایمان لائے بغیر اور اس کے
پیش کردہ پردہ گرام پر عمل کیے بغیر فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔

وَأَقِمْو الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَبُوا مَعَ الرَّاكِبِينَ ﴿٤٣﴾
 اتَّامِرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ
 تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٤٤﴾ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ
 وَالصَّلَاةِ ۚ إِنَّهَا الْكَلْبِيرَةُ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ﴿٤٥﴾
 الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا رَبِّهِمْ ۖ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ
 رَاجِعُونَ ﴿٤٦﴾

ترجمہ: ۴۳۔ اور قائم کرو نماز کو اور دو زکوٰۃ اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے
 ساتھ (۴۳) کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو۔ اور اپنی جانوں کو فراموش کرتے ہو
 حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ کیا تم نہیں سمجھتے (۴۴) اور مدد طلب کرو صبر اور نماز
 کے ساتھ۔ اور بے شک یہ نماز البتہ بھاری ہے۔ مگر ان لوگوں پر جو عاجزی
 کرنے والے ہیں (۴۵) وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں کہ بیشک وہ اپنے پروردگار
 سے ملنے والے ہیں۔ اور بیشک وہ اسی پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے
 والے ہیں (۴۶)

گزشتہ صفحہ پر
 اس رکوع کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کا ذکر فرمایا۔
 پھر زمین پر اترنے کا حکم دیا۔ اور ہدایت و رہنمائی کا وہ اصول ہی بتلادیا۔ جس پر جنت میں دوبارہ
 داخلے کا دار مدار ہے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل سے خطاب ہوا۔ دوسری قوموں کے مقابلے
 میں بنی اسرائیل کو مدت و رزق تک فضیلت حاصل رہی۔ نبوت اور حکومت ان میں رہی۔ ان
 میں بڑے بڑے عابد و زاہد لوگ پیدا ہوئے۔ مگر ایک طویل عرصہ کے بعد اس قوم میں طغیاء
 پیدا ہو گئیں۔ جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے خلافت ارضی بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل میں
 منتقل کر دی۔

گذشتہ درس میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے اُن پر کیے گئے انعامات یاد دلانے گئے اور انہیں قرآن پاک پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی۔ اور انہیں نصیحت کی گئی کہ وہ بنی اسرائیل میں اولین کافر نہ بنیں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے آئندہ نسلیں بھی انہی کے قدموں پر چلیں گی۔ اور اس طرح اُن کا دِبال بھی کھڑی سہل کرنے والوں پر پڑے گا۔ انہیں حق و باطل کی تبلیغ سے اور کتمانِ حق سے منع کیا گیا اور ترغیب دی گئی کہ تمہاری اپنی کتابوں میں قرآن پاک اور غامض ترین کتب کے متعلق جو پیش گوئیاں موجود ہیں انہیں ظاہر کریں۔

مدینہ طیبہ کے اطراف میں بسنے والے اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ بدترکی کے زعم میں مبتلا تھے۔ وہ انبیاء علیہم السلام کے خاندان میں سے ہونے کی وجہ سے دوسری اقوام کو کم تر سمجھتے تھے، عربوں کو وہ جاہل، اُن پر ہر اور اُمّی خیال کرتے تھے۔ اس قسم کے اشیائے گئے اسی سورۃ میں، سورۃ ال عمران میں اور دیگر سورتوں میں بھی ملتے ہیں۔ بنی اسرائیل کا دوسرا باطل زعم یہ تھا کہ نبوت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انہی کے خاندان میں جاری رہے گی۔ مگر جب بنی اسرائیل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسماعیل میں آگئے تو ان کی ساری برتری ختم ہو گئی اور وہ حسد کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ ان کے قبولِ حق سے انکار کی ایک بڑی وجہ یہ تھی۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس وقت انہیں جوہل اور منصفی برتری حاصل تھی۔ ایمان لانے سے وہ ضائع ہو جاتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اب ان کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔ اور انہیں حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کرنی پڑے گی۔ چنانچہ ایسی ہی چیزیں اُن کے ایمان لانے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ یہود کو ثبوتِ مال و ثبوتِ بہہ کی وجہ سے بیماریاں لاحق تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ ایمان لانے سے گریز کرتے تھے۔ اس زمانے میں بھی اکثر لوگ انہی دو بیماریوں میں مبتلا ہو کر خیر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ثبوتِ مال کی بیماری کی شدت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَرَثَةُ الْغَلْبِ الْخَيْرِ نَسْكَدُ يَدًا مَلِكُ الْحَبْتِ لَنْ

میں فطرۃ بڑی شدید ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبَّاجَمًا تَمْ جی بھر کر دل سے محبت کرتے ہو۔ جس کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور لوگوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔ اس قسم کی چیزیں بنی اسرائیل کے قبول حق میں مانع تھیں۔

ان بیماریوں کا علاج

ان دو بیماریوں کا علاج اللہ تعالیٰ نے یہ بتوڑ کیا وَأَقِمْو الصَّلَاةَ نَازِقًا قُمْ کرو۔ وَأَتُوا الزَّكَاةَ اور زکوٰۃ ادا کرو۔ یعنی حب جاہ کی بیماری کے لیے نماز شافی ہے۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے غرور، تکبر اور بڑائی کا علاج رکھا ہے۔ جو شخص نماز قائم کرے گا، اس کا مطلب سمجھے گا۔ وہ حب جاہ کی بیماری سے شفا یاب ہو جائے گا۔ اسی طرح حب مال کی بیماری کا علاج ادائیگی زکوٰۃ میں ہے۔ اور اس میں بہت سی حکمتیں ہیں مثلاً ان کے نخل دُور کرنا بھی ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص ہر سال مال کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ تو وہ نخل کی لعنت پاک ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ صرف مقررہ مقدار میں زکوٰۃ ادا کر دینا ہی کافی نہیں بلکہ فرمایا لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا حُبُّونَ یعنی تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی پسندیدہ چیز خرچ نہ کرو یہی وہ جذبہ ہے۔ جو مال کی محبت کو کم کر کے نخل سے نجات دلاتا ہے۔ گویا نماز اور زکوٰۃ حب جاہ اور حب مال کی بیماری کا علاج ہے۔

نماز جامع عبادت ہے

اہم بیضادی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے وَأَسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ میں نماز کے ساتھ توسل پکڑنے کا اس لیے حکم دیا ہے کہ نماز تمام عبادت کی جامع ہے۔ نماز میں روحانی، نفسانی اور جسمانی ہر قسم کی عبادت جمع ہیں مثلاً نماز طہارت پر موقوف ہے اور طہارت اسلام میں ایک بہت بڑا اصول ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا حصہ ہے اسی طرح ستر کا ڈھانپنا نماز کے لیے شرط ہے۔ ستر پوشی تو ہر حالت میں لازم ہے۔ مگر نماز کے دوران تو اور زیادہ ہو کہ ہے۔ انسان برہنگی کی حالت میں نماز ادا نہیں کر سکتا۔ عبادت کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ مال بھی صرف کرنا پڑتا ہے تو اگر نماز میں الفاظ جیسی عبادت بھی شامل ہے۔ پھر نماز کے لیے قبلہ شریف کی طرف رخ کرنا بھی ضروری ہے۔ نماز کی حالت میں انسان متعلق ہوتا ہے۔ اور اعتکاف ایک مستقل عبادت ہے لہذا نماز میں عکوف بھی شامل ہے

نماز کے دوران انسان کے اعضا اور جوارح خشوع کا اظہار کرتے ہیں۔ دل سے نیت اور اخلاص بھی ضروری ہے۔ اگر نیت اور خلوص نہ ہو تو نماز نہیں ہوتی۔ اسی طرح نماز میں شیطان کے ساتھ مجاہدہ بھی شامل ہے۔ نماز میں انسان رب العزت کے سامنے مناجات کرتا ہے۔ اور قرآن کریم کی تلاوت جیسی بہترین عبادت سے فیضیاب ہوتا ہے۔ نماز میں انسان تہمتیں کا تکلم کرتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ۔ یہ بہت بڑی حقیقت ہے۔ جس کی انسان گواہی دیتا ہے۔ نماز میں انسان کھانے پینے سے بھی اجتناب کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ الغرض اہم بیضادی فرماتے ہیں۔ کہ نماز ایک ایسی اعلیٰ درجے کی عبادت ہے۔ کہ اس میں بہت سی دوسری عبادات بھی شامل ہیں۔ نماز و زکوٰۃ کا حکم دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ مل کر نماز ادا کرو۔ اسی لیے تو نماز باجماعت ہمارے مذہب میں تقریباً واجب کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ حضور علیہ السلام کی ایسی سنت مؤکدہ ہے۔ کہ اگر بلا عذر ترک کر دے تو انسان منافقوں میں شمار ہونے لگتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت میں ہے کہ اگر تم باعذر نماز سے تعلق کر دو گے تو پیغمبر علیہ السلام کی سنت کو چھوٹنے والے بن جاؤ گے۔ اور اگر ایسا کر دو گے تو نَضَلْتُمْ گمراہ ہو جاؤ گے۔ صرف معذور افراد کو گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ وگرنہ تندرست آدمی کو بغیر جماعت کے نماز پڑھنے کی قطعاً اجازت نہیں۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جماعت میں شریک ہوتے تھے اور جماعت سے پیچھے وہی رہتا تھا۔ جس کا نفاق معلوم ہوتا ہے۔ یا وہ معذور رہتا تھا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہودیوں کی نماز میں رکوع نہیں تھا۔ صرف سجدہ ہی ہوتا تھا۔ اس لیے حکم ہوا کہ رکوع بھی کرو۔ اگرچہ یہ سجدہ سے کم درجے کا رکوع ہے۔ مگر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جس نماز میں رکوع نہ ہو، وہ نماز باطل ہو جاتی ہے بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ بیشک رکوع نماز کا ایک اہم رکن ہے مگر مَعَ الرَّاكِعِينَ سے صاف واضح ہے

۱۔ مسلم ۲۲۲/۱ ۲۔ مسلم ۲۲۲/۲ ۳۔ تفسیر عزیزی فارسی ۲/۱۳۲ ۴۔ معالم التنزیل ۲/۱۳۲

۵۔ تفسیر عزیزی فارسی ۲/۱۳۲ ۶۔ تفسیر ابن کثیر ۵/۸۵

اِس سے مراد نماز، جماعت ہے۔ کیونکہ اِس میں انسان کے لیے بے شمار فوائد ہیں۔ اِسی سے اجتماعیت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ بہت سی بیماریوں کا علاج ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو الغامات یا دوائے۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ کے کھڑی پیغام پر ایمان لانے کی تلقین کی۔ پھر اُن کی خامیاں ظہر کر کے انہیں تیس اور کمان حق سے منع فرمایا۔ ان بیماریوں کا علاج نماز اور زکوٰۃ بتلایا۔ اور اِس کے بعد بنی اسرائیل کی بہت بڑی کمزوری کی طرف توجہ دلائی۔ اور فرمایا اَتَاْمُرُوْنَ اَنْتَاسَ بِالْبِرِّ کَیَا تَمْلُوْنَ کُفْرًا کَیَا تَمْلُوْنَ کُفْرًا ہو۔ وَتَنْتَکُوْنَ اَفْکَکُمْ اور اپنی جانوں کو فراموش کر دیتے ہو۔ وَاَنْتُمْ تَسْتَلْمُوْنَ اَلْکِتَابَ حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ مقصد یہ کہ جس نبی کی طرف تم دوسروں کو دعوت دیتے ہو۔ خود جانتے بوجھتے بھی اِس پر عمل نہیں کرتے ظاہر ہے۔ کہ یہودی تورات کے عالم تھے اور وہ لوگوں کو تورات کے حقائق سے روشناس کراتے تھے۔ ان میں اللہ تعالیٰ کے آخری کلام قرآن پاک اور آخری نبی محمد رسول اللہ کے متعلق پیش گوئیاں بھی موجود تھیں۔ جو انہوں نے لوگوں کو بتائی تھیں۔ مگر جب یہ حقائق سامنے آ گئے تو دوسروں کو غلط کرنے والے یہودی علماء خود ان حقائق سے منحرف ہو گئے۔ گویا انہوں نے اپنے آپ کو فراموش کر دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ یہودی عالم اپنے مسلمان رشتہ داروں کو کسا کرتے تھے۔ کہ تم جس شخص پر ایمان لائے ہو۔ وہ بلاشبہ سچا اور آخری نبی ہے۔ اِس کا دامن نہ چھوڑنا۔ بخود اس پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ وجہ یہ تھی۔ کہ ایمان لانے سے اُن کے مالی فوائد ضائع ہوتے تھے۔ اُن کے اِسی دیر کے متعلق فرمایا کہ دوسروں کو تلقین کرنے میں اور خود کو فراموش کرتے ہیں۔ بعض دنیوی ناپی کے بے جہنم کے کندہ تراش بنتے ہیں۔ آگے سورۃ ال عمران میں ذکر آئے گا۔ کہ نصاریٰ ایک وفد حضور علیہ السلام کی خدمت میں آیا تھا۔ جز دنیا کے مال کی خاطر لیان سے محروم رہا سیرت کی۔ اور دوسری کتابوں میں موجود ہے۔ کہ اِس وفد کے لوگوں نے کہا۔ کہ اگر ہم ایمان قبول کر لیں۔ تو ہمارے دلیفے اور تنخواہیں بند ہو جائیں گی۔ لہذا ہم ایمان لانے کے

یہ تیار نہیں۔ اسی سے فرمایا کہ تم دوسروں کو تویشی کی طرف دعوت دیتے ہو۔ مگر خود اس سے بچتے ہو یہ کہاں کا انصاف اور عقلندی ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: کہ عراج کی رات میرا گھر ایسے لوگوں پر ہوا۔ جن کے ہونٹ جہنم کی قینچیوں سے کھٹے بستے تھے۔ میں نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا۔ یہ کون لوگ ہیں انہوں نے بتایا کہ حضور! یہ آپ کی امت کے خطیب ہیں۔ جو لوگوں کو امر بالمعروف یعنی نیکی کا حکم کرتے تھے۔ مگر اپنے آپ کو فراموش کر دیتے تھے۔ اہم دینی نے بھی ایک روایت بیان کی ہے۔ کہ جہنم میں ایک ایسا شخص بھی ہوگا۔ جس کی بدلہ سے جہنم والے بھی بیزار ہوں گے۔ لوگوں نے عرض کیا۔ حضور! ایسا بد بخت شخص کون ہوگا؟ آپ نے فرمایا وہ صاحب علم شخص جو اپنے علم سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ ایک دوسری حدیث میں اس طرح آتا ہے۔ کہ جو شخص دوسروں کو نیکی سکھاتا ہے۔ اور خود اس پر عمل نہیں کرتا۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے چراغ جو دوسروں کو روشنی مہیا کرتا ہے۔ مگر خود جلتا رہتا ہے۔

بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ قیامت کے روز ایک شخص کو لایا جائے گا۔ اور اسے اس حالت میں جہنم رسید کیا جائے گا۔ کہ اس کی آنتیں پیٹ سے نکل کر نیچے کی طرف ٹھک رہی ہوں گی۔ وہ شخص آنتوں کو اس طرح کھینچے گا۔ جیسا کہ عاخر اس کو کھینچنا ہے لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو جائیں گے۔ اور پوچھیں گے کہ لے فلاں! تجھے یہ مصیبت کس طرح پہنچی۔ حالانکہ تو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتا تھا۔ اور برائیوں سے منع کرتا تھا۔ وہ کہے گا۔ ہاں میں تم کو نیکی کا حکم کرتا تھا۔ مگر خود نیکی نہیں کرتا تھا۔ تمہیں برائیوں سے منع کرتا تھا۔ مگر خود باز نہیں آتا تھا۔ اس لیے آج مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔

تو فرمایا اے بنی اسرائیل! تم لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہو۔ بڑے مسائل بیان کرتے ہو۔ قرآن پاک کی تھانیت کا اقرار کرتے ہو۔ بنی آخر الزمان کے اوصاف حمیدہ بھی بتاتے

۱۔ تفسیر کبیرہ ۴۴، ۲۔ بن کثیر ۱۱۱، ۳۔ تفسیر کبیرہ ۴۴، ۴۔ بن کثیر ۱۱۱

۵۔ مسلم ۴۴، ۶۔ بخاری ص ۱ تفسیر غازی ۵۵، ۷۔ منثور ۱۱۱

ہو۔ مگر خود ایمان نہیں لاتے۔ اپنے آپ کو فراموش کیے بیٹھے ہو أَفَلَا تَعْقِلُونَ کیا تم میں عقل و شعور کا مادہ نہیں ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں۔

صبر و صلوٰۃ کی
برکات

فرمایا وَأَسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ یعنی مدد طلب کرو صبر اور نماز کے ساتھ۔ صبر و صلوٰۃ کو اختیار کر دو گے۔ تو برائیاں دور ہو جائیں گی۔ حُبّ الِمْجَاه کا علاج بھی تم صبر کے ذریعے کر سکتے ہو۔ نماز پڑھو گے تو عجز و انکاری پیدا ہوگی اور اس میں مختلف بیماریوں کی شفا ہے۔ پھر فرمایا وَلَهَا الْكِبْرِيَاءُ اور یہ نماز بے شب بڑی بھل اور بھاری ہے۔ إِنَّا عَلَى الْخَشِيعِينَ مگر عاجزی کرنے والوں کے لیے یہی نماز رحمت کا سامان بنتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کو إِذَا حَزَبَهُ أَهْرٌ فَنَزَعَ إِلَى الصَّلَاةِ جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی۔ تو نماز کی طرف رجوع فرماتے۔ کیونکہ نماز سے تعلق باللہ کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اور انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ جب قدر مضبوط ہوگا۔ اسی قدر مشکلات کم ہو جائیں گی۔ انسان کو مصائب کا احساس اسی وقت ہوتا ہے۔ جب اس کا تعلق باللہ کمزور ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ نماز کئی ظاہری بیماریوں کی شفا کا سبب بھی بنتی ہے۔ ام ابن کثیرؒ اور ابن جریرؒ نے روایت بیان کی ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ ایک دفعہ پیٹ کے درد میں مبتلا ہو گئے۔ شدت درد کی وجہ سے آپ لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ حضور علیہ السلام کا آپ پر گزر ہوا۔ تو فارسی لہجہ میں فرمایا أَشْكُمُ درد کیا تمہارے پیٹ میں درد ہو رہا ہے شکم فارسی میں پیٹ کو کہتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کیا فَعَسَا کہ حضور ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ فَعَسَلٍ فَإِنَّ الصَّلَاةَ شِفَاءٌ اٹھو اور نماز پڑھو کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے شفا رکھی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ نے نماز پڑھی۔ تو پیٹ کا درد دور ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے شفا عطا کر دی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔

رجوع الی اللہ

تو فرمایا یہ نماز بوجھل ہے۔ مگر عاجزی کرنے والوں پر نہیں۔ اور وہ کون لوگ ہیں الَّذِينَ

لَيُظَنُّونَ جَوَاقِفٍ كَرْتِے ہيں اَنَّهُمْ قُلِقُوا رَبِّهِمْ كَرُوۤا پِشۡتِے پُرورِ دُگَارِے مَلَاَقَاتِ كَرْنِے والے ہيں لَفْظِ ظَن اَصْدَارِ مَعَانِي ميں اِسْتِعْمَالِ ہوئے وَالَا لَفْظِ كَرْتِے ہيں اِس كَا مَعْنٰ اَكْمَانِ بھي ہو تہے۔ اور لَيُظَنُّونَ بھي۔ مَكْرَبِيَاں پَر ظَن كَا مَعْنٰ يَقِيْنِ ہيے۔ غَرَبِي زَبَان ميں بعض دوسرے كئى الفاظ بھي مَتَضَادِ مَعَانِي رَكْبَتِے ہيں۔ جيسے جَوْن كَا مَعْنٰ سِيَاہ بھي اور خَفِيہ بھي۔ اِسى طَرَحِ حَمِيمِ كَا مَعْنٰ گَرَم اور سَرْد دونوں طَرَحِ ہوتا ہيے۔

فَرِيَا يَہِ مَآزِ اُنْ لَوگوں پَر اَوَجَلِ نَہِيں ہيے جَنبِيں يَقِيْنِ ہيے كہ اَنہيں اِيك دِنِ اللہ تَعَالٰى كِي بَدَاہِ ميں حَاضِرِ ہونا ہتہ۔ وہاں اَعْمَالِ كِي بازِ پَرَسِ ہوگى۔ اور مَآزِ جِيسِي نِعْمَتِ كِي قَدَرِ وہاں جَا كَرِ مَعْلُومِ ہوگى۔ اور اَنہيں يَہِ بھي يَقِيْنِ ہيے وَ اَنَّهُمْ اَمِيْدِ رَاجِعُوْنَ كہ اَنہيں اللہ تَعَالٰى ہي كِي طَرَفِ لوٹ كَرِ جانا ہتہ۔ دوسرے مَقَامِ پَر فَرِيَا وَ اِلٰى اللہ تَرْجِعُ الْاُمُورُ "مَتَمِ چيزوں كَا رَجوعِ اللہ تَعَالٰى ہي كِي طَرَفِ ہيے۔ وَ اَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى" اور ہر چيز كِي اِنْتَا بھي دہيں ہوگى۔ چُونكہ عَاجِزِي كَرْنِے والوں كَا اِن بَاتُوں پَر يَقِيْنِ ہيے۔ اِس ليے وہ نَہَايَتِ نَوَاضِي اور ذَوَقِ وَ شَوَقِ كے سَا تَحْ مَآزِ پُر مَحْتِے ہيں۔ اُن پَر يَہِ بھَارِي نَہِيں ہو تى۔

الۃ

البقرة ۲

درست دیکھتے

(آیت ۴۰، ۴۱)

يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓئِيْلُ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ
وَالَّذِيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلٰى الْعٰلَمِيْنَ ۝۴۰ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِيْ
نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ
مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُوْنَ ۝۴۱ وَاذْكُرْ جُتُوْكُمْ مِّنْ
اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكُوْمُوْنَكُمْ سُوْرَ الْكُذٰبِ يُدْخِلُوْنَ اَبْنَاءَكُمْ
وَيَسْتَعْمِلُوْنَ نِسَاءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
عَظِيْمٌ ۝۴۲ وَاذْفَرَقْنَا بِكُمْ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنَاكُمْ
وَاعْرَقْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝۴۳

ترجمہ: اے اسرائیل کی اولاد! یاد کرو میری اس نعمت کو جو میں نے تم پر

العام کی اور یہ کہ میں نے تم کو فضیلت بخشی جہاں والوں کے مقابلے میں ۴۰

اور ڈرو اس دن سے کہ نہیں بچائے گا کوئی نفس دوسرے نفس سے کچھ بھی اور

ذبح کی جائے گی اس سے سفارش اور نہ لیا جائے گا اس سے فدیہ اور نہ ان کی

مدد کی جائے گی۔ ۴۱ اور اس وقت کو یاد کرو۔ جب ہم نے تم کو نجات دی فرعون

والوں سے۔ وہ چمکتے تھے۔ تم کو بہت بُری نظر۔ وہ ذبح کرتے تھے تمہارے

بیٹوں کو اور زندہ پھوڑتے تھے۔ تمہاری عورتوں کو اور اس بات میں آزمائش

تھی تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی ۴۲ اور اس بات کو یاد کرو جب ہم نے

تمہارے لیے دریا کو پھاڑ دیا تھا۔ اور ہم نے تمہیں نجات دی اور اہل فرعون کو غرق کیا۔

اور تم دیکھ رہے تھے۔ ۴۳

پہلے رکوع میں اتنا تھا۔ اب یہاں سے اللہ تعالیٰ نے تفصیل کے ساتھ بنی اسرائیل

پر آیات

کا ذکر کیا ہے۔ اور انہیں وہ انعامات و معجزات یاد دلانے ہیں جو ان پر ظاہر کیے گئے تھے۔

نزدیک قرآن کے زمانے کے بنی اسرائیل کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ ایمان قبول کر لیں نیز اس

قوم میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ساتھ ساتھ بل ایمان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی روش سے بچتے رہیں۔ کہیں ان کی غرابیوں میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ فرعون کی خلائی میں عرصہ دراز تک رہنے کی وجہ سے بنی اسرائیل میں بے شمار غریبیاں اور سرکشی کا مادہ پیدا ہو گیا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جیشہار بنیاد عظیمہ اسلام تشریف لائے۔ سرکشی کا جو مادہ اس قوم میں پیدا ہو چکا تھا۔ وہ بے قرار رہا۔ یہ سب باتیں ان آیات سے واضح ہوں گی۔

اسرائیل کا معنی امت کا بندہ ہے۔ اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے
 لَبِئْسَ مَا يَدْعُ لَكُمْ فِرْعَوْنُ يَعْقُوبُ ذَكِّرُوا نِعْمَتِي الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ
 اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی۔ اللہ تعالیٰ کے انعامات میں بنی اسرائیل کی غلامی سے آزادی بحیثیت قوم انیس برتری دینا اور ان میں کثرت سے نبی بھیجا وغیرہ شامل ہیں اور دوسری بات یہ کہ وَإِنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ تمہیں جہاں والوں پر فضیلت بخشی۔ سورۃ مائدہ میں آتا ہے۔ إِذْ جَعَلْنَا فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا یاد کرو اس احسان کو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر بڑے بڑے بادشاہ پیدا کیے۔ اور کثرت سے انبیاء مبعوث فرمائے۔ اور تم کو وہ چیز عطا کی جو جہاں والوں میں سے کسی دوسری قوم کو عطا نہیں کی۔

یہاں پر بنی اسرائیل کی جہاں والوں پر فضیلت سے یہ مراد نہیں ہے کہ انہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر بھی فضیلت حاصل ہے۔ قرآن پاک میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کو سب سے زیادہ فضیلت بخشی ہے۔ اور اس فضیلت کا تعلق دنیا سے بھی ہے اور آخرت سے بھی۔ گویا دونوں جہانوں میں امت محمدیہ کی فضیلت مسلم ہے۔ بنی اسرائیل کی فضیلت سے مراد یہ ہے کہ انہیں اپنے دور میں دینی اور دنیوی ہر دولہانہ سے باقی تمام عالم پر برتری حاصل تھی۔ اُس زمانے میں اس قوم میں صلاحیت بھی پائی جاتی تھی۔ اور اُن کی علمی حیثیت بھی مستند تھی۔ ایک خاص چیز جو بنی اسرائیل میں پائی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس قوم نے اپنی تاریخ کو محفوظ رکھا ہے۔ چنانچہ بائبل کا ایک بڑا حصہ تاریخ بنی اسرائیل پر مشتمل ہے۔ برخلاف اس کے ہندو قوم ہزاروں برس تک برسرِ اقتدار رہی ہے مگر سوائے چھوٹے موٹے قصے کہانیوں کے ہندوؤں کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اپنی یہ غامی خود ہندو بھی

بنی اسرائیل
کی فضیلت

تسلیم کرتے ہیں۔ گویا بنی اسرائیل کے دور میں جو دوسری اقوام موجود تھیں، ان میں سے کسی کی تاریخ بھی محفوظ نہیں ہے۔ بنی اسرائیل ہی ایک واحد قوم ہے جس کی تاریخ ملتی ہے۔

اسلامی تاریخ
کی حفاظت

البتہ جب حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا زمانہ آیا تو انہیں علمی لحاظ سے بھی برتری حاصل ہوئی اور انہوں نے اپنی تاریخ کو بھی محفوظ کر لیا۔ انہیں زمانے میں بڑا عروج حاصل ہوا۔ مگر جب یہ امت بھی زوال پذیر ہوئی۔ تو اس کی حیثیت بھی دنیا کی دیگر زوال پذیر اقوام سے مختلف نہ رہی۔ موجودہ دور کے مسلمان کو اپنی تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ نہ اپنی تاریخ کی حفاظت کی کوشش کرتا ہے۔ اور نہ اپنی کتاب کی تشریح اور تفسیر معلوم کرنے کی سعی کرتا ہے۔ مسلمانوں کے زمانہ عروج کی تاریخ تو آج بھی موجود ہے۔ اسلام نے بڑے بڑے مؤرخ پیدا کئے۔ جنہوں نے اپنے زریں دور کے ایک ایک لمحے کو اپنی کتابوں کے اوراق میں محفوظ کر لیا۔ ان مؤرخین میں علامہ طبری، قیسری، صدی بخاری میں ہوئے ہیں: ابن خلدون اور ابن کثیر، انھوں صدی کے مؤرخ ہیں۔ ابن اثیر، جنہوں نے تاریخ اور دیگر علوم کو محفوظ کیا۔ جو مؤرخ بھی ہیں۔ اور تاریخ دان بھی۔ مگر آج ہم ہیں جو اپنے اکابر کے جمع کردہ علمی ذخیرہ سے بھی خاطر خواہ مستفید نہیں ہو پتے جبکہ انگریز کی جدت پیدا ہوئی ہے۔ اس نے مسلمانوں کو ان کی اپنی تاریخ سے بے بہرہ کر دیا ہے آج مسلمان اپنی تاریخ کو فراموش کر چکا ہے۔ اُسے اب یورپ کے افراد پر فخر ہے۔ ان کی تاریخ کو حفظ کرتے ہیں۔ اپنی تاریخ سے نہ تو واقفیت پیدا کی جاتی ہے۔ اور نہ اُسے محفوظ کرنے کی جگہ دے دی جاتی ہے۔

امت مسلمہ
کی برتری

بہر حال یہ چیز بنی اسرائیل کے خصائل میں سے ہے۔ کہ انہوں نے اپنی تاریخ کو محفوظ رکھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں فضیلت بخشی اور فرمایا کہ میں نے تمہیں عانیں پر فضیلت بخشی۔ یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ عالمین سے مراد اقوام عالم ہیں۔ اور اس سے صرف انسان مراد ہیں۔ کیونکہ دنیا کی باقی اشیاء تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت کے لیے پیدا فرمائی ہیں: **خَلَقَ لَكُمْ** **مَّا فِي الْأَرْضِ** **جَمِيعًا** **لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ**۔ لہذا برتری صرف انسان کو ہی حاصل ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو اپنے زمانہ میں اقوام عالم پر فضیلت حاصل تھی۔ یہ فضیلت مطلقاً ہر زمانے کے لیے نہیں تھی حضور علیہ السلام نے فرمایا: کہ میری امت سب امتوں سے

بعد میں آنے والی ہے: ترقیامت کے دن سب آگے ہوگی۔ ان کا حساب و کتاب بھی ذاتی امتوں سے پہلے ہوگا۔ اور جنت میں بھی سب سے پہلے جائیں گے۔ انہیں باقی تمام امتوں پر برتری حاصل ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان پر کیے گئے اخلاقیات یا دلائل کے بعد فرمایا: **وَالْقَوُّ** **يَوْمَئِذٍ يَجْزِي نَفْسًا عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا** اور اس دن سے دُرو جس دن کوئی نفس نہ بچائے گا۔ دوسرے نفس سے کچھ نہیں۔ بہت ہی خوفناک اور خطرناک دن آنے والا ہے۔ ہر نفس کو اپنے عقیدے اور عمل کے مطابق بجھنا پڑے گا۔ یہ درکھو اس دن انسان کی برتری تقویٰ کے اعتبار سے ظاہر ہوگی۔ تقویٰ کی تشریح میں شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھی تھی: **إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَايَ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْعُقُوبَىٰ** یہ ہے کہ انسان عدل و احسان کا دامن تھام لے قربت و اردوں کے حق ادا کرے اور فحش اور بے حیائی کی باتوں سے بچتا ہے۔ عقیدے اور عمل میں اپنوں اور بیگانوں سے عدل لازم ہے۔ اور احسان تو بڑی منزل ہے۔ بحقوق کی ادائیگی — اس سے بھی آگے ہے۔ یہ تمام چیزیں تقویٰ میں شامل ہیں۔

وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ اور نہ اس نفس سے سفارش قبول کی جائیگی۔ **منہ شفاعت** شاہ رفیع الدین فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت میں مطلق سفارش کی نفی کی گئی ہے، حالانکہ سفارش برحق ہے۔ قرآن و سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ سفارش ہوگی۔ اس مقام پر جس سفارش کی نفی کی گئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کسی کافر کے حق میں سفارش معنی نہیں ہوگی کسی کافر سے سفارش قبول نہیں کی جائیگی۔ جسو علیہ السلام نے فرمایا: میری سفارش برحق ہے۔ اور یہ میری امت کے ہر اس شخص کو پہنچے گی **مَنْ دَخَلَ شِرْكًا بِاللَّهِ** شینا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا۔ مگر کافر کے حق میں یہ بالکل قبول نہیں ہوگی۔ البتہ اگر کسی کی فطرت پاک ہوگی جیسے وہ صحیح ہوگا، مشرک اور کافر نہیں ہوگا۔ تو سفارش معنی ہوگی **مَنْ ذَا الَّذِي يَنْفَعُ عَبْدًا**

رَبِّهِ يَذُنُّهُ اللَّهُ تَعَالَىٰ كِي اجازت کے بغیر بھی کوئی سفارش نہیں ہوگی۔ سفارش کی دوسری شرط یہ ہے کہ وہ رضیٰ لہ قَوْلُ سفارش اس کے حق میں ہوگی جس کا عقیدہ اور بات اللہ تعالیٰ کو پسند ہوگی۔ فاسد عقیدہ انسان کے ہاتھ میں سفارش کا کوئی مکان نہیں۔

حضرت شاہ رفیع الدین فرماتے ہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا۔ جس وقت ہل کوئی چیز فقیہ نہیں ہوگی۔ حشر میں بڑی بڑی منزلیں آئیں گی۔ جب قمری تجلی دوزخ سے نازل ہو رہی ہوگی۔ تو ابیر غیسر السدہ بنی غمیر جائیں گے۔ عدیث میں آتا ہے کہ نفسی نفسی پکاریں گے اس موقع پر سفارش کہاں ہوگی۔ ہاں جنس دوسرے مواقع پر دو شرائط کے ساتھ سفارش ہوگی کہ اللہ تعلقے کی اجازت ہو اور جس کے حق میں سفارش کی جا رہی ہے۔ اس کا عقیدہ صحیح ہو۔

فرمایا اُس دن سے دُر جس دن سفارش بھی قبول نہیں کی جائے گی۔ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ اور جس دن فدیہ بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ کہ کوئی شخص فدیہ دے کر اپنی جان چھڑا سکے۔ یہ بھی ممکن نہیں ہوگا۔ دوسری جگہ صاف موجود ہے کہ اگر کوئی شخص سونے کی بھری ہوئی پوری زمین بھی فدیہ دیکر اپنی جان بچا، چاہے گا۔ تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔ اول تو اتنا مال و دولت، سونا، چاندی، مسیا ہونا ہی ناممکن ہے۔ اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی جائے۔ تو اتنا بڑا فدیہ بھی کسی کا نہ آئے گا۔ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ اور نہ کسی طرف سے ان کی مدد ہوگی۔ دنیا میں کسی کو چھڑانے کے یہی طریقے ہیں۔ کیس سفارش چل گئی۔ کیس فدیہ یا نذرانہ دے دیا یا کیس جتنا بند کرنا۔ مگر میدان حشر میں ان میں سے کوئی چیز بھی کارگر نہیں ہوگی۔

بعض لوگوں نے سفارش کا عقیدہ بالکل ایسا بنایا ہے۔ جیسے عیسائیوں نے کفارے کا عقیدہ بنا رکھا ہے۔ یہ غلط عقیدہ ہے۔ سفارش حقیقت میں انسان کے عقیدے اور اعمال کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ یہودیوں نے بھی غلط امید لگا رکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہوں گے۔ اور وہ کسی ختمہ کے بونے اسرہیلی کو دوزخ میں نہیں گرنے دیں گے۔ مگر جو چاہیں کرتے رہیں، دوزخ میں نہیں جاسکتے۔ آگے آ رہا ہے کہتے

تھے "وَقَالُوا لَنْ نَمُوتَ الشُّرَارُ لَا يَأْتِيهِمْ مَوْتُ" اگر ہم دروغ میں گئے بھی تو
 ہم فتنے دن کے لیے جتنے دن ہمارے ہوں گے پھر بے کھچڑے کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "لَنْ
 يَدْخُلَ الْجَنَّةَ" مگر مَنْ كَانَ يَهْدِي وَيُضِلُّ وَيُفْسِدُ یعنی جنت کے دروازے
 یورپی اور عیسائی ہیں۔ ان کے مددگار کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ یہ ہم غلط عقیدے
 سفارش کے متعلق ہیں جو کہ ان کے اسی قسم کا عقیدہ بنایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ماضی ہو یا ماضی بعید
 درست ہو یا باطل، اعمال کا کوئی حصہ ہو یا نہ ہو، ہمارے سفارشی میں کچھ نہیں گئے۔ انہوں نے شریعتیں
 بنائی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکلف بنایا ہے، مکلفیتوں ہوتی ہیں۔ اس سے باز نہیں
 ہوتی ہے۔ عقیدے اور اعمال کے متعلق پوچھا جائے گا، قرآن پاک میں صاف موجود ہے، تاقی
 كُلُّ نَفْسٍ نَجَاهُ عَنْ نَفْسِهَا بِنَفْسٍ عَمِلَتْ بِهَا مِنْ عَمَلٍ۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ وہ دن بھی آئے ہیں جس دن اللہ تعالیٰ
 انسان سے براہِ راست خطاب کرے گا۔ وَلَيَسَّ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ تَرْجُماً جب
 خدا تعالیٰ اور انسان کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا، براہِ راست سوال و جواب ہوں گے۔
 انسان سوال ہے اور جس سفارش کے عیسائی یا مشرک یورپی قائل ہیں، ایسی سفارش کا اسلام
 کوئی مقام نہیں ہے

بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ارشاد ہوتا ہے: وَإِذْ جَعَلْنَاكَ مِنْ
 ذُرِّيَّةِ عَادٍ اور یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے تمہیں آل فرعون سے نجات دی، فرعون نے
 بنی اسرائیل پر غمزدگی کے پاد توڑ رکھے تھے، اس کے حرمی بھی اس کی ماں میں جلائے تھے۔
 اور غمزدگی میں فرعون کے ساتھ شریک ہوتے تھے، وہ تمہارے ساتھ کیا سوچ کر تے تھے۔
 يَوْمَ مَوْنَكُمْ مَوْدُودُ فَقَدْ بَدَّوْا فِيكُمْ ذُرِّيَّةَ عَادٍ مِمَّنْ كَفَا
 بَنَاءَ كُفْرِهِمْ هَاهُنَا وَهَاهُنَا كَرِهَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ
 كَوْمًا يَنْبِتُ۔

مردوں کے قتل اور عورتوں کے زندہ رکھنے کا عمل بنی اسرائیل کے ساتھ دودھ پیش آیا۔ پہلی دفعہ یہ ظلم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ڈھایا گیا۔ جب بچہ میوں نے پیش گوئی کی کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ جو فرعون کی سلطنت کے زوال کا باعث بنے گا۔ اُس وقت فرعون نے حکم دے دیا کہ بنی اسرائیل میں جو بھی بچہ پیدا ہو۔ اُسے ذبح کر دیا جائے اور اُسے زندہ نہ چھوڑا جائے۔ مگر جب موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فرعون کے گھر میں ہی اُن کی پرورش کی۔ اور وہ سارے واقعات پیش آئے جو سورۃ قصص میں مذکور ہیں۔

ظلم کی اس چکی میں کتنے بچے پسے۔ اسکے متعلق مختلف روایات آتی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اُس وقت نوے ہزار بچے ذبح کئے گئے۔ ظلم و جبر کی یہ انتہا تھی۔ اُن والدین کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ جن کے سامنے ان کے نومولود بچوں کو قتل کر دیا جائے۔ ایسے والدین کی پریشانی کا کیا حال ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے اُس احسان کو یاد کرو۔ جب میں نے تمہیں اس ظلم سے نجات دی۔

بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کا دوسری دفعہ حکم فرعون نے اُس زمانے میں دیا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی بن کر آئے اور تبلیغ کا کام شروع ہوا۔ اس وقت فرعون کو دوبارہ خطرہ پیدا ہوا کہ بنی اسرائیل کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسے کسی طرح کم کرنا چاہیے۔ چنانچہ اُس نے حکم دے دیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو۔ اُسے پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جائے۔ اور اگر لڑکی پیدا ہو۔ تو اسے زندہ چھوڑ دیا جائے۔ لڑکیاں ہماری خدمت گزاری کے کام آسکیں گی۔

فرمایا وَفِي ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑا امتحان تھا۔ بنی اسرائیل کے لیے واقعی یہ بہت بڑی آزمائش تھی کہ اپنے سامنے بچوں کو ذبح کرنا اور وہ کس طرح اس امتحان میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جب بنی اسرائیل اس امتحان میں کامیاب ہوئے۔ بہت اور حوصلہ نہ چھوڑا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس ظلم سے نجات دے دی۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دوسرا بڑا احسان یہ بتلایا وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمْ
 الْبَحْرَ فَاَجْعَلْنَا كُفْرًا وَجِبْ جَمْعُ تَمَاسِیْ یسے دریا کو پھاڑ دیا۔ اور تم کو نجات دی بنی
 اسرائیل جب ہجرت کر کے مصر آئے تھے۔ تو اس وقت یعقوب علیہ السلام کے خاندان کے
 بہتر آدمی تھے۔ چار پانچ صدیوں کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے تو اس وقت
 بنی اسرائیل کی تعداد تقریباً چھ لاکھ ستر ہزار ہو چکی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا
 کہ میرے ان بندوں کو لے کر یہاں سے نکل چلیں۔ آپ نے اپنی قوم سے مشورہ کیا اور طے یہ
 پایا کہ بغیر اطلاع یہاں سے نکلنا درست نہیں بلکہ فرعون سے اجازت حاصل کر لینی چاہیے۔
 چنانچہ انہوں نے فرعون سے اجازت طلب کی کہ ہم باہر سی تقریب میں جانا چاہتے ہیں۔ اجازت
 مل گئی۔ انہوں نے فرعونوں سے زیورات وغیرہ بھی حاصل کر لیے۔ کہ ایک خاص تقریب میں
 شامل ہونا ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل سفر پر روانہ ہو گئے۔ سارا دن گزر گیا۔ اگلی رات فرعونوں کو
 احساس ہوا کہ کہیں بنی اسرائیل بالکل ہی نہ چلے جائیں۔ ان کا پتا کرنا چاہیے۔ فرعون نے تعاقب
 کا حکم دے دیا۔ ایک دن لشکر کی تیاری میں گزر گیا۔ اور دوسری رات بھی گزر گئی۔ بنی اسرائیل
 مسلسل چلتے رہے۔ مصر سے شرق کی جانب بیکہ قلمزم آتا ہے۔ اس کو عبور کرنے کے بعد
 صحرائے سینا آتا ہے۔ یہ بارہ کوس کی مسافت ہے۔

تفسیری روایتوں میں آتا ہے کہ فرعون کا لشکر بارہ لاکھ افراد پر مشتمل تھا۔ شاہ رفیع الدینؒ
 فرماتے ہیں کہ لشکر اور بازاری لوگ ملا کر کل نفری ساٹھ لاکھ کے قریب تھی۔ اور جب
 بنی اسرائیل بیکہ قلمزم کے کنارے پر پہنچے تو پتا چلا کہ پیچھے فرعون لشکر لے کر آ رہا ہے بڑے گھبرائے
 کہ اب تو ہم بچوٹے جائیں گے۔ اور ہم میں سے ایک شخص بھی زندہ نہیں بچے گا۔ موسیٰ علیہ السلام
 نے بنی اسرائیل کو تسلی دی کہ گھبراؤ مت اِنَّ مَعِيَ رَبِّی سَیَمْدِنِ بِشَیْءٍ مِّمَّارَبِ میرے
 ساتھ ہے۔ وہ ضرور راہنمائی کرے گا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا اِنَّ اَصْرِبُ بِقَصَاۃِ
 الْبَحْرِ یعنی اے موسیٰ اپنی رعیت سے سمندر میں بارہ جگہ ضرب لگاؤ۔ بنی اسرائیل کے بارہ

وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن
 بَعْدِهِ وَأَنتُمْ ظَالِمُونَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِمَّنْ بَعْدَ
 ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٢﴾ وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَىٰ الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ
 لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿٥٣﴾ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَتُومِرُ إِنَّكُمْ
 ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ
 فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ
 فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿٥٤﴾

ترجمہ: اور اُس وقت کو یاد کرو جب کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے چالیس
 رات کا وعدہ کیا۔ پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا۔ اور تم ظلم کرنے والے
 تھے ﴿٥١﴾ پھر ہم نے معاف کیا تم کو اس کے بعد تاکہ تم شکر یہ ادا کرو ﴿٥٢﴾ اور
 اس بات کو یاد کرو جب ہم نے دی موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور فرقان تاکہ تم ہدایت
 پا جاؤ ﴿٥٣﴾ اور اس واقعہ کو یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا۔
 اے میری قوم کے لوگو! بے شک تم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ بوجہ بنائے کے
 بچھڑے کو معبود۔ پس توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے۔ پس قتل کرو
 ایک دوسرے کو۔ یہ بہتر جتنا ہے پیدا کرنے والے کے پاس۔ پس اُنہی نے رجوع
 کیا تمہارے اوپر بیشک وہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے ﴿٥٤﴾

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر جو نعمات فرمائے ان کا ذکر مسلسل آ رہا ہے۔ فرعون کی غلامی
 سے نجات دلانے، دریا کو بچاڑ کر معجزانہ طور پر پانی میں راستے بنانا اور بنی اسرائیل کو بچانا اور پھر
 فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت وغیرہ کا ذکر آچکا ہے۔ اس درس میں بعض مزید نعمات کا تذکرہ
 ہے۔ سمجھو ان کے بنی اسرائیل کو کتاب اور شریعت عطا کرنا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَرَدَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ۚ اِس بات کو دھیان میں لاؤ جب کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا تھا۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ کوہ طور پر چالیس رات تک تنہائی میں اعتکاف کریں۔ قرآن پاک میں ہے کہ اصل وعدہ ایک مہینہ کا تھا۔ مگر بعد میں بڑھا کر چالیس رات کر دیا گیا۔ وعدہ یہ تھا کہ مسلسل چالیس رات کے اعتکاف کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی جائے گی۔ اور یہ اس وقت کا واقعہ ہے۔ جب بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے نجات حاصل کر چکے تھے۔

وَعَدْنَا بَابَ مَنْعِلِهِ كَصَيْفِهِ . اور اس کا معنی بھی وَعَدْنَا ہی ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عظیم اور جلیل القدر پیغمبر تھے۔ بنی رسول اور صاحب شریعت تھے۔ خدا تعالیٰ کے خلیفہ بھی تھے۔ لفظ موسیٰ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ جسے عربی میں ڈھال یا گیا ہے۔ عبرانی زبان کا اصل لفظ مِیث تھا۔ معنی کا معنی پانی اور شا کا معنی درخت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے بچپن میں پانی میں بہتے چلے آئے تھے۔ جب انہیں اٹھایا گیا وہاں درخت بھی موجود تھے۔ اس بنا پر آپ کا نام میثا اور پھر عربی میں موسیٰ بن گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے سولہ سو سال پہلے ہوئے ہیں۔ آپ کی عمر مبارک یک سو تیر سال تھی۔ اسی عمر میں یہ سائے واقعات پیش آئے۔ آپ کے والد کا نام عمران تھا۔ آپ کا شجرہ نسب اس طرح ہے موسیٰ بن عمران بن بصیر بن فہث بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم لاوی یعقوب علیہ السلام کے سب سے بڑے بیٹے تھے اور عرف عام میں بڑا بیٹا بنی ریاست اور نیابت کا وارث ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے موسیٰ علیہ السلام کو دونوں حیثیتیں حاصل تھیں۔ حقیقی ریاست یعنی نبوت بھی ان کو حاصل تھی۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بنی اور رسول بنایا۔ اور عام ریاست یعنی نیابت بھی بڑا ہونے کی حیثیت سے آپ کو ہی حاصل تھی۔

فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل کو احساس ہوا کہ وہ اب آزاد ہو چکے ہیں۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ چکی ہیں۔ لہذا ان کے پاس اپنا قانون بنانا چاہیے۔ جس سے وہ رہنمائی حاصل

کریں۔ اور اس کے مطابق زندہ کی بسر کریں۔ چنانچہ قوم کی خواہش پر موسیٰ علیہ السلام نے رب العزت کی بارگاہ میں عرض کی کہ ہمیں کوئی قانون عطا کیا جائے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ طور پر آکر چالیس دن کا اعتکاف کرو۔ تو تمہیں کتاب دی جائے گی جو تمہارے لیے مکمل قانون ہوگی۔

تفسیر معالم التنزیل اور بعض دیگر تفاسیر میں یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل بحر قلزم کو عبور کر کے صحرائے سینا میں وارد ہوئے اور انہوں نے چالیس سال میدان تیرہ میں گزارے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات بھی وہیں ہوئی۔ ہارون علیہ السلام بھی اسی مقام پر فوت ہوئے۔ تاریخ سے بھی یہ چیز ثابت ہے کہ چالیس سال تک بنی اسرائیل صحرائے سینا میں ہی صحرا نوردی کرتے رہے۔ یہ لوگ مصر کی طرف نہیں گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا تھا کہ ارض مقدس پر حملہ کرو۔ وہاں پر تمہیں قبضہ دلایا جائے گا۔ مگر یہ لوگ اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ چالیس سال بعد بنی نسل نے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے ارض مقدس پر حملہ کیا اور کامیاب ہوئے، اُس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نائب حضرت یوشع علیہ السلام منصب نبوت پر فائز تھے۔ انبیائے بنی اسرائیل میں حضرت یوشع علیہ السلام کا ذکر آتا ہے۔ کو ان کے زمانے میں شام اور فلسطین پر بنی اسرائیل قابض ہوئے۔ اُس زمانے میں اس علاقے میں قوم عمالقتہ کی حکومت تھی۔

معالم التنزیل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بحر قلزم کو پار کرتے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے قوم کے کچھ آدمیوں کو مصر کی طرف بھیجا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ وہاں کا انتظام کریں۔ ایسا نہ ہو کہ چور، ڈاکو، قزاق، بھند وغیرہ مکات میں بد امنی پھیلے۔ یہ بات اگرچہ عام روایتوں کے خلاف ہے تاہم اس بات کا امکان ہو سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بعض لوگوں کو وہاں بھیجا ہو مگر آپ خود وہاں نہیں گئے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کوہ طور پر اعتکاف ہوئے تو وہاں سے اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن ملی۔

توراة کا لفظی معنی قانون ہے اور اس سے مراد قانون شریعت ہے۔ اپنے زمانے میں توراة بڑی عظیم المرتبت کتاب تھی۔ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا تھا کہ ایسی کتاب عنایت کروں گا۔ جسکی شریعت اور قانون قرون تک جاری رہے گا۔ آسمانی کتب میں سب سے اعلیٰ مرتبہ قرآن پاک کا ہے اور اس کے بعد توراة کا۔ جس طرح قرآن پاک میں قانون فوجداری۔ دیوانی۔ اخلاق۔ عبادات بمعنا وغیرہ موجود ہیں۔ اسی طرح توراة میں بھی ہر قسم کے قوانین موجود ہیں جس طرح توراة کا معنی قانون ہے۔ انجیل کا معنی بشارت ہے۔ زبور کا معنی صحیفہ ہے۔ اور اس میں زیادہ تر دعائیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن ہے۔ جس کا معنی پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ چنانچہ آج بھی دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب قرآن پاک ہی ہے۔

حکمت نامی
نعمت ہے

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام ذوالقعدہ کی ابتداء میں کوہ طور پر متعلق ہوئے اور ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو اللہ تعالیٰ نے توراة عطا کی۔ گویا پورا ماہ ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے دس دن آپ نے احکامات کیا۔ یہ چالیس دن کا بھی خاص اثر ہوتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔ مَنْ أَخْلَصَ لِلَّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا ظَهَرَتْ يَنَابِغُ الْحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهِ عَلَى لِسَانِهِ جس نے چالیس دن تک اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص کیا۔ حکمت اس کے دل سے نکل کر اس کی زبان پر ظاہر ہو جائے گی۔ حکمت و الثوری کو کہتے ہیں اور یہ بڑی گہری بات ہے جسے نصیب ہو جائے۔ وَمَنْ يَكُنْ الْحِكْمَةُ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا جسے حکمت عطا کر دی گئی۔ اُسے خیر کثیر مل گئی۔ دوسری جگہ فرمایا وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ اِمْسِكْ لِقْمَانَ كَحِكْمَةِ عَطَاكِ۔ یہ لقمان اللہ نے ایک بزرگ تھے۔ نبی نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی ذہانی عطا کی تھی۔ تو مقصد یہ ہے کہ چالیس دن تک اخلاص بہ تنے سے حکمت زبان پر جاری ہو جائے گی۔ حدیث شریعت کا یہ مطلب ہے۔

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے۔ خُصِّ طَيْنِ اَدَمَ اَرْبَعِينَ صَبَاحًا اَوْ اَدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنْ يَحْسِبَ رُوْزًا يَكْ خَمِيرًا كُنِيَ۔ اور یہ اللہ کے سلسلہ میں بھی آتا ہے۔ کہ جب

۴۴۹
کی حکمت

۴۴۹ معالہ التذلل ص ۲۱۱۔ ابن کثیر ص ۹۱۔ ۴۴۹ فیض القدر شرح جامع مغیر ص ۲۱۱۔

۴۴۹ تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۱۱۔

حاصل قرار پاتا ہے تو چالیس دن تک نطفہ رہتا ہے۔ اس کے بعد علقہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کے چالیس دن بعد گوشت کا لوتھڑا بنتا ہے۔ پھر چالیس دن بعد اس میں روح انسانی ڈالی جاتی ہے۔ اس سے پہلے روح حیوانی ہوتی ہے۔ صوفیائے کرام عام طور پر چالیس دن کا پندرہ گنت ہیں چالیس دن روزہ بھی رکھواتے ہیں۔ اور عبادت بھی کرتے ہیں جس کا خاص اثر ہوتا ہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک خوبصورت عورت باجماعت نماز پڑھا کرتی تھی۔ کسی نوجوان کی نظر پڑی تو اُس پر عاشق ہو گیا۔ اس نے عورت کو ملاقات کا پیغام بھیجا۔ وہ بھی سمجھ گئی۔ کہ یہ شخص فتنے میں مبتلا ہو گیا ہے۔ وہ عورت کامل الایمان تھی۔ کتنے لڑکے اس کے ملاقات کا موقع اس شرط پر دینے کو تیار ہوں کہ تم حضرت عمرؓ کے پیچھے چالیس دن تک نماز ادا کرو۔ اور یہ اس حالت میں ہو کہ تمہاری تکبیر اولیٰ فوت نہ ہو۔ اس شخص نے اُسے نہایت آسان کام سمجھتے ہوئے نماز باجماعت شروع کر دی۔ ابھی بارہ روز ہی گزرے تھے کہ اس میں تغیر آنا شروع ہو گیا۔ جب چالیس دن مکمل ہوئے تو اس شخص کی کایا ہی پٹ چکی تھی۔ اب اُس عورت نے پیغام بھیجا کہ تمہاری شرط پوری ہو چکی ہے۔ تم اگر ملاقات کر سکتے ہو۔ نوجوان نے جواب بھیجا کہ اب میری ملاقات اللہ تعالیٰ سے ہو چکی ہے۔ تمہاری ملاقات کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ چالیس دن کے چلنے کا اُس نوجوان پر یہ اثر ہوا۔ اس کے بعد اس عورت نے اس واقعہ کا ذکر اپنے خاوند سے کیا۔ اور اُس نے سارا واقعہ حضرت عمرؓ کو سنا دیا۔ آپؓ فرمایا صَدَقَ اللہُ تَعَالٰی اللہ تعالیٰ نے بالکل سچ فرمایا اِنَّ لِّصَلٰوۃِ تَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَاۃِ وَالْمُنْكَرِ بے شک نماز بے حیائی اور بُرے کاموں سے روکتی ہے۔ اور پھر نماز بھی ایسی جو امیر المؤمنینؓ کے پیچھے ادا کی گئی ہو۔ سُبْحٰنَ اللہِ اس کا کیا ہی اثر ہو گا۔ بہر حال چالیس کے عدد کا یہ خاص اثر ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام چالیس روزہ کے لیے کوہ طور پر متعین ہو گئے تھو اَتَّخَذْنٰمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِہٖ ثُمَّ نَبَاۤیَا۔ وَأَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ۔ بنی اسرائیل کی گمراہ پرستی

اور تم بڑے ظلم کرنے والے تھے۔ تم نے کچھ خیال نہ کیا۔ تمہارے پاس ایک پیغمبر بھی موجود تھے۔ مگر اس کے باوجود تم گوسالہ پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ شرک میں ملوث ہو گئے۔ حالانکہ ”اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ“ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ”وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ“ کفر کرنے والے بہت بڑے ظالم ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں دغل انداز کرتے ہیں۔ اس کی صفات میں شرک کرتے ہیں۔ یا اس کی عبادت میں شریک بٹھراتے ہیں۔ سورۃ طہ میں آتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی سے منع کرتے رہے۔ انہوں نے ہر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس قوم نے کوئی بات نہ مانی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ گوسالہ پرستی ہر قوم میں پائی جاتی ہے۔ یہ سب سمجھو کہ صرف بکھرے کی پر جا ہی ”شرک“ نہ فعل ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوجھ کی بھی پر جا کی جائے گی۔ وہ شرک ہی ہو گا۔ ترمذی شریف میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ ”فَعَسَىٰ عِبَادُ النَّبِيِّ تَبَادُوهُ دِينَارًا كَابَنَدِهِمْ كَابَنَدَتَاهُ يَوْمَ يَكْمُلُ كَابَنَدُهُ“۔ ”اِنْ اُعْطِيَ رَضِيَ وَاِنْ لَمْ يُعْطَ سَخِطَ“ اگر اسے دے دیا جائے تو راضی ہو جاتا ہے۔ اور اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہوتا ہے۔ یہ دراصل درجہ و دینار کی عبادت ہی تو ہے۔ اس کو بھی گوسالہ پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایک مام مقولہ ہے کہ جو چیز تجھے نہ تعالیٰ کی عبادت سے غافل کر دیتی ہے۔ وہ تیرا طاغوت ہے۔

مختلف قوموں کے
ایک دوسرے پر
اثرات

اس مقام پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ہارون علیہ السلام جیسے نبی کی موجودگی میں بنی اسرائیل کو سالہ پرستی میں کیسے مبتلا ہو گئے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں: کہ اس کی غالب وجہ یہ ہے۔ کہ مصر میں صدیوں تک بستے ہوئے بنی اسرائیل نے مصریوں کے اثرات قبول کر لیے تھے۔ منسرن لوگ سانپ کی پوجا کرتے تھے۔ لگائے کی پوجا کرتے تھے۔ اور سوج کی پوجا کرتے تھے۔ فرعون کا معنی ہی بڑا دیوتا ہے۔ لہذا یہ سوج کے نام پر بنایا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ مظاہر قدرت کی پوجا کرتے تھے۔ یہی چیز بنی اسرائیل میں بھی سرایت کر چکی تھی۔ لہذا انہوں نے بھی پچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔

اقوام عالم کے ایک دوسرے پر اثرات تاہم یہی طور پر ثابت ہیں۔ برصغیر کے شلمان ہندوؤں کے آثار سے بہت متاثر ہوئے۔ ہندوؤں کی بہت سی دھرمیں سکندروں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مرنے والے کاتیجا۔ ساتواں۔ پالیسواں وغیرہ ہندو دھرم میں۔ درختوں کی لکڑیوں کو ان دھرموں سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح بنی اسرائیل چونکہ مصریوں کے غلام تھے۔ لہذا ان کے اثرات بنی اسرائیل میں بھی سرایت کر گئے۔ موجودہ زمانے میں دیکھ لیں جو قومیں انگریزوں غلامی میں رہی ہیں۔ وہ سب ان کی تہذیب و تمدن سے متاثر ہیں۔ مشرقی ممالک میں سے ایرانیوں۔ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں نے ان کا بڑا اثر قبول کیا ہے۔ یہی حال عربوں مصریوں اور شامیوں کا ہے۔ بعینہ مصریوں کی عادات بنی اسرائیل میں سرایت کر چکی تھیں۔ لہذا موقع ملے ہی انہوں نے گوسالہ پرستی شروع کر دی۔

بعض اسرائیلی حوالی عقیدہ کہتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز میں مداخلت کر جاتا ہے۔ اور اس شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ جیسے ہندوؤں میں اوتار کا عقیدہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ فلاں کی شکل میں ظاہر ہو گیا ہے۔ یا فلاں جہنم میں اس نے ظہور کر لیا ہے۔ تو اسی قسم کے غلط عقیدہ کی بنا پر سامری بہت انہیں گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جیسا کہ قرآن میں موجود ہے۔ سامری نے کہا "هَذَا إِلَهُكُمْ وَإِلَهُ مُوسَىٰ ذُنُوبُهُمْ يَبْغِي تَهَارًا" اور موسیٰ علیہ السلام کا الہیسی ہے اللہ تعالیٰ اس بچھڑے میں صول کر آیا ہے۔ لہذا اس کی پر جانشروع کر دو۔ بچھڑے نے بولنا تو شروع کر ہی دیا تھا۔ جمال قسم کے بنی اسرائیل سامری کی باتوں میں آگے۔ اور انہوں نے بچھڑے کی پر جانشروع کر دی۔

باقی۔ بایہ سوال کہ سامری نے یہ کدھم کیسے ظاہر کر دیا۔ تو یہ شخص مسیحا، مسٹر یا مداری یا جادوگر تھا۔ وہ مختلف قسم کے بڑک جانتا تھا، چنانچہ اس نے چال بازی سے کام لیا۔ جب فرعون کا لشکر بنی اسرائیل کے تعاقب میں بحیرہ قلزم پر پہنچا اور ان کے گھوڑے سمندر میں اترنے سے ہچکچائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو گھوڑی پر سوار کر کے ہیبی جو لشکر فرعون کے آگے آگے چل رہی تھی۔ سامری نے دیکھا کہ جس جگہ پر جبریل علیہ السلام کی گھوڑی کا پاؤں ٹپکتا ہے وہاں فوراً سبزہ اُگ آتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس میں کوئی کدھم ہے، اس نے گھوڑی کے پاؤں والی جگہ کی گھوڑی سی مٹی نمنونہ کر لی۔ وہ سنا تو تھا ہی۔ اس نے سونے کا بچھڑا بنایا۔ اور اس کے منہ

میں وہ مٹی رکھ دی۔ جس کی وجہ سے بچہ پڑے نے بولنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس نے مشہور کر دیا۔
کہ خدا تعالیٰ اس میں حلول کر آیا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام
کی واپسی

موسیٰ علیہ السلام چالیس روزہ اعتکاف کے بعد اللہ تعالیٰ کی کتاب لے کر واپس آئے
تو دیکھا کہ کئی لوگ شرک میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ آپ سخت ناراض ہوئے۔ مشرکین کو زجر کیا۔
اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے بھی بڑے ناراض ہوئے کہ آپ نے قوم کو شرک میں مبتلا ہونے
سے کیوں نہ روکا۔ بھائی نے غدر پیش کیا کہ میرا قصور نہیں ہے۔ میں نے تو انہیں ہر چند شرک
سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر یہ تو میرے قتل کے درپے ہو گئے تھے۔ "وَكَادُ ذَا يَقْتُلُونَنِي"
یہ سارا واقعہ سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر یہ لوگ آپ کی بات
نہیں مانتے تھے۔ تو آپ ان کو چھوڑ کر الگ ہو جاتے۔ اس کے جواب میں ہارون علیہ السلام
نے کہا کہ میں نے تفریق کو پسند نہ کیا۔ کہ آپ واپس آکر اعتراض کرتے کہ قوم کو دو ٹکڑوں
میں کیوں تقسیم کر دیا۔ ان میں پارٹی بازی پیدا کر دی ہے۔ لہذا میں نے انہیں کے درمیان بستے
ہوئے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر ان بدبختوں نے میری بات نہ مانی۔

بچہ پڑے کے
بجاریوں کا
قتل عام

جب موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو خوب ڈانٹا تو وہ پشیمان ہو گئے۔ انہیں احساس ہو گیا کہ
انہوں نے غلط کام کیا ہے۔ اور اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ تو عرض کیا کہ ہمارے اس جرم کا ازالہ کس
طرح ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَتُوبُ عَنْكُمْ مِنْ اَبَدٍ ذٰلِكَ لَعْنُكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ہم نے تمہیں معاف کر دیا۔ تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔ تمہاری توبہ قبول کر لی مگر بڑے
سخت طریقے سے جیسا کہ آیت میں آتا ہے۔ "وَإِذْ آمَنَّا مَوْسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ
جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی۔ اور فرقان یعنی فیصلہ کن طاقت یا معجزات عطا کیے
لَعْنُكُمْ تَهْتَدُونَ تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا "وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يُعْظِمُكُمْ
ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ لے میری قوم کے لوگو! تم نے اپنی جانوں پر بڑا ظلم کیا ہے۔
بِإِخْتَاذِكُمُ الْبَعْدَ کہ ایک بچہ پڑے کو عبور دینا یا ہے، فتوبوا الی باریکم
پس توبہ کر دینے پر آمادہ کے سامنے اور یہ توبہ صدق دل سے ہونی چاہیے۔ محض زبانی

توبہ قابل قبول نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے توبہ کا طریق کار یہ متعین فرمایا کہ فَاَقْتُلُوا اَنْفُسَكُمْ اپنی
 ہی جانوں کو قتل کرو۔ مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں نے شرک کا ارتکاب نہیں کیا۔ وہ مشرکوں کو قتل کر
 دیں۔ اس کے بغیر توبہ قبول نہیں ہوگی۔ فرمایا یہ بظاہر بہت بڑا امتحان ہے کہ تم خود ہی ایک دوسرے
 کو قتل کرو مگر یاد رکھو ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ یہ بات تمہارے
 پیہ کرنے والے کے نزدیک بہتر ہے۔

الغرض حضرت ہارون علیہ السلام اپنے ان بارہ بزرگ ساتھیوں کو لے کر آگئے جنہوں نے
 پچھڑے کی پوجا سے اجتناب کیا تھا۔ اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں
 برہنہ تواریں تھیں۔ ہارون علیہ السلام ایک اونچی جاگ پر کھڑے ہو گئے۔ اور کہا يَا مَعْشَرَ بَنِي
 اِسْرَآئِيْلَ اِنَّ اَخْوَانَكُمْ اَتَوْكُمْ شَاهِرِيْنَ سَيُوفِهِمْ يُرِيدُوْنَ
 اَنْ يَّعْتُلُوْكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاصْبِرُوْا یعنی اے بنی اسرائیل کے گروہ۔ یہ تمہارے
 بھائی برہنہ تواریں لیے تمہارے قتل کے لیے آئے ہیں۔ لہذا تم اللہ سے ڈرو اور صبر کرو۔ اپنے
 قتل میں مزاحمت نہ ہونا۔ چنانچہ ہارون علیہ السلام کے ہمراہیوں نے تواریں چلانا شروع کر دیں ان
 کے اپنے ہی عزیز واقارب مائے گئے۔ بیشمار لوگ قتل ہوئے۔

فرمایا جب یہ شرط پوری ہوگئی تو فَتَنَابَ عَلَيْكُمْ اللّٰهُ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول
 کر لی اِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے توبہ
 کی قبولیت کا فائدہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل قتل ہو کر آخرت کے دائمی عذاب سے بچ گئے۔

الْقَمَرِ
درس بہت در

البقرة
(آیت ۲۵۵ تا ۲۵۷)

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَى لَنْ نُؤْمِنَ بِكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ جَهْرَةً فَلَخَذْنَاكَ
الصُّعُفَةَ ۚ رَأَيْتُمْ تُنْظَرُونَ ۝ ٥٥ ثُمَّ بَعَثْنَاكَ مِنْ بَيْنِ
مَوْتِكَمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ ٥٦ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ
الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالتَّلْوِيَّ كَأَوْامِرٍ
طَيِّبَاتٍ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ
يَظْلِمُونَ ۝ ٥٧

ترجمہ: اور جب تم نے کہاے موسیٰ! ہم ہرگز تیری تصدیق نہیں کریں گے یہاں

تک کہ ہم دیکھ لیں اللہ کو ظاہر پس پھر یہ تم کو کھلی سے اور تم دیکھ رہے تھے ۵۵

پھر اٹھایا ہم نے تم کو تمہاری موت کے بعد تاکہ تم شکر ادا کرو۔ ۵۶ اور ہم نے تمہارے

اوپر بادل کا سایہ کر دیا۔ اور تمہارے اوپر من اور سونے امارا لکھا۔ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے

تمہیں روزی دی ہیں۔ اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے ۵۷

بنی اسرائیل کی خرابیوں اور ان کی سرکشی کا ذکر آچکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر جو

ربط آیات

انعامات کیے ان کا ذکر بھی ہو گیا ہے۔ گذشتہ درس میں بیان ہوا تھا: وَإِذْ أَسْنَأْنَا مُوسَىٰ

النَّكِبَ وَالْفُرْقَانَ یعنی اس وقت کو دھیان میں لاؤ۔ جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب

اور فیصلہ کن بات عنایت کی۔ اس کے لیے خود بنی اسرائیل کے لوگوں نے خواہش ظاہر کی

تھی کہ ان کے لیے کوئی ضابطہ حیات ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور

پر اعتکاف بیٹھنے کی ہدایت کی۔ اور تکمیل اعتکاف پر اللہ تعالیٰ نے توراۃ عطا فرمائی۔

موسیٰ علیہ السلام کتاب توراۃ لے کر قوم کے پاس آئے اور انہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے

روایت ہے

کی خواہش

تمہارے لیے یہ ضابطہ حیات دیا ہے۔ قوم نے کہا کہ ہمیں پڑھ کر سنائیے۔ موسیٰ علیہ السلام نے

کتاب کو پڑھنا شروع کیا۔ تو وہ کہنے لگے کہ ہمارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ کتاب واقعی اللہ تعالیٰ

نے آپ کو دئی ہے۔ یا آپ خود بنا لائے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں اُسی واقعہ کی طرف اشارہ کئے گئے ہیں۔ اسرائیل کو خطاب ہے وَإِذْ قُلْتُمْ لِمُوسَىٰ اور اس وقت کو یاد کرو۔ جب تمہنے کہا اے موسیٰ إِنِّي نَزَّيْتُ إِلَيْكَ الْكِتَابَ ہم ہرگز آپ کی بات کی تصدیق نہیں کریں گے۔ کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ کتاب ہے۔ حَتَّىٰ نَسْأَلَ اللَّهَ جَهَنَّمَ یہاں تک ہم خود اللہ تعالیٰ کو ظاہری طور پر نہ دیکھ لیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ چلو تمنا ہی یہ شرط بھی پوری ہوگی۔ آپ نے ستر آدمی منتخب کئے۔ کہ میرے ساتھ طور پر چلو۔ وہاں میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے براہ راست سنا دوں گا کہ یہ کتاب اُسی نے نازل کی ہے۔ قوم طور پر چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔ آپ نے ہر قبیلے سے نوچر آدمی نکلے۔ بارہ قبیلوں کے بہتر آدمی جمع ہوئے۔ ان میں دو آدمی حضرت یوشع اور قابیل کے گئے۔ کہ ہمیں آپ کی بات پر یقین ہے۔ لہذا ہمیں طور پر جانے کی ضرورت نہیں۔ چونکہ ان دو آدمیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی اس لیے اللہ تعالیٰ نے بعد میں انہیں نبوت سے سرفراز فرمایا۔ اور موسیٰ علیہ السلام اپنی ستر آدمیوں کو لے کر طور پر پہنچے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام کیا۔ کہ ہاں یہ کتاب میں نے ہی دی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی بات سننے کے باوجود یہ لوگ ایمان نہ لائے۔

بعض مفسرین کلام کہتے ہیں۔ کہ جن لوگوں نے کچھ بڑے کی پوجا کی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے ستر آدمیوں کو منتخب کیا۔ کہ کوہ طور پر جا کر اللہ تعالیٰ سے اس فعل شیع کی معافی طلب کریں۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ کا کلام سننے کے بعد ان لوگوں نے یہ بے ادبی کی۔ کہ اے موسیٰ! ہم ہرگز تیری تصدیق نہیں کریں گے۔ جب تک ہم اللہ تعالیٰ کو ظاہر نہ دیکھ لیں۔ اس پاداش میں اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دی۔ جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

بنی اسرائیل و
ستر

تفسیری روایات اور بائبل کی روایات کے مطابق جب ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام بالمشافہ سننے کے بعد بھی تورات کو کتاب النبی تسلیم نہ کیا فَأَخَذْنَا مِنْكُمْ الصَّعِقَةَ تو انہیں بجلی نے پکڑ لیا۔ ان کی سرکشی کی یہ سزا دی گئی کہ کیمہ بجلی چلی چکی اور سب کو فنا کر گئی۔ کہتے ہیں کہ

بجلی دراصل عالم مثال کا حجاب زری یا ناری تھا جس کی چمک ظاہر ہوئی تھی۔ اور جو ان لوگوں کی تباہی کا باعث بنی۔ بنی اسرائیل کو یاد دلایا گیا کہ یہ سارا واقعہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا۔
وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ۔

روایت الہی اس
جہان میں ممکن نہیں

بنی اسرائیل کی روایت الہی کی شرط قابل قبول نہیں تھی۔ کیونکہ اس جہاں میں کسی شخص کے پاس یہ صلاحیت موجود نہیں ہے۔ جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کر سکے اس مادی جہان کے بعد جب اگلے جہان میں پہنچیں گے۔ تو وہاں پر یہی نگاہیں اتنی طاقتور ہو جائیں گی کہ ان میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے اِنَّكُمْ لَنْ تَعُوْا رَبَّكُمْ عَزَّ وَجَلَّ حَتَّى تَمُوْتُوْا تَمَّ مَعْنٰی بَعْدُ۔ یعنی رب کو نہیں دیکھ سکتے۔ چنانچہ قیامت کے بعد جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کی روایت تمام محدثین اہل فہم کے نزدیک بالاتفاق ثابت ہے۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔ قرآن پاک میں موجود ہے وَجُوْہٌ يُّوْفَوْنَ نَازِلَةٌ اِلٰی رَیْقَہَا نَاطِلَةٌ مِثْلٰی حَمَیْمٍ۔ اس دن تہہ و تازہ ہوں گے۔ اور اپنے رب کا دیدار کرنے والے ہوں گے۔ مگر یہ سب اگلے جہان کی بات ہے۔ اس جہاں کے کثیف اعضاء میں یہ طاقت نہیں ہے۔ کہ وہ زیارت الہی سے مشرف ہوں۔ بلکہ اگلے جہاں کے لطیف اعضاء میں اللہ تعالیٰ یہ صلاحیت پیدا فرمادیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی روایت کا انکار بعض گمراہ فرقے مثلاً رافضی، معتزلہ اور خارجی وغیرہ کرتے ہیں۔ جن کا اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار نہ اس دنیا میں ممکن ہے۔ اور نہ اگلے جہان میں دلیل ان کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لامکان ہے۔ جہت اور سمت سے بھی پاک ہے۔ اور رویت کسی مکان اور سمت میں ہی ممکن ہے۔ دائیں، بائیں، اوپر، نیچے وغیرہ لہذا اللہ تعالیٰ کا دیدار ممکن نہیں۔ محدثین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رویت قرآن و سنت سے ثابت ہے مگر اس رویت کی کیفیت کوئی نہیں بتا سکتا۔ یہ بے کیف رویت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ انسان میں ایسی صلاحیت پیدا کر دے کہ اسے بے کیف رویت الہی نصیب

ہو جائے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ رویت تو یقیناً ہوئی مگر لا تَذَرُكَهٗ
الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْإِبْصَارَ۔ انسانى آنکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں۔ مگر وہ
آنکھوں کو پالیتا ہے۔ یہاں یہ کیفیت ہے۔ مگر وہاں کیا ہوگا۔ وہاں تو تجلیات ہوں گی۔ اور
علی قدر المراتب ہوں گی۔ وہاں ذاتی اور صفاتی دونوں قسم کی تجلیات ہوں گی۔ جن میں انسان دیکھے گا
خدا تعالیٰ کی رویت اس طریقے سے ہوگی۔ مگر یہ اس جہاں میں ممکن نہیں۔

آگے سورۃ اعراف میں موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آتا ہے۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کلام کیا تو انہیں رویت کا اشتیاق بھی پیدا ہوا۔ عرض کیا رَبِّ ارْنِیْ اَنْظُرَ الْیَنبُتَ مَوْلَاکَ رِیْمٍ مِّیْنَ جَنَّةِ
ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ حکم ہوا لَنْ تُرَیْہَا ثُمَّ نَظَرْنَا فَاَنْظُرْ اَنْظُرْ اَنْظُرْ دیکھو۔
فَاِنْ نَسْتَفِیْہَا مَکَانَہَا فَسَوْفَ نَدَسِیْہَا اِگر یہ پیڑ اپنی جگہ پر قائم رہ گیا تو پھر شاید تم
بھی مجھے دیکھ سکو۔ فَلَمَّا تَحَجَّلَ رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ جب اللہ تعالیٰ نے پیڑ پر تھوڑی سی تجلی ڈالی۔
سَحَابًا مِّمَّہَا دَکَّآ۔ پہاڑ ریزے ریزے ہو گیا۔ وَخَرَّ مُوسٰی صَعِیْقًا اور موسیٰ علیہ السلام ہوش
ہو کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش میں آئے تو کہنے لگے تَبٰتُ الْیَنبُتَ مَوْلَاکَ رِیْمٍ مِّیْنَ جَنَّةِ میں تو رہ کر رہا ہوں
میری درخواست درست نہیں تھی۔ فرمایا فَخُذْہَا اَنْتَ لَکَ۔ اے موسیٰ! جو میں تمہیں دے
دوں اسی پر اکتفا کرو۔ وَکُنْ مِنَ الشَّکْرِیْنَ اور شکر گزار بن جاؤ۔ مقصد یہ کہ رویت الہی اس
جہان میں ممکن نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اہل فیصلہ ہے۔ جسے بدلہ نہیں جاسکتا۔

حضرت علیہ السلام نے معراج کے موقع پر اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا تھا یا نہیں۔ اس میں مختلف آراء ہیں مگر صحیح بات یہ ہے کہ دیدار کیا، شاد دل اللہ محدث و ملوئی اور قاضی شہار الشہانی پتی و فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا۔ مگر عالم بالامیں کیا۔ اس ملوئی جہاں میں نہیں کیا۔

عالم بالامیں رویت کے وقت تو حضور علیہ السلام حظیرۃ القدس میں پہنچے ہوئے تھے۔ وہاں تو رویت یقیناً ہوگی۔

الغرض جب بنی اسرائیل نے یہ بے ادبی کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دیکھے بغیر اس کتاب پر ایمان نہیں لائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ کا قہر نازل ہوا۔ بھلی پڑی اور سترے ستر آدمی ہلاک ہو گئے۔ اب

موسیٰ علیہ السلام کو ایک اور پریشانی لاحق ہو گئی۔ جیسا کہ سورۃ اخلاف میں آیت۔ موسیٰ علیہ السلام نے نہایت عاجزی کے ساتھ بارگاہِ رب العزت میں دعا کی۔ مولا کریم! اگر تو چاہتا تو مجھے بھی ہلاک کر دیتا۔ تو ان اسرائیلیوں کو اس سے پہلے بھی ہلاک کر سکتا تھا۔ یہ بیوقوف ہیں۔ ان کی دوسری میری ذات پر کوئی حرج نہ آئے اگر میں واپس قوم میں اکیلا جاؤں گا۔ تو وہ کہیں گے۔ کہ ہمارے آدمی سے جا کر مرادیں۔ اے مولا کریم! مہربانی فرما نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ اور فرمایا۔ ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ پھر ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں اٹھایا۔ صریح لفظ موجود ہے۔ وہ لوگ مر چکے تھے۔ موت کے بعد انہیں زندہ کیا۔ بعض توجیہ کرتے ہیں کہ مرے نہیں تھے۔ بلکہ سوتے پڑ گیا تھا۔ پھر برٹش میں آگئے۔ یہ بات درست نہیں۔ مَوْتِكُمْ سے واضح ہے۔ کہ ان لوگوں کی موت واقع ہو گئی تھی۔ اور پھر تفسیری روایتوں میں یہ بھی آتا ہے۔ کہ ان کی زندگی سر کی طرف سے شروع ہوئی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے جسم کا باقی حصہ رکھ ہو چکا ہے۔ پھر اس میں زندگی کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے۔ اور پھر وہ پوسے کے پوسے زندہ ہو گئے۔ یہ سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ فرمایا یہ اس واسطے کیا لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔

قرآن پاک میں حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ بھی اسی قسم کا ہے۔ جب عزیر علیہ السلام سوال کے بعد اٹھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ كَمْ لَبِثْتَ تم کتنے دن سوئے ہو۔ عرض کیا لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ایک دن یا اس کا کچھ حصہ سویا ہوں فرمایا بَلَدٌ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ تم تو سو سال تک سوئے ہو۔ اتنا عرصہ گزر گیا۔ اس دوران تمہارا گدھا فنا ہو گیا۔ اس کی مٹیاں چور چور ہو گئیں۔ اب دیکھو اس کی مٹیوں کو ہم کیسے اکٹھا کرتے ہیں۔ پھر انہیں گوشت پناٹے ہیں۔ اور زندگی بخشے ہیں۔ برخلاف اس کے کھانا جلد خراب ہو جانے والی چیز ہے۔ مگر وہ بالکل تازہ پاس پڑا ہے۔ لَمْ يَتَغَيَّرْ وہ گھاسٹرا نہیں۔ آخر میں فرمایا أَلَمْ أَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ میں جانتا ہوں کہ خدا تعالیٰ قادر علیٰ

ہے۔ وہ جس طرح چاہے اور جب چاہے کر سکتا ہے۔

الغرض! اُن ستر آدمیوں کو اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد دوبارہ زندگی دی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ ان لوگوں نے دوبارہ زندہ ہو کر اقرار کیا۔ کہ ہم جی غلطی پر تھے۔ ہمیں ایسی انتہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ کرتے۔ اس کے بعد انہوں نے قوم میں ہر گروا ہی دی۔ کہ بے شک ہم نے خدا تعالیٰ کا کلام سنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ کہ میں نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی ہے۔ اے بنی اسرائیل! اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔

جلد سہم

اس کے علاوہ دوسری بات یہ تھی۔ کہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو یاد دلایا کہ شام و فلسطین تمہارے جدا مجید تحفہ ت ابراہیم اور اسحق علیہما السلام کی وراثت ہے۔ لہذا تم اپنی وراثت دوبارہ حاصل کرو۔ اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ ان کا ٹھکانا یہی ہے اب اس علاقے پر عمالہ قوم کا قبضہ ہے۔ تم ان کے خلاف جہاد کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارا وطن واپس دلا دیں گے۔ وہی وطن جہان تمہارے آباد اجداد آباد تھے۔ اور جن کی قبریں بھی وہیں ہیں۔ تم تھوڑی سی محبت کرو۔ اللہ تعالیٰ فتح عطا کریں گے۔

بنی اسرائیل مسلسل غلامی کی وجہ سے بزدل ہو چکے تھے۔ اُن میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اُن کے ضمیر مردہ ہو چکے تھے۔ اس لیے وہ جہاد پر آمادہ نہیں تھے۔ یہ غلامی کا اثر تھا۔ آج ہمارا حال بھی یہی ہے انگریز کی سو سالہ غلامی کے نتیجے میں اخلاق بگڑ چکے ہیں جنہوں نے انگریز کا دودھ پیا ہے۔ ان کے اخلاق کی درستگی کا کوئی امکان نہیں۔ البتہ نئی نسل آئے گی۔ نئے حالات پیدا ہوں گے۔ تو عرصہ کے بعد اخلاق کی درستگی کی توقع کی جا سکتی ہے۔

قوم عمالہ بڑے سخت لوگ تھے۔ جب بنی اسرائیل نے ان کی جرأت و شجاعت کے کارنامے سے توائی کے حوصلے مزید پست ہو گئے۔ کہنے لگے ہم جہاد نہیں کر سکتے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بڑا بھجایا کہ تم صرف کمر بستہ رہو۔ اللہ تعالیٰ ضرور فتح عطا فرمائیں گے سو قلمذہ میں تفصیلات موجود ہیں۔ یہ قوم کسی طرح جہاد پر آمادہ نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا میں مبتلا کیا۔ چالیس سال تک صحرا میں نظر بند ہے۔ یَتِيَهُوْنُ فِي الْاَرْضِ

فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ اے موسیٰ! یہ فاسق لوگ ہیں۔ ان پر افسوس نہ کریں۔ یہ اسی سرزمین میں حیران و پریشان پھرتے رہیں گے۔ اس صحرائے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ نیز یہ کہ یہ ساری نسل یہیں ختم ہو جائے گی۔ نئی نسل کا نیا خون آئے گا تو ان میں جذبہ جہاد بیدار ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام وہیں وفات پا گئے۔ پرانی نسل کے وہ لوگ جنہوں نے فرعون کی غلامی کا دورہ دیکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔ ستر سال کے بعد نئی نسل نے علم جہاد بند کیا اور شام و فلسطین کو فتح کیا۔

بدل کا سایہ۔ بنی اسرائیل کی تمام تر نافرمانیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کو انعامات سے نوازتا رہا۔ صحرائے تیرہ میں نظر بندی کے دوران بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں معاش اور زندگی کے اسباب معجزانہ طور پر مہیا فرمائے۔ بنی اسرائیل خمیوں میں اقامت پذیر تھے۔ جب خیمے بچھ گئے۔ تو ان کے لیے سورج کی گرمی سے بچنا مشکل ہو گیا۔ صحرائ کی گرمی بھی ایسی جو پاکستان کی گرمی سے چھ گنا زیادہ ہو۔ بنی اسرائیل سخت تکلیف میں مبتلا ہو گئے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک اور انعام فرمایا وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ یعنی اے بنی اسرائیل! ہم نے تم پر بدلوں کا سایہ کر دیا۔ جب دن کے وقت دھوپ تیز ہوتی تو اللہ تعالیٰ بدلوں کو حکم دیتے وہ بنی اسرائیل پر چھا جاتے۔ اور اس طرح وہ دن کے وقت سورج کی تپش سے محفوظ رہتے۔

حسن اور سوزی۔ صحرائے سینا میں خورد و نوش کے لیے کوئی چیز میسر نہ تھی۔ نہ کھیتی باڑی اور نہ کوئی فصل ملے۔ چھ لاکھ ستر ہزار افراد کے لیے کھانے کے بغیر چارہ نہ تھا۔ نسل بتدریج بڑھ رہی تھی۔ اور اشیائے خورد و نوش کی ضرورت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ان کے کھانے پینے کا انتظام اس طرح فرمایا وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوٰی اے بنی اسرائیل! ہم نے تم پر من اور سلوی نازل کیا۔ من کا لفظی معنی احسان ہوتا ہے۔ سورہ جاثیہ میں آتا ہے۔ یَعْمَلُونَ عَلَيْنَا اِنْ اَسْلَمُوا اِنْ اَسْلَمُوا اِنْ اَسْلَمُوا آپ پر احسان جتلاتے ہیں۔ کہ وہ ایمان سے آئے ہیں۔ تاہم من میں یہ معنی پوشیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی محنت و مشقت کے احسان کے طور پر انہیں کھانا مہیا کیا۔ کوئی کھیتی باڑی نہیں کرنی پڑی۔ اور نہ ہی کوئی دوسرا کاروبار کرنا پڑا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے بالکل محنت میں ان کے لیے کھانے کا بندوبست کر دیا۔

من ترنجبین کی قسم کے دانے تھے۔ جیسے دھنیا کے دانے ہوتے ہیں۔ یہ سنایت شیریں مادہ تھا۔ جو رات کو بنی اسرائیل کے غیموں یا دوسری رہائش گاہوں کے ارد گرد برس جاتا تھا۔ اور اس کی مقدار اس قدر کافی ہوتی تھی۔ کہ ہر فرد کو ایک ایک سیر کے قریب میسر آ جاتا تھا۔ بسج اٹھتے تھے۔ اور یہ دانے اکٹھے کر لیتے تھے۔ یہ ان کی چوبیس گھنٹے کی خوراک کے لیے کافی ہوتا تھا۔ چونکہ ہفتے کے روز چھٹی ہوتی تھی۔ اس لیے جمعہ کے دن دو دن کی خوراک مل جاتی تھی۔

من کے دنوں میں خاص قسم کی شکر ہوتی تھی۔ جو کہ حیات انسانی کے لیے بڑی ضروری ہے۔ انسانی جسم کی حیات کو برقرار رکھنے کے لیے شکر کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ انسان کا جسم ٹھنڈا ہو کر ختم ہو جانے کا۔ قدرت نے انسان کے جسم میں ایسا نظام پیدا کر دیا ہے۔ کہ انسان جو بھی غذا استعمال کرتا ہے۔ یہ تجزیہ میں پہنچ کر شکر بن جاتی ہے۔ یہ شکر ہر قسم کے مائع اور ٹھوس وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر جسم یہ اصلی شکر نہ بھی کھائیں۔ تو بھی انسانی جسم خوراک کے دیگر اجزاء سے شکر حاصل کر لیتا ہے۔ گویا انسانی جسم کو کوئی غذا ضرورت ہوتی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ اشیائے خورد و نوش سے تجزیہ میں پیدا کرتا ہے۔ اور پھر وہ جسم کے باقی حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس طرح انسانی جسم کو نشتر، پیردین یا لحمیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو دالوں وغیرہ سے بھی حاصل ہوتے ہیں الغرض! بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے من کے دانے مہیا کر کے ان کی یہ ضرورت پوری کر دی۔

حضور علیہ السلام نے اپنے ایک ارشاد میں عبود نامی کعبہ اور من کی تعریف فرمائی ہے۔ حدیث میں آتا ہے: الْعَجْوَةُ مِنَ الْجَنَّةِ وَفِيهَا شِفَاءٌ مِّنَ السَّعَةِ عَجْوَةٍ۔ جنت کی کعبہ ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے زہر اور سحر کا علاج رکھا ہے۔ اسی طرح فرمایا: الْكُمَاةُ مِنَ الْحَنِ وَمَا هَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ یعنی کھنیاں من میں سے ہیں اور ان کے پانی میں اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کے لیے شفا رکھی ہے۔ یہ چھوٹی مولیٰ زرد و سفید کھنیاں خورد و بینی سے بڑی لذیذ چیز ہے۔ انسانی جسم کے لیے گوشت کا اثر کمزوری ہے۔ نہ ان کا کوئی نفع ہوتا ہے۔ اور نہ ان کی کوئی مخالفت کرتا ہے۔ خود بخود اُٹھتی ہیں اور لوگوں کے کام آتی ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

ان کے پانی میں اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کے لیے شفا رکھی ہے۔ اس کا پانی سر میں جلا کر لگایا جائے یا ویسے ہی سنانی اس کے پانی میں بھگو کر آنکھوں میں لگائی جائے۔ تو آنکھوں کی کئی بیماریوں کے لیے شفا کا حکم رکھتی ہے فرمایا یہ کھنبیاں سن ہی کی ایک قسم ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے تہنجیمین کی قسم کے اس مادہ کو بنی اسرائیل کے لیے خوراک کا ذریعہ بنایا۔

سلوی سلوان کے مادہ ہے۔ یہ بیٹر کی قسم کا جائز تھا۔ ہر بختے ان جائزوں کے غول کے غول دریائے شہر کی طرف سے اڑ کر آتے تھے۔ اور بنی اسرائیل کے خیموں کے قریب آکر بیٹھ جاتے تھے۔ جنہیں وہ آسانی سے پکڑ لیتے تھے۔ انہیں پکڑنے کے لیے دوسرے شکار کی طرح ان کو محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ بلکہ جو بنی ذرا اندھیرا ہوتا تھا۔ بنی اسرائیل ان جائزوں کو آسانی کے ساتھ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق پکڑ لیتے تھے۔ چہر ان کو ذبح کر کے ان کا گوشت پکاتے تھے۔ اور کباب بناتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نہایت عالی درجے کی خوراک مہیا کی تھی۔

پنے آپ پر غم

بادل کے سائے اور خوراک کی بہم رسانی کے عہدہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک اور نعمت عطا کی تھی۔ تفسیری راتوں میں آتا ہے کہ ایک بہت بڑا ستون نازل ہوا تھا جس سے بنی اسرائیل روشنی حاصل کرتے تھے۔ رات کے وقت یہ آؤچمک اٹھتا تھا جس سے اس قدر روشنی میسر آجاتی تھی۔ جو بنی اسرائیل کی ضروریات کے لیے کافی تھی۔

فرمایا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ اے بنی اسرائیل کھاؤ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو رزق دی ہیں وَمَا ظَلَمُونَا اور انہوں نے ہم پر کوئی زیادتی نہیں کی وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ بلکہ انہوں نے اپنی ہی جانوں پر ظلم کیا۔ بنی اسرائیل کو حکم یہ تھا کہ کھانے پینے کی چیزیں ہم نے عطا کی ہیں۔ انہیں خوب کھاؤ پو۔ مگر ان کا ذخیرہ نہ کرو۔ لیکن انہوں نے ذخیرہ کرنا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گوشت گلنے سڑنے لگا۔ مسلم شریعت کی روایت میں آئے۔ لَوْ زَكَّ بَنُو إِسْرَءِيلَ یعنی اگر بنی اسرائیل ذخیرہ اندوزی کا ارتکاب نہ کرتے تو گوشت کبھی بگڑتا۔ خواہ مہینوں پڑا رہتا۔ مگر ان کی اس نافرمانی کی وجہ سے گوشت سڑنے لگا۔ اس

طرح گویا انہوں نے خود اپنا نقصان کیا۔ ہم پر کوئی ظلم نہ کیا۔ بلکہ خود اپنی جانوں پر ظلم کے مرتب ہوئے
 اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر بڑے انعام کئے۔ ان کی نافرمانی اور معصیت کی وجہ سے
 طرح طرح کی آزمائشیں بھی آتی تھیں۔ اس کے باوجود یہ لوگ سرکشی میں مبتلا ہوئے۔ جہاد کا انکار
 کیا۔ نبی کی تکذیب کی۔ اس کو ستایا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کی خوراک کا غیر معمولی انتظام
 فرمایا۔ پانی کی ضرورت پیش آئی تو جیسا کہ آگے آئے گا وہ بھی مہیا فرمایا۔

الْبَقَرَةِ

البقرة ۲

درس بہت وجہاً

آیت ۵۸، ۵۹

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ
شِئْتُمْ رَغَدًا وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ
نَغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتَكُمْ وَسَازِغِ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٨﴾
فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ
فَنَزَّلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمِثْقَلِ
كَذِبِهِمْ يَفْسُقُونَ ﴿٥٩﴾

ترجمہ: اس وقت کو یاد کرو جب کہ ہم نے کہا داخل ہو جاؤ اس بستی میں اور
کھاؤ اس میں سے جہاں بھی تم چاہو کثرت سے۔ اور داخل ہو دو دروازے میں سجدہ
کرتے ہوئے۔ اور کوشش کرو۔ ہم بخش دیں گے تمہاری غلطیوں کو۔ اور زیادہ دیں گے
ہم نیک کرنے والوں کو ﴿۵۸﴾ پس تبدیل کر دیا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا بات
کو۔ سوائے اس کے جو ان کو کوئی گئی تھی۔ پس نازل کیا ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے
ظلم کیا عذاب آسمان کی طرف سے۔ اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ﴿۵۹﴾

تفہیم

جس طرح ابتداء رکوع میں بنی اسرائیل سے خطاب تھا۔ یٰبَنِي إِسْرَءِیْل اذْكُرُوا
نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ اسی طرح ان آیات کے مخاطب بھی بنی اسرائیل
ہی ہیں۔ جہاں اس قوم پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا تذکرہ ہو رہا ہے اس کے ساتھ ساتھ بنی اسرائیل
کے تقصیر، سرکشی اور نافرمانی کا حال بھی بیان ہو رہا ہے۔ انعامات میں سے فرعون کی غلامی سے
آزادی کتاب تورات کا حصول اور من و سلویٰ کا ذکر ہوا۔ پھر ان کی نافرمانی کا ذکر ہوا۔ انہوں نے
اللہ تعالیٰ کی بنیاد پر انہیں سزا بھی ملی۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اللہ
تعالیٰ نے معاف بھی کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم جہاد کی تیاری کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں
شام و فلسطین کا وہ علاقہ واپس دلا دیں گے جو تمہارے آباء اجداد کا مسکن رہا ہے۔ مگر بنی اسرائیل

نے انکار کر دیا۔ کہنے لگے۔ وہاں پر بڑے سخت لوگ ہیں۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ البتہ اگر وہ خود بخود اس بستی سے نکل جائیں تو ہم وہاں جانے کو تیار ہیں۔ اس کی مکمل تفصیلات تو سورۃ مادہ میں ہیں۔ تاہم کچھ باتیں سورۃ بقرہ میں بھی آ رہی ہیں۔ ان کی نافرمانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل ستر سال تک تیسرے کے بیابان میں سرگردان پھرتے رہے۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے تقرر اور سرکشی کا حال بیان فرما کر دوسرے لوگوں کو متنبہ کر دیا ہے کہ سرکشی کا نتیجہ ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت آتی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو من و سلویٰ کھاتے ہوئے کئی سال گزر گئے۔ بعض روایات میں اٹھارہ سال کا ذکر آتا ہے۔ تو انہوں نے بعض دوسری چیزوں کا مطالبہ شروع کر دیا۔ جس کا ذکر اگلے کوع میں آئے گا۔ کہ ہم ایک ہی طرح کا کھانا کھا کر تنگ آ گئے ہیں۔ من و سلویٰ کی بجائے سبزیاں اور دال وغیرہ کھانے کو چاہتا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اگر تم ایسا ہی چاہتے ہو۔ تو اس بستی میں چلے جاؤ۔ وہاں پر یہ چیزیں تمہیں سیر آجائیں گی۔

وہ کون سی بستی تھی جس میں بنی اسرائیل کو داخلے کا حکم ہوا تھا۔ اس کے متعلق مفسرین کی مختلف آراء ہیں بعض مفسرین اسے بیت المقدس سے منسوب کرتے ہیں مگر یہ درست نہیں۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ اریحامی بستی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس بستی کے لوگوں سے جہاد کرو۔ تو اللہ تعالیٰ غلبہ عطا کرے گا۔

اس معاملہ میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ کہ مذکورہ بستی میں داخلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں واقع ہوا یا ان کے بعد۔ تاہم صحیح بات یہی ہے کہ وہ بستی موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد فتح ہوئی۔ حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کی نئی نسل جہاد پر آمادہ ہوئی۔ ترانیں شام اور فلسطین پر غلبہ حاصل ہوا۔ ہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ من و سلویٰ کی بجائے دوسری خوراک کی طلب ہے۔ تو اس اریحامی بستی میں داخل ہو جاؤ۔ وہاں تمہیں تمہاری مطلوبہ چیزیں میسر آئیں گی۔

فَمَا وَادَّ قُلْنَا اَدْخُلُوْا هَذِهِ الْقَرْيَةَ اِنَّ اِسْرَءِلَ

ہم نے کہا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ۔ فَكَلُّوْا مِنْهَا حَيْثُ رِشْتُمْ رَعْدًا کھاؤ اس میں کھلے طور پر وسعت کے ساتھ۔ تمہیں اس معاملہ میں کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔ ہاں یہ بات یاد رکھو کہ وَادَّخُلُوْا الْبَابَ سُجَّدًا اور اس بستی کے دروازے میں داخل ہو کجہ کرتے ہوئے

سجود

بستی میں داخل ہوتے وقت سجدہ کرنے سے مراد کجہ شکر ادا کرنا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں فتح عطا کی ہے۔ اس بستی کا قبضہ دلایا ہے۔ تو اس کے بدلے غرور و تکبر نہ کرنا بلکہ عاجزی اور انکاری کرتے ہوئے سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے داخل ہونا یا کرنا انبیاء علیہم السلام کا عمل اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں اور ایمان والوں کا شیوہ ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب مکہ معظمہ فتح ہوا تو حضور علیہ السلام اونٹنی پر سوار تھے۔ اور دھڑلے کے وقت آپ سر کو جھکائے ہوئے تھے۔ آپ اگر کمر داخل نہیں ہوئے۔ بلکہ نہایت عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے داخل ہوئے۔ پھر آپ نے غسل فرمایا اور آٹھ رکعت نماز ادا کی۔ یہ چاشت کا وقت تھا۔ اسی طرح جب حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایران کا پایہ تخت مدائن فتح کیا۔ اور آپ نے اس قلعہ میں جا کر آٹھ رکعت نماز ادا کی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حضور کجہ شکر تھا۔ جو فتح و کامیابی پر پیش کیا گیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو بھی یہی حکم تھا۔ کہ جب فتح حاصل ہو جائے۔ اور اس بستی میں داخل ہونے لگو تو نخوت و تکبر کی بجائے عاجزی دکھاتے ہوئے اور کجہ شکر بجالاتے ہوئے داخل ہو۔ کیونکہ یہ آسمانی تعلیمات کا اہم اصول ہے۔

معرکہ بدر میں بڑے بڑے کھار مارے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فتح دی تو اہل ایمان نے شکرانہ کے طور پر دو نفل پڑھے۔ اور اس بات پر اللہ رب العزت کا شکر یہ ادا کیا۔ کہ اس نے اہل ایمان کو ظالموں سے نجات دلائی۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بحر قلزم سے باہر نکالا اور شکر فرعون کو غرق کیا تو موسیٰ علیہ السلام نے بھی کجہ شکر ادا کیا۔ کیونکہ یہ ایمان والوں کا شیوہ ہے کہ جب کوئی نعمت ملے تو کجہ شکر بجالاتے ہیں شریعت محمدیہ میں کجہ شکر کی بجاآوری نہایت مستحسن فعل ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ کجہ شکر ادا کرنے کے لیے دو رکعت نماز

نفل ادا کرنی چاہیے۔ تاہم صرف سجدہ کرینا بھی درست ہے۔

استغفار
برکات

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دو احکام دیے تھے۔ ایک تو یہ کہ اس بستی میں سجدہ و شکر ادا کرتے ہوئے داخل ہوں۔ اور دوسرا یہ کہ وَقُولُوا حِطَّةٌ اور زبان سے یوں کہیں کہ اے اللہ! ہماری غلطیوں کو معاف فرما دے۔ حِطَّہ کا فعلی معنی مگر دینا ہے۔ ہماری خطاؤں کو گرا دے۔ لفظ حِطَّہ دراصل أَحْطَطْ عَنَّا حِطًّا کا مخفف ہے۔ یعنی ہماری غلطیوں کو تباہیوں اور خطاؤں کو مٹا دے۔ معاف کر دے یا مہ گذر فرما۔ اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو سجدہ و اور استغفار کی تعمین کی۔ اور فرمایا کہ اگر تم اپنی خواہش کے مطابق خوراک حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تو ان دو شرائط کے ساتھ بستی اریحا میں داخل ہو جاؤ۔

بزرگ فرماتے ہیں کہ ہر چیز کی کوئی ابتداء ہوتی ہے۔ وَأَوَّلُ الْخَيْرِ الْإِسْتِغْفَارُ اور خیر کی ابتداء استغفار سے ہوتی ہے۔ یعنی انسان اپنی غلطیوں کی معافی طلب کرے۔ ابن ماجہ اور ترمذی شریف کی حدیث میں آتا ہے: وَخَيْرُ الْخَطَايَا بَيْنَ التَّوَابُونَ ہر شخص خطا کا ہے غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں مگر بہترین خطا کار وہ ہیں جو توبہ کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ الثَّابِتُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ گنہ سے توبہ کر لینے والا ایسا ہی ہے جیسا اس نے کوئی گنہ نہ کیا ہو۔

فرمایا جب تم استغفار کرو گے۔ مجھ سے معافی مانگ لو گے۔ تو پھر میں اس کا صلہ یہ دوں گا۔
 کہ **كَفِّرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ** اور لغزشوں کو بخش دیں گے۔ معاف کر دیں گے۔ اور صرف معاف ہی نہیں کریں گے بلکہ **وَسَنُيِّدُ الصُّحُفَ لِلَّذِينَ يُنْكِرُونَ** کو مزید
 اجر عطا فرمائیں گے۔

عالم خاندانی
میں تبدیلی

بنی اسرائیل کی طبیعتوں میں قہر و اور سرکشی گھر کر چکی تھی وہ معمولی سے معمولی حکم بھی ماننے کو تیار نہ تھے۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا پس تبدیل کر دی ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا تو رُخِ عَیْرَ اِذْ ذٰلِكَ قِيلَ لَهُمْ وہ بات جبراً انہیں کسی گئی تھی۔ یعنی انہیں حکم تو رہا

کہ کچھ شکرا داکرتے ہوئے جائیں۔ وہ اکڑتے ہوئے اور چوڑا گھیسے ہوئے داخل ہوئے۔ اسی طرح حکم یہ تھا کہ زبان سے استغفار کرتے ہوئے داخل ہوں۔ مگر انہوں نے لفظ حِطَّة کی بجائے حِنْطَةَ کہنا شروع کر دیا۔ کتنا تو یہ چاہیے تھا کہ اے اللہ ہمیں معاف کر دے حِطَّة مگر انہوں نے کہا حَبَّة فی شَعْرَةٍ یعنی ہمیں تو خوشی کے اندر گندم چاہیے۔ ایسی ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کہنے لگے۔ جو کہ مدبھے کی بے ادبی، گستاخی اور سرکشی تھی۔

یہاں پر لفظ ظَلَمُوا کہہ کر اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ احکام کو تبدیل کرنے والے سائے کے سائے بنی اسرائیل نہیں تھے۔ بلکہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ظلم کیا جس طرح پکھڑے کی پوجا کرنے والے بھی۔ سائے کے سائے لوگ نہیں تھے۔ اسی طرح احکام میں تبدیلی کے مرتکب بھی کچھ لوگ تھے۔ چنانچہ آگے ان کی سزا کا ذکر بھی آئے۔ انہوں نے خدا تعالیٰ کی نصیر تبدیلی کی جو کہ بہت بُری بات ہے۔ انہیں تو اتباع کرنا چاہیے تھا۔ انکے مامور ہے۔ لہذا اے اللہ تعالیٰ کے ہر فرمان پر تسلیم خم کر لینا چاہیے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جو کوئی بھی احکام خداوندی میں تغیر و تبدل کا باعث بنے گا۔ وہ ذلت و رسوائی میں مبتلا ہوگا۔

عالمی قوانین اور
حق شفعہ

اسلامی اصولوں میں تغیر و تبدل ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے۔ اس دور میں ہمارے ہاں بھی بعض تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ جنرل ایوب خان کے زمانے میں عالمی قوانین نافذ ہوئے۔ علما و مومنین نے ہر جنبہ احتجاج کیا۔ کہ اس کی بعض شقیں قرآن و سنت کے خلاف ہیں۔ مگر حکومت کے سربراہوں نے نہ رٹی۔ یہ قوانین آج تک نافذ چلے آئے ہیں۔ اسی طرح حق شفعہ کا قانون بنایا۔ اعدائیت کی دُرسے شفعہ سرور تین قسم کے لوگوں کے لیے ہے۔ یعنی شفعہ کا وہ شخص حقدار ہے جو یا تو جانیدار کی مہلت میں شریک ہو یا حق میں شریک ہو یا پردی ہو۔ مگر اب دوستیں اور بھی ملائی گئی ہیں۔ حالانکہ اہم شافعی تو پردی کے حق کے بھی قائل نہیں تھے مگر اس دہے میں مزارع اور بائع کے لڑکے وغیرہ کو بھی حق شفعہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ خدائی قانون میں ترمیم نہیں تو اور کیا ہے۔

وراثت میں لڑکی
کا حصہ

لڑکیوں کی وراثت سے محرومی بھی مذاتی احکام میں تبدیلی کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لڑکوں اور لڑکیوں ہر دو کو وراثت میں حصہ دیا ہے۔ مگر ہائے ہاں اس میں بھی رد و بدل ہوا ہے۔ لڑکیوں کی وراثت کے اکثر لوگ قائل نہیں۔ اس ملک میں انٹریڈ آیا۔ تو اس نے خود لوگوں سے پوچھا کہ تم اپنے معاملات کو شریعت کی رو سے نہٹانا چاہتے ہو۔ یا رواج کے مطابق۔ تو بعض اصلاخ کے لوگوں نے رواج کے مطابق تقسیم کو قبول کیا۔ چنانچہ یہ قانون آج تک موجود ہے کہ وراثت کی تقسیم رواج کے مطابق کی جاتی ہے۔ جس سے لڑکی محروم ہو جاتی ہے۔

صوبہ سرحد میں یہ قانون ڈاکٹر خان کی وزارت میں نافذ ہوا۔ مال کا سارا عملہ اس قانون کا پابند تھا۔ افسر مال، تحصیلدار، پٹواری وغیرہ اسی کے مطابق انتقال چڑھاتے تھے۔ مشورہ ہے کہ وہاں پر ایک شخص کا چھ مربع میل بیماری رقبہ تھا۔ اس نے ساری جائیداد دو لڑکوں کے نام بہرہ کر کے لڑکیوں کو محروم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے دنیا پر ہی یہ سزا دی کہ حقوے کی بیماری میں مبتلا ہوا وہ جب تک زندہ رہا اس کا نہ ٹیڑھا رہا۔ وہ بڑوں کے بھی آپس میں لڑتے بھڑتے رہے۔ ایک نے دوسرے پر گولی چلا دی اور اس کا بازو کٹ گیا۔ اس طرح گویا اس شخص کو اسلامی قانون کی خلاف ورزی کر کے کچھ نصیب نہ ہو سکا۔

ظالموں کا شر

بہر حال اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام میں رد و بدل بہت بُری بات ہے اور قابلِ عذاب ہے۔ مگر بنی اسرائیل کے بعض ظالم لوگوں نے اس بات کو بدل دیا جو انہیں کہی گئی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَانْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ لُغَمٍ مِمَّا يَفْقَهُونَ اِنْ يَنْزِلُ عَلَيْكَ مِنْ السَّمَاءِ مَاءٌ فَسُفْجًا يَغِيظُ الْكَافِرِينَ۔ مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے طحون کی بیماری کی صورت میں عذاب نازل کیا۔ صرف ایک دن میں چوبیس ہزار اشخاص لقمہ اجل ہوئے۔ اور کل ستر ہزار آدمی اس عذاب میں مبتلا ہو کر اپنے انجام کو پہنچے، دو چار دن کے اندر اس بیماری نے اپنا کام کیا اور بنی اسرائیل کا صفایا ہو گیا۔ فرمایا اس کی وجہ یہ تھی کہ بھکا کافراً يَفْسُقُونَ وہ لوگ فسق کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام کی نافرمانی کرتے تھے۔ لہذا

اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دی۔ اگر آج بھی کوئی اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کا مرتکب ہوگا۔ تو وہ خدا تعالیٰ کے عذاب کی زد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ جہنم سے تو یہ اس کی حکمت ہے۔ وہ اس کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

زمین کی آبادی
اور بربادی

اہم بیضاوی فرماتے ہیں: کہ اللہ تعالیٰ کی زمین کی آبادی نیکی اور اطاعت سے ہوتی ہے اور مخلوق کی برائیوں کی وجہ سے اس کی بربادی ہوتی ہے۔ فسق و فجور کو آپ بیشک ترقی کا نام دیں مگر حقیقت یہ ہے کہ کھیل تماشہ، لود و لعب، بدکاری، فحاشی، زنا، سود خوری وغیرہ سب بگاڑ کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہ زمین میں فساد پھیلانا ہے۔ آبادی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ کیونکہ زمین کی آبادی تو ہر حال نیکی اور خدا تعالیٰ کی اطاعت سے ہوگی۔ جس قدر کچھ چین نصیب ہوگا۔ اسی قدر آبادی ہوگی۔ جس قدر گناہوں میں اضافہ ہوگا۔ اتنی ہی بے چینی بڑھے گی۔ لوگ اضطراب اور طرح طرح کے مسائل کا شکار ہوں گے۔ لہذا معلوم ہوا کہ نافرمانی بہت بُری چیز ہے۔ اس سے بچنا چاہیے۔ ان آیات میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ہم سب کے لیے تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے کہ نیکی اور بدی میں تمیز کریں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں، نافرمانی سے پرہیز کریں۔

الْقَاف
درس بیت پنجم ۲۵

البقرة
(آیت ۶۰)

وَإِذَا سَأَلَ مُوسَى لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ نَسِيبًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ
كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعَثُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۖ ⑥۰
ترجمہ : اور اس وقت کو یاد کرو جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا۔ پس ہم نے کہا کہ اپنی راہی کے ساتھ پتھر کو مارو۔ پس اس میں سے بارہ چشمے بھوٹ پڑے۔ تحقیق جان یا سب لوگوں نے اپنا اپنا گھاٹ۔ اللہ کی دی ہوئی روزی سے کھاؤ اور پیو۔ اور زمین میں فساد نہ کرو۔ بوسے نہ چلو ۖ ⑥۰

گذشتہ آیات میں اُن انعامات کا ذکر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر کیے۔ منجملہ ان کے دشمن سے رہائی اور ذلت ناک عذاب اور غلامی سے نجات کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک عظیم الشان کتاب عطا فرمائی۔ صحرائے سینا میں دھوپ سے بچاؤ کے لیے سر پہ بادل کا سایہ کیا۔ خوراک کے لیے مَن اور سلویٰ فراہم کیا۔ جب بنی اسرائیل نے بنسری اور تڑکاری کا مطالبہ کیا۔ تو انہیں ایک دوسری بستی میں اترنے کا حکم دیا جہاں ہر چیز میسر تھی مگر ساتھ یہ نصیحت بھی کر دی کہ اس بستی میں سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتے ہوئے داخل ہونا۔ مگر بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کو تبدیل کر دیا۔ سجدہ شکر ادا کرنے کی بجائے اگر کر سنی میں داخل ہوئے۔ اور زبان سے استغفار کرنے کی بجائے بعض یہودہ باتیں کہنے ہوئے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکشی اور تمرد کی یہ سزا دی کہ آسمان سے طاغون کی صورت میں عذاب نازل ہوا۔ ہزاروں کی تعداد میں بنی اسرائیل ہلاک ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ نافرمانی کرتے تھے انہوں نے صحرائے سینا میں اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت اور موسیٰ علیہ السلام کی بات کو ٹھکرا دیا۔

بنی اسرائیل
کی طلب گاری

توراة اور بعض اسرائیلی روایتوں میں ذکر آتا ہے کہ بنی اسرائیل وادی سکات کے قریب

ایک مقام پر تھے۔ اُسے قارون کی بستی بھی کہتے ہیں۔ یہ علاقہ کچھ پہاڑی ہے۔ اور کچھ صحرا ہے پانی نایاب ہے۔ اس مقام پر ہی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے پانی کا مطالبہ کیا۔ کہنے لگے ہمارے پاس پانی کا ایک قطرہ تک نہیں۔ حلق خشک ہو رہے ہیں۔ اُسے موسیٰ علیہ السلام ہمارے لیے پانی کا بندوبست کرو۔ اس معاملے میں رہ موسیٰ علیہ السلام سے اس قدر بدتمیزی سے پیش آئے کہ ان پر ٹوٹ پڑے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں ان الفاظ کے ساتھ دعا کا آغاز کیا کہ اے مولیٰ کریم! بنی اسرائیل میرے ساتھ اس قدر سختی سے پیش آ رہے ہیں کہ مجھے شکار کرنے کے درپے ہیں۔ لہذا تو ہی ان کے لیے پانی کا انتظام فرما۔ آیت زیر درس میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اُس واقعہ کو یاد کر جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا۔ استسقی کا لفظی معنی طلب آب ہے۔ اور اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے سامنے گرا گڑانا، استغفار کرنا اور معافی مانگنا ہے۔ حضرت ابو علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات میں ملتا ہے، کہ قحط سالی کے دوران انہوں نے اپنی اپنی قوم سے کہا تھا۔ يَسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُؤْتُوا لِيْهِ سَلٰمًا اے قوم اپنے رب سے استغفار کرو اور توبہ کرو۔ "يُرْسِلُ السَّمَاءَ عَلَیْكُمْ مِذْرٰرًا" تاکہ وہ تمہارے لیے آسمان سے پانی برسائے۔ جب کبھی دنیا خشک ساں کا شکار ہو جائے۔ زمین، باغات، انسانوں، حیوانوں کے لیے پانی کی قلت پیدا ہو جائے۔ تو فراہمی آب کے لیے کئی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ منجملہ ان تدابیر کے شریعت نے استغفار کو بڑی اہمیت دی ہے۔ کہ انسان اپنے رب تعالیٰ سے بننے گناہوں کی معافی مانگیں۔ صدقہ خیرات کریں۔ جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی برسائے گا۔ باران رحمت نازل کرے گا اور خشک سالی دور ہو جائے گی۔ غرضیکہ استسقی کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے رو رو کر گناہوں کی معافی طلب کی جائے۔

استسقا کی
حقیقت

معنا کر ام میں سے ہم ابرصینہ کو باقی تمام فقہاء پر فوقیت حاصل ہے۔ فقہا ہست و اجتہاد میں کوئی بھی آپ کا ہم پلہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑی گہری بصیرت عطا فرمائی تھی۔ انہوں نے دین کی ایسی زبردست خدمت کی ہے۔ جو آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ ہے گی۔ آپ نے دین کا پنچوڑ اور خلاصہ اس طریقے پر پیش کیا کہ تمام غمی قومیں اُسے بخوش قبول کر

استغفار کا طریقہ

گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور حکم دیا فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ یعنی اپنی
 ہاٹی اس پتھر پر مارو۔ موسیٰ علیہ السلام نے حکم کی تعمیل کی۔ جو سنی لامٹی پتھر پر ماری فَالْفَجْرُ مِنْهُ
 اُشْنَتَا عَشْرَةً عِشَاءً اس میں سے بارہ چھٹے بھوٹ بڑے اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے
 بنی اسرائیل کے لیے پانی کا انتظام فرمادیا۔

اس بابے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ دو کون سا پتھر تھا جس پر لامٹی مارنے سے پانی
 جاری ہو گیا تھا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ وہ پتھر موسیٰ علیہ السلام کے تھیلے میں موجود تھوہ تفسیری
 روایات کے مطابق یہ پتھر حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعے دنیا میں آیا تھا۔ اور نسل بعد نسل موسیٰ
 علیہ السلام تک پہنچا۔ تاہم کسی صحیح روایت سے ایسا ثابت نہیں ہے۔ بخاری اور مسلم شریف کی
 بعض روایات سے موسیٰ علیہ السلام کے ایک دوسرے واقعہ کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ اس
 زمانے میں بنی اسرائیل کے لوگ پردے کا خاص خیال نہیں کرتے تھے۔ نہاتے وقت بھی ایک
 دوسرے کے سامنے کپڑے اتار کر نہانا شروع کر دیتے تھے۔ بر خلاف اس کے حضرت موسیٰ علیہ السلام
 بڑے حیا دار تھے۔ غسل کرتے وقت سرپوٹی کا خاص خیال رکھتے اور پردے میں نہاتے۔ دین کا
 اصول بھی یہی ہے کہ بول و براز پر غسل کرتے وقت دوسرے شخص کی نظر نہیں پڑنی چاہیے۔
 ایسے اوقات میں پردہ واجب ہے۔ مگر بنی اسرائیل الٹی ذہنیت کے مالک تھے۔ موسیٰ
 علیہ السلام کو پردے میں غسل کرتے دیکھا تو سمجھا کہ ان کے جسم میں کوئی عیب ہے جسے چھپانا
 چاہتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ آپ کو اُدرہ کی بیماری لاحق ہے۔ جس میں خیسے پھول جاتے ہیں۔
 اللہ تعالیٰ کی قدرت ایک روز ایسا واقعہ پیش آیا کہ موسیٰ علیہ السلام کسی بڑے پتھر کی
 اوٹ میں اس پتھر پر کپڑے رکھ کر پردے میں غسل فرما رہے تھے کہ وہ پتھر آپ کے کپڑوں
 سمیت بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ نے یہ ماجرا دیکھا تو سخت پریشان ہوئے ثَوْبِي حَجَرٌ وَ
 ثَوْبِي حَجَرٌ یعنی پتھر میرے کپڑے۔ پتھر میرے کپڑے کہتے ہوئے۔ پتھر کے پیچھے بھاگے

اور اسی حالت میں اپنی قوم کے پاس پہنچ گئے۔ لوگوں نے آپ کو برہنہ حالت میں دیکھا مگر جسم میں کوئی عیب نہ پایا تو کہنے لگے مَا جِئْتُمُو سِیْءًا مِنْ بَنَائِیْ مُوسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ کُوْنُوْا کُوْنِیْ بِمَارِیْ لَاحِقِیْ نِیْیِیْنَ۔ ہم تو غلط سمجھ رہے تھے۔ بہر حال جب موسیٰ علیہ السلام اس بھاگتے ہوئے پتھر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ تو اپنی جلالی طبیعت کے مطابق اس پتھر کو اپنے ڈنڈے سے خوب پیٹا جس کی وجہ سے اس پتھر پر لامعنی کے پانچ سات نشان پڑ گئے۔ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ یہ بڑا مبارک پتھر ہے۔ ایک طرف اس نے میرے حکم کی تعمیل کی کہ کپڑے لے کر بھاگ نکلا اور دوسری طرف موسیٰ علیہ السلام کے ادب کو بھی ملحوظ رکھا۔ یعنی اتنا نرم ہو گیا کہ اس پر لامعنی کے نشان پڑ گئے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اس پتھر کو اپنے پاس رکھ لو۔ اس میں بڑی حکمت ہے۔ کہتے ہیں۔ یہ وہی پتھر تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تھیلے میں تھا۔ اور جب بنی اسرائیل نے پانی طلب کیا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسی پتھر پر لامعنی ماری۔ بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ بہر حال یہ تفسیری روایات میں کسی آیت یا صحیح حدیث سے ثابت نہیں

بعض تاریخی روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وادی حوریب میں جو پہاڑی سلسلہ اور چٹانیں ہیں۔ وہیں زمین پر پڑی ہوئی ایک چٹان پر موسیٰ علیہ السلام نے لامعنی ماری تھی۔ اور اس میں سے پانی برآمد ہوا تھا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اس پتھر میں اب پانی تو نہیں ہے۔ مگر پانی کے نکلنے کے نشانات اب تک موجود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان سوراخوں سے کسی وقت پانی نکلتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ پانی بنی اسرائیل کی ضرورت پوری کرنے کے لیے نکالا تھا۔ جب وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ پانی کی ضرورت باقی نہ رہی۔ تو وہ بھی ختم ہو گیا۔

پانی کے بارہ چشمے پھوٹنے کی حکمت یہ تھی کہ بنی اسرائیل بارہ قبیلوں پر مشتمل تھے۔ ان کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ تھی۔ ان کے آپس کے کسی متوقع جھگڑے کے پیش نظر اللہ تعالیٰ

پانی کی
تقسیم

نے ہر قبیلے کے لیے علیحدہ علیحدہ چٹمہ مقرر کر دیا۔ چٹموں کا تخمین ہر قبیلے کی تعداد کے لحاظ سے کیا گیا تھا۔ بڑے قبیلے کے لیے بڑا چٹمہ مقرر ہوا۔ اور چھوٹے قبیلے کے لیے چھوٹا چٹمہ۔ اس طرح گویا پانی تقسیم کر دیا گیا۔ فرمایا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ سِرِّمَکَی نے اپنا اپنا گھاٹ معصوم کر لیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہر قبیلے میں ایک ایک چٹمہ تقسیم کر دیا۔ ہر قبیلے نے اپنی ضرورت کے مطابق نمایاں کھود لیں۔ اور پانی کو دور تک لے گئے۔

اس تقسیم سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ مشرکہ مفاد کی اشیاء کی تقسیم عدل و انصاف پر ہونی چاہیے۔ تاکہ کسی قسم کا تنازعہ پیدا نہ ہو۔ حضرت صامع حیدر سہم کی اونٹنی دسے معاملہ میں بھی پانی تقسیم کیا گیا تھا۔ لَكِنَّ شَرْبَ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٌ۔ قوم صالح علیہ السلام سے فرمایا کہ پانی پینے کی ایک روز متاری باہمی سوگی۔ اور ایک روز اونٹنی کی۔ قوم نے مقررہ مدت تجاوز کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم تباہ ہو گئی۔

ایک اعتراض اور
اس جواب

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ پتھر سے پانی کیسے آیا۔ یہ خلاف عقل معلوم ہوتا ہے یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کی چیزوں کو اپنی ناقص عقل سے قیاس کرنا مناسب نہیں۔ ایسا کام ناقص العقل لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے سائنس دان، ریاضی دان، جغرافیہ دان سب کے سب ناقص العقل ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی حکمت یا تخلیق کی کوئی خبر نہیں۔ وہ تو محض اپنی دھند میں مگن رہتے ہیں۔

اہم بیضادی فرماتے ہیں کہ پتھر سے پانی نکلنا کون سی بعید العقل بات ہے۔ یہ تو عام مشاہدے کی بات ہے۔ مقناطیس بھی ایک پتھری ہے جو لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی تاثیر پیدا کر دی ہے۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کسی پتھر میں پانی کو اپنی طرف کھینچنے کی تاثیر پیدا کر دے۔ تو یہ کون سی ایسی بات ہے جو عقل میں نہ آتی ہو۔ ہاں سرسید کو کچھ میں آ سکی۔ پانی تو پتھر کے نیچے موجود تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پتھر کو ذرا سا ہلا دیا تو پانی کو دپڑا۔ سرسید بیچارہ تو ہجرت کا اہم تھا۔ اور معجزات کا منکر تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ پانی کا اجراء محض اللہ تعالیٰ

کے حکم سے ہوا۔ یہ معجزہ تھا۔ جو موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوا۔ بحیرہ قمر میں کیا ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام نے لاکھٹی چٹائی اور بارہ راستے بن گئے۔ پانی کناروں کے ساتھ منجھ ہو کر رہ گیا۔ وہاں لاکھٹی مارنے کا حکم ہوا۔ تو پانی میں راستے بن گئے اور سیاں لاکھٹی ماری تو خشک بھتر سے پانی کے چشمے بھوت پڑے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا۔ پانی نکالنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ لاکھٹی مارنا ممتار کا کام ہے۔

نبی کا معجزہ ہو یا ولی کی کرامت ہو۔ اصل حکم تو اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ بکود کرنے والی معجزہ اور کرامت وہی ذات ہے۔ اسی مقام پر آکر لوگ ٹھوکر کھا جاتے۔ نبی کے معجزے یا ولی کی کرامت کو ان کا ذاتی فعل سمجھتے ہیں۔ اور شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو ان کا ذاتی فعل سمجھا۔ وہ شرک میں مبتلا ہو گئے۔ حالانکہ وہ تَریَاذِنَ اللہ تعالیٰ تھا۔ فرمایا وَ اُنْبِرْنِی اَرْکُمَہُ وَاَلَا بُرْصَہُ وَ اُنْحِی الْمَوْتَ بِیَاذِنَ اللہ تعالیٰ میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے مادہ زاد اندھے اور ابرص کو ٹھیک کر مابوں۔ اور مردے میں جان ڈال دیتا ہوں۔ اسی طرح اولیاء اللہ کی جو کرامات صحیح طریقے سے ثابت ہیں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہوتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ عزت بخشتے ہیں اس کے ہاتھ پر کرامت ظاہر ہو جاتی ہے اپنی مرضی سے تو کوئی نبی بھی معجزہ پیش نہیں کر سکتا۔ قرآن پاک میں تصریح موجود ہے۔ وَمَا کَانَ لِرَسُولٍ اَنْ یَّاتِیَ بِاٰیٰتِہِ اِلَّا بِاِذْنِ اللہ تعالیٰ۔ فعل تو اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ مگر نبی کے ہاتھ پر ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے ہادی عظیم علیہ السلام کی زندگی میں بے شمار معجزات پیش آئے۔ پتھروں سے پانی نکالنا تو عام مشاہدہ کی بات ہے۔ جنگلوں اور پہاڑوں سے چشمے نکلتے ہیں۔ مگر ہمارے نبی رحمت علیہ السلام کا معجزہ ملاحظہ فرمائیے کہ ہاتھ کی انگلیوں سے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے کہتے ہیں کہ لشکر اسلامی جہاد کے لیے سفر پر تھا۔ راستے میں پانی کی قلت پیدا ہو گئی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کسی کے پاس تھوڑا سبب بانی ہے تو پیش کیا جائے۔ چنانچہ ایک لوٹے میں تھوڑا سا پانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے اس پانی سے وضو فرمایا۔

پھر وہ پانی پیالے میں ڈال کر اپنا ہاتھ مبارک اس پیلے میں رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے انگلیوں مبارکہ کے نیچے سے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا۔ آپ نے فرمایا یہ بابرکت پانی ہے۔ اے اللہ تعالیٰ نے نکالا ہے۔ آد پانی پی لو اور اس سے وضو کرو۔ لوگوں نے پانی حاصل کیا۔ اس سے وضو کیا اس میں سے پیا اور دوسری ضروریات پوری کیں۔ جب سارا شہر سیراب ہو گیا۔ تو آپ نے اپنا ہاتھ مبارک اٹھایا اور پانی نکلنا بند ہو گیا۔ اسی لیے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دیگر انبیاء علیہم السلام کو جو معجزات عطا کیے وہ اس کا کمال ہے مگر جو معجزات حضور علیہ السلام کو عنایت کیے وہ کمالوں سے بھی بڑھ کر کمال ہے۔ معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جو یا ہما سے رسول عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو۔ اصل میں کمال اللہ تعالیٰ کا ہی ہے۔

بر نعمت پر
اللہ تعالیٰ کا شکر

بنی اسرائیل کے کھانے کے لیے من و سلوی کا بندہ رست ہو گیا۔ اور پینے کے لیے بارہ چشمے جاری ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کُلُوا وَشَرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی سے کھاؤ اور پیو۔ بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ساری نوع انسانی کو یہ بات سمجھا دی گئی ہے کہ ہر قسم کی روزی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے۔ اے کھاؤ اور پیو اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ شیخ سعدیؒ نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔

ابرو باد و مرد و خورشید و فلک در کھند تا توانی بخت آری و بغفلت نخوری
ہمہ از ہر تو سر گشتہ و فرماں بردار شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نہری
فرماتے ہیں کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے گردش کر رہی ہیں۔ تاکہ تو روٹی کو ہاتھ میں لائے اور غفلت سے نہ کھائے۔ روٹی کھاتے وقت انسان کو غور کرنا چاہیے کہ روٹی کا یہ ٹکڑا کتنے مراحل طے کر کے آپ کے ہاتھ میں پہنچا ہے۔ کارخانہ قدرت میں لاکھوں مشینیں اور کرڈروں ہاتھ کام کر رہے ہیں۔ جب ایک روٹی اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھ میں دیتا ہے، پانی کا ایک گلاس جو آپ کے ہونٹوں تک پہنچتا ہے۔ یہ کن کن مشینوں سے گذر کر آتا ہے۔ اسی طرح لباس کی تیاری میں کتنی مشینیں کتنا خام مال، کتنے انسانی دماغ اور ہاتھ کام کرتے ہیں۔ تب جا کر

زینت اور ستر پوشی کے لیے کپڑا مہیا ہوتا ہے۔ یہ تمام چیزیں انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں کہ جس ملک الملک نے انسان کو اس قدر انعامات سے نوازا ہے۔ اس کی روزی استعمال کر کے کیا اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ اسی لیے فرمایا کہ کس قدر انصافی کی بات ہوگی۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں استعمال کرنے کے بعد اس کی فرمانبرداری نہ کرو۔

قرآن پاک میں دوسرے مقام پر آتا ہے: کُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ حَلَالٍ اور طیب چیزیں کھاؤ جو تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں وَاشْكُرُوا لِلَّهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُونَ۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اگر تم اسی کے بندے ہو۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے۔ کہ ناداروں کو محروم نہ رکھو۔ تم سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے تم مالک ہو مگر اس بات کی طرف غور نہیں کرتے کہ یہ نعمت آئی کہاں سے ہے۔ یہ کس کی عنایت ہے۔ یاد رکھو۔ اگر غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کو محروم رکھو گے۔ ان کا حق ادا نہیں کرو گے تو یہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور مستحقین پر زیادتی ہوگی۔ ہر صاحب استطاعت کا فرض ہے۔ کہ وہ ناداروں کا خیال رکھے۔ اُسے دیکھنا چاہیے۔ کہ سوسائٹی میں کوئی محبوس یا تنگناز ہے۔ خاص طور پر سربراہان مملکت کا یہ فرض منجس ہے۔ کہ اپنے اپنے ملک میں عاجمندیوں کی خبر گیری کریں۔

صیار الدین برنی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ کہ بادشاہ یا حاکم حقیقت میں وہ ہے جس کی سلطنت میں کوئی شخص محبوس یا تنگناز ہے۔ امور سلطنت اس طریقے پر سرانجام دینے چاہئیں کہ ہر شخص کو اس کی بنیادی ضروریات مہیا ہوں۔ بے شک اعلیٰ درجے کی ضروریات نہ بھی حاصل ہو سکیں۔ تو کم از کم ادنیٰ شعبے کی توہین چاہئیں۔ ہر شخص کے کھانے پینے، پہننے اور بننے کے لیے انتظام ہونا چاہیے۔ لہذا یہ انسانوں کا اجتماعی فریضہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی استعمال کریں۔ اور اس کا شکریہ بھی ادا کریں۔

افسوس کی بات یہ ہے۔ کہ اس زمانے میں نیکی کا تصور ہی ختم ہو گیا ہے، جس کے پاس خداوندی الارض دولت آتی ہے وہ اسے اپنے باوا کی سمجھتا ہے۔ نہ خدا کا حق نہ رسول کا حق اور نہ انسانیت کا حق کسی چیز کی پرہیز نہیں کرتا۔ مستحقین پر خرچ کرنے کی بجائے رسم و رواج پر خرچ ہوتا ہے۔ مشرکانہ افعال پر خرچ ہوتا ہے۔ بے حیائی اور فحاشی پر خرچ ہوتا ہے یہ ساری ناشکر گزاری کی

مات میں۔ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ حساب نہیں لے گا یا اس کی پکڑ نہیں ہوگی۔ ایک ایسا دن آنے والا ہے جب ہر چیز کا محاسبہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ اسی لیے فرمایا کھاؤ اور پو اللہ تعالیٰ کی روزی سے وَلَا تَقْشَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ چلو۔ فساد سے مراد خدا تعالیٰ کے قانون، شریعت اور دین کے خلاف چلنا ہے۔ سائے فساد کی جڑیسی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دو سکر مقام پر فرمایا: كُلُوا مِنْ ثَمَرِهَا فِي الْأَرْضِ مِنْ حَلَالٍ طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ حلال اور پاک چیزیں کھاؤ مگر شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ شریعت کے خلاف قدم اٹھانا شیطان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔ بدعت، شرک، معصیت وغیرہ خلاف شریعت ہیں۔ اور اسی کو فساد کہا گیا ہے۔ جہاں فساد ہوگا وہاں امن و چین نصیب نہیں ہو سکتا۔ نہ ہم خدا تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کر رہے ہیں۔ نہ قانون شریعت کا احترام کر رہے ہیں۔ اسلام کا نام کتنے زور شور سے لیتے ہیں۔ مگر عمل صفر کے برابر ہے۔ البتہ ظلم و ستم کا کوئی شمار نہیں۔

اس ماہ کی ابتدائی تاریخوں کی اخباری خبر ہے۔ کسی گھر میں نوجوان لڑکی اور بچہ تھا۔ ماں باپ کہیں گئے ہوئے تھے۔ رات کے وقت دو سپاہی دونوں کو اٹھا کر لے گئے۔ اور ایک مکان میں بند کر دیا۔ اور اُس بچی کے ساتھ زیادتی کی۔ یہ تو ان سرکاری کارندوں کا حال ہے۔ جو خود دہشت کی حفاظت پر مامور ہیں۔ جب ان کا یہ حال ہے۔ تو دوسرے لوگوں کا کیا ہوگا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مجرموں کی نشاندہی ہونے کے باوجود اگر اُن تک قانون کا ہاتھ نہیں پہنچتا تو اس صورت میں کیا خدا تعالیٰ کا قہر نازل نہیں ہوگا۔ بہر حال اس قسم کے واقعات فساد فی الارض کے ہونے میں وجہ یہ ہے کہ ہم سب نے خدا تعالیٰ کے قانون کو چھوڑ رکھا ہے۔ اسی وجہ سے دنیا میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ شیطان کے نقش قدم پر چلنا اسی کا نام ہے۔

الغرض فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ روزی سے کھاؤ پو۔ مگر زمین میں فساد برپا نہ کرو۔

الْم

درست و سبب

نہجہ ۲۵

(آیت ۶۱)

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى كُنْ نَصِيْرًا عَلٰى طٰغِيْرِ رَاجِدٍ فَادْعُ لَنَا ذَبٰكَ
مُخْرِجَ كُنَّا مِمَّا تُنَبِّئُ الْاَرْضُ مِنْ اٰفَاقِهَا وَقِثَابُهَا وَقَوْمِهَا
وَعَدَ سِهَا وَبَصِيْهَا قَالَ اَتَتَّبِعِدِلْوَنَ الَّذِى هُوَ اَدْنٰى بِاِلٰهِى
هُوَ خَيْرٌ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَأَلْتُمْ وَ ضَرِبْتَ
عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ وَالْمَسْكَنَةَ وَبَاءُ وِبَغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَتَّبِعُوْنَ الشَّيْطٰنَ بَغِيْرَ الْحَقِّ
ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝۶۱

ترجمہ: اور جب کہ تم نے اے موسیٰ! ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے ایک ہی قسم
کے کھانے پر۔ پس اپنے پروردگار سے ہمارے لیے دعا کر کہ وہ ہمارے لیے وہ
چیزیں نکالے جن کو زمین اگاتی ہے۔ اپنی ترکاریوں سے اور اپنی کھڑیوں سے
اور اپنے گندم سے اور اپنے سوسے اور اپنے پیاز سے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کیا
تم بل میں بیٹے ہو اس چیز کو جو ادنیٰ ہے اس سے جو بہتر ہے۔ کسی شرم میں اتر
جاؤ۔ بے شک تمہارے لیے وہی کچھ ہوگا۔ جو تم نے مانگا۔ اور ان پر ذلت اور
مسکنت مسلط کی گئی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا عذاب لیکر لوٹے اس وجہ سے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ
کا آیاتوں کے ساتھ کفر کرتے تھے۔ اور اللہ کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ بات
اس وجہ سے ہوئی کہ انہوں نے نافرمانی کی۔ اور وہ مد سے اگے نکل جاتے تھے ۝۶۱

اللہ تعالیٰ کے بنی اسرائیل پر انعامات۔ ان کی سرکشی و مکر اور پھر ان پر اللہ تعالیٰ کے
قہر و غضب کا تذکرہ گذشتہ دوس سے چلا آ رہا ہے۔ فرعون کے مظالم۔ بنی اسرائیل کا مصر سے
خروج۔ پھر چالیس سال تک صحرائے سینا میں سرگردانی۔ شام و فلسطین میں داخلہ۔ من و سلویٰ اور
پانی کی فراہمی کے تمام واقعات تفصیلاً آپ کے ہیں۔ اب اس آیت میں جس واقعہ کی طرف

۶۱

اشارہ ہے۔ وہ بھی بنی اسرائیل کو صحرائے سینا میں ہی پیش آیا۔

غلام کے اثرات

در اصل مسلسل غلامی کی وجہ سے بنی اسرائیل کی اخلاقی قدریں بالکل ختم ہو چکی تھیں۔ ان میں طرح طرح کی کمزوریاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اسی غلامی کے متعلق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کہا تھا: غلامی میں بدل جاتا ہے۔ قوموں کا ضمیر

مقصود یہ کہ جب کوئی قوم کسی دوسری قوم کی غلام بن جاتی ہے۔ تو پھر نہ ان کا جسم اپنا ہوتا ہے۔ اور نہ ان کا ذہن اپنا ذہن ہوتا ہے۔ بلکہ یہ دونوں چیزیں غالب قوم کی تابع ہو جاتی ہیں۔ قرآن پاک میں بھی موجود ہے: عَبْدًا مَّحْلُوكًا لَا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ غلام مملوک کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کا ضمیر تک بدل جاتا ہے۔ اس کی نئے اپنی نئے نہیں رہتی۔ اس کے اخلاق کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ چونکہ بنی اسرائیل لمبے عرصے تک فرعون کے غلام رہ چکے تھے۔ لہذا مذکورہ ساری کمزوریاں ان میں پائی جاتی تھیں۔

بنی اسرائیل کو صحرائے سینا میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی کہ وہاں رہ کر ان میں جفاکشی پیدا ہو۔ بھوک پیاس اور مشقت برداشت کرنے کی قوت پیدا ہو۔ اور غلامی کے دور کی کمزوریاں دور ہو جائیں۔ تاکہ یہ لوگ آئندہ زمانے میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ کسی ملک کے وارث بن کر نظم و نسق چلانے کے اہل بن سکیں۔ مگر ستر سال تک یہ لوگ غلامی کے اثرات میں گرفتار رہے۔ اپنے اصلی مقام سے غافل رہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے بار بار کہنے کے باوجود ذہنی غلامی کے خول سے باہر نہ نکل سکے۔

جب پرانی نسل ختم ہوئی تو نئی نسل نے کیرٹھ لی۔ خواب غفلت سے بیدار ہوئے۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد یوشع حیدر السلام نبی ہوئے۔ تو ان کی قیادت میں بنی اسرائیل کی نئی نسل نے شام و فلسطین کو فتح کیا۔ مَشْرِقَ الْأَمْرِ مِصْرَ وَمَغَارِبَہَا مَشْرِقَ الْأَمْرِ مغرب کے سارے علاقے اللہ تعالیٰ نے ان کو دلائیے۔

طعام کی تبدیلی

ارشاد ہوتا ہے: وَاذْكُرْ لَكُمْ يَوْمَ تَكُنُ عَلَى طَعَامٍ وَاجِدَ بَنِي إِسْرَآئِيلَ ائْسَ وَاقْتَدُوا كَمَا دَكُرُوا۔ جب تم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ صحرائے سینا میں بلا مشقت من و سلوی کھاتے کھاتے بنی اسرائیل کے مزاج پر

پکے تھے۔ اور وہ کھانے میں تبدیلی چاہتے تھے۔ لہذا انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی۔ کہ ہم ایک کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ حالانکہ حقیقت میں من اور سلویٰ دو مختلف کھانے تھے مگر مسلسل یہی کھانا کھانے کی وجہ سے انہوں نے انہیں ایک ہی کھانا کہا۔ کہ اب ہم زیادہ دیر تک اس کھانے سے شکم پر پی نہیں کر سکتے۔ اسرائیلی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہمیں تو مصر کی مچلی یاد آرہی ہے۔ وہاں ہمیں مختلف قسم کی سبزیاں اور ترکاریاں میسر آتی تھیں۔ اور یہاں پر ایک ہی قسم کا کھانا کھا کر تنگ آچکے ہیں۔ اے موسیٰ علیہ السلام! فَادْعُ لَنَا رَبَّنَا اَب ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کریں۔ یُخْرِجْ لَنَا کَرۡوۡہَ نَمۡلَہٗ ہمارے لیے مِمَّا تُنۡبِئُ الرَّسۡلُ وہ چیزیں جن کو زمین اگاتی ہے۔ مِّنۡ بَقْلِہَا اپنی ترکاریوں سے وَقَشَہَا اپنی لکڑیوں سے وَفَوۡہِمَا اور اُندہ سے وَعَدَہَا اور اپنی مسورے وَبَصَلِہَا اور پیاز سے۔ یعنی اے موسیٰ! ہمیں تو ان چیزوں کی ضرورت ہے۔ اپنے رب سے کہہ دیں یہ دوائیے۔ من و سلویٰ جیسی قوت بخش غذا سے ان کا جی بھر گیا تھا۔ اور وہ اس قسم کی چٹ پٹی چیزوں سے اپنے سز کا ذائقہ بدلنا چاہتے تھے۔ بنی اسرائیل کی اس فرمائش پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی سرزنش کی۔ قَالَ اور فرمایا اَتَشۡبَدُ لَوۡنَ الَّذِیۡ ہُوَ اَذٰی بِالَّذِیۡ ہُوَ خَیۡرٌ یَاۤہِیۡمَ اَوۡنِیۡ اور گھٹیا چیز کو اعلیٰ اور بڑھیا چیز سے بدلنے کے خواہش مند ہو۔ تم کہتے ہو قوف ہو کہ اللہ تعالیٰ تو تمہیں من و سلویٰ جیسی بہترین غذا فراہم کر رہا ہے۔ اور تم سبزی ترکاری اور لہسن پیاز کے تیکھے پھر ہے ہو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بالکل مختلف من و سلویٰ سے رکھا تھا۔ اور پھر وہ حساب و کتاب سے بھی بری تھے۔ ان چیزوں کا کوئی حساب کتاب نہیں تھا۔ پھر ان کے مطلوبہ لہسن پیاز پر تو حساب کتاب ہی ہو گا۔ یہ بھی ان کے گھٹلے کا سودا تھا۔ مگر وہ اُمی پڑھتے تھے۔

کاشفہ حقیقت
طلب کا سبب

جب بنی اسرائیل کا اصرار حد سے بڑھ گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے

کھلوا یا۔ کہ اگر تم یہ چیزیں چاہتے ہو۔ اِهْبِطُوا مِصْرَ اَتَوْسِی شہر میں اتر جاؤ۔ وہاں جا کر کھیتی بڑی کرو۔ بل جلاؤ۔ آبپاشی کرو۔ اور اپنے لیے اپنی مرضی کی چیزیں کاشت کرو۔ فَإِنَّ لَّكُمْ مَّا سَأَلْتُمْ پس جو کچھ تم چاہتے ہو تمہیں مل جائے گا۔ البتہ ذرا محنت مشقت کرنی پڑے گی۔

بعض فرماتے ہیں کہ انکس کی قراۃ میں اِهْبِطُوا مِصْرَ واپس مصر چلے جاؤ۔ وہاں جا کر اُسی طرح کھیتی بڑی کرو جس طرح فرعونی کرتے تھے۔ اور بنزریاں وغیرہ حاصل کر لو۔ مگر دوسری قراۃ یعنی مِصْرَ اَتَوْسِی کی تئوین کے ساتھ زیادہ رائج ہے۔ یعنی کسی شہر یا قصبے میں اتر جاؤ۔ اور کاشتکاری کرو۔ تم اپنی مطلوبہ چیزیں حاصل کر لو گے۔ تم ایک اعلیٰ چیز چھوڑ کر اس کے بدلے میں معمولی چیزیں چاہتے ہو۔ یہ چیزیں تمہیں محنت و مشقت کے بعد حاصل ہوں گی۔

حضرت ابوامامہ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے کسی گھر میں لہ کا پھل دیکھا تو فرمایا۔ یہ جہاں بھی ہو، وہاں ذلت کا دور دورہ ہوتا ہے کاشتکاری بذاتِ خود ایک مشقت طلب کام ہے۔ اس کے علاوہ مالِیہ اور آبیانہ وغیرہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ شہری تہذیب سے مَدَنی انسان بہت سی اچھی چیزوں سے محروم رہتا ہے۔

کاشتکاری ایک اچھا پیشہ بھی شمار ہوتا ہے۔ اس کی تعریف بھی آئی ہے۔ اس پیشے کو فضیلت کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔ بہترین پیشہ جاد ہے، اس کے ذمے حاصل ہونے والا مال پاکیزہ ترین ہوتا ہے۔ دوسرے نمبر پر تجارت کا پیشہ ہے۔ رزق کا زیادہ تر حصہ اللہ تعالیٰ نے تجارت میں ہی رکھا ہے۔ اس کے بعد کاشتکاری چھٹی یا ہٹی ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص کوئی فصل کاشت کرتا ہے۔ کوئی دانہ بوتا ہے یا پودا یا درخت لگاتا ہے۔ اس کے پھل میں سے اگر کوئی جائزہ وغیرہ کھائے گا۔ تو بونے والے کو صدقے کا ثواب ملے گا۔ اللہ تعالیٰ نے کاشتکاری کو یہ فضیلت بخشی ہے۔ اس طرح فرمایا چوتھے نمبر پر صنعت و حرفت کا پیشہ ہے۔ دینی نقطہ نگاہ سے مختلف پیشوں کی یہ درجہ بندی ہے۔

بنی اسرائیل کے جتنے بھی واقعات ذکر کئے جہے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ اسی ترتیب سے

پیشے لحاظ
فضیلت

یہودیوں کی
ذلت و برائی

ساتھ واقع ہوئے ہوں جس ترتیب کے ساتھ انہیں بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کا بیان محض عبرت اور تنبیہ کے لیے ہے۔ کہ نوع انسانی ان واقعات سے سبق حاصل کرے۔ اور برائیوں سے اجتناب کرے۔ ان کے ضمن میں یہودیوں کو بار بار خطاب کیا جا رہا ہے۔ کہ دیکھو تمہارے اباؤ اجداد میں یہ یہ خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ ان سے عبرت حاصل کرو۔ اور ایسی برائیوں سے باز آ جاؤ۔ انکی نافرمانیوں کی وجہ سے وَضُیَّتْ عَلَيْهِمُ الذَّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ اُن پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی۔ مسکنت مال کی کمی کو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ذلت و رسوائی کی لعنت اُن پر اس وقت مسلط کی گئی جب وہ بحیثیت قوم عادی مجرم بن گئے۔

یہ عام مشہور بات ہے۔ کہ یہودی دنیا میں امیر ترین قوم میں مگر یہ درست نہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ یہودیوں میں بھی مال و دولت بھروسے لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ درنہ اکثریت ان کی بھی محتاج ہی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر یہودی مالدار بھی ہوں تو پھر بھی ان کی حالت خستہ ہی ہوتی ہے۔ سو وہ اپنے آپ کو مسکین ہی ظاہر کرتے ہیں۔

حکومت سے محرومی بھی ذلت و رسوائی کی نشانی ہے۔ یہ قوم دو تین ہزار سال تک حکومت سے محروم رہی۔ دنیا میں کسی جگہ ان کی سلطنت نہیں تھی۔ یہ لوگ اتنے لمبے عرصہ تک در بدر رہے پھر پتے پتے۔ ان کو کسی دوسری حکومت نے بھی برداشت نہ کیا۔ جرمی دے ان کے دشمن۔ اٹلی ولسے ان کے دشمن۔ یہ سازشی ذہن کے لوگ ہیں۔ انہیں کوئی بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

آج اعتراض ہوتا ہے۔ کہ مسلمانوں کا دعوئے تھا۔ کہ دنیا میں یہودیوں کو کبھی اقتدار نصیب نہیں ہوگا۔ ان کا کوئی ملک نہیں ہوگا۔ مگر ان کی سلطنت قائم ہو چکی ہے۔ معاذ اللہ قرآن پاک کا دعویٰ غلط ہو گیا ہے۔ ہرگز نہیں۔ چوتھے پائے میں موجود ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس قوم کو کبھی اقتدار نصیب نہیں ہوگا۔ مگر دو شرطوں کے ساتھ اِلَّا بِحَبْلِ مِنَ اللّٰهِ وَحَبْلِ رَمْلِ الشَّامِ یعنی یا تو اللہ تعالیٰ کی رسی کو پکڑ لینے سے یا پھر لوگوں کی رسی کو تھام لینے کی وجہ

سے۔ ہاں قرب قیامت میں دجال کے ظہور کے وقت اُن کو عروج حاصل ہوگا۔ تو اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رسی کے تویہ قریب بھی نہیں جاتے۔ البتہ انہوں نے لوگوں کی رسی کو پکڑ رکھا ہے۔ امریکہ برطانیہ فرانس وغیرہ کے دامن سے چٹے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ان کو وطن بھی حاصل ہو گیا ہے۔ اور باقی دنیا کو آنکھیں بھی دکھانے لگے ہیں۔ ان کی سلطنت کا قیام محض امریکہ کی بے ایمانی کو نتیجہ ہے۔ آج امریکہ اگر اپنا ہتھ اٹھالے تو یہودی سلطنت دو درن بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ الغرض! اگر آج یہودیوں کو کسی خطہ زمین پر عروج حاصل ہے تو وہ بھی قرآن پاک کے بیان کردہ اصول کے مطابق ہی ہے۔ ورنہ اس قوم کی حقیقت یہی ہے۔ وَبَاءُ وَيَغْضَبُ قُلُوبَ اللَّهِ کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مذابجی لے کر لوٹے۔

آیات النبی
کا انکار

فرمایا ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ بنی اسرائیل کی ذلت و سوائی کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں جب کوئی انسان نافرمانی کرتا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت بستی ہے۔ ابیس کا بھی یہی حال ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "إِنِّ بَعَثْتُكَ لَعْنَتِي إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ" جاؤ تم پر قیامت تک میری لعنت بستی ہے گی اسی طرح کافروں کے متعلق فرمایا کہ جو کفر کی حالت میں مر گیا اُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْعَالَمِينَ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ۔ ان پر اللہ تعالیٰ۔ اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت مسلط ہوگئی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ کے احکام کو ٹھکراتے تھے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ ذلت و رسوائی کے سوا اور کیا ہوگا۔

انبیاء علیہم السلام
کا قتل

بنی اسرائیل پر لعنت مسلط ہونے کی دوسری وجہ یہ بیان فرمائی کہ وَفَعَلُوا لِنَبِيِّنَا بِغَيْرِ الْحَقِّ کہ وہ انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ میں مثلاً ہے کہ انہوں نے یرمیا بنی شعیبا بنی حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کے دیگر سینکڑوں نبیوں کو قتل کیا۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ایک دن میں خدا تعالیٰ کے تین سوا نبیاء علیہم السلام کو شہید کیا۔ جب اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں نے ایسا کرنے

سے منع کیا اور انہیں طعن و ملامت کی تو ان کو بھی شہید کر دیا گیا۔ یہ قوم اس قسم کی عادی مجرم بن چکی تھی جس کی وجہ سے یہ معذوب اور ملعون ٹھہری۔

یہاں پر **بَغْيِ الْحَقِّ** پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ نبیوں کے ناحق قتل کا کیا مطلب ہے؟ جبکہ نبی کا قتل تو بلاشبہ ناحق ہی ہو گا۔ نبی کا قتل برحق تو ہو ہی نہیں سکتا۔ تو مفسرین کرام اس اشکال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ یہاں پر ناحق کا لفظ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ قاتل خود سمجھتے تھے کہ وہ غلط کام کر رہے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ سخت عذاب روز قیامت اس شخص کو ہو گا جس نے کسی نبی کو قتل کیا ہو گا یا جس کو کسی نبی نے قتل کیا ہو گا۔ دونوں قسم کے اشخاص سخت ترین سزا کے مستحق ہوں گے۔ امیہ بن خلف کی مثال موجود ہے کہ حضور علیہ السلام نے خود اپنے نیزے سے اس ملعون کو رہتا ہوا شریکین مکہ میں سے یہ بڑا خزانہ قسم کا کاڑھتا؟

ناؤمانی اور
سے بجاوڑ

بغرض! سابقہ بنی اسرائیل کی خرابیاں اور ان کی سزائیں بیان کر کے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے بنی اسرائیل کو سمجھا جا رہا ہے کہ اب بھی سمجھ جاؤ۔ خدا کا آخری نبی آگیا ہے۔ **اٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتُ** جو کچھ میں نے نازل کیا ہے۔ اس پر ایمان لے آؤ۔ معافی کا دروازہ اب بھی کھلا ہے۔ اگر تم ٹھیک ہو جاؤ۔ اپنے اخلاق و اعمال درست کر لو۔ تو تم آج بھی عروج حاصل کر سکتے ہو۔ مگر وہ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی کو تسلیم کرنے والے نہیں تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر ہمیشہ کے لیے لعنت مسلط کر دی گئی۔ انکار آیات اور قتل انبیاء کے بعد تیسری وجہ یہ بیان فرمائی۔ **ذَلٰتِ بِمَا عَصَوْا** کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ عصیان کا معنی اللہ تعالیٰ کے حقوق کو ضائع کرنا ہے۔ وہ لوگ حقوق اللہ کی بالکل پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اس کے کسی حکم کی تعمیل کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ نیز یہ کہ **وَكَانُوْا يَفْتَدُوْنَ** وہ حد سے نکل جاتے تھے۔ تعدی کا معنی انسانوں کی جانوں اور مالوں کا تلف کرنا ہے۔ بنی اسرائیل کا ذوق ہی بدل چکا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحیح مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ نیکی اور

بدی میں تمیز کرتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ ذَسَرْتُكَ حَسَنًا وَسَاءَ ثَنًا سَيَتَشَنَّ جِب تَمَارِی نَی قَمِیَس نَی مَی مَی۔ اور بُرانی سے نفرت ہو۔ تو سمجھ لو کہ تم مومن ہو اور اگر نیک اور بدی میں تمیز پاتی نہیں رہی تو سمجھ لو کہ تم قیس روحانی بیماری لاحق ہو گئی ہے۔

اس کی مثال انسانی جسم کے ساتھ دی جا سکتی ہے۔ جب آدمی تندرست ہوتا ہے۔ تو اس کی زبان کا ذائقہ درست ہوتا ہے۔ اسے میٹھی چیز میٹھی لگتی ہے۔ اور کڑوی چیز کڑوی لگتی ہے مگر جب جسم بیمار ہو جاتا ہے۔ تو اس کی زبان کا ذائقہ بھی بدل جاتا ہے۔ اسے میٹھی چیز بھی کڑوی محسوس ہوتی ہے۔ مقصد یہ کہ اگر کوئی شخص نیک اور بدی میں تمیز کرتا ہے۔ تو وہ صحیح مومن ہے۔ ورنہ وہ بیمار ہے۔

بنی اسرائیل کے لوگ بیمار تھے۔ وہ تعدی کی بیماری میں مبتلا تھے۔ نہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کا پاس رکھتے تھے۔ اور نہ بندوں کے حقوق کا خیال کرنے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے معصوم نبیوں کو قتل کیا جو خدا تعالیٰ کی رحمت اور انسانوں کے لیے نمونہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی کھلی خلاف ورزی، اس کے احکام کو حیلوں، باتوں یا تادیبوں کے ذریعے ٹھکرانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کی برائیوں کی تفصیلات سورۃ بقرہ، سورۃ آل عمران، سورۃ نساء اور مادہ وغیرہ میں آرہی ہیں۔ ان کی برائیاں بیان کر کے مسلمانوں کو تنبیہ کی جا رہی ہے۔ کہ کہیں تم بھی اسی قسم کی خرابیوں میں مبتلا نہ ہو جانا، وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ، تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کہا کہ ہم نے سنا لیا۔ حالانکہ وہ انکار ہی کرتے ہیں۔ اے مسلمانو! اگر تم بھی انہیں لوگوں کی بدشس پر چلو گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ تمہاری صحت ایمانی بھی جاتی ہے گی۔ اور ذائقہ ایمانی بھی تبدیل ہو جائے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالْمَسَائِكِينَ كَانُوا
أَمَنًا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلُوا صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾

ترجمہ: جو لوگ مسلمان ہوئے اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے اور جو نصرانی ہوئے

اور صابی، جو شخص بھی ایمان لایا — اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر

اور اپنے کام کے۔ پس ان کے لیے ان کا اجر ہے۔ ان کے رب کے پاس اور ان پر

کچھ خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ﴿۶۲﴾

اس سے تین آیات میں بنی اسرائیل کی نافرمانیوں، فساد فی الارض، اس کے نتیجے میں ان
پر سزا دی جانے والی ذلت اور مسکنت کا ذکر تھا۔ آیت زیر درس کے بعد بنی اسرائیل کی یکے بعد دیگرے
خرابیوں کا ذکر ہوگا۔ اس درمیانی آیت میں اللہ تعالیٰ نے وہ قانون بتا دیا ہے جس کی پابندی
انتخاب کر کے اور جس پر عمل پیرا ہو کر ان کو نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ قانون کسی خاص فرقے
یا گروہ کے لیے نجات مختص نہیں کرتا بلکہ جو بھی شخص اس میں دیے گئے اصول کی پابندی کرے
گا۔ وہ نجات پا جائے گا خواہ وہ کسی خاندان کی نسل یا کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ اصل
بنی اسرائیل کے نسب سے تعلق رکھنے والی قوم کی فرقت کی تردید ہے جس میں وہ مبتلا تھے۔ اور اسی نام
بزدلی کی وجہ سے اپنے آپ کو نجات یافتہ سمجھتے تھے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے چار گروہوں یعنی یونانی، یہودی، نصاریٰ اور صابین
کا ذکر فرمایا ہے۔ البتہ سورۃ حج میں پانچویں گروہ مجوسیوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ نزول قرآن کے
وقت جو فرقے پائے جاتے تھے۔ ان میں مشرکین، یہودی، نصاریٰ اور صابی ہیں۔ حضرت
مولانا شیخ السدہ اپنی تفسیر کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت

کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کو کہتے ہیں البتہ صابی ایک ایسا فرقہ ہے جس نے مختلف ادیان سے بعض ایسی چیزوں کو اختیار کر لیا ہے جنہیں وہ اچھا سمجھتے ہیں۔ اس فرقہ کے پیروکار حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتے ہیں۔ فرشتوں کی پستل کرتے ہیں۔ زبدہ پڑھتے اور کعبے کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ بہت سی جائز باتوں میں اختلاف بھی کرتے ہیں۔

ابن ایمان

اس آیت میں جن مذاہب کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ ان میں سرفہرست ہل ایمان ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّ الْكَافِرِيْنَ اَمْسُوْا بِكُمْ شَكٌّ وہ لوگ جو ایمان لائے یعنی مسلمان ہوئے صرف اَمْسُوْا میں وہ تمام لوگ آجاتے ہیں جو بظاہر ایمان لے آئے۔ اور ان میں منافقین بھی شامل ہیں۔ کیونکہ بظاہر تو وہ بھی کلمہ پڑھتے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ نمازیں بھی ادا کرتے تھے۔ نبی علیہ السلام کی مجلس میں بھی بیٹھتے تھے۔ اور پھر آپ کی اطاعت کا دعویٰ بھی کرتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ اَمْسُوْا کی فہرست میں داخل نہیں ہو سکتے۔ یہاں اَمْسُوْا سے مراد وہ اہل ایمان ہیں۔ جو صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ پر۔ اس کے رسولوں پر اس کی کتابوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس خطاب کے مصداق ایسے ہی لوگ ہیں۔ محض زبانی دعوئے ایمان سے نجات ممکن نہیں ہے۔

ہادُوا
کا مضمون

دوسرے گروہ فرمایا۔ وَالَّذِيْنَ هَادُوْا اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے۔ یہاں پر مطلقاً یہودی نہیں فرمایا۔ بلکہ فرمایا جو یہودی ہوئے۔ اس میں امتیاز یہ ہے۔ کہ یہود ایک نسل مذہب سے یہ تبلیغی مذہب نہیں ہے۔ یہودی وہ ہیں جو نسلی طور پر بنی اسرائیل ہیں۔ اور یہودی ہونے سے مراد وہ لوگ بھی ہیں جو اگرچہ نسلی طور پر یہودی نہیں ہیں مگر انہوں نے یہودی مذہب قبول کر لیا۔ نزول قرآن کے وقت مدینہ کے گرد دلتوں میں بنی طی وغیرہ ایسے قابل تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور یا اس سے بھی پہلے جب بڑے بڑے حوادث پیش آئے۔ تو یہ لوگ اپنے اس وطن سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہو گئے تھے۔ یہاں پر ان کے قلعے اور آبادیاں تھیں یہ لوگ صاحبِ علم کہلاتے تھے۔ یہ لوگ اصل یہودی تھے۔ مگر بعض لوگ ایسے بھی تھے جو اصل عربی النسل تھے۔ مگر یہودیوں سے متاثر ہو کر اس مذہب میں داخل ہو گئے تھے۔ انہیں کے

متعلق کہا گیا ہے کہ جو یہودی ہوئے۔

یہودیوں کو یہود کہنے کی درود جہات سان کی جاتی ہیں۔ بمغترین کلام فرماتے ہیں کہ پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ نام حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے یودا کے نام پر ہے۔ اس نام کی دوسری توجیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ سورۃ اعراف میں آتا ہے **هُدًى لِّكَ هَٰذَا**۔ **هُدًى** کا معنی ہوتا ہے۔ رجوع کرنا۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کا دعائہ کلمہ ہے۔ جب بنی اسرائیل نے سخت گستاخی کی۔ اور کہا کہ ہم ہرگز اس کتاب کو نہیں مانیں گے۔ جب تک اللہ تعالیٰ خود ہم سے ہم کلام ہو کر اس کتاب کی تصدیق نہ کرے۔ تو موسیٰ علیہ السلام قوم کے ستر آدمیوں کو ساتھ لے کر کوہ طور پر گئے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ان کا مطالبہ پورا کر دیا۔ مگر یہ پھر بھی ایمان نہ لانے۔ تو اللہ تعالیٰ کا قہر بجلی کی صورت میں نازل ہوا۔ اور وہ ستر آدمی ہلک ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام سخت رنجیدہ خاطر ہوئے۔ کہ مولا کریم! میں قوم کو جا کر کیا بتاؤں گا۔ وہ کہیں گے کہ ہمارے آدمی وہاں لے جا کر مروا دیے۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت عاجزی کے ساتھ دعا کی تھی۔ اور عرض کیا تھا **اِنَّا هٰذَا نَاِلِیْکَ**۔ مولا کریم! ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا تھا۔ تو بعض فرماتے ہیں کہ یہودیوں کو یہود کا لقب اس **هُدًى** کے ماننے سے دیا گیا تھا۔

اس وقت پر ہی دنیا میں یہودیوں کی تعداد دو کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ برخلاف اس کے نصاریٰ کم و بیش دو ارب کی تعداد میں ہیں۔ یہودی اپنے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر کاربند کہتے ہیں۔ مگر ان میں ابتداء کے زمانہ ہی میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ ان میں سرکشی کا مادہ وافر مقدار میں موجود تھا۔ بعد میں یہ عادی مجرم بن گئے۔ عصیان ان کی رشت میں داخل ہو گیا۔ اور یہ لوگ حقوق العباد کو ضائع کرنے لگے۔ حتیٰ کہ انبار علیہم السلام کو قتل کیا۔ یہ لوگ اپنے آباد ابدال کے شیعہ افعال پر نادم ہونے کی بجائے۔ ان پر فخر کرتے تھے۔ کہ وہ بہت اچھا کام کرتے رہے ہیں۔ ان کے عہد اعمال اور اخلاق میں بے شمار قبائح پیدا ہو چکے تھے۔ اور آج تک موجود ہیں۔

یہودیوں کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جسمانی صورت کے معتقد ہیں۔ اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کو جسمانیت سے متبرا سمجھتے ہیں۔ مگر کہتے ہیں کہ اس کا تعلق جسم کے ساتھ بھی ہے۔ اس جسم کو وہ مثالی اور نورانی مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی جسمانیت شعاع کی طرح ہے۔ جو پھیل جاتی ہے۔ اور سکڑ جاتی ہے۔ اسی لیے انہوں نے رویت الہی کا مطالبہ پیش کر دیا۔ لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى نَرَى اللَّهَ جَهْدَةً ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کو ظاہری طور پر نہ دیکھ لیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر گریہ، ہنسی، حزن اور غم کا بھی اطلاق کرتے ہیں۔

یہودی انبیاء علیہم السلام کے بارے میں بھی بڑی بدگمانی رکھتے ہیں۔ بلکہ ان پر تہمتیں لگاتے ہیں۔ تورات کے مطالعے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام پر کیا کیا بدنامیوں سے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تہمت لگائی۔ کہ آپ ہارون علیہ السلام سے حد کرتے تھے اس لیے آپ نے حضرت ہارون علیہ السلام کو قتل کیا۔ (العیاذ باللہ) حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو حضرت ہارون علیہ السلام کے بارے میں سفارشی تھے کہ "وَأَشْرِكُكُمْ فِي آمْرِى" (۳۲) کُنْ نَسِجَكَ كَثِيرًا لِّئَلَّا يَكُونَ لِي فِي دَعْوَاكَ حَاجَةٌ۔ وہ مجھ سے زبان میں زیادہ فصیح ہے۔ اے اللہ میری زبان میں مکت ہے۔ رِذَا يُصَدِّقُنِي اے میرا معاون بنائے جو میری تصدیق کرے۔ کہیں فرمایا اے میرا وزیر بنائے۔ ہم مل کر تیرے دین کی تبلیغ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَوْفِيَتْ سُوءَاتُكَ يَمُوسٰى۔ اے موسیٰ تیرا سوال پورا کر دیا گیا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے مگر یہ بد بخت یہودی کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو قتل کر دیا تھا۔

یہودیوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبی نہیں مانتے بلکہ ولی مانتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ نبی تو محض اپنی ہوتا ہے۔ مگر دلی نبی سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس میں تقرب الی اللہ کا وہ زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ عقیدہ بالکل باطل ہے۔

ان بد بختوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ سونے کا بکھڑا خود حضرت ہارون علیہ السلام نے بنایا تھا یا انہوں نے بنانے کا مشورہ دیا تھا (العیاذ باللہ) اسی طرح انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام پر یہ تہمت لگائی کہ انہوں نے اپنے کمانڈر انچیف اور یا کو قتل کر دیا اور اس کی بیوی کو گھر میں رکھا (العیاذ باللہ) انہیں لوگوں نے سحر کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کیا کہ یہ جادوگر اور طلسمات کا ماہر ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کے بارے میں بہت بڑا جھوٹ ہے۔

یہودی یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت رالمی ہے جو کبھی فاسوخ نہیں ہوگی۔ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھی منکر ہیں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے تو انہوں نے سخت مخالفت کی۔ اور انہو دجال تک کہ۔ ان بد بختوں نے ان کے منہ پر پتھر کا اور انہیں سولی پر لٹکانے کی کوشش کی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر زنا کی تہمت انہی ظالموں نے لگائی۔ (العیاذ باللہ) یہودیوں کی بد اخلاقی، بد عقیدگی اور ان کی بُری خصلتوں کی تفصیلات قرآن پاک میں موجود ہیں۔ بعض چیزیں تفاسیر میں ملتی ہیں۔ اور بعض تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔

نصاری کی وجہ تسمیہ

مومنین اور یہود کے تذکرہ کے بعد تیسرے گروہ کے متعلق فرمایا وَالنَّصَارَىٰ اور نصاریٰ جو اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لفظ نصاریٰ، نصرانی کی جمع ہے۔ اور نصرت کے معنی مدد کرنے کے ہوتے ہیں۔ مسخرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اذیت پہنچاتے تو آپ لوگوں کو مخاطب کر کے فرماتے: مَنْ أَنْصَارِیَ إِلَى اللَّهِ؟ اللہ تعالیٰ کے راستے میں کون میرا مددگار ثابت ہوگا؟ قَالَ الْحَوَارِیُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ؟ تو حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے راستے میں مدد کے لیے تیار ہیں چنانچہ اسی لفظ سے ان کو نصاریٰ کا نام دیا گیا۔ یعنی نصرت کرنے والے۔ مدد کرنے والے جنہو دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جس بستی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام رہتے تھے۔ اس بستی کا نام

۱۔ تفسیر عزیزی قدسی ص ۲۶۸، ۲۔ تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۶۸، ۳۔ تفسیر ابن کثیر ص ۱۴۱

۴۔ معالم التنزیل ص ۳، ۵۔ درمنثور ص ۵۱

نامصرہ تھا۔ چنانچہ اس بستی کی نسبت سے اس گروہ کو نصرانی کے لقب سے طعن کیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مدینہ کی نسبت کر کے منیٰ کہا جاتا ہے۔ یا کسی کو مکی یا شامی وغیرہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

نصاری کے
عقائد باطلہ

نصاری بھی عجیب و غریب عقائد رکھتے تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کا عقیدہ بالکل جڑا چکا ہے۔ نجات کل کے مسیحی پولس نامی ایک شخص کے بگاڑے ہوئے ہیں۔ یہ شخص مسیحیت کا مبلغ تھا۔ اس نے دین مسیحی کا بالکل علیہ بگاڑ دیا۔ پولس نے بھی عیسائیت کو اس طرح خراب کیا جس طرح عمر بن لُحی نے دین ابراہیم کو بگاڑ دیا تھا۔ عرب اقوام تقریباً دو ہزار سال تک حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے مذہب پر قائم رہے۔ اتنے عرصہ تک یہ توحید پرست رہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل اس شخص نے عربوں میں بت پرستی کا طریقہ ایجاد کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نازل قرآن کے وقت سارا عرب شرک میں غرق ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ خاندان کعبہ کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔

پولس نے مسیحیت کے ساتھ بھی ایسا ہی سوچا کیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بندہ اور رسول بننے والے لوگ آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔ اور تثلیث کا مسئلہ ان میں رواج پا گیا۔ آگے سورۃ مائدہ میں آکر ہے کہ انہوں نے "إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ" کا عقیدہ بنالید اور اس طرح گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔ اُس وقت انہوں نے چار گروہ بنالیے۔ مگر اس وقت کے کچھ تو ایک اور پروٹسٹنٹ دونوں گروہ شرک میں۔ دونوں میں سے کوئی بھی توحید پر قائم نہیں رہا۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا یا تیسرا خدا یا ابن اللہ کہا۔ انہوں نے یہ عقیدہ بھی قائم کر لیا کہ خدا عیسیٰ علیہ السلام میں حلول کر گیا ہے۔ یہودیوں نے بھی یہی کہا تھا کہ خدا کچھڑے میں حلول کر گیا ہے۔ اس طرح کا باطل عقیدہ عیسائیوں نے وضع کر دیا۔

سید علی ہجویری صاحب کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ صوفیائے کرام کے بارہ فرقے ہیں۔ ان میں سے دو فرقے مردود ہیں۔ اور باقی دس فرقے مقبول ہیں۔ دو مردود فرقے یہی حلول

”اے فرقے ہیں۔ وحدت الوجود کا عقیدہ بھی انہی لوگوں کا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ
بنہ سے کے اندر داخل ہو گیا ہے (العیاذ باللہ) تو بہ حال یہ لوگ بھی اس قسم کی بدعتیہ گئی کا شکار
ہو چکے ہیں وَالصَّابِئِیْنَ اور صابی۔

صحابی روزیہ؟

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ صابی کا عام فہم معنی بے دین ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص ایک
دین چھوڑ کر دوسرے دین میں داخل ہو جائے تو اُسے صابی کہتے ہیں۔ اسی بنا پر عرب کے مشرکین
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صابی کہتے تھے۔ یعنی انہوں نے پرانا دین چھوڑ کر نیا دین اختیار کر لیا ہے
تاہم اس مقام پر جس صابی فرقہ کا تذکرہ ہے۔ مفسرین نے اس کی بہت سی تفصیلات بیان کی
ہیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس فرقہ کے پیروکاروں کا عقیدہ ہے کہ
نیک نیتی اور سعادت حاصل کرنے کے لیے انسان کسی نبی کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ اگر وہ
روحانیات اور فرشتوں کے ساتھ رابطہ قائم کرے تو اس کے لیے یہی کافی ہے۔ انہیں سے
انسان فیض حاصل کر سکتا ہے۔ یہ لوگ مختلف قسم کے سیکل بنائے ہیں۔ مثلاً آفتاب، مابتاب
ستاروں اور ملائکہ کے نام کے سیکل بنائے جاتے ہیں۔ جس طرح ہم لوگ قبلہ کی طرف منکر کے سجدہ کرتے
ہیں۔ یہ لوگ ستاروں کو سجدہ جلاتے ہیں۔ اور انہیں قبلہ تصور کرتے ہیں۔

اس فرقہ کے متعلق یہ بھی بھلا ہے کہ یہ تین نمازیں پڑھتے تھے۔ اس زمانہ میں صابیوں کے
جانشین پروریزی اور چکڑاوی ہیں۔ چکڑاوی بھی تین نمازوں کے قائل ہیں۔ ان کے بعض لوگ دو نمازیں
پڑھتے ہیں اور بعض صرف ایک۔ یہ سب گمراہ فرقے ہیں اسی طرح پروریز کا عقیدہ یہ ہے کہ موجودہ
نماز کی کوئی حقیقت نہیں۔ صحیح نماز وہ ہوگی جو حکومت مقرر کریگی۔

صابیوں کی اور بھی بہت سی تفصیلات ملتی ہیں مثلاً ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے کو کوئی شخص
ہاتھ لگا دے۔ تو اس کے لیے غسل ضروری ہو جاتا ہے یہ لوگ گدھے اور کتے کے گوشت کو تو
نہیں کھاتے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اونٹ اور بچے دار جانور کے گوشت کو بھی پیوریوں کی طرح
حرام سمجھتے ہیں۔ یہ پیاز اور باقلی کو بھی حرام سمجھتے ہیں۔ مارا ہوا یا مار پھیلنے والی سانپ کی مانند پھیل
بھی ان کے ہاں حرام ہے۔ یہ لوگ شراب کو حلال اور جائز سمجھتے ہیں۔ مگر نشے کو حرام گردانتے

ہیں۔ طلاق کے متعلق ان کا شرعی مسئلہ یہ ہے کہ حاکم وقت کی اجازت کے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اُن کے ہاں ایک سے زیادہ نکاح بھی جائز نہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک وقت میں صرف ایک عورت سے ہی نکاح ہو سکتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی نے صابیوں کے مختلف بیگلوں کی شکل و صورت کا بھی تذکرہ کیا ہے مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ علتِ اولیٰ (FIRST CAUSE) یعنی تخلیق پر بھی بیکل بندتے ہیں۔ عقل کا بیکل الگ ہوتا ہے۔ سیاست کا الگ۔ اسی طرح صورت کا بیکل بندتے ہیں۔ اور پھر نفس کا بیکل گول شکل کا بناتے ہیں۔ زحل سیارے کا بیکل مدس شکل کا ہوتا ہے۔ اور مشتری کا بیکل مثلث شکل کا۔ آفتاب کا بیکل مربع شکل کا ہوتا ہے۔ اور مہتاب کا بیکل مٹمن یعنی آٹھ پہلو کا ہوتا ہے۔ یہ لوگ قیامت کا بائبل انکار کرتے ہیں۔ اس کی بجائے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ چھتیس ہزار چار سو پچیس سال کا ایک دور ہوتا ہے۔ جب ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ تو پھر برزی روح کا ایک ایک جوڑا پیدا ہوتا ہے مثلاً انسان، چرند، پرند، کیڑے مکوڑے وغیرہ ہر ایک کا ایک جوڑا پیدا ہوتا ہے۔ جس سے آئندہ نسل ملتی ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ موجودہ دور جب تک موجود ہے یہ سلسلہ اسی طرح چلتا ہے گا۔ اس کے بعد یہ تباہی کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا۔ اور پھر دوسرا دور شروع ہو جائے گا۔ علیٰ ذہن القیاس۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں کلدانیوں کی ایک بہت بڑی تہذیب گندی ہے اس کامرکز بابل شہر تھا۔ جو کہ کم و بیش ایک سویل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ شہر بغداد سے قریباً ستر یا سویل دور تھا۔ اس سے پہلے آشوریوں کی تہذیب کا دور دورہ تھا۔ وہ ختم ہوئی ہو تو کلدانی تہذیب کو عروج حاصل ہوا۔ انہیں کے مقابلے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھیجا تھا۔ آپ وہاں تبلیغ کافر بیضہ انجام دیتے رہے۔ مگر مجبور ہو کر وہاں سے ہجرت کی اور شام و فلسطین کو مرکز بنایا۔ پھر خانہ کعبہ کی تعمیر کے لیے مکہ مکرمہ آئے۔ تو صابیوں کی طرح یہ کلدانی بھی ستاروں اور روحانیت کے قائل تھے۔ اور ان کو قبلہ بنا کر ان کی طرف سجدہ کرتے تھے

صیغی بقابل صابی

حضرت مولانا عبید اللہ رحمہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں دو قسم کے مذاہب ہیں۔ ایک صیغی اور دوسرا صابی۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک صابی دور تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد در صیغیت شروع ہو چکا ہے اب صیغیت کی آگے تین شاخیں ہیں۔ یعنی مسلمان، یہود اور نصاریٰ۔ ان میں سے صرف مسلمان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین (ملت) پر قائم ہیں۔ باقی دونوں گروہ اصل دین سے ہٹ چکے ہیں۔

دور ابراہیمی سے پہلے جو صابی گروہ تھا۔ وہ اب بھی موجود ہے مگر اس کی بھی تین شاخیں ہیں۔ یعنی مجوس، برہمن اور بدھ، مجوسیوں کو زیادہ تر عروج ایران میں ہوا۔ وہاں ان کی تاریخی حیثیت مسلم ہے۔ تاریخ کی ایک مشہور کتاب ایران بعد ساسانیوں میں موجود ہے کہ مجوس کی بھی دو قومیں ہیں ایک کا نام ایرج ہے۔ اور دوسری کا طور۔ قدیم زمانے میں ایران کے بادشاہ فریدون کے درویش ایرج اور طور تھے۔ انہیں کے نام پر مجوس کی دو شاخیں پھیل گئیں۔ مجوسی بھی دراصل اہل کتاب تھے۔ مگر بندوں کی طرح انہوں نے بھی مذہب کو بگاڑ دیا۔

حضرت علیؓ کی روایت میں آتا ہے کہ مجوسیوں کے کسی بادشاہ نے اپنی بہن کے ساتھ زنا کیا۔ اور پھر اسے جائز قرار دینے کے لیے وقت کے علماء کو ساتھ ملا دیا۔ خود غرض مضبوط اور عالموں نے بادشاہ کے حق میں فتویٰ دے دیا کہ ایسا کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کی شریعت میں بھی تو بہن کے ساتھ نکاح جائز تھا۔ گویا مجوسیت میں اس قسم کی بے حیائی بھی روا تھی حتیٰ کہ ماں کے ساتھ نکاح بھی جائز سمجھتے ہیں۔ مجوسیوں کی دوسری شاخ برہمن ہے۔ جو ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور تیسرے بدھ ہیں۔ جو چین اور جاپان میں آباد ہیں۔ یہ سب کی سب صابی امتیں ہیں۔

ایمان بار

ان چار گروہوں یعنی اہل ایمان، یہود، نصاریٰ اور صابی کا تذکرہ کر کے اب وہ اصول بتائے جا رہے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ تو فرمایا ان چاروں گروہوں میں سے مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ تو شخص بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا۔ یعنی کوئی شخص کسی بھی گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔ کتنا بڑا کافر اور مجرم ہو۔ بدترین قسم کا ظالم ہو۔ اگر اس نے صدقِ دل سے توبہ کر لی۔ اور

اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لے آیا۔ تو اس کی توبہ قبول ہو جائے گی۔ اور وہ نجات حاصل کر لے گا۔
ایمان میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانا کافی نہیں۔ بلکہ اس کی صفات۔ اس کی تقدیر
وعدائیت۔ اس کے انبیاء علیہم السلام اور اس کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ اس کے
بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں: کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو۔ کہ
خدا بنی نہیں بھیجتا یا حکم جاری نہیں کرتا۔ تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص اگر بغیر توبہ کے مر گیا۔ تو وہ
جہنمی ہے۔ بنی بھیجنا۔ حکم جاری کرنا۔ شریعت دینا یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔
اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کا انکار بھی دوسرے معنوں میں اللہ تعالیٰ کی صفت کا انکار ہے۔ فرشتے
اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیض پہنچانے والی مخلوق ہے۔ یہ لطیف اجسام والی نورانی پاک اور منزہ
مخلوق ہے۔ ان پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

ایمان بلاخره

فرمایا ایمان حاصل کرنے کا دوسرا قانون ایمان بالآخرۃ ہے۔ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
یہ دہی دن ہے جو اس جہان کا آخری دن (LAST DAY OF THIS WORLD) ہوگا۔ پچیس
سال کے اس دن میں تمام انسانوں کا حساب کتاب ہوگا۔ اور اس کے بعد دوسرا دور شروع
ہو جائے گا۔ گویا قیامت کے دن کو ماننا بھی اتنا ہی لازم ہے۔ جتنا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا۔ جو
شخص روزِ جزا کا انکار کرے گا۔ وہ بھی کفر میں داخل ہو جائے گا۔

اعمال صالحہ

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کے بعد تیسرا قانون وَعَمِلْ صَالِحَاتٍ یعنی نجات کا حق دار وہ شخص ہو گا جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اعمال صالحہ بھی انجام دیتا ہو۔ مجددِ ملت ثانی شیخ احمد سرہندی فرماتے ہیں کہ بنیادی طور پر اعمال صالحہ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج ہیں۔ ہفتائے کرام البتہ جہاد کو بھی بنیادی اعمال میں شمار کرتے ہیں۔ تو جو لوگ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے ساتھ ان بنیادی اعمال کو بھی انجام دیں گے۔ ان کے متعلق فرمایا فَدَعُوهُمُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّهِمْ ان کو ان کے رب کے پاس بلالے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا وَدُخِرُوا عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُعْذَرُونَ ان پرستقبل میں کوئی خوف نہیں ہو گا۔ اور نہ وہ سابعہ اعمال

پر غمگین ہوں گے۔ جیسا کہ روایات میں آتا ہے۔ کہ قیامت کے دن سب لوگ خوفزدہ ہوں گے۔ مگر یہ طبعی اور عارضی ہوگا۔ بالآخر وہ ہر قسم کے خوف سے بچ جائیں گے۔ بعض اوقات دنیا میں بھی بعض نیک لوگوں کو مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ اور وہ ملال و حزن سے دوچار ہوتے ہیں مگر یہ عارضی چیز ہے۔ یقیناً کے اعتبار سے ایسے لوگوں کو خوف نہیں ہوگا۔ حتیٰ کہ خسرو اسے دن کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا يَحْزَنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ بڑے دن کی گھبراہٹ بھی انہیں خوفزدہ نہیں کرے گی۔ اللہ ان کے دل کو سکون کی دولت سے مالا مال کرے گا۔ رَتَّلَتْهُمْ الْمَلَائِكَةُ فرشتے ملاقات کریں گے تو انہیں تسلی دیں گے۔ کہ گھبراہٹ اب تمہارے لیے امن ہی امن ہے۔ اور آئندہ بھی کوئی خوف نہیں ہوگا۔ کہ ہم سے کسی وقت کوئی نعمت چھین جائے گی۔ یا کوئی تکلیف پہنچے گی۔ وہ لوگ دنیا میں انجام دیے گئے اپنے کسی عمل پر بھی غمگین نہیں ہوں گے۔

الغرض! اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نجات کا یہ قانون سمجھا دیا کہ نجات کسی خاص فرقہ یا گروہ کے لیے مختص نہیں ہے۔ ایمان کا دعویدار ہو یا یہودیت کا۔ کوئی عیسائی مذہب رکھتا ہو یا صابی۔ نجات کے لیے واحد قانون یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔ آخرت کے دن پر ایمان لائے۔ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کتابوں اور فرشتوں پر ایمان لائے اور اعمال صالحہ انجام دیے۔ اس کے بغیر نجات نہیں ہے۔ ہر گروہ اپنے ہی فرقے کو افضل اور حق پر سمجھتا ہے مگر نجات کا دار و مدار اسی قانون پر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے بتلادیا۔ آگے قانون کی مزید تشریح آ رہی ہے۔

وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ
بِقُوَّةٍ وَادْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾ ثُمَّ لَوَّيْتُمْ مِمَّنْ كَبَدَ
ذَلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٦٤﴾

تم جبرہ بن اور اس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ عہد کیا۔ اور ہم نے تمہارے
اوپر طور کو بلند کیا۔ جو کچھ ہم نے دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑو۔ اور یاد کرو جو کچھ اس میں
ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ ﴿۶۳﴾ پھر تم اس کے بعد پھر گئے۔ پس اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور

اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاتے ﴿۶۴﴾

ان آیات میں بھی بنی اسرائیل کی خرابیوں کا ہی ذکر ہے۔ اس سے پچھلی آیت میں قانون
نجات کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔ کہ نجات کسی خاص فرقہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اس کا
دارومدار ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ اور اعمال صالحہ پر ہے۔ آیات ذریعہ میں بنی اسرائیل کی توجہ
اس واقعہ کی طرف دلائی جا رہی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ جو کتاب میں
تمہیں دے رہا ہوں اس کے احکام کی پابندی کرو گے۔ مگر وہ کہنے لگے کہ یہ احکام تو بڑے مشکل
ہیں ہم سے عمل نہیں ہو سکے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ڈرانے کے لیے ان کے سروں پر کوہ طہ
کو کھڑا کر دیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ اس واقعہ کو یاد کرو جب
ہم نے تم سے پختہ عہد کیا۔

بنی اسرائیل
کا عہد

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات حاصل ہو گئی۔ فرعون اور
اس کے تمام لشکر ہلاک ہو گئے۔ تو بنی اسرائیل نے خود ہی موسیٰ علیہ السلام سے فرمائش کی کہ ہمارے
لیے کوئی شریعت مقرر کرو۔ جس کی ہم پابندی کریں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو

تورات عطا فرمائی مگر وہ طرح عرض کے بیٹے بہانوں سے اس کے احکام کو ٹالنے کی کوشش کرنے لگے۔ اور انہوں نے تورات کے منزل من اللہ ہونے پر شک و شبہ کا اظہار کیا۔ اور اعتراض یہ کیا کہ ہم اس کتاب پر ایمان لائے کیلئے تیار نہیں جب تک خود اللہ تعالیٰ اس کی تصدیق نہ کرے۔ کہ یہ اس کی عطا کردہ کتاب ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام شراذیموں کو لے کر کوہ طور پر گئے۔ ان لوگوں نے اپنے کانوں سے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا۔ مگر اس کے باوجود گتہ خفی کی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دی نہ بجلی آئی اور سب کو خاکستر کر گئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے پھر انہیں زندگی عطا کی۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود طور سے واپس آنے والے لوگوں نے اپنی قوم سے کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہم سے ہمکلام ہوا ہے۔ اور اس نے کہا ہے کہ یہ کتاب میں نے ہی دی ہے۔ مگر اس کے تمام احکام پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جس قدر ممکن ہو اس پر عمل کرنا اور باقی کو چھوڑ دینا۔ چنانچہ انہوں نے خود ہی فیصلہ کر لیا۔ کہ تورات کے جملہ احکام تو بہت مشکل ہیں۔ لہذا ہمیں ساری تورات پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور انہوں نے صحیح احکام کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے اس کتاب پر عمل کرنے کا پختہ عہد کر لیا تھا۔ چنانچہ اسی کو فرمایا گیا ہے۔ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ

فَرَمَا وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمْ الطُّورَ اور ہم نے تمہارے اوپر طور کو بلند کیا جیسا کہ ارتفاع طور

الفاظ سے ظاہر ہے۔ مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طور پہاڑ کو اٹھا کر ان کے سروں پر سائے کی طرح کھڑا کر دیا تھا یہ اتنی خوفناک صورت حال تھی کہ پہاڑ کسی دقت بھی ان پر گر کر ان کو پکنا چور کر سکتا تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے پوچھا کہ تم تورات کے احکام پر عمل کرو گے یا نہیں۔ تو انہوں نے عہد کیا کہ مولا کریم! ہم سے یہ مصیبت ڈال دے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تیرے احکام پر عمل پیرا ہوں گے۔

معجزات کے بعض منکرین رَفَعْنَا کی مختلف تاویلیں کرتے ہیں۔ دو کہتے ہیں۔

کہ پیار کو بنی اسرائیل کے سروں پر معلق نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ بنی اسرائیل کو پیار کے دامن میں اس طرح کھڑکیا
 تھا کہ پیار کا کچھ حصہ ان پر چھبکا ہوا تھا۔ یہ ان کی غلط فہمی ہے سورۃ اعراف میں نَتَقْنَا کا واضح لفظ آتے ہے جکا مطلب
 کھانڈ کر کھڑا کر دینا ہے اور معجزانہ طور پر الیا ہو جانا کوئی بعید بات ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے پتھر سے پانی نکال سکتا ہے
 عمدہ کو پھاڑ کر اس میں بارود راستے بنا سکتا ہے۔ من اور سلوی نازل کر سکتا ہے وہ اگر کسی پیار
 کو اٹھا کر سروں پر معلق کر دے تو کون سی بڑی بات ہے۔ بلکہ تورات میں قرۃ تفصیل بھی آتی ہے
 کہ نہ صرف پیار معلق ہو گیا تھا۔ بلکہ ساتھ دھواں اٹھ رہا تھا۔ اور آگ کے شعلے سامنے نظر آ رہے تھے
 الغرض ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے وہ عہد لیا۔ جس کا تذکرہ اس آیت میں آتا ہے
 لغوی طور پر طور ایسے پیار پر بولا جاتا ہے۔ جو سر ہنر ہو۔ یعنی اس پر بکثرت درخت پائے
 جائیں۔ خشک پیار کے لیے طور کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ یہاں پر جس پیار کا ذکر ہے یہ وہی
 طور ہے۔ جو صحرائے سینا کے اطراف میں واقع ہے۔ اور اس کی ایک چوٹی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام
 کو اللہ تعالیٰ سے شرف تکلم حاصل ہوا تھا۔ اسی پیار پر آپ کو تورۃ ملی تھی۔

دین میں جبر نہیں

بنی اسرائیل کے سروں پر طور معلق کر کے عہد لینے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ تو جبری
 عہد ہو گیا۔ جو کہ ٹھیک نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ یعنی
 دین میں جبر نہیں ہے۔ مگر یہاں پر جبر عہد کرایا گیا۔ مفسرین کرام اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ خشک
 دین میں جبر نہیں۔ مگر اس سے مراد یہ ہے کہ کسی کو کوئی دین اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔
 خواہ اس کا دل ماننے یا نہ ماننے۔ کم از کم اسلام میں تو ایسا نہیں ہے۔ اسلام تو یہ چاہتا ہے۔ کہ
 تبلیغ کی جائے۔ اسلام کی خوبیاں بیان کی جائیں۔ اس کے متعلق اگر کوئی غلط فہمیاں ہیں۔ تو انہیں
 دور کیا جائے۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔ اور اسے اسلام کی دعوت دی جائے۔
 اسلام کی پوری تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمانوں نے کسی بھی زمانے میں کسی پر جبر
 نہیں کیا۔ نہ کسی کو زبردستی مسلمان بنایا۔ البتہ کیمونسٹوں اور عیسائیوں کی تاریخ واضح ہے۔ کہ انہوں
 نے کیسے کیسے ظلم کئے۔ مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنایا گیا۔ اور بعض کو تہ تیغ کیا گیا۔

کسی غیر مسلم کو اسلام میں داخل کرنے کے لیے قطعاً جبر روا نہیں۔ البتہ فی الجملہ اسلام میں جبر ہے۔ جو قانون ظلمی کامر تکب ہو گا۔ اس پر جبر بھی ہو گا۔ بنی اسرائیل پر پیارا معلق کرنے کا مقصد بھی یہی تھا۔ کہ جو عہد کیا تھا۔ اس کی پابندی کرو۔ ورنہ یہ پیارا تمہارے اوپر گرا دیا جائے گا۔ تورات میں تو یہ الفاظ آتے ہیں۔ کہ اگر تم نے عہد کی پابندی نہ کی تو تمہارا مہفن ہمیں بنے گا۔

اگر قانون کی پابندی کے لیے جبر کو جبر فی الدین سمجھ لیا جائے۔ تو سارا معاملہ ہی دہم برہم ہو جائے گا۔ حدود اور تعزیرات کا سلسلہ بند کرنا پڑے گا۔ جب کسی ملزم کو سزا دی جائے گی۔ تو وہ جبر جبر کی دہائی دینے لگے گا۔ کہ اس پر زیادتی ہو رہی ہے۔ اُسے جبر کوٹے لگائے جائے ہیں یا اُسے جبر اُقیم میں ڈالا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ اس پر جبر نہیں ہو گا۔ بلکہ قانون کی خلاف ورزی پر تعزیر ہوگی۔ الغرض! اسلام میں داخل کرنے کے لیے کسی پر جبر نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ قانون کی پابندی کرانے کے لیے جبر سزا دی جاسکتی ہے۔

مسلمانوں کے انحطاط کے زمانہ میں سلطان سلیم ترکی نے عیسائیوں کی سازشوں سے تنگ آکر حکم دے دیا۔ کہ ترکی کی عملداری میں تمام عیسائیوں کو جبراً مسلمان بنایا جائے۔ اُس زمانے کے شیخ الاسلام کو اس حکم کی خبر ملی۔ تو فوراً سلطان کے پاس پہنچے اور اس سے اس حکم کے متعلق دریافت کیا۔ سلطان نے تسلیم کیا۔ کہ اُس نے عیسائیوں کی سازشوں سے تنگ آکر یہ حکم صادر کیا ہے۔ تو شیخ الاسلام نے درڑوک الفاظ میں سلطان سے کہا۔ کہ آپ کا یہ حکم اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ کہ دین میں جبر نہیں ہے۔ مگر آپ غیر مسلموں پر جبر کر رہے ہیں۔ کہ وہ اسلام میں داخل ہوں۔ سلطان بات کو سمجھ گیا اور اپنا حکم واپس لے لیا یہ تاریخی واقعہ ساری دنیا کو معلوم ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ اور انہوں نے اس کی پابندی کا اقرار کیا تو اہتماماً بالکتاب اللہ تعالیٰ نے فرمایا خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ جو کچھ ہم نے دیا ہے۔ اُسے مضبوطی سے پکڑ لو۔ اہتماماً بالکتاب کا مطلب یہ ہے کہ اسے تسلیم کرو۔ اس پر ایمان رکھو۔ اور پھر اسی کے مطابق عمل کرو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں: کہ پوری کوشش اور جانفشانی کے ساتھ اس کا

پڑھنا پڑھانا۔ لیکن سچا۔ اس میں مندرج قوانین کی پابندی کرنا انسان کی ترقی اور خطیرۃ القدس کا مہر بننے اور علیتین تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔ غرض کتاب کو مضبوطی سے پکڑنے کا مطلب مضبوط ہاتھوں سے پکڑنا نہیں۔ بلکہ اس کے قوانین پر سختی کے ساتھ عملہ کرنا ہے۔ محض خالی خالی وعدوں سے کام نہیں بنے گا۔

قوانین کی پابندی

استمساک بالکتاب کے بعد دوسرے نمبر پر فرمایا وَ اذْکُرْ وَاٰمَرَ فِیْہِ اور جو کچھ اس میں ہے اُسے یاد کرو۔ یعنی اس کو پڑھتے پڑھتے ہو۔ یہ قرآن پاک قانون خداوندی ہے۔ سنت رسول اس کی شرح ہے۔ مگر آج کتنے لوگ ہیں۔ جو قرآن و سنت سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ اس آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے بات ہمیں سمجائی جا رہی ہے۔ کہ جو کچھ قرآن پاک میں قانون نازل ہوا ہے۔ اُسے یاد کرو۔ اس کو خود پڑھو اور دوسروں کو پڑھاؤ۔ اس کی تشریح کرو۔ تاکہ قانون کی تفصیلات عوام الناس تک پہنچ سکیں۔ جس طرح ایک عام دینی حکومت کے قانون کی تشریح ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قانون قرآن پاک کو عام کرنا بھی ہمارے فرائض میں داخل ہے۔

شاد عبد العزیزؒ فرماتے ہیں۔ کہ حاکم وقت کو اپنی رعایا پر اس طرح مہربان ہونا چاہیے۔ جیسے کوئی باپ اپنی اولاد پر ہوتا ہے۔ ایک باپ کی یہ انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی اچھی تربیت کرے۔ ہر شریف النفس باپ ایسا ہی چاہے گا۔ بلکہ باپ تو یہ پند کرے گا۔ کہ اس کا بیٹا اس سے زیادہ ترقی کرے۔ اسی طرح حاکم کو بھی اپنی رعایا کی تربیت اور ادب کی طرف کرنی چاہیے۔ اور اپنے قانون کی خوب تشریح کرنی چاہیے۔ تاکہ رعایا کا کوئی فرد اس سے ناواقف نہ رہے۔ اور قانون پر عمل پیرا ہو جائے۔ اب اگر حاکم خود اپنے قانون کی پابندی کرے گا۔ تو رعایا بھی اس پر کاربند ہوگی۔ اور اگر وہ خود پابندی نہیں کرتا تو وہ دوسروں سے کیسے پابندی کر دے گا۔ جو شخص خود فاسق و فاجر اور بدکار ہے وہ دوسروں کو نیکی اور بھلائی کا کیا درس دے گا۔ جو خود جوار کھیتا ہے۔ وہ دوسرے جوار یوں کو کیسے سزا دے گا۔ شرابی حاکم شرابیوں سے کیسے

نہیں گا۔ لہذا ضروری ہے کہ حاکم پہلے خود قانون کی پابندی کرے اور پھر دوسروں کے سختی کے ساتھ پابندی کروائے۔ اس کے بعد جو کوئی قانون شکنی کرے اسے سخت ترین سزا دے۔
 فرمایا وَإِذْ كَرُمُوا مَا فِيهِ اس میں جو کچھ لکھا ہوا ہے۔ اسے یاد کرو۔ اور اس کے پڑھانے کے لیے وسائل بھی مہیا کرو۔ مدرسے قائم کرو۔ معلم مقرر کرو تاکہ ہر خاص و عام اس کی تعلیمات سے مستفید ہوں۔ اُسے علم ہونا چاہیے کہ ہمارا قانون بہترین قانون ہے۔ اس دستور سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دستور نہیں۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ میں تمام شریف ہندوؤں اور دو سکس غیر مسلموں کو چیلنج کرتا ہوں کہ اگر وہ پوری نیک نیتی کے ساتھ خود کرکے تو اسلام سے بہتر کوئی قانون نہیں پائیں گے۔ لہذا میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ جس طرح میں نے اس دستور کو قبول کر لیا ہے۔ آؤ تم بھی اسے لے لو۔ اور فلاح پا جاؤ۔ کہ اس سے بڑھ کر کوئی مضابطہ حیات نہیں ہے۔ وَإِذْ كَرُمُوا مَا فِيهِ کا یہی مطلب ہے۔

وہ کون سے جرائم ہیں۔ جو اس دنیا میں نہیں ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے توفیر دیا ہے۔ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ کہ زنا کے قریب تک نہ جاؤ۔ مگر آج آپ کے سامنے کیا کیا واقعات پیش ہو رہے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ساتھ زنا بالجبر اور پھر انہیں ہلاک کر دینا ایک عام معمول بن چکا ہے جس سرزمین پر اس قسم کے واقعات پیش آتے ہوں۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کیسے نازل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا غضب ہی آسکتا ہے، ۹۱ء میں روس میں کیا ہوا۔ پورے دو کروڑ انسانوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ بڑے بڑے مالداروں کو ٹانگوں سے باندھ کر کئی کئی میل تک ٹھسٹا گیا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ وہ سرمایہ داروں کی طرفداری کرتے تھے یہ لوگ انسانیت کے دشمن تھے۔ جس معاشرے میں اس قسم کے ظلم ہوتے ہوں اور ان کے انسداد کا کوئی بندوبست نہ ہو۔ اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ یہ سب کچھ عنقریب دنیا کے سامنے آجائے گا۔

فرمایا جو کچھ اس کتاب میں موجود ہے اسے یاد کرو۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ کہ تم متقی بن جاؤ گے۔ اگر انسان کا عقیدہ صحیح ہو۔ قرآن پاک کو پڑھتا پڑھاتا ہے۔ ذریعہ تہذیب و انجاء دیتا ہے۔ تو متقیوں کی فہرست میں شامل ہو جائے گا۔ اور تقویٰ ایک ایسی چیز ہے۔

جس کو اختیار کرنے سے شریعت کے احکام کی تعمیل انسان کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک کو **هُدًى لِلْمُتَّقِينَ** کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔

بنی اسرائیل کی عہد شکنی

فرمایا ہے بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ سے پختہ عہد کرنے کے بعد **فَخَرَّ قَوْكَيْسُ مَوْتًا** 'بَعْدَ ذَلِكَ تَمَّ' اس کے بعد اس عہد سے پھر گئے۔ اسے پورا نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے پھر بھی تم پر مہربانی کی اور تمہیں موقع دینا رہا۔ کہ تم اپنے عہد کی پاسداری کر سؤ۔ حتیٰ کہ یہ آخری موقع بھی دیا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن پاک بھی نازل ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا آخری نبی علیہ السلام بھی آپکا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ ایفائے عہد کرتے ہوئے **وَامِنُوا بِمَا أُنْزِلَتْ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ** اس چیز پر ایمان لے آؤ جو میں نے نازل کی ہے۔ یعنی قرآن پاک جو کہ اس چیز کی تصدیق کرتا ہے۔ جو پہلے سے تمہارے پاس ہے۔ یعنی توراۃ اور دیگر کتب سماویہ۔ لہذا اب بھی موقع ہے کہ ایمان لے آؤ **وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ** اور اس کے ساتھ اولین کفر کرنے والے نہ بنو اگر ایسا کرو گے تو آنے والی نسلیں بھی تمہارے ہی نقش قدم پر چل کر رہ راست سے ہٹ چکی رہیں گی۔

فرمایا اس کے باوجود **فَكُونُوا فَضْلًا لِلَّهِ عَلَيْهِمْ ذَرَحَاتُ** اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی **لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَسِرِينَ** تو تم نقصان اٹھانے والوں میں ہوتے۔ فوراً ہلاک ہو جاتے اور تمہیں دربارہ موقع بھی نہ ملتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے۔ کہ وہ تمہیں بار بار موقع دے رہا ہے۔ کہ اب بھی سمجھ جاؤ اور راستہ پر آ جاؤ۔ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری کوتاہیوں اور غلطیوں کی طرف دیکھے تو فوراً ہلاک کر دے اور توبہ کا موقع بھی نہ مل سکے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٦٦﴾

ترجمہ: اور البتہ تحقیق تم جانتے ہو ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے ہفتے کے دن یاد کی گئی تھی۔ پس ہم نے ان کو کما کر ذیل بندہ بن جاؤ ﴿۶۵﴾ اور بنا دیا ہم نے اکی لوگوں کو عبرت ان کے لیے جو اس وقت موجود تھے۔ اور جو پیچھے آنے والے تھے۔ اور متقیوں کے لیے نصیحت بنا دیا ﴿۶۶﴾

یہود کا مقدس دن ہفتہ

گذشتہ آیات میں اُس عہد و پیمان کا ذکر ہوا جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے لیا تھا۔ کہ وہ تورات پر عمل پیرا ہوں گے۔ اب ان آیتوں میں خداوند تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا وہ واقعہ یاد دلایا ہے۔ جس میں ان نافرمانوں کو سزا دی گئی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ یعنی اے اسرائیلیو! تم ان لوگوں کو جانتے ہو۔ جنہوں نے ہفتے کے دن تعدی در زیادتی کی تھی ہفتے کے دن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تورات میں حکم نازل فرمایا تھا۔ کہ اس دن کوئی شخص کوئی کام نہ کرے۔ نہ تجارت کرے نہ زراعت کرے۔ نہ مزدوری کرے اور نہ کوئی دوسرا کام انجام دے حتیٰ کہ گھر میں کھانے پینے کی بھی ممانعت کر دی۔ اور حکم دیا کہ اس روز صرف عبادت کی جائے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہ کیا جائے۔ اور ساتھ تنبیہ کر دی۔ کہ جو کوئی ہفتے کے روز اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرے ہوئے۔ کوئی کاروبار کرے گا۔ وہ جک ہو جائے گا۔

جموں نصیحت

یہودیوں کے لیے ہفتہ اور نصاریٰ کے لیے اتوار کا دن مقدس ہے۔ مگر اہل اسلام کے لیے جمعہ کا دن مبارک ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی

امتوں کو برباد کیا۔ کہ وہ جمعہ کا دن نہ پاسکیں۔ بلکہ یہ فضیلت اللہ تعالیٰ نے آخری امت کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ کیونکہ جمعہ تمام الہم سے زیادہ فضیلت والا دن ہے۔ آپ نے فرمایا اَلْیَهُودُ عِنْدَ اٰیَتِیْهِمْ یَوْمَہُمْ سَکَنٌ وَ النَّصَارَیْ یَوْمَہُمْ سَکَنٌ وَ النَّصَارَیْ یَوْمَہُمْ سَکَنٌ۔ اس کے بعد یعنی التوار کا دن منتخب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی حد تک اختیار دے دیا تھا کہ وہ اپنے لیے بہتر دن منتخب کر لیں۔ اور انہوں نے یہ ایام پسند کیے۔ اور جمعہ کو منتخب نہ کیا۔ جو کہ مسلمانوں کے مقدس میں تھا۔ یہودیوں نے ہفتے کا دن اس لیے اختیار کیا کہ کائنات کی تخلیق ہفتہ کے روز شروع ہوئی تھی۔ اس لیے ان کے ہاں یہ سب سے متبرک دن سمجھا گیا۔

یہودی قانون
شکنی

جیسا کہ بیان ہو چکا۔ اللہ تعالیٰ نے ہفتے کا دن خالص عبادت کے لیے مقرر کیا تھا اور اس روز دیگر ہر قسم کے کام کی ممانعت کر دی تھی۔ مگر یہود نے اس حکم کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ اس خلاف ورزی کی تفصیل قرآن پاک میں کئی ایک مقامات پر آئی ہے۔ تاہم سورۃ اعراف میں ایک پورا رکوع اسی موضوع پر ہے۔ وہاں پر ہفتے کے روز تعدی کرنے والوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ کہ یہ لوگ بحیرہ قلزم کے کنارے واقع بستی میں بستے تھے۔ تورات کے مطابق اسی بستی کا نام ایلہ تھا۔ جسے آج کل عتہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ چونکہ یہ ساحلی لوگ تھے۔ ان کا پیشہ عام طور پر ماہی گیری تھا۔ تاہم انہیں ہفتہ کے علاوہ باقی چھ دنوں میں مچھلیاں پکڑنے کی عام اجازت تھی۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا استحقاق لینا چاہا۔ کہ یہ لوگ کس حد تک میرے حکم کی پابندی کرتے ہیں۔ لوگوں نے مشاہدہ کیا۔ کہ ہفتہ کے روز بہت زیادہ مچھلیاں نظر آتی تھیں۔ جب کہ باقی دنوں میں خال خال ہی پکڑی جاتی تھیں۔ تو انہوں نے زیادہ تعداد میں مچھلیاں حاصل کرنے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی۔ کہ سمندر کے کنارے حوض بنائے۔ جن میں ہفتے کے روز سمندر کا پانی چھوڑ دیتے۔ جب بہت سی مچھلیاں ان حوضوں میں جمع ہو جاتیں۔ تو پیچھے بند لگا دیتے تاکہ یہ مچھلیاں واپس سمندر میں نہ چلی جائیں۔ چنانچہ وہ لوگ ہفتہ کے روز واقعہ مچھلیوں کو نہ پکڑتے بلکہ انہیں حوض میں جمع کر کے اگلے روز یعنی التوار کو پکڑ لیتے۔ گویا اس طرح وہ حیلہ سازی سے احکام الہی کی خلاف ورزی کرتے جب ان سے کہا جاتا کہ بھائی! اللہ تعالیٰ نے ہفتے کے روز مچھلیاں پکڑنے سے منع کر

رکھا ہے۔ تم ایسا کیوں کرتے ہو۔ تو وہ کہتے کہ ہم ہفتے کے روز شکار نہیں کرتے بلکہ اگلے روز کرتے ہیں۔ لہذا یہ کوئی خلاف ورزی نہیں ہے۔

شاہ عبدالغفور اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ لوگ کافی عرصہ تک یہی حیلہ استعمال کرتے رہے۔ حتیٰ کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ آیا۔ تو انہوں نے لوگوں کو کھیتی سے منع کیا اور بتایا کہ اس روز شکار کرنا حرام ہے۔ یہ حیلہ سازی بہت بُری بات ہے۔ وہ کہنے لگے کہ یہ کام تو ہم اپنے اباؤ ^{بعد} سے کرتے چلے آئے ہیں۔ اس میں کوئی بُرائی کی بات نہیں ہے۔ کفار مکہ بھی یہی کہتے تھے کہ جس چیز کو تم شرک بتاتے ہو۔ یہ کام تو ہم خدا بعد نسل کرتے چلے آئے ہیں۔ اگر یہ واقعی بُرائی کا کام ہوتا تو اللہ تعالیٰ ضرور ہمیں روکنے کے لیے ہمارے ہاتھ بند کر دیتا۔ چونکہ آج تک ایسا نہیں ہوا۔ لہذا یہ کوئی بُرا کام نہیں۔

الغرض! حضرت داؤد علیہ السلام نے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام سنایا۔ انہیں نیکی کی تلقین کی اور بدائیوں سے منع کیا۔ انہوں نے اچھی طرح تنبیہ کی۔ کہ اگر تم اپنی بُری خصلتوں سے باز نہیں آؤ گے۔ تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آ جاؤ گے۔ آپ کی اس تبلیغ سے تقریباً بارہ ہزار لوگ نہ صرف خود اس غلط کام سے باز آ گئے۔ بلکہ انہوں نے دوسروں کو بھی روکنا شروع کر دیا۔ اس کے باوجود بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی۔ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے باز آنے کے لیے تیار نہ تھے۔ گویا ایک گروہ فاسقین کا تھا۔ قرآن کے مضامین میں صاعین کا ایک گروہ بھی پیدا ہو گیا۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ ایسا تھا۔ جو خود تو بُرائی کا ارتکاب نہ کرتا تھا۔ مگر دوسروں کو روکتا بھی نہ تھا۔ آگے قرآن پاک میں آتا ہے۔ کہ یہ گروہ بُرائی سے منع کرنے والوں کو کہتا تھا۔ کہ تم انہیں کیوں روکتے ہو۔ کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو۔ مگر صالحین کا گروہ انہیں جواب دیتا۔ **مَعَذِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّكَمْ وَلَعَلَّكُمْ يَتَّقُونَ** کہ بھائی! اللہ تعالیٰ کے سامنے معذرتیں کے لیے انہیں روکتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے پوچھ لیا۔ کہ تم نے انہیں بُرائی سے کیوں نہ روکا تو ہمارا کیا جواب ہو گا۔ قیامت کے روز نہ امت اٹھانی پڑے گی۔

اہل علم کے لیے ضروری ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان اور اس کی عطا کردہ شریعت

لوگوں تک پہنچائیں۔ اور تبلیغ کا حق ادا کریں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی تبلیغ سے کوئی شخص راہِ راست پر آجائے
 اسی واسطے بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے: **لَمَّا جَبَّ أَخْبَرْتُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْهُ**
كَرْهِيًّا أَخْلَاكَ وَأَوْجَبَ دَعَاكَ تَوَفَّرَ لَكَ أَنْ يَهْدِيَ اللَّهُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرَ لَكَ
مِنْ أَنْ — تَكُونَ لَكَ حُمْرَ النَّعَمِ اگر ایک آدمی نے بھی تمہاری وجہ سے ایمان
 قبول کر لیا۔ تو یہ تمہارے لیے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت سے بھی بہتر ہو گا۔ جہاد کا اصل مقصد
 جنگ و جدال نہیں بلکہ اس کا مقصد فتنہ و فساد کو مٹانا اور درندہ صفت لوگوں کو راستے سے ہٹانا ہے
 وقت گزرتا گیا۔ اور یہ قہینوں کو وہ اپنی اپنی بات پر اڑے رہے۔ آخر کار صالحین نے سوچا
 کہ ہم ان نافرمانوں کے ساتھ کب تک گزار کریں گے۔ کیوں نہ ہم ان سے الگ ہو جائیں۔
 کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے اور ہم بھی اس میں مبتلا ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے
 باقی دو گروہوں کا بائیکاٹ کر دیا اور قریب ہی اپنے علیحدہ علاقے میں مستقل ہو گئے۔ ان دونوں
 علاقوں کے درمیان دیوار یا کوئی اور آڑ بٹھتی جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔
 البتہ ایک دوسرے کی آوازیں سن سکتے تھے۔

انسان بندہ
بن گئے

ایک دن ایسا ہوا کہ صالحین کے گروہ نے دوسرے گروہ کے کسی آدمی کی آواز نہ سنی۔ اور
 نہ ہی ان کی کوئی حرکت وغیرہ محسوس کی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد جب انہوں نے جھانک کر دیکھا۔
 تو اللہ تعالیٰ کا حکم آچکا تھا **فَقُلْتُ لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ** پس ہم نے کہا کہ تم سب
 ذلیل بندہ بن جاؤ۔ چنانچہ صالحین نے دیکھا کہ اس گروہ کے بڑے بڑے بڑھے خنزیروں کی شکل میں اور
 نوجوان طبقہ بندروں کی صورت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ غلطیوں تبدیل ہو چکی ہیں بلکہ شعور باقی ہے۔ اپنے
 کیے پر نادم ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں کہ یہ ہمارے فلاں رشتہ دار
 ہیں۔ اور یہ فلاں رشتہ دار ہیں۔ اس مقام پر صرف بندروں کا ذکر ہے، ہم دوسرے مقام خنزیر بھی آتا
 ہے۔ **فَجَعَلَ مِنْهُمْ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ** کہتے ہیں کہ یہ لوگ اس شکل و صورت
 میں تین دن تک زندہ رہے۔ اس کے بعد ہلاک ہو گئے۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان بندہ اور خنزیر کیسے بن گئے۔ حالانکہ اس زمانے میں ذروں کی تیسویں کا بھی عام چھپا ہے۔ جو کہ متبے۔ کہ موجودہ انسان بندروں کی ترقی یافتہ نسل ہے پہلے سب بندہ ہی تھے۔ مگر ترقی کرتے کرتے انسان بن گئے۔ اس کا دعویٰ اس دلیل پر مبنی ہے۔ کہ بندہ کی شکل انسانی شکل کے مشابہ ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان بندہ یا خنزیر کی نسل نہیں ہے۔ اور نہ بندہ انسان کی نسل سے ہیں۔ بلکہ یہ ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ بندہ اور انسان پہلے ہی علیحدہ علیحدہ نسلیں تھیں اور آج بھی ویسی ہی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ معترضین ذروں کی تیسویں کو تسلیم کرنے میں تو کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے مگر جب قرآن پاک کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان انسانوں کو بندروں کی شکلوں میں تبدیل کر دیا۔ تو انہیں یقین نہیں آتا۔

بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا لَعَنَ اللَّهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى۔ یہود و نصاریٰ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو منع کیا تھا کہ تمہارے لیے چربی کا استعمال جائز نہیں۔ خواہ حلال جائز ہی کی ہو۔ مگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم میں اس طرح حید سازی کی کہ چربی خود تو نہیں کھاتے تھے۔ مگر اسے پگھلا کر فروخت کر دیتے تھے۔ اور اس کی قیمت کھا جاتے تھے۔ جب اہل سے کہا جاتا کہ تمہارے لیے چربی حرام ہے تم اسے کیوں کھاتے ہو۔ تو وہ کہتے کہ ہم چربی تو نہیں کھاتے۔ بلکہ اُسے فروخت کر دیتے ہیں۔ اسی لیے حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے لَا تَرْتَكِبُوا مَا ارْتَكَبَتِ الْيَهُودُ لَعْنَةُ اِيْمَانٍ وَالْوَالِدُ! اس چیز کا ارتکاب کرو۔ جس کا یہود کرتے تھے۔ فَتَسْتَحِلُّوا حَرَامَ اللَّهِ بِأَفْزَى الْحِيلِ کہ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو حیلے بہانے سے حلال کر لیتے تھے۔ کہیں تم بھی ان کی پیروی نہ کر کے مغضوب علیہ نہ بن جانا۔

یہود بعض برائیاں کھلے عام کرتے تھے مثلاً سود علی الاعلان کھاتے تھے اسی طرح دوسروں کا مال ناحق کھا جاتے تھے مگر ان برائیوں پر اللہ تعالیٰ نے اُن کی شکلیں مسخ نہیں کیں۔ ایسا کیا ہے۔ کہ اُن جہائم پر جن کا ارتکاب انہوں نے حیلے بہانے سے کیا۔ معلوم ہوا کہ ناجائز

حید سازی بست بڑی خصلت اور بست بڑا جرم ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں خنزیروں اور بندوں کی صورت میں تبدیل کر دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم حید سازی سے خدا تعالیٰ کے قانون کو نہ توڑنا یہ بڑا سخت جرم ہے ایسا کرنے والوں کی اگرچہ اب فیکس تو تبدیل نہیں ہوں گی۔ مگر ان کا باطن بالکل ایسا ہی ہو گا۔ اب کیا کچھ نہیں ہوتا۔ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے حید سازی کی جاتی ہے۔ سود اور رشوت کی مادیوں کی جاتی ہیں۔ اور اس کے جواز کا فتویٰ لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ حید سازی اور حرام ہے۔

جائز حید سازی

اگر نیت نیک ہو اور حید سازی حرام سے بچنے کے لیے کی جائے تو یہ جائز ہے۔ حضور علیہ السلام نے بعض امور میں خود حید سازی کا طریقہ بتلایا ہے۔ مثلاً حدیث شریف میں آتا ہے: کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہؓ سے بست اعلیٰ قسم کی کھجوریں لائے۔ آپ نے دریافت فرمایا اَکُلْتُمْ خَبْرَ هَكَذَا کیا خبر کی سب کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ حضور! بعض گھٹیا اور ناقص قسم کی کھجوریں بھی وہاں پائی جاتی ہیں۔ آپ کے مزید دریافت کرنے پر صحابہؓ نے بتایا کہ ہم ادنیٰ قسم کی دو صاع کھجوروں کے عوض اعلیٰ قسم کی ایک صاع کھجوریں لے لیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ذَلِکَ الرَّبْوُ یہ تو سود ہو گیا۔ ایک ہی جنس کا لین دین تو برابر ہی کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ ذکر کم و بیش۔ ایسا نہ کرو۔ یہ حرام ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم سب مل کر حل یہ ہے۔ کہ پہلے ادنیٰ قسم کی کھجوروں کو کسی دوسری جنس مثلاً گندم، جو کے عوض بیچ ڈالو یا ان کی نقد قیمت وصول کر لو۔ اور پھر اس سے اعلیٰ درجے کی کھجوریں خریدو۔ یہ حید جائز ہے۔

اس قسم کی مثالیں قرآن پاک میں بھی ملتی ہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کسی معمولی بات پر ناراض ہو گئے۔ تو قسم کھائی کہ تندرست ہو گیا۔ تو بیوی کو سولاٹھیاں یا کوڑے ماروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تمہاری بیوی نیک خاتون ہے۔ اس کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو۔ بلکہ اپنی قسم پوری کرنے کے لیے تو چھڑیوں کا ایک گٹھلے لو۔ اور ایک ہی دفعہ بیوی کو ضرب لگا دو یہ کافی ہے۔ گویا سو کڑوں کی سزا سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ حید سازی بتلائی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں بھی حیلہ سازی کا ذکر آتا ہے۔ کہ آپ نے بھائی بنیامین کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے مگر اس ملک کے قانون کے مطابق وہ انہیں نہیں روک سکتے تھے اُدھر اسرائیلی قانون کے مطابق جو شخص چوری کا ارتکاب کرے اُسے سال بھر غلامی کرنا پڑتی تھی۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائی کو روکنے کے لیے اسرائیلی قانون کا سہارا لیا۔ اور اس کے لیے حیلہ یہ بنایا کہ اس کے سامان سے چھانہ برآمد کر لیا۔ اسی حیلہ سازی کو قرآن پاک نے اس طرح بیان فرمایا: **كَذَلِكَ كَدْنَا لْيُوسُفَٰ هِمًّا** ہم نے یوسف علیہ السلام کو ایسا کرنے کی تدبیر بتائی تھی۔ البتہ ناجائز حیلہ سازی ہر حال حرام ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچنے کے لیے ذیلوریوی کے نام بہہ کر دیا۔ جب اس کے پاس سال پورا ہونے لگا۔ تو بیوی نے خاوند کے نام بہہ کر دیا۔ گویا نہ کسی کے ہاں زکوٰۃ پورا سال گزرے اور نہ اُس کی زکوٰۃ دینی پڑے۔ یہ حیلہ سازی ناجائز ہے اسی طرح کسی بھی فرعن، روزہ، نماز، جہاد وغیرہ سے بچنے کے لیے کوئی حیلہ سازی کرے گا تو مجرم بھٹے گا۔

تبیلی اشغال
کی توجیہ

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان، فرائض کو جانوروں کی شکل میں اخلاص طوع پر خنزیروں اور بندروں کی شکل میں کیوں تبدیل کیا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک قانون مقرر کیا تھا۔ کہ ہفتے کے دن سوائے عبادت کے کوئی کاروبار نہیں کریں گے۔ مگر انہوں نے حکم خداوندی کو توڑ کر مچھلی کا شکار شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا کے طور پر خنزیر اور بندر بنا دیا۔

محققین فرماتے ہیں کہ اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ان انسان اور جانور میں یہی فرق ہے کہ انسان قانون کی پابندی کرتا ہے۔ اور جانور اس سے مستثنیٰ ہے۔ اب اگر انسان بھی قانون کی خلاف ورزی شروع کرے تو ظاہر ہے کہ وہ انسانیت کے درجے سے گہر کر حیوانیت کے درجے پر آگیا۔ اور ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے انسان بندر سے زیادہ مشابہ ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے انہیں بندر کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ شکل و صورت کے علاوہ بندر جس اور شے میں

بھی انسان سے مشابہ ہوتا ہے۔ یہ بڑا نفال جانور ہے۔ جس طرح انسان کو کرتے ہوئے دیکھو اسی طرح کرنے لگتا ہے۔ تو گویا اللہ تعالیٰ نے اُن نافرمانوں کو جانوروں کی اس قسم میں تبدیل کیا جو اُن سے زیادہ مشابہ ہیں۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ جب اکیلا آدمی کسی ضبطے کی پابندی کرتا ہے۔ تو اسے اخلاق کا نام دیا جاتا ہے۔ اور جب کوئی دو افراد آپس میں کوئی معاملہ کرتے ہیں۔ تو اسے قانون کہا جاتا ہے۔ قانون کی ادنیٰ ترین صورت میاں بیوی کے درمیان نکاح کا ضبطہ ہے۔ جس کی پابندی دونوں فریقوں پر لازم ہے۔ اگر کوئی فریق اس قانون کو توڑے گا۔ تو وہ انسانیت کے درجے سے گر کر حیوانیت کے زمرے میں شامل ہو جائے گا۔ اس کی مزید وضاحت یوں سمجھیں کہ عقد نکاح کے قانون کے مطابق کوئی عورت ایک ہی مرد کے ساتھ مختص ہوتی ہے۔ یہ ایک معاملہ یا (AGREEMENT)

ہوتا ہے۔ جس کی پابندی ضروری ہے۔ اگر اسی ضبطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عورت ایک مخصوص مرد کی بجائے کسی دوسرے مرد کی خلوت میں بھی چلی جائے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ جانور کی سطح پر آجائے گی۔ جس پر کسی ایسے قانون کی پابندی لازم نہیں۔ اسی طرح مرد اگر اپنی منکوحہ عورت کی علاوہ کسی دوسرے عورت کی طرف نظر پڑے دیکھتا ہے۔ تو وہ قانون کی خلاف ورزی کر کے انسانیت کے درجے سے گر جائے گا۔

اب نکاح کی بھی شرائط ہیں۔ نکاح ایسے مرد اور عورت کے درمیان ہو سکتا ہے۔ جو آپس میں محرمات میں سے نہ ہوں۔ اگر محرم ہوں گے۔ تو نکاح جائز نہیں ہوگا۔ اگر ایسا کریں گے تو قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔ اہم شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ کہ ان تمام شرائط کے ساتھ جو کام ہوگا وہ درست ہوگا۔ ورنہ قانون شکنی کی زد میں آجائے گا۔ اسی طرح مباشرت کے لیے بھی بعض شرائط ہیں۔ کہ کوئی شخص اپنی عورت کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے۔ کسی دوسرے مرد کے ساتھ جائز نہیں۔ جب مرد اور عورت آپس میں ملیں گے۔ وہ بھی فطری طریقے سے۔ غیر فطری راستے سے استغناء بھی خلاف قانون ہے۔ جو کسی طرح جائز نہیں۔

قانون شکنی پر خنزیر اور بندر کی سزا اللہ تعالیٰ نے اس واسطے دی ہے۔ کہ یہ دونوں جانور اخلاقی طور پر دوسرے جانوروں کی نسبت زیادہ گرسے ہوئے ہیں۔ خنزیر ایک ایسا جانور ہے۔ کہ اس کی دہ کے ساتھ کئی کئی نزدیک وقت جھنجھکتے ہیں۔ یہ اس قسم کا بے غیرت جانور ہے۔

اور بندر کی ایک بہت بڑی خصلت یہ ہے۔ کہ یہ اپنے ہی ہم جنس بندر کے ساتھ بھی قضائے شہوت کرتا ہے۔ خنزیر قانون کی ایک شق کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ تو بندر دوسری شق کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ سور کا گوشت کھانے والے لوگ بے غیرت سمجھے جاتے ہیں۔ انگریز اور سکھ جو خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں۔ ان میں بے غیرتی کا وہ کثرت سے پایا جاتا ہے۔ الغرض جب یہود نے اللہ تعالیٰ کے قانون کو توڑ ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی شکلیں ان جانوروں میں تبدیل کر دیں۔ جو خود قانون شکن ہے۔

نماز کا ایک اہم قانون ہے۔ کہ مقتدی اہم سے آگے نہ بچے۔ رکوع، سجود، قنوت، تہنود، ہر مقام پر اہم کی اقتدار میں ہے۔ اور اگر کوئی نمازی اہم سے آگے نکلنے کی کوشش کرے گا تو اس کی مثال گدھے کے ساتھ دی گئی ہے۔ جو کہ بڑا بوقوت جانور ہے۔ گویا جو شخص نماز کے قانون کو توڑتا ہے۔ وہ گدھے کی مانند ہے۔ یہ تو اس کی باطنی صورت ہے۔ فرمایا اہم سے آگے نہ بچے میں ایسا نہ ہو یَجْعَلُ اللَّهُ صُورَتَهُ صُورَةَ حِمَارٍ کہ اللہ تعالیٰ اس کی شکل گدھے کی نہ بنائے یعنی کہیں ظاہری طور پر بھی قانون شکن گدھا ہی نہ بن جائے قانون شکنی پر سخت وعید آئی ہے۔

فرمایا ہے بنی اسرائیل! تم جانتے ہو ان لوگوں کو جنہوں نے ہفتے کے دن تعدی کی اور حکم بجا نہ لائے۔ بلکہ جلد سازی سے اس کی عمر مت کو توڑا۔ تو ہم نے انہیں کہا۔ کہ ذلیل و خوار بندر بن جاؤ۔ پھر جب وہ بندروں کی شکلوں میں تبدیل ہو گئے۔ تو باقی دنیا کے لیے وہ نشانِ عبرت بن گئے۔ فَجَعَلْنَاهَا نَكَارَةً لِّمَنْ يَذِّهَبُ وَمَا خَلَقْنَاهُ بِمَنْ نَعِيَ مَوْجُودِهِ اور آئندہ آنے والے لوگوں کے لیے عبرت کا نشان بنادیا۔ ان لوگوں کی رباوں پر اور تادیب کی کتابوں میں محفوظ ہو گیا۔ کہ فلاں قوم نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں خنزیر اور بندر

بنا دیا۔ یہ اس لیے کہ اس واقعہ کو یاد کر کے آئندہ نسلیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچیں۔
 فرمایا تبدیل اشکال محض عبرت کے لیے ہی نہیں بلکہ اسے وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ بھی
 بنا دیا۔ کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے لیے اس واقعہ میں نصیحت ہے۔ کہ اگر آئندہ بھی
 کسی نے اللہ تعالیٰ کے قانون کو توڑا۔ تو اس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ
 نے متقیوں کے لیے اس واقعہ کو نصیحت بنا دیا۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبُحُوا بَقَرَةً
قَالُوا اتَّخَذْنَا هَذَا قَالًا أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿١٦﴾

ترجمہ: اور جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے۔ بیشک اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ تو انہوں نے کہا۔ کیا تو بتاتا ہے ہم کو ٹھٹھاکا بوا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ پناہ بخدا۔ اس بات سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں ﴿۱۶﴾

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی جلد سازی کا تذکرہ بیان فرمایا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کو کس طرح توڑتے تھے۔ اس جرم کی پاداش میں ان کی شکلوں کو تبدیل کر دیا گیا۔ اور بالآخر وہ ہلاک ہو گئے۔ آیت زیر درس میں بنی اسرائیل کے ایک اور واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں اس قوم کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ مگر انہوں نے اس حکم کو مان چاہا۔ اور اس ضمن میں طرح طرح کے سوال کئے۔ گویا بال کی کھال اتار رہے ہیں۔ من حیث القوم یہ غرابی بھی بنی اسرائیل میں موجود تھی۔ اس آیت میں اسی بات کا ذکر کیا گیا ہے۔

در اصل گائے ذبح کرنے کا حکم ایک خاص مقصد کے تحت دیا گیا تھا۔ جس کا ذکر اگلے رکوع کی پہلی آیت میں ہے: **وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادْرَأَتْكُمْ فِيهَا** جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا۔ اور الزام ایک دوسرے کے سر متوپنے لگے **وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ** اور اللہ تعالیٰ ظاہر کرے والا ہے۔ جس کو تم چھپاتے ہو۔ قتل تو ہو گیا۔ مگر قاتل کو پتا نہیں چلتا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم ایک گائے ذبح کرو اور اس کا ایک ٹکڑا مقتول کے جسم پر مارو، تو وہ زندہ ہو کر خود بتا دے گا کہ اس کا قاتل کون ہے، چنانچہ قاتل کا پتہ چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ جس کا تذکرہ آیت زیر درس میں ہو رہا ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس مقصد کی خاطر گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا۔

اس کو تو بعد میں بیان کیا ہے۔ مگر اس حکم کا تذکرہ پہلے کر دیا گیا ہے۔ گویا واقعات کے تقدم و تاخر کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اس کے متعلق مغترین کرام بیان کرتے ہیں۔ کہ قرآن پاک کا اسلوب بیان یہ ہے۔ کہ جب چیز زیادہ ضروری ہوتی ہے اُسے پہلے بیان کیا جاتا ہے۔

اس واقعہ کے دو اجزاء ہیں۔ ایک اصل قتل جس میں مقتول کا حق ضائع ہوا۔ اور دوسرا جزو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے۔ کہ گائے ذبح کرو۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم بندوں کے حق پر مقدم ہے۔ اس لیے گائے ذبح کرنے کے واقعہ کو مقدم رکھا اور اصل واقعہ قتل کو مؤخر کر دیا گیا۔ قرآن پاک میں بعض دوسری مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے حق کو بندوں پر مقدم رکھا گیا ہے مثلاً وَتَقْضَىٰ رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّاَّ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اپنا حق پہلے بیان کیا اور والدین یعنی بندوں کا بعد میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح سورۃ لقمان میں آتا ہے: وَ اِنْ جَاهَدَكَ عَلَىٰ اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَذًا تُطَعُّهُمْ کہ ماں باپ اللہ تعالیٰ کے حقوق ضائع کرنا چاہیں یعنی تمہیں شرک پر آمادہ کریں۔ تو ان کی اطاعت مت کرو۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اپنے حق کو والدین کے حق پر مقدم رکھا اس واقعہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے ذبح گائے کو مقدم رکھا۔ کہ یہ اس کا اپنا حق ہے اور مقتول کے حق یعنی دیت یا قصاص وغیرہ کو مؤخر کر دیا۔

اس واقعہ سے حیات بعد الممات کا مسئلہ بھی حل ہوتا ہے: كَذٰلِكَ يُخَيِّ اللّٰهُ الْمَوْتٰی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر اُس مردہ کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ اور اس نے اپنے قاتل کی نشاندہی کر دی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے روز تمام مردوں کو دوبارہ زندہ کر دے گا۔ اور پھر حساب کتاب اور جزا و سزا کے تمام واقعات پیش آئیں گے۔

درج قتل

ملا علی قارئ دسویں صدی کے بڑے پائے کے محدث گندھارے میں آپ کا اصل وطن ہرات تھا۔ مگر مکہ میں آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے عربی میں مرقات کے نام سے مشکوٰۃ شریف کی مندرجہ شرح لکھی ہے۔ اپنی اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک بڑا دولت مند

شخص تھا جس کی ایک بیٹی غنی کسی نے اُسے نکاح کا پیغام بھیجھا مگر اس شخص نے قبول کیا جسکی وجہ سے اُسے قتل کر دیا گیا۔

عام طور پر مفسرین کرام وجہ قتل یہ بیان کرتے ہیں کہ عاقل نامی ایک دولت مند شخص تھا جو کہ لادہ تھا۔ اُس کے بھائی کے لڑکے اس کی جائیداد کے وارث تھے چنانچہ اس کے بھتیجے اس تاک میں تھے کہ یہ مرے تو اس کی جائیداد پر قبضہ کریں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ اُس شخص کے بھتیجے مناسب موقع کی تلاش میں ہے۔ آخر ایک دن اُسے کسی کام کے سامنے کہیں دوسری جگہ لے گئے اور دیرانے میں جا کر قتل کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے خود ہی دنیا پٹنا شروع کر دیا۔ کہ کسی نے اُن کے چچا کو قتل کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ قریبی بستی والوں پر قتل کا الزام لگایا۔ اور اُن سے دیت بھی طلب کی۔ مگر بستی والوں نے اس قتل میں موٹ ہونے کی نفی کی، اور کہا کہ ہم اس معاملہ میں بالکل بے گناہ ہیں؛ خَاذِرَةُ تَحْمِلُهَا میں یہی بات بیان کی گئی ہے کہ قتل کا الزام ایک دوسرے پر لگا ہے تھے۔

قانون قاتل

قانون قاتل یہ ہے کہ اگر کسی مقتول کے قاتل کا پتا نہ چلا ہو۔ تو وقوع قتل سے قریب ترین بستی کے لوگوں سے قتل کے متعلق دریافت کیا جائے گا۔ اگر وہ انکار کریں تو ان میں سے پہلی بستی کے قسم دلائی جائے گی۔ کہ نہ انہوں نے خود قتل کیا ہے۔ اور نہ وہ قاتل کو جانتے ہیں۔ ایسا کرنے سے وہ لوگ قتل کے الزام سے تو بری ہو جائیں گے۔ تاہم انہیں مقتول کے ورثہ کو دیت یعنی خون بہا دینا پڑے گا۔ اس واقعہ کے متعلق مفسرین کرام کی مختلف آراء ہیں بعض کہتے ہیں کہ قتل کے اس واقعہ کے وقت بنی اسرائیل میں قاتل کا قانون رائج تھا۔ جس کا ذکر توراہ میں بھی موجود ہے۔ اور یہ ہماری شریعت میں بھی موجود ہے۔ بنی اسرائیل کا قانون قاتل یہ تھا کہ قاتل نامعلوم ہونے کی صورت میں وقوع کی قریبی بستی سے معبرین کو نکالا جائے گا۔ اور وہ لوگ بھیا (کہائے) لیں جس نے نہ صل چلایا ہو۔ بلکہ درمیانی عمر کی ہو۔ اور بے عیب ہو۔ وہ لوگ بھیا کو پاس بسنے والی ندی پر لیجا کر

اس کی گردن توڑ دیں۔ اور پھر لاوی خاندان کے کاہن اس پر کچھ پڑھیں پڑھائیں۔ یہ لوگ اس ندی پر اپنے ہاتھ دھوئیں اور یوں کہیں کہ اے پروردگار ہم اس خون سے بری ہیں۔ نہ ہم کو ملے ہے کہ یہ خون کس نے کیا ہے۔ جب وہ ایسا کریں گے۔ تو اللہ تعالیٰ ان کو معاف کر دے گا۔

بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ جس وقت قتل کا یہ واقعہ پیش آیا اس وقت تک توراۃ نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔ چونکہ ان کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود نہیں تھا۔ اس لیے وہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نبی بھی تھے اور ظاہری طور پر حکومت بھی موسیٰ علیہ السلام کی تھی۔ چنانچہ آپ نے ان لوگوں کو فرمایا کہ بھائی! ایک گائے ذبح کرو تو تمہارے مسئلہ کا حل نکل آئے گا۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ اگر بنی اسرائیل اس وقت بیت دلیل نہ کرتے بلکہ کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے تو بات بن جاتی۔ مگر ان کی طبیعتوں میں تعمق تھا۔ وہ بال کی کھال اتارنا جانتے تھے۔ انہوں نے پیغمبر کا حکم ماننے کی بجائے طرح طرح کے سوالات کرنے شروع کر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جوں جوں سوال کرتے گئے۔ توں توں سختی بڑھتی گئی حتیٰ کہ بیچ نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ اور وہ مجبور ہو گئے۔ مگر اس حیلہ سازی میں کافی عرصہ گزر گیا۔ اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم پر عمل نہ کیا۔ اسی لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ تعمق اچھا نہیں ہر بات میں بال کی کھال نہ اتارو بلکہ حکم پر عمل کرو۔ جس قدر زیادہ باریکی میں جاؤ گے۔ اسی قدر سختی میں مبتلا ہو گے۔ اور آخر مجبور ہو جاؤ گے۔

قاتل کی تلاش کے لیے موسیٰ علیہ السلام نے ایک مبارک راستہ اختیار کیا۔ کہ اس طرح گائے ذبح کرو اور پھر اس کے جسم کا ایک ٹکڑا مقتول کی لاش پر دو تو وہ خود اپنے قاتل کا نام بتا دے گا۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی تھے۔ انہیں بذریعہ وحی بھی قاتل کی خبر مل سکتی تھی اور وہ ان کو بتا سکتے تھے۔ اس کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اسرائیلیوں کے دماغوں میں تعمق بھرا ہوا تھا۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام براہ راست قاتل کی نشاندہی کر دیتے تو قوم بگڑ جاتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی عادات کو خوب سمجھتے تھے۔ جب وہ توراۃ لے کر آئے تھے۔ تو اس وقت بھی اسرائیلیوں

نے سے اللہ تعالیٰ کی کتاب ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر مجبور ہو کر انہوں نے اسے تسلیم کیا۔ پھر انہوں نے عہد و پیمان کو بھی توڑا۔ اور جب ان پر جبر کیا گیا کہ وہ طور ان کے سروں پر معنق کر دیا گیا۔ پھر وہ راہِ راست پر آئے۔ اور تورات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔

۱۔ شاد ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس قسم کی بڑیاں بنی کے علم و عمل سے عیسائی کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں۔ اور بنی سے قطع تعلقی تین وجوہ سے ہوتی ہے۔ اول بے خبری یعنی اُمتی کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ بنی کا عمل اور عقیدہ کیا ہے۔

بنی سے
قطع تعلقی

ثانیاً یہ کہ طبیعتوں میں جاڑ پیدا ہو جائے۔ اُمتی اصل راستے سے بھٹک جائیں تو بھی بنی سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔

تیسری وجہ ماحول کا اثر ہے۔ جب لوگ معاشرے کے دیگر لوگوں سے متاثر ہو کر ان کا طریقہ اختیار کر لیں۔ تو پھر بھی اپنے بنی سے قطع تعلقی پیدا ہو جاتی ہے۔ بنی اسرائیل میں یہ قیمنوں بیماریاں موجود تھیں جن کی وجہ سے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بات بات میں تخرار کرتے تھے۔ حجت باذن اور حیلہ بازی کرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو ماننے کی کوشش کرتے تھے یہ بیماریاں آج امت محمدیہ میں بھی موجود ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا لَتَبْعَنَّ سُنَّ مَنْ كَانَ قَبْلُکُمْ یعنی میری امت! ایک وقت آئے گا۔ جب تم بھی پہلی قوموں کی طرح ہی ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ ان کمزوریوں سے محفوظ رکھے۔ اور بنی علیہ السلام کی صحیح اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔

ارشاد ہوتا ہے وَ اِذْ قَالَ مُوسٰی لِقَوْمِهٖ اِنَّ اللّٰهَ يَامُرُکُمْ اَنْ تَذَبْحُوْا بَقَرَةً ؕ اِس واقعہ کو یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ کائے ذبح کردہ بقرہ کا لفظ عربی زبان میں عام طور پر گائے پر بولا جاتا ہے۔ مگر یہ لفظ اسم جنس کے طور پر بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ یعنی نر اور مادہ یا گائے اور بیل دونوں پر استعمال ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جس جانور کو اللہ تعالیٰ نے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ گائے نہیں بلکہ بیل تھا۔ حجت موسیٰ علیہ السلام

نے قوم کو سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیکر تمہارے مسئلہ کا حل فرمایا ہے۔ تم حکم کے مطابق گائے یا بیل ذبح کر کے اس کے گوشت کا ٹکڑا مقتول کے جسم پر لگاؤ۔ تو یہ زندہ ہو کر خود اپنے قاتل کا نام بتائے گا۔ مگر وہ ظالم قوم تعمیل حکم کی بجائے کہنے لگی۔ اے موسیٰ علیہ السلام قَالُوا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کیا آپ ہمارے ساتھ ٹھٹھا (مذاق) کرتے ہیں۔ بھلا ایسا بھی کہی ہوا ہے۔ کہ مردہ دوبارہ زندہ ہو جائے اور اپنے قاتل کی نشاندہی کرے۔ یہ تو آپ ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہیں۔

هٰذَا مَصَدَرٌ مِّنْ مَّفْعُولٍ بِهٖ نَفْعٌ مِّنْ يَّرْبَعُ کہ کیا تو ہمیں ٹھٹھا کیا ہوا بتاتا ہے۔ دیکھو! حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا عظیم اور صاحب کتاب نبی ہے۔ مگر قوم اس قدر بھٹی ہوئی ہے کہ معجزہ کا انکار کر رہی ہے۔ حالانکہ تھوڑا عرصہ قبل ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر کئی ایک معجزات کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انیس فرعون کی غلامی سے نجات دلائی پھر یہ چالیس سال تک صحرائیں سرگرداں پھرتے رہے۔ من و سلوی کھاتے رہے۔ پانی کے لیے بارہ چٹے جاری ہوئے۔ اس کے باوجود مزاج فاسد ہیں۔ صاف کہہ دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس بات پر سخت غصہ آیا قَالَ فَرَغْتُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں۔ اس بات سے کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ اے نادانوں! تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں خدا تعالیٰ کا نبی ہو کر خدا تعالیٰ کا حکم سنا رہا ہوں۔ تم کہتے ہو کہ مخول کر رہا ہوں۔ یہ تو جاہلوں کا کام ہے۔ اسی لیے ہماری شریعت میں ٹھٹھا حرام ہے۔ سورۃ حجرت میں آتا ہے لَا يَخْصَرُ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ قَوْمٌ كَوْمٌ کوئی قوم کسی قوم سے ٹھٹھا نہ کرے۔ یہ منہسی مذاق جس سے دوسرے کی تحقیر ہوتی ہو۔ سمحت منع ہے۔ ہاں ایسا مذاق جس سے دوسرے کی تحقیر کا پہلو نہ نکلتا ہو جائز ہے۔ تاہم اس کی زیادتی بھی مناسب نہیں۔

صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ خوش طبعی بھی فرمایا کرتے تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہو کر خوش طبعی کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں میں خوش طبعی کرتا ہوں۔ مگر میری خوش طبعی اور عام لوگوں کی خوش طبعی میں بنیادی طور پر فرق ہے۔ اَنْ لَا اَقُولَ اِلَّا حَقًّا میں حق کے بغیر کچھ نہیں کہتا۔ خواہ خوش طبعی ہی ہو۔ حدیث شریف میں موجود ہے

خوش طبعی
جائز ہے

کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا: حضور! میں جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ مگر میرے پاس سواری نہیں ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: تمہیں اونٹ کے بچے پر سوار کر دیں گے۔ اُس نے سمجھا کہ شاید حضور اونٹ کا کوئی چھوٹا بچہ عنایت فرمائیں گے۔ کسے لگا مگر میں اس پر سواری کیا کروں گا۔ اُس کی تو حفاظت کرنی پڑے گی: نا معلوم کتنے سال بعد وہ بچہ سواری کے قابل ہو گا۔ اُس کی یہ بات سن کر حضور علیہ السلام مسکرائے اور فرمایا کہ تم نے اونٹ کے بچے کو بالکل چھوٹا بچہ کیوں سمجھ لیا۔ بڑا اونٹ بھی تو کسی اونٹ کا بچہ ہی ہوتا ہے۔ میں تمہیں اونٹ کا وہ بچہ دوں گا۔ جو سواری کے قابل ہو گا۔

اسی طرح ایک بڑھیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کے نبی! میرے لیے جنت کی دعا فرمائیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: اے اُم فداں! کوئی بڑھیا جنت میں داخل نہیں ہو سکتی۔ وہ بیچاری پریشان ہو گئی۔ جب وہ روتی ہوئی جانے لگی۔ تو حضور علیہ السلام نے اُسے واپس بولایا اور فرمایا کہ میں نے صحیح بات کی ہے۔ جنت میں بڑھی عورت نہیں جائیگی۔ بلکہ جو بھی جائے گی۔ جوانی کے عالم میں جائے گی۔ جنتی مرد اور عورتیں سب تیس پینتیس سال کے پیمے میں ہوں گے۔ جب وہ جنت میں جائیں گے۔

الغرض! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا پناہ بخدا کہ میں ٹھٹھا کر کے جاہل بن جاؤں یہ شانِ نبوت کے خلاف ہے۔ میں تو تمہیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا رہا ہوں۔ اس کا حکم سنا رہا ہوں اور تم اُسے ٹھٹھے پر محمول کر رہے ہو۔ اب وہ سمجھے کہ یہ تو سنجیدہ بات ہے۔ چنانچہ انہوں نے سوالات کرنے شروع کر دیے۔ جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

الْعَمَّ

البقرة

درس کی ویڈیو

آیت ۶۸ تا ۷۴

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ فافعلوا مَا تَأْمُرُونَ ﴿٦٨﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْثُهَا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوثُهَا تَكُرُّ النَّظِيرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَبَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُكَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيهَا قَالُوا النَّجِثُ بِالْحَقِّ فَذَبْحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾ وَلَاقَتْنِي نَفْسًا فَادْرَأْنِي فِيهَا وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٧٢﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا كَذَلِكَ يُخَيِّ اللَّهُ الْعَوَى وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٧٣﴾

ج

ترجمہ: بنی اسرائیل نے کہا کہ اپنے پروردگار سے دعا کر، ہمارے لیے بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہے (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ گائے زعفران (بڑھی) اور نہ بچیا (نوعمر) ہو۔ بلکہ اس کے درمیان میں ہو۔ پس کہ ڈالو جو تم کو حکم دیا جاتا ہے ﴿۶۸﴾ انہوں نے کہا کہ اپنے رب سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لیے بیان کرے کہ اس گائے کا رنگ کیا ہے (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ زرد رنگ کی گائے ہے۔ اس کا رنگ گہرا ہے۔ جو دیکھنے والوں کو خوش کرتا ہے ﴿۶۹﴾ ان لوگوں نے کہا کہ ہمارے لیے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لیے بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہے۔ بیشک وہ نے ہم پر

مشتبہ ہو گئی ہے۔ اور بیشک اگر اللہ نے چاہا تو ہم راہ پائیں گے ﴿۵۰﴾ (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ ایسی گائے ہے جو کہ نہ محنت کرنے والی ہو جو جوتی دچھاڑتی ہو زمین کو اور نہ سیراب کرتی ہو کھیتی کو۔ صحیح سلامت ہو۔ اور اس میں کوئی داغ نہ ہو۔ ان لوگوں نے کہا کہ اب آپ ٹھیک بات لائے ہیں۔ پس انہوں نے اس گائے کو ذبح کیا۔ اور وہ ایسا کرنے کے قریب نہیں تھے ﴿۵۱﴾ اور (اے بنی اسرائیل) اس واقعہ کو دھیان میں لاؤ۔ جب تم نے ایک جان کو قتل کر ڈالا۔ اس میں تم جھگڑا کرنے لگے۔ (ایک دوست کے سر پر دھرنے لگے) اللہ اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے، اس چیز کو جس کو تم چھپاتے تھے ﴿۵۲﴾ پس ہم نے کہا کہ مارو اس مردہ کو گلے کے بعض حصے کے ساتھ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرے گا۔ اور اسی طرح وہ تم کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے۔ تاکہ تم سمجھو اور غور و فکر کرو ﴿۵۳﴾

گزشتہ درس میں بنی اسرائیل کی حیل سازی کا ذکر ہو چکا ہے۔ انہوں نے احکام الہی حیلے بدلنے سے ملنے کی کوشش کی۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے تعمق اختیار کیا۔ اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ پھر جوں جوں سوالات کرتے گئے۔ توں توں ان کی سختیاں بڑھتی گئیں۔ آخر انہوں نے مجبور ہو کر گائے کو ذبح کیا۔ اللہ اس کا ایک ٹکڑا مردہ کے جسم کے ساتھ لگایا۔ تو وہ زندہ ہو گیا۔ پھر اس نے بتایا کہ میں اس کے بھتیجوں نے دولت پر قبضہ کرنے کے لیے قتل کیا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی مخفی بات کو ظاہر کر دیا۔

قاتل کا یہ بھی ارادہ تھا کہ وہ مقتول چچا کی لڑکی کو حاصل کرے گا۔ کیونکہ اس کی جائیداد کی وارث تو وہی تھی۔ نیز وہ اس لالچ میں تھا کہ مقتول کی لاش کو جس علاقے میں پھینکا گیا ہے۔ اس کی قریبی بستی کے لوگوں سے مقتول کی دیت بھی وصول کرے گا۔ یہ تمام باطل خیالات اس کے دل میں جاگزیں تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس چیز کو تم چھپاتے ہو۔ اس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے۔ چنانچہ ان کی ساری تدبیر ناکام ہو گئی۔ جب وہ قتل کا یہی وعدہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس لے کر گئے۔ تو انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ گائے ذبح کر دو۔ یہ سن کر پہلے تو وہ جھگڑ گئے۔ کہ اے موسیٰ علیہ السلام کیا آپ ہم سے نھا کرتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے بنی نے کہا کہ میں ٹھٹھا نہیں کرتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ جو تمہیں پسپا رہا ہوں بٹھٹھا کرنا تو

جاہوں ۱۰۰۰ ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اس بات کو بخیرہ گئی سے لیا۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر نبی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے حکم کی فوراً تعمیل کر دیتے اور بونی بھی گائے فسخ کر دیتے۔ تو ان کا مسئلہ حل ہو جاتا۔ مگر ان کے مزاج میں فساد چھپا ہوا تھا۔ وہ سیت و صل کرنے لگے۔ چنانچہ سوال جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور وہ خود ہی پابندیوں میں جکڑے گئے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے سر۔ت کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے جس قسم کی گائے کے فسخ کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تلاش میں ہائی وقت لگا دیا۔ تاہم اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی خاص مصلحت یہ تھی کہ اس طریقہ سے ایک غریب آدمی کی پرورش مقصود تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک پرہیزگار آدمی فوت ہو گیا اور اپنے پیچھے بیوہ، ایک بچہ اور ایک بچہ چھوڑ گیا۔ اس کے مدوہ اس کی کوئی جائیداد نہیں تھی۔ مرنے سے قبل اس شخص نے دعا کی تھی کہ مرنے پر میرے بچے کے سینے میں پتھر سے میں برکت ڈال دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا کو اثر قبولیت بخشا۔

اس بچے کی نیک نیتی اور سعادت مندی کے متعلق دو روایات آتی ہیں۔ امام ابن کثیرؒ نے یہ دو تفصیل کی ہے کہ ایک دفعہ اس کا باپ سویا ہوا تھا۔ نینے میں باہر سے کوئی بھڑا ہوا فرخت کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بچے کو اتنی ہزار میں بیس فرخت کرنے کی پیش کش کی۔ مگر بچے نے جواب دیا کہ میں اپنے باپ کی اجازت کے بغیر تم سے سو روپے نہیں کر سکتا۔ جب وہ اٹھ گیا تو بات کریں گے۔ تب جو نے کہا کہ باپ کو جتنا روپے تم قیمت پر بھی بیس ہزار بیچ دوں گا۔ مگر لڑکا باپ کے آرام میں مغل ہونے پر رضا مند نہ ہوا۔ تب کہہ سے کہ قیمت لینے پر بھی تیار ہوا۔ مگر لڑکے نے کہا کہ میں سنی ہزار کی بجائے ایک لاکھ روپیہ دینا پسند کروں گا۔ مگر باپ کو بے آرام نہیں کر دینا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس لڑکے کی نسی کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اُسے برکت سے نوازا۔

بعض دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرشتہ ان فی شعل میں سے بچے کے پاس

۱۔ تفسیر درمنثور ج ۱، تفسیر ابن کثیر ج ۱، ۲۔ تفسیر عزیزی فارسی ج ۱، ۳۔ تفسیر عزیزی فارسی ج ۱

۴۔ تفسیر ابن کثیر ج ۱، ۵۔ تفسیر عزیزی فارسی ج ۱، ۶۔ معالم التنزیل ج ۱

آیا اور پھر اس کی قیمت دریافت کی۔ اور پھر دو دینار کی پیش کش بھی کر دی۔ لڑکے نے کہا۔ کہ میں اپنی والدہ سے پوچھے بغیر قیمت طے نہیں کروں گا۔ جب والدہ سے دریافت کیا تو وہ اتنی قیمت پر رضا مند ہوئی۔ فرشتے نے زیادہ قیمت لہا دی۔ نہتے سے پھر کہا کہ میں اپنی والدہ سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ مگر والدہ نے پھر انکار کر دیا۔ غرض! فرشتہ قیمت بڑھا کر با۔ اور لڑکا بار بار والدہ سے مشورہ کرتا رہا۔ مگر والدہ کسی قیمت پر کبھی بچہ اسی پکھنے پر راضی نہ ہوئی۔ لہذا بچے نے یہاں کوہ طلق جواب دیدیا۔ اب فرشتے نے کہا۔ کہ تم بڑے سعادتمند بیٹے ہو جو اپنی والدہ کی رائے کے بغیر ایک قدم نہیں چلتے۔ تو سنو! میں بیکھڑت کو غریب نے کے لئے تمہارے پاس لوگ آئیں گے۔ جو تمہاری قیمت پر بچہ خریدو گت۔ کرنا یہ تمہیں والدہ کر دے گا۔

ادھر بنی اسرائیل کو ایسے بچہ کے کی تلاش ہوئی۔ جو اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ نشانیوں پر پورا اترے پھرتے پھرتے انہیں بنی بچہ امل گیا۔ جس میں بیان کردہ تمام صفات پائی جاتی تھیں۔ جب انہوں نے قیمت پٹانا چاہی۔ تو سودا بن سہا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آکر بتایا کہ غلو بہ بچہ قبول کیا ہے۔ مگر اس کا ملک مناسب قیمت پر بیچنے کو تیار نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس شخص کو بد بھیجا۔ اور بچہ نہ بیچنے کی وجہ دریافت کی۔ اس نے عرض کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ آپ ہی بتائیں۔ جب کہ میں اس کا ملک ہوں۔ کیا میں اپنی مرضی کے مطابق اس کو تصرف میں لانے کا مجاز نہیں ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ بیشک تجھے اپنی مرضی کے مطابق تصرف کی اجازت ہے۔ تو اس نے کہا کہ میں اس بچہ کے لئے اس کا ہم وزن سونا ہوں گا۔ اس سے کم قیمت پر مرضی نہیں ہوتا۔ بعض دوسری روایتوں میں قہر ہے کہ اس نے بچہ اس کی عہد قیمت سے دس گنا زیادہ قیمت حسب کی۔ تاہم ہم وزن سونے والی روایت زیادہ مشہور ہے چنانچہ بنی اسرائیل نے وہ بچہ اس کے وزن کے برابر سونا لئے کر حاصل کیا۔ اور پھر اسے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ذبح کیا۔

الغرض! بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں فوز و حور پکڑ لی تھی۔ یہ بچہ اسے کر

ذبح نہ کیا۔ بلکہ اس کے متعلق سوالات کرنے شروع کر دیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں سوال و جواب کی تفصیل بتائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ جب انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ تو کہنے لگے قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ اے موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں تفصیل سے بتائے کہ جس گائے کو ذبح کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ وہ کیسی ہو۔ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہے۔ إِنَّهَا بَقَرَةٌ تَذَرِضُ وَلَا يَكْرَهُ وہ گائے نہ تو بڑھئی ہے۔ اور نہ نو عمر بلکہ عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ دونوں عمروں کے درمیان ہو۔ فَاتَّقُوا مَا تَوَصَّوْنَ پس کر ڈالو جس چیز کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ بمعصیہ تھا کہ اب بھی زیادہ سوال و جواب کے چکر میں نہ پڑو۔ بلکہ درمیان عمر کی کوئی گائے نہ لے کر ذبح کر دو یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جس کی فوری تعمیل ہونی چاہیے۔ مگر وہ بد بخت قرعہ پیر بھی تعمیل حکم پر آمادہ نہ ہوئی۔ بلکہ دوسرا سوال کر دیا قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یعنی اے موسیٰ علیہ السلام ہمیں اپنے رب سے یہ پوچھ دیں يُبَيِّنْ لَنَا وہ ہمیں واضح طور پر بتائے مَا كُونَتْ کہ اس گائے کا رنگ کیا ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے پھر اللہ تعالیٰ سے دریافت کر کے انہیں بتایا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقْ كُونَهَا وہ گائے زرد رنگ کی صفت ہے۔ کہ وہ زرد بھی ہو اور گہرے بھی ہو یہ رنگوں کے مختلف نام ہیں۔ اور پھر آگے ان کی صفات ہیں۔ صَفِيَّةٌ زَنْجٌ کو بیض اور سرخ کو احمر کہتے ہیں تو اس گائے کے رنگ کے متعلق فرمایا کہ وہ گہرا زرد ہو۔ تَشْرُطُ الشَّظِيرَيْنِ جو لوگوں کو بدل بھلنے والا ہو۔ جسے دیکھ کر لوگ خوش ہو جائیں۔

بنی اسرائیل کے دل و دماغ میں تعمق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے قیصر سوال کر دیا۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ اے موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے دعا کریں يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ وہ ہمارے لیے بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہو۔ إِنَّ الْبَقَرَ تَشْبَهُ عَلَيْهِ بیشک گائے ہم پر مشابہہ ہو گئی ہے۔ یعنی ہم ابھی تک اس کی ٹھیک ٹھیک نشانیاں نہیں جان سکے۔ اگر ہمیں اس کی پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا جائے وَأَنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ تو بے شک اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہم راہ پا لیں گے۔ اس دفعہ انہوں نے اپنے مطالبہ کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ منسلک کیا کہ یہ آغوشِ رحمت تھی جو انہوں نے دریافت کی۔ عام قانون بھی ہے کہ وَرَه تَقُولُ لَكَ شَيْءٌ

إِنِّي فَعَلْتُ ذَلِكَ عِندَ (۲۳) إِنْ أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ : یعنی جب بھی کوئی مستقبل میں کام کرنا ہو۔ تو یوں نہ کہو کہ کل یہ پرسوں غمزدہ کر دوں گا۔ بلکہ اس فعل کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ حلق کر دو۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ایسا کر دوں گا۔ مومن کی یہی شان ہے۔ کہ وہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا و اس کی توفیق کا طلبکار ہوتا ہے۔

اس آخری سوال کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے کہا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ كَمَا أَمَرَ اللّٰهُ تَعَالٰی فَمَا هِيَ۔ اِنَّهَا بَقَرَةٌ زَاذَلُولٌ تُثِيرُ اُزْرَ صَاحِبِهَا ذَلُولٌ کے لفظی معنی ہے ہموار کی گئی۔ اس لیے جس اونٹنی کو سواری کے لیے ہموار کیا گیا ہو۔ اُسے نَاقَةٌ ذَلُولٌ کہتے ہیں۔ اور ہموار کرنے کے لیے محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو یہاں زَاذَلُولٌ کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس سے محنت نہ کرانی گئی ہو۔ کہ تَثِيرُ اُزْرَ صَاحِبِهَا کہ وہ زمین اکھاڑتی ہو۔ یعنی وہ کبھی ہل میں بھی نہ جوتی گئی ہو۔ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ اور اس نے کبھی کھیتی کو سیراب نہ کیا ہو۔ یعنی کبھی اس سے پانی کھینچنے کی محنت بھی نہ لی گئی ہو۔ بلکہ گائے ایسی ہونی چاہیے۔ مُسَلَّمَةٌ تَجْوِبُ كُلَّ مَسْأَلَةٍ بِمَحْمَدٍ بِرَاحَةٍ۔ لَا شَيْءَ فِيهَا اس میں کوئی عیب نہ ہو۔ بالکل بے داغ ہو۔

بنا خرمجور
ہو گئے

الغرض! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو ان کے تمام سوالات کے جوابات دے دیے۔ کہ مطلوبہ گائے کس عمر کی ہو۔ اس کا رنگ کیا ہونا چاہیے۔ اور پھر وہ ایسی ہونی چاہیے۔ جس سے محنت کا کوئی کام نہ لیا گیا ہو۔ بلکہ صحیح سلامت اور بے داغ ہونی چاہیے۔ اب ان کے لیے فرار کا کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ آخر مجبور ہو کر کہنے لگے۔ قَالُوا اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا لَهَا۔ موسیٰ علیہ السلام اب آپ نے ٹھیک بات کہی ہے۔ حالانکہ بات تو انہوں نے پہلے بھی درست ہی بتائی تھی۔ مگر ان کے چنے داغ خراب تھے۔ جو علمہ آمد میں لیت و لعل کر رہے تھے اب انہوں نے سوچا کہ تعمیل حکم کرنی ہی پڑے گی۔ فَذَجَّوْهَا تَوَطَّلِبُهَا كَانَتْ تَدَاشُّ كَرْنَهُ۔ اس کی بھاری قیمت ادا کرنے کے بعد اُسے ذبح کر ہی دیا۔ وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ حَقِيقَتِ يَوْمَئِذٍ۔ کہ وہ ایسا کرنے پر تیار نہیں تھے۔ مگر اب مجبور ہو گئے تھے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ بنی اسرائیل خود اپنے اُپر پابندیاں عائد کر کے مجبور ہو گئے۔ یہ فضول روایت اصول آج بھی جاری ہے۔ کہ جو شخص خود اپنے اُپر کوئی پابندی لگائے گا۔ وہ خود ہی تنگ ہو گا۔ اَجَلُ كَاشِحٌ

فضول رسومات میں کیا ہو رہا ہے۔ جوں جوں لوگ بڑی رکیں اپنے اُوپر عاید کئے ہیں۔ ان میں جڑے جاسے ہیں۔ نہ خدا راضی اور نہ اُس کا رسول راضی اور نہ خود ہی راضی رہ سکتے ہیں۔ یہی جہیز کی رقم کو لے لیں۔ اس نے کس حد تک طول پڑا ہے۔ فلاں چیز چاہتے۔ فلاں چیز چاہیے۔ لڑکے والے خود مطالبہ کر رہے ہیں۔ کبھی ٹیویشن کی فیس، کبھی یونیورسٹی فیس، کبھی کوٹھی اور کار کا مطالبہ۔ یہ سب کچھ کیسے۔ ایک ایک کر کے اشیاء میں اضافہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ ایک آدمی کی دسترس سے باہر ہو گیا۔ یہ سب اپنی ہی عام کردہ پابندیوں کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

واقو قتل

فَرِیَا وَادَّ قَتْلُكُمْ فَنَفَا ذَرَجْتُمْ فَاِذَا جَاءَ تَمْلِیْکَ اَیْکَ جَانِ کَوْتَلْ یَا بَہْرَ اَیْکَ دَسْتَرِ کَے سر ہوتے ہوئے۔ یہ ہے وہ اصل واقو جس کی وجہ سے بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ اور جسے بظاہر مقدم آنا چاہیے تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کے حکم کو پسے رکھا گیا اور اس واقو کو مؤخر کیا گیا۔ یہ واقو بھی میں نے عرض کر دیا ہے۔ کہ بنی اسرائیل کے ایک دو تئمنا عا میل نامی آدمی کو اس کے جہیزوں نے مال و دولت اور اس کی مینی کے حصول کی خاطر قتل کر دیا۔ اور پھر خود دیت وصول کرنے کے لیے قریبی بستی کے لوگوں پر قتل مت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ مزید وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو قادر مہر اور مخفی چیزوں کو جانتا ہے۔ اُس پروردگار نے ان کا زندقہ کر دیا اور یہ طریقہ بتایا کہ گائے ذبح کر کے اس کے جسم کا ایک حصہ مقتول کو لگا دو تو وہ زندہ ہو کر خود اپنے قاتل کو زندہ بنائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہی چیز کو یہاں بیان فرما رہے ہیں۔ کہ تم تو حقیقت کو چھپاتے تھے۔

وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ مگر اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے۔ اس چیز کو جو تم چھپاتے ہو۔

نذرانہ اور زمین کی۔ غلو دستر اور قتل و غارت ہر زمانے میں سموں رہا ہے اور آج بھی موجود ہے۔ مگر یہ چیز ہر خوشنمہ و ناز و ناس سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے کہ وہ کسی کو کس طرح معاف کرتا ہے۔ یہاں تو بڑی بڑی مصلحتوں کے محور مرہ جاتے ہیں۔ اور بڑی بڑی سمایف اٹھاتے ہیں مگر یہ آدمی ضرور جو بات سے کھیل رہا ہوتا ہے۔ یہ تو منشا کے یزدنی ہے کسی مخلوق کے بس کی بات نہیں۔

احیاء موتی
مطلوبہ موجود

الغرض! قاتل کا پتا چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا

فَقُلْتُ ضَرْبُكَ بِبَعْضِهَا یعنی کائے گوشت کا ایک حصہ اس مقتول کی لاش پر درود اسہ
قیمتہ ہو گا۔ کَذِبَتْ رُوحِي اللہ نے مولاؑ اس طریقے سے اللہ تعالیٰ اس مُرے کو زندہ کر دے گا۔
اور وہ تم میں بنائے گا کہ اُس کے قاتل کون ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور مردہ زندہ ہو گیا۔

اس چیز میں اختلاف پیدا ہوتا ہے کہ کائے کا کون سا حصہ تھا جو مردہ پیدا کیا۔ بعض روایات
میں دم آتا ہے۔ بعض میں قلب اور بعض میں زبان بیان کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ اللہ تعالیٰ کا حکم
تھا۔ اور معجزانہ طور پر ایسا ہوا تھا۔ کائے کے گوشت میں ایسی کوئی تاثیر نہیں تھی جس سے مردہ زندہ ہو
جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو قصاب ہزاروں جانور روز بروز ذبح کرتے ہیں۔ وہ تو قاتل مردے زندہ کر لیں۔
اصل میں وہ تو خدا تعالیٰ کا حکم تھا کہ اس طریقہ سے مردہ زندہ ہو کر اُن کی پوشیدہ بات کو ظاہر کر دے گا۔
ایمانے موتی بالکل اسی طرح کا معجزہ تھا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا فَقُلْتُ
اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ کہ اس پتھر پر اپنی لڑائی مار تو اس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے۔ لایا
ہم اسے پاس بکھی ہیں۔ اور پتھر بھی بے شمار ہیں۔ مگر پانی نہیں نکلتا۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے
پانی میں مارنے کا حکم دیا تو بارہ راستے بن گئے۔ یہ سب عجائبات تھیں۔

بہر حال کائے کا ایک جزو مُرے کو کائے کے معجزانہ طور پر زندہ کر دیتا ہے۔ اس سے
پوچھا کہ تمہیں کس نے قتل کیا تھا۔ تو اس نے صاف بتا دیا کہ اُس کے قاتل اُس کے بھتیجے ہیں اور
یہ روزِ جمعہ میں کھڑے لوگوں کو حقیقت کا علم ہو گیا۔ اس کے بعد وہ مردہ پھر اپنی مردہ حالت میں
تبدیل ہو گیا۔ اس واقعہ میں یہ سبق پیدا ہوتا ہے کہ جو ملک ملک اپنے حق سے ایک مردہ کو زندہ کر
سکتا ہے۔ وہ قیامت کے روز تمام مردوں کو قبروں سے زندہ نکالتے پر مبنی قدر ہے اور اس قسم
کے وقعت کو مشاہدہ اس لیے کر دیا جاتا ہے۔ وَلْيُرِيكُمْ آيَاتِهِ کہ اللہ تعالیٰ تمہیں
اپنی نشانیاں دکھائے جس سے تم عبرت حاصل کرو۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ تاکہ تم غور و فکر کر سکو۔
اللہ تعالیٰ کی ان آیات کے پیش نظر اپنے اعانت کی راہ متعین کر سکو۔

قاتلِ شہید
سے عتاب

مجتہدوں نے چچا کو اس لیے قتل کیا تھا کہ وہ اس کی وراثت میں اس بھال حاصل کرنا چاہتے

تھے مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ قاتل نہ صرف وراثت سے محروم ہو گئے، بلکہ انہیں مقتول کی دیت ادا کرنا پڑی۔

ہماری شریعت میں بھی قاتل وراثت سے محروم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے
 الْقَاتِلُ لَا يَرِثُ قَاتِلُ وَرَثَتِ كَاخْتَارَ نَفْسِ بَوَاتِ اُس نے جرم ہی ایسا بڑا کیا ہے کہ وہ اپنے
 جائز حصے سے بھی محروم ہو گیا۔ اہم مالک کا مسک یہ ہے کہ اگر قاتل عداوت ہو تو قاتل مقتول کی وراثت
 سے محروم ہو گا۔ اور اگر غلطاً قتل ہوا ہے تو وراثت کا حقدار ہے۔ باقی ائمہ اس بات کے قائل
 ہیں کہ قاتل خواہ عمدہ ہو یا غلطی سے۔ ہر حالت میں قاتل اپنے مقتول وراثت کی وراثت سے محروم ہو
 جائے گا۔ اسی طرح مسلمان غیر مسلم کا اور غیر مسلم مسلمان کا وراثت نہیں ہو سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا
 فرمان ہے۔ لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ مَثَلًا اِذَا مَرِئَانِي ہو
 جائے۔ تو وہ مسلمان باپ کی وراثت سے محروم ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر باپ مذہب تبدیل کر
 لے۔ تو وہ بیٹے کی وراثت سے حصہ نہیں پاسکے گا۔

البقرة
(آیت ۷۴)

الم
درس سی و دو

ثُمَّ قَتَّ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ
قَسْوَةً وَإِنْ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ وَإِنْ مِنْهَا
لَمَا يَشْقَقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنْ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ
خَشْيَةِ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۷۴﴾

ترجمہ: پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ پس وہ پتھروں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے
بھی زیادہ سخت ہیں اور بیشک بعض پتھروں میں سے ابتر وہ ہیں کہ جن سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں اور خشک
ان پتھروں میں سے بعض ایسے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں ان سے پانی نکلتا ہے اور بیشک ان پتھروں میں
سے بعض ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے نیچے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان
کاموں سے غافل نہیں ہے جو تم کرتے ہو ﴿۷۴﴾

بنی اسرائیل کی بہت سی برائیوں کا ذکر گذشتہ آیات میں آچکا ہے۔ اور بعض کا ذکر آگے
بھی آئے گا۔ آیت زیر درس میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام برائیوں کا نتیجہ بیان فرمایا ہے بنی اسرائیل
کی طرف سے کتمان حق، بکھڑے کی پرستش، قانون کی خلاف ورزی، قتل، انبیاء علیہم السلام وغیرہ
یہ تمام ایسی بیماریاں تھیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کے دل سخت ہو گئے۔ سورۃ مائدہ میں
بنی اسرائیل کی قیامت قبلی کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ
لَعَنَهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً يُعْنِي بَنِي إِسْرَءِيلَ كَ عَصِدٍ وَبَيَانِ تَوَلُّوْنَ كِي وَجْهٍ
سے ہم نے ان پر لعنت بھیجی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ لوگ اس
قسم کے کام کرتے تھے کہ "يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ" اللہ تعالیٰ کے کلام کو
اپنے مقام سے تبدیل کر دیتے۔ گویا آسمانی کتاب میں تحریف کے مرتکب ہوتے تھے۔ جس کی وجہ
سے قیامت قبلی جیسی لعنت میں گرفتار ہوئے۔ بلکہ ان کے قدم بھی اٹک گئے۔ ان میں ضعف و ہمت
کی بیماری بھی پیدا ہوئی۔ جس کی وجہ سے وہ جہاد کے لیے بھی آمادہ نہ ہوئے۔ بلکہ کہنے لگے کہ

موسیٰ علیہ السلام! آپ اور آپ کا خدا جا کر جہاد کریں۔ ہم تو یہیں بیٹھیں گے۔

ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے: حضور علیہ السلام کا ارشاد فرمایا ہے لَا تُكْثِرُ لَكَ ذِكْرُ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے علاوہ زیادہ کا ذکر نہ کرو۔ کیونکہ فخر و دل بڑھانے کی وجہ سے انسان میں قنات قلبی پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے بعید ترین وہ شخص ہے جس کا دل سخت ہو۔ خدا تعالیٰ سے دوری مسافت کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے درمیان پرست نہ جائیں۔ انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہو جائے۔ اسی لیے فرمایا کہ ذکر الہی کے علاوہ کثرت کا دم سے اجتناب کرو۔

مناجمہ اور ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا، حضور! میں اپنے دل میں سختی محسوس کرتا ہوں۔ اس کا علاج بتائیے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: قسیم کے سر پر ہاتھ رکھو۔ غریبوں اور مسکینوں کی پرورش کرو۔ انسانوں کے ساتھ بھروسہ سے پیش آؤ۔ اللہ تعالیٰ متعارف قنات قلبی دور فرمائیں گے۔ ایک دوسری حدیث میں حضور علیہ السلام کا ارشاد فرمایا ہے رِقَّةٌ قَلْبِيَّيْنِ چار چیزوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور جمود العین یعنی اس کی آنکھیں منجمد ہو کر رہ جائیں۔ اُن سے خشیت الہی کی وجہ سے کبھی آنسو نہ نکلیں۔ ثانیاً: قنات القلب یعنی اس کا دل سخت ہو جائے جو نرم نہ ہو۔ ثانیاً: طول الامل لمی مید۔ رابعاً: حرص علی الدنیا یعنی اس کے دل میں دنیا کی محبت سے زیادہ ہو۔

پتھروں کا زیادہ سخت دل
بنی اسرائیل اس قنات قلبی کا شکار ہو چکے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مایہ نابل کے فرمایا: ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ حالانکہ تم خدا تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں یعنی اس کی طرف سے معجزات دیکھ چکے تھے اس کے باوجود تمہارے دلوں میں نرمی پیدا نہ ہوئی۔ بکثرت تو یہیے ہو گئے، جیسے پتھر ہوتے ہیں۔
فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدَّ قَسْوَةً بکثرت پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے لفظ آف در معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے۔ اگر اس کا معنی بن۔ رکھ لیا جائے تو مطلب ہو گا: تمہارے دل پتھروں

الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ فَهُوَ سَاجِدٌ یعنی جن حالتوں میں اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ قرب حاصل ہوتا ہے۔ ان میں حالت سجدہ سب سے اولیٰ ہے، اس حالت میں جس قدر غجز و انخاری ہوگی اسی قدر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اتصال سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی اتصال کی بدولت انسان کی حالت درست رہ سکتی ہے۔

عالم کلام یہ کہ جو شخص پتھروں جیسے اوصاف کا حامل بھی نہیں ہے۔ یعنی نہ تو اس سے مخلوق کو عام فائدہ پہنچتا ہے۔ نہ وہ شخص محدود پیمانہ پر مفید ہے۔ اور نہ ہی اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اتصال ہے۔ تو پھر ایسا انسان بلاشبہ بد بخت لاشعری ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ انہیں قدرتِ خداوندی کی نشانیاں نظر آتی ہیں۔ بلکہ جو ان کے ساتھ چلنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ بھی اس نعمت کے محروم نہیں ہتے اور پھر ان کی وجہ سے بڑی بڑی باتوں کا ظہور ہوتا ہے۔

ہماری بعض ایسے اکابر قریبی زمانہ میں ہوئے ہیں جو یقیناً مقررینِ الہی میں سے ہیں سید احمد شہید بریلوی سادات کے خاندان میں سے حسنی تھے۔ دطن مالوت کے بریلی تھا۔ دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بیعت کی اور علم حاصل کیا۔ شاہ صاحب نے مزید تربیت کے لیے اپنے برادر خورد شاہ عبدالقادر کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے قین سال تک سید احمد شہید بریلوی کی تربیت کی۔ یہ وہی شاہ عبدالقادر ہیں جنہوں نے سب سے پہلے قرآن پاک کا اردو ترجمہ کیا۔ صاحب کشف بزرگ تھے ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے۔

شاہ عبدالعزیز کی عمیق نظروں نے جانچ لیا کہ سید احمد شہید بریلوی عظیم صلاحیت کے مالک ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے ہی لوگوں سے بہت اہم کام لے لیتا ہے۔ چنانچہ قین سال تربیت مکمل کر لینے کے بعد شاہ صاحب نے سید احمد شہید کو لونگ جا کر فوجی تربیت حاصل کرنے کا حکم دیا۔ لہذا آپ نے چھ سال تک فوجی تربیت بھی حاصل کی۔ گویا سید احمد شہید شاہ عبدالعزیز کے تربیت یافتہ اور ان کے مجاز تھے۔

جنس اکابر
دین

خود شاہ عبدالعزیز برصغیر میں اپنے باپ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بعد بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ آپ محدث اور مفسر قرآن تھے۔ آپ کے داماد مولانا عبدالحی بھی بڑے پائے

کے بزرگ تھے۔ آپ سید صاحب سے زیادہ عالم تھے۔

شاہ اسماعیل شہید، شاہ عبدالغنی کے بیٹے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے پوتے تھے قرآن پاک کے علاوہ تفسیر و تراجم حدیث زبانِ یاد تھیں۔ صبح کی نماز پڑھ کر قرآن پاک کی تلاوت شروع کرتے اور سورج نکلنے تک ختم کر لیتے۔ ادھر عصر کے بعد شروع کرتے تو مغرب کی اذان کے ساتھ ختم کر لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قدر انعام فرمایا تھا۔

ایک مرتبہ آپ کے ہاتھ میں شیخ عبدالحق محدث کا وہ رسالہ آگیا جس میں نماز کی ترکیب لکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس طریقے کے مطابق ہی نماز پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ رات کے وقت دو رکعت ایسی نماز پڑھنے کی توفیق میسر آجائے جس کے دوران کوئی دوسرا نہ آئے، ایسی کوشش میں رات بھر میں تو رکعت نماز ادا کی، مگر مقصد حاصل نہ ہوا اس بات کا ذکر آپ نے سید احمد شہید بریلوی سے کیا کہ شیخ عبدالحق محدث کے رسالہ میں مذکور طریقے سے نماز پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ محض کتاب میں طریقہ پڑھ کر مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ آؤ میرے ساتھ دو رکعت نماز ادا کر لو۔ چنانچہ جب سید صاحب کی اقدار میں نماز پڑھی تو اللہ تعالیٰ نے حضور قلب عطا کیا، اور مطلوبہ کیفیت حاصل ہو گئی، اس واقعہ کا ذکر آپ نے حضرت مولانا عبدالحق کے پاس بھی کیا کہ حضور قلب کے لیے انہوں نے کتنی کوشش کی مگر یہ چیز سید احمد شہید کے ساتھ نماز پڑھنے سے حاصل ہوئی، یہ سن کر مولانا عبدالحق کو بھی اشتیاق پیدا ہوا۔ سید صاحب سے عرض کیا تو انہوں نے انہیں بھی اپنے پیچھے نماز پڑھائی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی وہی کیفیت عطا کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں صاحبان یعنی شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحق ہمیشہ سید احمد بریلوی کے ہمراہ رہے۔ شاہ اسماعیل کو تو اللہ تعالیٰ نے شہادت کا مرتبہ عطا کیا، مگر مولانا عبدالحق کی سسر کے دوران سسر کے علاوہ بیچ تار میں جا کر بیمار ہوئے اور وہیں پر داعی اجل کو بلاتا ہلا کوٹ کی تاریکی جناب میں شاہ اسماعیل شہید فوج کے ساتھ آئے تھے اور مولانا عبدالحق سید احمد شہید کے لشکر میں عمدہ قضا پر فائز تھے، اس اسلامی فوج کے امیر سید احمد شہید بریلوی تھے، سرمد میں ان کی قائم کردہ اسلامی حکومت تین سال تک چلی، اس کے بعد مسلمانوں کی نالافتی کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکی، اسی دوران مولانا عبدالحق بیمار ہوئے جب ان کی زندگی کی امید باقی نہ رہی تو سید صاحب

نے پوچھا کوئی خواہش ہو تو بتائیں کہنے لگے خواہش تو شہادت کی موت کی تھی جو پوری نہیں ہو سکی۔ اب چاہتا ہوں کہ اس آخری وقت میں آپ کا قدم میرے سینے پر ہو۔ یہ صدمہ جس نے ان کی خواہش کو پورا کیا۔ اور آپ نے اس کے بعد اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

مسلمانوں کی ناکامی کی بڑی وجہ ان کی اپنی غلامی ہے۔ یہ غلامی ابن عسکری کے دور کے بعد ساتویں صدی میں شروع ہوئی۔ اسی وجہ سے سلطنتیں تباہ ہوئیں۔ اور سلطان مدبر زوال ہی بنے پھر یہ اپنے قدموں پر تہہ نہ گئے۔

تو بہر حال میں عرض کر رہا تھا کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا اتصال نصیب ہوتا ہے۔ حقیقت معنوں میں وہی کامیاب ہوتے ہیں۔ اور جن لوگوں میں پتھروں والی تین صفحات جی نہیں پائی جاتی وہ بہشت اور شہنشاہی ہوتے ہیں۔ ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں۔ بلکہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت بنی اسرائیل کی مثال واضح ہے۔ یہ پتھروں سے بھی گئے گئے گذرے ہیں۔ ان کا وجود غیر معنی جبر بن گیا۔ انسان کے لیے مفہم ہے گریہ سارے اسرائیلیوں کی غریبوں کا ذکر ہے۔

فَرِيَا وَمَا اللَّهُ بِغَفُورٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ يَا دُرُكْهُو اللّٰهُ تَعَالٰی تَمَاسَّی كَسٰی فَعَلْ غَافِلٌ نِّیْسَ هَی۔ تمہاری تمام برتوتیں اس کی نگاہ میں ہیں۔ ایک وقت آنے والا ہے۔ جب اللہ جل شانہ تمہارے اعمال کا انجام تمہارے سامنے رکھ دے گا۔ یہ سارا بنی اسرائیل کو خطا ہے کہ اب بھی سمجھ جاؤ اور راہِ راست پر آ جاؤ۔ تو اچھے انجام کو پہنچ جاؤ گے۔ ورنہ تم اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔

فَتَصْمُمُونَ ۚ كَانُوا مِنْكُمْ وَكَانَ فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَسْمَعُونَ
 كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يَحْزَنُونَ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ
 ④۵ وَرَدُّ لَفْظِ الَّذِينَ آمَنُوا قَائِلًا آمَنَّا وَذَٰ خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَى
 بَعْضٍ قَائِلًا أَخَذْتُوهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ
 عِنْدَ رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ④۶ أَوْ لَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ
 مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ④۷ وَمِنْهُمْ أَقْسَاؤُنَ لَا يَعْلَمُونَ
 الْكِتَابَ إِلَّا أَمْاٰلِي وَذٰلِكَ هُمْ لَا يُظُنُّونَ ④۸ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُمُونَ
 الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيُشَارَكُوا
 بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ
 وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ ④۹

ترجمہ: (اے اہل ایمان) کیا تم توقع رکھتے ہو کہ (اہل کتاب) ایمان لائیں گے تمہاری

بات پر۔ حالانکہ ان میں سے ایک گروہ ایسا تھا جو اللہ کا کلام سننے سے بچتا تھا۔ پھر اس کو

جہل ڈالتے تھے۔ بعد اس کے کہ انہوں نے اسے سمجھ لیا تھا۔ اور وہ جانتے بھی یہی

④۵ اور جب وہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم بھی ایمان لائے۔ اور جب

انہیں ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض، بعض کے پاس، تو کہتے ہیں، کیا تم ان (مکلفین)

کے پاس ایسی چیزیں بیان کرتے ہو، جو اللہ نے تم پر ظاہر کی ہیں، تاکہ وہ ان کے ذریعے

تمہارے ساتھ تمہارے رب کے ہاں تجرٹا کریں۔ کیا تم سمجھتے نہیں؟ ④۶ کیا یہ

نہیں اس بات کو نہیں جانتے کہ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جس چیز کو یہ چھپاتے ہیں

اور جس کو ظاہر کرتے ہیں ④۷ اور ان میں سے بعض ان پر رحم ہیں، جو نہیں جانتے

کتاب کو سزا دینے کی سزا نہیں۔ اور ان میں سے وہ مکرمان کرتے ④۸ پس ہلاکت

آنکھیں سیاد ہوں گی۔ قدرِ میانہ اور رنگِ گندمی ہو گا۔ مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لے آئے۔ اور آپ نے اپنی نبوت کا اعلان فرمادیا۔ تو یودیوں نے قرآن میں آپ کے بیان کردہ عیسے کو بدل دیا۔ اور لوگوں سے یہ کہنے لگے۔ کہ نبی آخر الزمان (علیہ السلام) جسے قدوائے ہوں گے آپ کی آنکھیں نیلی ہوں گی۔ اور بالِ سیدھے ہوں گے۔ اس طرح انہوں نے لوگوں کو آپ پر ایمان لانے سے روکنے کی کوشش کی۔

یودی بڑھو

الغرض! اہل ایمان کو گھایا جا رہا ہے۔ کہ یہود سے یہ توقع نہ رکھو۔ کہ تمہاری تبلیغ سے یہ لوگ ایمان لے آئیں گے۔ یہ تو سخت قسم کے ہٹ دھرم لوگ ہیں۔ جانتے بوجھتے ہوئے بھی یہ راہِ راست سے دور ہی رہیں گے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت یہودیوں کے دس بڑے عالم موجود ہیں۔ اگر یہ دس آدمی ایمان قبول کر لیں تو کوئی بھی یہودی باقی نہیں رہے گا۔ سب ایمان لے آئیں گے۔ مگر یہ عالم اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہے۔ ان میں سے صرف ایک آدمی نے ایمان قبول کیا۔ باقی سب اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ نصاریٰ کا بھی یہی حال ہے۔ حضور علیہ السلام کو چودہ سو سال گزر چکے ہیں۔ مگر انہوں نے آج تک انہیں تسلیم نہیں کیا۔ آپ ارشاد ہے کہ نصاریٰ اسی طرح دنیا میں موجود رہیں گے۔ حتیٰ کہ جب مسیح علیہ السلام قرب قیامت میں نازل ہوں تو اس وقت ان کی سرکوبی ہوگی۔ اور پھر یہ دنیا سے ختم ہو جائیں گے۔

یہود کے ساتھ
موافقت اور
ان کی مخالفت

ابتداءً زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے ساتھ موافقت کرنے کا حکم دیا۔ تاکہ انہیں ترغیب ہو۔ اور یہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں اس قسم کے احکام ملتے ہیں آگے دیکھیں بارے میں قرآن پاک میں بھی آئے گا۔ کہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم یہودیوں کی ترغیب کے لیے ہی تھا۔ خود حضور علیہ السلام نے سر کے بالوں کے بنانے میں اہل کتاب کا طریقہ اختیار کیا۔ اس زمانے میں مسلمان سر میں ٹانگ نکالا کرتے تھے۔ مگر یہود ٹانگ نہیں نکالتے تھے۔ بلکہ ویسے ہی بالوں کو پیچھے کی طرف ڈال دیتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے موافقت کی خاطر ان کا طریقہ اپنایا۔ لہذا آپ ٹانگ نہیں نکالا کرتے تھے۔ مگر

یہودی سخت متعصب تھے۔ ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ لہذا بعد میں آپ نے ہائیک نہان شروع کر دیا۔ آپ نے دیکھ لیا کہ یہ لوگ کسی طرح راہِ راست پر آنے کے لیے تیار نہیں۔

اس کے بعد آپ نے دوسرے طریقے اختیار فرمایا۔ اور الشرائع میں اہل کتاب کی مخالفت شروع کر دی۔ چنانچہ ایسے کسی ایک مسئلہ ہیں۔ جن میں اہل کتاب خصوصاً یہودیوں کی مخالفت کا حکم ہے۔ یہود محرم الخام کی دسویں تاریخ کا روزہ رکھتے تھے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ تم ان کی مخالفت کرو اور دسویں تاریخ کے ساتھ نویں تاریخ کا روزہ بھی رکھا کرو۔ اسی طرح یہود حیض والی عورت کو گھر میں نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ علیحدہ کر دیتے تھے۔ آپ نے فرمایا تم عورت کو ہر حالت میں اپنے گھر میں رکھو۔ فرمایا حیض والی عورت گھر کے سامنے کام انجام دے سکتی ہے۔ موانے اس کے کہ اس کے ساتھ مباشرت جائز نہیں۔ میاں بیوی اکٹھے لیٹ سکتے ہیں ایک برتن میں کھانا کھا سکتے ہیں تاہم مباشرت نہیں کر سکتے۔

اہل کتاب بالوں کو زخما جائز سمجھتے تھے حضور علیہ السلام نے اس کام کی اجازت مرحمت فرمائی۔ یہ ان سے مخالفت کی بنا پر تھا۔ اسی طرح یہود تہ بند نہیں باندھتے تھے۔ آپ نے شعور پہنے اور تہ بند باندھنے کا حکم دیا مقصد یہ کہ شروع شروع میں مدینہ کے یہودیوں کی خاطر ان کی موافقت میں بعض امور انجام دیے۔ مگر جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ بڑے منہ دی اور ہٹ دھرم لوگ ہیں۔ تو آپ نے ان کے بعض امور کی مخالفت کا حکم دیا۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ اسی بات کو بیان فرماتا ہے۔
 کہ اے اہل ایمان! تم اہل کتاب سے کسی موافقت کی امید نہ رکھو۔ بلکہ یہ تو سخت عناد کی لوگ ہیں۔ یہ کبھی تمہاری بات ماننے پر تیار نہیں ہوں گے۔ بلکہ ان کا وطیرہ تو یہ رہا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سننے کے بعد اس پر عمل نہ کیا۔ بلکہ اس میں تحریف شروع کر دی۔

اہل کتاب میں سے تو ایک گروہ ایسا تھا۔ جو علانیہ طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہانہ کر آتا تھا۔
 اور آپ کی مخالفت کرتا تھا۔ البتہ ایک مخفی گروہ یہ بھی تھا۔ جو بظاہر تو داندہ اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔ مگر در پردہ ان کی ہمدردیاں یہودیوں کے ساتھ تھیں۔ اسی آیت میں ایسے ہی لوگوں کی دہمیلی

منہدین کی
چالاکیاں

کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَإِذْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْإِيمَانَ اور جب اہل ایمان سے ہمتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاپکے ہیں وَإِذَا أَخَذَ بَعْضُهُمْ رِأْسَ
بَعْضٍ اور جب یہ الگ ہوتے ہیں اہل ایمان کے علاوہ بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ تو قَالُوا أَتُخَذُ تَوْنُسُو بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكَ كُتُوبًا کہتے ہیں کیا تم مسلمانوں کو ایسی باتیں بتاتے ہو۔ جو
اللہ تعالیٰ نے تم پر ظاہر کی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ لِيُخَاجِبَكُمْ بِدِينِ رَبِّكُمْ یہ مسلمان
اللہ تعالیٰ کے ہاں اس بات میں تمہارے ساتھ مجبور کریں گے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ تم مسلمانوں کو
توراة کے احکام سے کیوں آگاہ کرتے ہو۔ جن میں کھانا کھانا کہ نبی آخر الزمان کی یہ نشانیاں ہیں۔ اور
یہ کہ توراة قرآن پاک کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ایسی باتیں اہل ایمان کو نہ بتاؤ۔ یہ آخرت
میں اسی سے تمہارے خلاف دلیل قائم کریں گے۔ کہتے تھے کہ یہ ایسی گہری بات ہے۔ جو
ہم سے خلاف جاتی ہے أَفَلَا تَعْقِلُونَ کیا تم نہیں سمجھتے۔ یعنی تمہیں اس نکتہ کی کیوں سمجھ نہیں
آتی کہ یہ چیزیں ہمارے حق میں نہیں ہیں۔

اہل کتاب کی ان تمام تر چالوں کے متعلق ارشاد خداوندی ہے۔ کہ ان کی ہوشیاری کسی کام
نہیں آئے گی۔ أُولَٰئِكَ يَلْمِزُونَ أَنَّ اللَّهَ يَكْفُرُ مَا كُفِّرُوا وَمَا يُعْلِنُونَ کیا یہ نہیں جانتے
کہ اللہ تعالیٰ ان کی ہر اس بات کو جانتا ہے۔ جو یہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں وہ سمجھتے
تھے کہ منافقت کا یہ چکر چلا کر وہ اہل کتاب اور اہل ایمان دونوں کے ساتھ تصفیات برقرار
رکھ سکیں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا پردہ فاش کر دیا۔ اور فرمایا کہ یہ لوگ جو بے ایمانی کر رہے
ہیں۔ احکام کی غلط تفسیر کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔ ان کی کوئی چال کامیاب
نہیں ہوگی۔

یہودیوں کی
موجوم آرزوئیں

فرمایا تم یہ کہو اور منافقت۔ تو عام لوگوں کی بیماریاں تھیں۔ یعنی یہ خصائل ان لوگوں کے
تھے۔ جو حق پرست علم رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ بعض لوگ ایسے بھی تھے وَمِنْهُمْ أُمِّيُونَ
لَا يَدْعُونَ الْكُتُبَ جو بالکل ان پر صحت نہیں کتاب کا بالکل علم نہیں تھا۔ فرمایا ایسے
لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتے إِلَّا مَا فِي سُوْرَةِ خُذْ آرزوؤں کے جن کا
ذکر آئے ہیں یعنی بہر بہشت صرف یہودیوں کے لئے وقف ہے۔ یا یہ کہ سخت ابراہیم علیہ السلام

دوزخ کے دروازے پر پکھڑے ہوں گے، اور قیامت کے دن کسی یودی کو جس نے ختنہ کی ہوگی اس میں نہیں گرنے دیں گے۔ یا اگر بنی اسرائیل دوزخ میں پہلے جی گئے تو محمدؐ اسے سننے ایام کے لیے جتنے دن ان کے آباد ابداد نے پکھڑے کی پوجا کی تھی۔ اس کے بعد پھر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ بنی اسرائیل کے جابل اور ان پر اس قسم کی آمیزوئیں لیے بیٹے تھے۔ مگر ان کا عقیدہ یہاں تک تھا کہ عربوں کا دل بخشم کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ سود کو بدل کرنے کے لیے طرح طرح کی تادیبیں کئے تھے شریعت کو جائز قرار دیتے تھے وَإِنْ فَعِمَ إِلَّا بَطْشًا اور زمین پر پھروہ کا حق کرتے۔

تورہ میں
تحریریت

تحریریت فی الکتاب کے تعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل کا حال یہ ہے کہ اس جرم کی بنا پر فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بایں کہ یہ ہجوۃ ہلاکت ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھ سے کتاب یعنی تورہ لکھتے ہیں ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ گویا اپنی تحریر کو اللہ تعالیٰ کی تحریر کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس قدر ظالم لوگ ہیں۔ اور یہ تحریریت اس لیے کرتے ہیں لیست تذاہبہ ثَمَنًا قَلِيلًا تاکہ اس کے ذریعے حیرت معاوضہ وصول کریں۔ مثلاً جب کسی زانی کو جہم کی نذر سے بچنا مقصود ہو تو کسرت تھے کہ تورہ کا حکم یہ ہے کہ ایسے شخص کا منہ کالا کرو اور گودے پر سوار کر کے شہر پھرا دو یا زیادہ سے زیادہ کوئی جہم نہ کر دو۔ اس طرح زانی کی جان بچا لیتے۔ اس کے علاوہ ان کے اور بھی بے شمار من گھڑت مسائل تھے جنہیں تورہ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ تحریریت کی دونوں صورتیں ان میں پائی جاتی تھیں۔ یا تو الفاظ ہی بدل دیتے تھے جیسا کہ بیان ہوا۔ یا پھر الفاظ تو نہیں بدلتے تھے۔ بلکہ ان کی تادیل غلط کر کے اپنا مقصد پورا کر لیتے تھے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی یہ قباحت بھی بیان کر دی کہ وہ کتاب الہی میں تحریریت جیسی قبیح حرکت کے مرتکب ہوتے تھے۔

تحریریت کا دائرہ شمالوں تک وسیع ہو چکا ہے۔ آج کے دور میں انصاف کی نظر سے دیکھیں گے۔ تو پتا چلے گا کہ اکثریت کے عقیدے خراب ہو چکے ہیں۔ کتنے خود ساختہ اور جوڑے عقیدے ہیں جنہیں آج کل کے نام نہاد علماء قرآن و سنت کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ تحریریت فی الکتاب و سنت نہیں تو اور کیا ہے آج کے داعی قہر پرستی رسومات فاسدہ و دگر

ہمات سے متعلق کتنی بناوٹی حدیثیں لوگوں کو سناتے ہیں۔ یہ بالکل یودیوں کا طریقہ ہے۔ جو مسلمانوں نے بھی اختیار کر لیا ہے۔ اس دور میں نیکی کا وہ معیار کہاں ہو گیا ہے۔ جو کتاب اللہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا اقوال صحابہ کا تھا۔ اصل دین کہاں چلا گیا۔ دور حاضر میں دین چند رسومات اور چھوٹے ختم تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ قرآن و سنت کی طرف کون رجوع کرتا ہے۔ نہ اُسے سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور نہ عمل کرنے کی اشرک و بدعت پر دین کا دار و مدار ہے۔ اس کی تبلیغ کرنے والے دو لوگ ہیں۔ جو چھوٹے قہقہے کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ یہی چیزیں فتنوں میں ہیں اور غزروں میں ہیں اور انہیں پر عمل ہو رہا ہے۔ بڑے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ آج چند رسوم کو دین کا نام لے دیا گیا ہے۔ اور لوگ حقیقت سے بہت دور جا چکے ہیں۔ دین کو سمجھنے والے لوگ بالکل قلیل تعداد میں ہیں۔ آج کہنے لوگ ہیں جو مغسورین، فقہاء اور ائمہ دین کی طرف پر دیسرج کا بیڑا اٹھائیں۔ اور دین کو اس کا صحیح مقام و دلائل حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ قریب قیامت میں فتنوں کا دور آئے گا۔ اُس وقت دین کو ہاتھ میں پکڑنا اس قدر مشکل ہو جائے گا۔ جیسے جلتے ہوئے کوٹوں کو پکڑنا۔ آج آپ کسی بقیع دھم کی تردید کر کے دیکھیں، ساری برادری اور خاندان ناراض ہو جائے گا۔ شادی بیاہ کی رسمیں دیکھ لیں۔ یہ انٹرنیشنل اور فوٹیج کی رسوم کی طرف نگاہ ڈالیں۔ میلوں اور عرسوں کی طرف دیکھیں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ قبروں پر چادریں چڑھانی جا رہی ہیں۔ میلے لگائے جاتے ہیں۔ قزایاں ہو رہی ہیں۔ خواجہ نظام الدین دویاز کی قبر پر دو ہزار روپے کی چادر لے کر ایک آدمی گیا، یہ کون سا دین ہے؟ مسٹر جناح کی قبر پر بیس قیمت گنبد کی تعمیر کون سی شریعت ہے؟ ہر جگہ عرسوں کی بھرمار ہے۔ قبروں کو غسل دیا جا رہا ہے۔ یہ کس شریعت کی باتیں ہیں؟ کیا یہ یود کا طریقہ نہیں ہے؟

دین کی بعض چیزیں ایسی ہیں جنہیں ہمارے لئے لوگ غلام کو مجبور کرتے ہیں اور پھر دین فحش و منکر کی اس خواہش کو تحریک کے ذریعے پورا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں نکاح و طلاق کے مسائل کی مثال واضح ہے۔ جلد بازی میں طلاق دے دیتے ہیں جب اپنے کیے پر ندامت ہوتی ہے تو اس کے لیے راستہ تلاش کرنے لگتے ہیں۔ طلاق کے کتنے ہی ایسے معاملات ہیں جن میں لوگ غلط فتوے حاصل کر لیتے ہیں۔ حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ طلاق جیسی اہم اور دوہیں چیز کو عائد کرنے سے پہلے اس پر

کچھ طرح غم کیا جاتا، کسی صاحبِ لڑائی عالم سے مشورہ یا جاتا۔ طلاق دینے اور پھر اس کے اثرات کے متعلق پوچھا جاتا۔ مگر ہمارے معاشرے کا اصول یہ ہے کہ طلاق دینے کے بعد اس کے اثرات کے لیے فتویٰ حاصل کرنے آتے ہیں کہ جی غلطی ہوگئی ہے لڑکے نے غصے میں آکر طلاق دے دی ہے۔ اب اس کا کوئی مل بتائیں۔ ہم چوبیس سال سے یہی کچھ دیکھ رہے ہیں اتنے عرصے میں صرف ایک آدمی نے طلاق دینے سے پہلے مشورہ کیا ہے کہ میرا بیٹا اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہے لہذا کوکشتش کے باوجود نباہ کی صورت نظر نہیں آتی۔ آپ ہمیں طلاق دینے کا صحیح طریقہ بتائیں۔ اور نہ باقی سب طلاق دینے کے بعد ہی آئے ہیں۔ کہ اب کسی طرح حلال کر دو۔ یہ دین میں تحریف نہیں اور کیا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تحریف کرنے والوں کے متعلق ارشاد فرمایا فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيهِمْ پس ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے کچھ یعنی خود کچھ کر اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا اور تحریف کے مرتکب ہوئے فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ اور ہلاکت ہے ان کے لیے جو انہوں نے کیا ہے یعنی غلط فتوے دیکر اور تحریف کر کے جو دنیا انہوں نے کمائی وہ ان کے لیے باعثِ ہلاکت ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر حلال کی بجائے حرام کھیا ہے تو اس کی قیمت میں تباہی ہی آئے گی اسی بات کو دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الَّذِيْنَ رَاٰ سُوْهُبًا اِنِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِاِثْمٍ ظٰلِمٍ یعنی کتنے ہی پیرائے عالم ہیں جو لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھا جاتے ہیں۔ یہ باطل طریقے ہی ہیں۔ جو شرک اور بدعتِ رسوم کو اپنا کر اختیار کئے جاتے ہیں۔ بھوٹی کمائیاں سنا کر اور باطل عقیدے پھیلا کر لوگوں کا مال بھضم کیا جاتا ہے۔ اور ان کے ایمان ضائع کئے جاتے ہیں۔ تو فرمایا اس قسم کی کمائی پر بھی لعنت تباہی اور بربادی ہے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کے باطل عقائد کی تفصیل آرہی ہے۔ اور قانونِ نجات کا دوبارہ تذکرہ ہوگا۔ جیسا کہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً قُلْ أَتُخَذُكُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يَخْلَفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨٠﴾ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَاطِبُنَا فَالِئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٨١﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٨٢﴾

الظہور

۸۰

ترجمہ اور (یہودی) کہتے ہیں کہ ہرگز نہیں چھوٹے گی ہم کو (دوزخ کی) آگ مگر چند دن کے لیے۔ (اے پیغمبر) آپ فرما دیجئے کیا تم نے پڑھا ہے اللہ تعالیٰ کے پاس کوئی عہد پس ہرگز نہیں خلاف کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے عہد کا — بلکہ تم اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے ﴿۸۰﴾ کیوں نہیں جس شخص نے بُرائی کائی اور گھیر لیا اس کو اس کے گناہوں نے، وہی لوگ دوزخ دے دیے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۸۱﴾ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے۔ وہی لوگ جنت دے دیے

ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ﴿۸۲﴾

یہودیوں کے
باطل عقائد

اس رکوع میں اہل کتاب کی ضربیوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کافروں سے امید قطع کرنے کا حکم دیا۔ کہ یہ بڑے متعصب لوگ ہیں۔ آپ ان سے ایمان لانے کی امید نہ رکھیں۔ اس کے بعد ان کے دو طبقوں یعنی اہل علم اور ان پر ظہم لوگوں کا ذکر ہوا۔ کہ ان جاہل لوگوں کے پاس دین نہیں۔ بلکہ چند چھوٹی آرزوئیں ہیں مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی ایک چھوٹی آرزو یہ ہے کہ وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ وہ کہتے ہیں کہ ہم دوزخ میں نہیں جائیں گے إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً مگر چند دن کے لیے جنت تو ہمارے لیے مقدر ہو چکی ہے۔ دوسری جگہ ان کی بات کو یوں بیان فرمایا لَنْ يَدْخُلَ

بیان کر رہے ہیں۔ اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب امت کا رشتہ علم و عمل نبی سے منقطع ہو جاتا ہے۔ تو آرزو میں اور خواہشات عقیدے بن جاتے ہیں۔ یہی حال یہودیوں کا تھا۔ ان کے تمام افعال نبی سے قطع تعلقی پر دلالت کرتے ہیں۔ انہوں نے نبی کی تعلیم کو پس پشت ڈال کر اپنی مرضی کے عقیدے وضع کئے ہوئے ہیں۔ اور انہیں من گھڑت عقیدوں بلکہ خواہشات کی بنا پر وہ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں روزخ سے بچالیں گے۔

سناؤں کے
باعل عقائد

اس قسم کے غلط عقیدوں کا دائرہ یہودیوں تک ہی محدود نہیں بلکہ مسلمانوں تک وسیع ہو چکا ہے۔ شفاعت کا مسئلہ ہی لے لیں۔ یہاں پر يَا شَافِعُ الْمُذْنِبِينَ کے نعرے ملتے جاتے ہیں کہ ہم جو چاہتے ہیں۔ حضور علیہ السلام ہماری شفاعت کر دیں گے اور ہم نجات پا جائیں گے۔ حالانکہ شفاعت کا مسئلہ قرآن پاک نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ شفاعت لوگوں کی خواہش پر نہیں ہوگی بلکہ یہ تو اللہ جل جلالہ کی مرضی پر موقوف ہے۔ لَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ ارْضَىٰ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر تو کوئی بھی سفارش نہیں کر سکا۔ تم کس زعم میں مبتلا ہو۔ یہ عقیدہ کہ خدا ضرور ہماری سفارش کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اُسے ضرور ہی قبول فرمائے گا۔ یہ تو یہودیوں والا عقیدہ ہے محض میلاد منفعہ کر لینا، جلوس نکال لینا یا گیارہویں مہینہ کافی سمجھ رکھا ہے۔ بس شفاعت کے حقدار ہو گئے۔ شیعہ بھی یوں کہتے ہیں حضرت حسینؑ کا نام لے لو۔ ماتم برپا کرو۔ بس نخشے جاؤ گے کسی نماز روزے کی ضرورت نہیں۔ اس قسم کے باطل عقیدے اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب علم و عمل کا تعلق نبی سے کٹ جاتا ہے۔ پھر خواہشات عقیدے بن جاتے ہیں۔ اور ساری عمر لوگ اسی دھمول کو پیٹتے رہتے ہیں۔ یہ یہودیوں والے عقائد ہیں۔ سفارش کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ جو لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ خدا چاہے رضی ہو یا ناراض نبی۔ ولی جبری سفارش کریں گے۔ اور ہمیں بچالیں گے یہودیوں نے بھی یہی ٹھٹھو کر کھائی۔ اور ہم بھی اُسی راستے پر چل نکلتے ہیں۔ ان میں اور ہم میں کیا فرق ہوگا

قانونِ نجات

فرمایا ہے بنی اسرائیل! نجات کا قانون وہ نہیں ہے جو تم نے بنا رکھا ہے کہ جنت میں پہنچنے کے لیے صرف یہودی ہونا کافی ہے۔ سبکی بلکہ قانونِ نجات یہ ہے کہ مَنْ كَسَبَ سَيِّئًا وَأَخَاطَتْ بِهِ خُطِيئَتُهُ جس شخص نے بھی گناہ کیا۔ اور اس کے گناہوں نے اُسے گھیر لیا فَأُولَٰئِكَ مَتَّعْنَا النَّارَ یہی لوگ دوزخی ہیں۔ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ جو

ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہی گناہ انسان کو گھیرے گا جو سب سے بڑا ہو گا۔ اور چاروں طرف چھایا ہو گا۔ اور یہ گناہ کفر و شرک کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ آدمی بہت سے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ مگر وہ گناہوں سے گھرا ہوا نہیں ہوتا۔ جب تک کفر و شرک کا ارتکاب نہ کرے۔ قرآن پاک میں آتا ہے: **وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ**۔ سب سے بڑے ظالم کافر ہیں۔ نیز فرمایا: **إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ**۔ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وضاحت کے ساتھ فیصلہ کر دیا: **إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ**۔ شرک کے لیے معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ **وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ**۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے معاف فرمائے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو بغیر توبہ کے بھی کسی کو معاف فرمائے۔ وہ مالک ہے مگر شرک اور کفر جیسے عظیم گناہوں کو معاف نہیں کریگا۔ یہ اُس کا اہل فیصلہ ہے۔ ہاں اگر سزا موت طاری ہونے سے پہلے پستے اُس نے توبہ کر لی، تو وہ معاف کر دے گا۔ کیونکہ توبہ کا دروازہ اس وقت تک کھلا ہے۔ جب تک کسی پر موت کے آثار ظاہر نہ ہو جائیں۔ **فَرَأَىٰ إِنَّ اللَّهَ يُفْتَلُ تَوْبَةً الْعَبْدِ مَا لَمْ يُعْزِغْهُ اللَّهُ عَنْ تَوْبَتِهِ**۔ فرمایا: **إِنَّ اللَّهَ يُفْتَلُ تَوْبَةً الْعَبْدِ مَا لَمْ يُعْزِغْهُ اللَّهُ عَنْ تَوْبَتِهِ**۔ انسان کی توبہ غرغره طاری ہونے سے پہلے پہلے مقبول ہے اس کے بعد نہیں۔

اسی لیے فرمایا: **وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَيْكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ**۔ کافر اور شرک دائمی جہنمی ہیں جس شخص نے اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کا انکار کیا **فَقَدْ ضَلَّ صُلًّٰىً بَعِيدًا**۔ ایسا شخص گمراہ ہو کر دور جا پڑا۔ اور اب وہ جہنمی ہے اس کے لیے دوزخ سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔

یہ ایسے شخص کی مثال ہے۔ جسے ایمان کی دولت نصیب نہیں ہوئی۔ بلکہ کھلم کھلا کفر پر اڑا رہا۔ البتہ ایک دوسری صورت یہ بھی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر اور دوسری چیزوں پر ایمان لائے۔ اور ساتھ ساتھ شرک کا ارتکاب بھی کرتا جائے۔ یعنی اُس نے اپنے ایمان کو شکوک و شبہات سے گھرا لیا ہے۔ اور اپنے ایمان کو خراب کر لیا ہے۔ قرآن پاک نے اس مضمون کو بڑی تاکید کے ساتھ

بیان کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام منادی کرتے تھے۔ اے لوگو! خوب اچھی طرح سن لو! اُعْبُدُوا اللّٰهَ رَبَّنَا وَذَرِكُوا اللّٰهَ تَعَالٰی کی عبارت کرو جو میرا بھی رب ہے۔ اور تمہارا بھی رب ہے۔ اپنی حاجتوں میں غیر اللہ کو مت پکارو، اور نہ ان کی ایسی تعظیم کرو۔ جو اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے، ورنہ شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے، اور نجات سے محروم ہو جاؤ گے اِنَّهُ مَنُ يَشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَدَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ۔ جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا، اللہ تعالیٰ نے اُس پر جنت حرام کر دی ہے۔ وَمَا أُوْلٰئِكَ اِلَّا دُوْخٌ مِّنْ دُوْخٍ مَّيْمَنٍ۔ اور اس کا ٹھکانا دوزخ میں ہوگا۔

اسی طرح کافروں کے متعلق فرمایا کہ ان کے لیے آسمانوں کے دروازے نہیں کھلیں گے۔ لَا تَقُوْلُوْهُمْ لَہُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَیَا ذٰلِیْہِمْ خُلُوْذَ الْجَنَّةِ حَتّٰی یَلْبِغَ الْجَمَلُ فِیْ سَوَآءِ الْجِبَالِ۔ یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گزر جائے نہ دھنٹ سوئی کے ناکے میں گزرے اور نہ گھار کے لیے جنت کے دروازے کھلیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر جنت حرام کر دی ہے۔

جس طرح کفر اور شرک عظیم گناہ ہیں۔ اسی طرح ایمان عظیم ترین نیکی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا اَمَّا اَنْتَ اَنْتَ عَمَّا لَ اَفْضَلُ۔ حضور! کون عمل افضل ترین ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا۔ یہ تمام اعمال کی جڑ اور بنیاد ہے۔ سی لیے فرمایا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ہُوَ لوگ ایمان لائے وَتَعْمَلُوا الصَّٰلِحٰتِ اور نیک اعمال کئے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ادا کیا۔ اس کے بعد جہاد اور نیکی کے دیگر کام انجام دیے، ان کے متعلق فرمایا اُولٰٓئِکَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ۔ یہی لوگ جنت والے ہیں۔ جنت کی چابی ان کے پاس ہے۔ اور یہ کوئی عارضی مقام نہیں ہوگا، بَلْکُمْ ہُمْ فِیْہَا خٰلِدُوْنَ۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں سے کبھی بھی نکالے نہیں جائیں گے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے فرمایا قانونِ نجات ہمارے پاس ہے۔ تم کفر اور شرک کا ارتکاب کرتے ہو۔ دنیا کی دیگر برائیوں میں مغموم ہوتے ہو۔ اس کے باوجود اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تمہیں دوزخ میں نہیں گرنے دیں گے۔ یہ بالکل باطل خیال ہے۔

الْعَمَلِ

البقرة ۲

درس سی و پنج ۳۵

(آیت ۸۳)

وَلَا تَأْخُذْ بَعِثَاتِ بَنِي إِسْرَءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَبِإِلَهِدِينَ
 إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا
 وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ
 وَأَنتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿٨٣﴾

ترجمہ: اور اس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عمل یا کرتے تھے
 کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ اور ان باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنا اور قرابت داروں
 کے ساتھ۔ اور یتیموں کے ساتھ اور مسکین کے ساتھ۔ اور مولوگوں کے لیے نیک بات
 اور نماز کو قائم رکھو۔ اور زکوٰۃ دیتے ہو۔ پھر پھرتے ہو (بنی اسرائیل) بہت تھوڑے

تم میں سے اور تم اعراض کرنے والے ہو ﴿۸۳﴾

ربط آیت

ان آیات میں بنی اسرائیل کی مختلف خطا بیاں بیان ہو رہی ہیں۔ پچھلے درس میں ان کے ان
 غلط عقائد کا رد تھا کہ یہودیوں اور نصاریٰ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص جنت میں نہیں جاسکتا۔ یہ اللہ تعالیٰ
 پر افتراء ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے ایسا کوئی عہد نہیں کیا۔ البتہ خود اللہ تعالیٰ نے تورات میں جو عہد
 بنی اسرائیل سے لیا تھا۔ اس کا ذکر ہے۔ اور وہ ایسا عہد تھا۔ جو کہ نہ صرف تورات میں تھا۔ بلکہ تمام نبیوں
 انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں بھی موجود تھا اور اس کی تمام باتیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت
 میں بھی آگئی ہیں۔

توجہ کے
دو پہلو

اس آیت میں جس عہد کا ذکر آیا ہے۔ وہ عہد توحید ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَأْخُذْ
 بِعِثَاتِ بَنِي إِسْرَءِيلَ اس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عمل یا کرتے تھے
 پختہ عمل کو کہتے ہیں۔ جو بڑا مضبوط اور پکا ہو۔ اور وہ عہد یہ تھا کہ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ یعنی تم اللہ تعالیٰ
 کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ لَا تَعْبُدُونَ کا لفظی معنی تو یہ ہے کہ تم عبادت نہیں کرو گے
 اور یہ خبر کی صورت ہے۔ مگر حقیقت میں یہ حکم ہے۔ یعنی لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ۔ اللہ تعالیٰ

کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ایسی بات کو خبر کی شکل میں ذکر کرنے کا مقصد اس میں زور پیدا کرنا ہے۔
 اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دو پہلو ہیں۔ مثبت پہلو تو پہلے گزرتا ہے۔ اور وہ یہ ہے
 کہ اَعْبُدُوا رَبَّكُمْ اپنے رب کی عبادت کرو۔ اس کی توحید کو تسلیم کرو۔ وحدانیت کا دوسرا
 پہلو منفی ہے۔ یعنی لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ جہاں تک
 پہلے حصے کا تعلق ہے۔ وہ تو واضح ہے۔ اور اس میں اختلاف بھی پیدا نہیں ہوتا کہ بھی اپنے رب
 کی عبادت کرو۔ مگر توحید کے دوسرے حصے میں جا کر اکثر گڑبڑ پیدا ہوتی ہے۔ اور لوگ شرک یا مبتدا
 ہو جاتے ہیں۔ اور یہ صورت حال اُس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب لوگ حقیقی رب کی عبادت کے
 ساتھ ساتھ غیر اللہ کی عبادت بھی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بائبل میں اگرچہ بہت کچھ تحریف ہو چکی
 ہے مگر توحید کا مسئلہ آج بھی اس میں موجود ہے۔ اور وہ اس طرح ہے کہ آسمان کے نیچے اور زمین
 کے اوپر خدا کے غیر کی عبادت نہ کرو۔ بحدہ نہ کرو۔ صرف خداوند جو بنی اسرائیل کا خدا ہے۔ اس کی
 عبادت کرو۔ مقصد یہ کہ توحید ایک مسئلہ ہے۔ جو تمام انبیاء علیہم السلام کی شرائط میں قدر مشترک کے
 طور پر موجود رہے۔ آیت زیر درس میں بھی یہی مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے مختلف اوقات میں مختلف عہد لیے۔ بمثل ان کے تورات بنی اسرائیل کے
 میں یہ عہد تھا۔ جسے قرآن پاک نے بیان کیا وَ إِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا ذُرِّيَّتَكُمْ
 الْعَهْدَ یعنی اے بنی اسرائیل اس بات کو یاد کرو۔ جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا۔ اور تمہارے
 سروں پر کوہ طور کو معلق کر دیا تھا۔ نیز یہ بھی کہ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ جو کچھ ہم نے عطا کیا
 ہے۔ اس کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ اور اس کے مطابق عمل کرو۔

اور پھر یہ بھی کسا تھا وَ اذْكُرُوا مَا فِيْهِ جَوْ كُفَّ بِهٖم نَارُ مَا زِلْ كُنَّا هٗنَا اس کو یاد کرو
 تورات میں یہ عہد بھی لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب لوگوں کے سامنے ظاہر کرو گے چھپاؤ
 گے نہیں۔ یہ لوگ اصل احکام کو چھپا بیٹھے تھے۔ اور ان کی جگہ خود ساختہ مسائل لوگوں کو بتاتے تھے۔
 اللہ تعالیٰ کے حکم لَتُبَيِّنَنَّ لِلنَّاسِ مَا هُمْ فِيْهِ خٰفُونَ نہ پتہ چلے کہ یہ عمل نہیں کرتے تھے۔

الغرض! اس مقام پر جس عہد کا ذکر ہے وہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔
 نہ کرنا۔ بلکہ صرف اور صرف اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کرنا۔ عبادت کے لیے ضروری ہے۔

ہے کہ جس عبارت کرنا ہے۔ اس کی صحیح پہچان بھی ہو۔ اسی لیے سب سے پہلے رب تعالیٰ کی پہچان کرانی گئی ہے: **الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ** (۱) **الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ** (۲) **مَلِكُ يَوْمِ الدِّينِ** (۳) یہ سب اللہ تعالیٰ کی پہچان ہی تو ہے۔ یعنی رب وہ ہے جو ان صفات کا مالک ہے: **الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ** وہی تمہارا بھی خالق ہے۔ اور تم سے پہلے آنے والے لوگوں کا بھی وہی مالک ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات کا جاننا بھی ضروری ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ علم محیط کا مالک ہے۔ اُسے فتنے فتنے کا علم ہے۔ **اِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ** اس صفت کی پہچان ہوگئی تو توحید مجھ میں آجائے گی۔ اسی طرح قادر مطلق ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی صفات خاصہ میں سے ہے **اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ** وہ قادر مطلق ہے۔ جو چاہے کرتا ہے۔ اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی صفت یہ ہے کہ وہ واجب الوجود ہے۔ اُس کا وجود اپنی ذات سے ہے۔ باقی تمام چیزوں کا وجود استعار ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ وہ خالق ہے۔ کسی چیز کا حکم دینا یا کسی چیز سے منع کرنا بھی اس کی صفت ہے۔

اس کے علاوہ ان چیزوں کی پہچان بھی ضروری ہے۔ جن کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر جائز نہیں مثلاً اللہ تعالیٰ عاجزی اور جہالت سے پاک ہے۔ رافضیوں کا عقیدہ باطل ہے جو کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو جہا بھی ہوتا ہے۔ یعنی پہلے وہ کام کر لیتا ہے۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ کام نہیں کرنا چاہئے تھا۔ یا جس طرح یہودیوں کا باطل عقیدہ ہے کہ بعض کام کر کے اللہ تعالیٰ نادم بھی ہوتا ہے۔ قرآن کے پہلے باب میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے خود بچھڑایا۔ تو ایسی یہودہ باتوں کا جاننا بھی ضروری ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو من کا گورنر بنا کر بھیجا۔ تو دست بردار نہ ہوئے! سب سے پہلے ان لوگوں کو توحید اور رسالت کی دعوت دینا **فَاِذَا عَدَا اللّٰهُ تَرَجَّلَ** جب وہ اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح سے پہچان لیں۔ تو پھر انہیں خدا تعالیٰ کے احکام یعنی نماز۔ روزہ۔

زکوٰۃ اور حج وغیرہ کے احکام بتلانا کہ اُس خدا تعالیٰ نے تم پر یہ فرائض عائد کیے ہیں۔ انہیں انجام دینا لازم ہے۔

والدین سے
حسن سلوک

بہر حال عہد کا پہلا حصہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اور اُس کے سوا کسی دوست کی عبادت نہ کرو۔ عہد کا دوسرا حصہ فرمایا وَالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ والدین کے ساتھ نیکی کرنا صرف بنی اسرائیل کی شریعت میں ہی ضروری نہیں تھا۔ بلکہ یہ تو شریعت محمدیہ کا بھی ایک لازمی جزو ہے: وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا یعنی خدا تعالیٰ کا یہ اہل فیصلہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ گویا اللہ تعالیٰ کے حق کا ذکر کیا۔ اور پھر ساری مخلوق میں والدین کو سب سے اول نمبر پر شمار کیا۔ یہ احکام تمام انبیاء علیہم السلام کے شرائع میں موجود رہے ہیں۔ توراۃ اور قرآن پاک میں بھی موجود ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حسن سلوک کے سلسلے میں والدین کو کیوں مقدم رکھا ہے۔ مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ خالق اور حقیقی مربی ہے اسی طرح والدین بھی اس مادی دنیا میں اولاد کی پرورش میں حصہ لیتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا حق مقدم رکھا ہے۔ والدین جو احسان اولاد کے ساتھ کرتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ساتھ مقابلتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کسی پر مہربانی فرما کر اس سے معاوضہ طلب نہیں کرتا اسی طرح والدین کے اپنی اولاد پر بے مثال احسان ہوتے ہیں۔ لہذا ماں باپ کے حقوق کو اللہ تعالیٰ نے دوسرے لوگوں پر فوقیت دی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ماں اور باپ میں سے کون مقدم ہے۔ تو اس کے متعلق حدیث پاک میں آتا ہے کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ میں کس کے ساتھ اچھا سلوک کروں۔ آپ نے فرمایا أَهْلَكَ یعنی اپنی ماں کے ساتھ، اس شخص کے تین بار کے سوال کے جواب میں آپ نے ماں کا ذکر کیا۔ حتیٰ کہ چوتھی دفعہ پوچھنے پر آپ نے فرمایا

اَبَاكَ یعنی اپنے باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ گویا خدمت کے سلسلے میں ماں کو باپ سے بھی مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کی پیدائش اور پرورش میں ماں زیادہ تکلیف برداشت کرتی ہے۔ لہذا خدمت کی زیادہ حقدار بھی وہی ہے۔ قرآن پاک نے ماں کے متعلق فرمایا: **حَمَلَتْهُ اُمُّهُ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ** یعنی ماں نے تکلیف پر تکلیف اٹھا کر بچے کو پیٹ میں رکھا۔ اسی لیے محدثین عظام فرماتے ہیں: اگر ماں اور باپ دونوں کو یہاں لگی ہوئی ہو۔ تو پہلے ماں کو پانی چلاؤ۔ کہ خدمت میں اس کا حق فائق ہے۔ مگر جہاں ادب و احترام مقصود ہوگا تو دہاں باپ مقدم ہوگا۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی ایک صورت ترکِ ایذا ہے۔ ماں باپ کو قول سے یا فعل سے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ کیونکہ یہ احسان کے خلاف ہے۔ بلکہ اولاد کا فرض ہے کہ اپنے جسم اور مال کے ساتھ ماں باپ کی خدمت کرے۔ اگر والدین مالی طور پر ضرورہ مند ہیں۔ تو ان کی ضروریات پوری کی جائیں۔ ورنہ جسمانی طور پر تو اولاد ان کو راحت پہنچائیں۔ مثلاً ان کی کھٹی چائی کریں۔ ان کو کھلائیں پلائیں۔ ان کو نسلانیں دھلائیں وغیرہ وغیرہ۔ ماں باپ کی فوٹیدگی کے بعد ان کے لیے بخشش کی دعا کرنا بھی ان کی خدمت کے مترادف ہے۔ ان کے لیے استغفار کرو۔ صدقہ و خیرات کرو۔ تاکہ ان کے لیے آخرت میں راحت کا سبب بنے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: کہ اگر ماں باپ نے کوئی وصیت کی ہے۔ تو اولاد کو چاہیے کہ اُسے پورا کریں۔ حتیٰ کہ ماں باپ کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک بھی ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سمجھا جائے گا۔

مسلم اور ترمذی شریفین کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ گدھے پر سوار کیس جا بے تھے۔ راستے میں ایک بڑا دھلا۔ آپ نے اپنا گدھا اس بڑے کو دے دیا۔ آپ کے سر پر چڑھتی تھی۔ وہ بھی بڑے کو دے کر رکھ دی۔ ساتھیوں نے عرض کیا: حضرت! آپ کے پاس یہ ایک گدھا تھا۔ جو سواری کے کام آتا تھا۔ مگر آپ نے اس دیہاتی کو دے دیا۔ دیہاتی لوگ

۱۔ کرب الدردی ص ۲۱۱ ۲۔ تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۱۳

۳۔ ابوداؤد ص ۲۴۴ ۴۔ ابن ماجہ ص ۲۶ ۵۔ مسلم ص ۳۱ ۶۔ جمع الفوائد ص ۱۶۹ ۷۔ بحوالہ مسلم۔ ترمذی۔ ابوداؤد

تو معمولی چیز پر بھی راضی ہو جاتے ہیں۔ آپ نے اپنی قیمتی سواری تک مٹے دی۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ بھائی! اس کا باپ میرے والد کا دوست تھا۔ اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ باپ کے دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا باپ کے ساتھ نیکی میں شریک ہے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کی بعض حدود بھی متعین ہیں۔ سورۃ لقمان میں واضح ہے: **وَإِنْ جَاءَكَ ذَكَ عَلَىٰ أَنْ تَشْرِكَ بِى مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبُهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا**۔ اگر ماں باپ تمہیں شرک پر آمادہ کریں تو پھر ان کی اطاعت نہیں کرنی البتہ دنیا میں ان سے اچھا سلوک کرو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اگر والدین ترکِ فرض پر مجبور کریں، تو ان کی بات نہیں ماننی چاہیئے۔ مثلاً کسی پر حج فرض ہو گیا ہے۔ مگر ماں باپ روکتے ہیں۔ تو ان کی بات کی پروا نہیں کی جائے گی۔ قربانی واجب ہے۔ اگر والدین اس سے روکیں تو نہیں رکن۔ البتہ اگر سنتِ مؤکدہ کی ادائیگی میں رکاوٹ ڈالیں۔ تو ان کے کہنے پر ایک دو دفعہ مانا جاسکتا ہے تاہم سنتِ مؤکدہ کی ادائیگی کرنی ہوگی۔ فغلی عبادت کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اگر ماں باپ روکتے ہیں، تو قطعاً طہ پر رک جاؤ۔ ماں باپ کی بات مانو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص مسجد میں جا کر نفل پڑھنا چاہتا ہے۔ اور والدین کہتے ہیں کہ ان کو تنہائی میں وحشت ہوتی ہے۔ لہذا نوافل کے لیے مسجد میں نہ جاؤ۔ تو ماں باپ کی خدمت مقدم ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہے۔ کفر و شرک پر آمادگی تو کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہیں۔ اس کے علاوہ اگر ماں باپ بدعات پر آمادہ کریں۔ تو ان کی اطاعت نہیں کرنا ہوگی۔ مثلاً وہ کہیں کہ قبر پر سجدہ کرو۔ یا داتا صاحب بجا چڑھاؤ۔ فلاں جگہ نیانہ دے کر آؤ۔ تو ایسی باتوں کو نہیں ماننا۔ بلکہ ایسی چیزوں کی مخالفت ضروری ہو جاتی ہے۔ تاہم ان تمام تر حدود و قیود کے باوجود والدین سے حسن سلوک ہر حالت میں لازم ہے۔ **وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا** کا یہی مطلب ہے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بعد فرمایا **وَذِي الْقُرْبَىٰ** یعنی قرابتداروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو۔ قرابتداروں کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم محرم قرابتداروں کی ہے۔ یعنی دو درجہ

جو آپس میں محرم ہوں اور جس کو آپس میں نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ مثلاً بھائی بہن، چچا بھتیجی، پھوپھی بھتیجی وغیرہ۔ قرابتداروں کی دوسری قسم غیر محرموں کی جیسے ماموں زاد، خالہ زاد، چچا زاد وغیرہ۔ فرمایا ان سب کے ساتھ اچھا سلوک کرو کسی کو ایذا نہ پہنچاؤ۔ رضاعی ماں کی خدمت کرو۔ دودھ والے رشتہ داروں کی مالی خدمت زیادہ موزوں ہے۔ ایک مالدار شخص اپنے محتاج عزیزوں کی خبر گیری نہیں کرے گا۔ تو مجرم ٹھہرے گا۔ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئے گا۔ فرمایا: **وَاتِّذُنِي حَتَّىٰ** قرابتداروں کو ان کا حق ادا کرو۔ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے۔ تو ان کی امداد کرو۔ یہ ان کا حق ہے اس کے بعد فرمایا **وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ** یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی نیک سلوک کرو۔ یتیم وہ نابالغ بچہ ہوتا ہے جس کے سرپر والدین کا سایہ نہ ہو۔ اس کی پرورش کرنے والا کوئی نہ ہو۔ اس کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم ہے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔

یتیم، مسکین
اور فقیر

کہتے ہیں کہ جانوروں میں یتیم وہ سمجھا جاتا ہے جس کی ماں موجود نہ ہو۔ باقی چیزوں میں یتیم وہ چیز ہے جس کی نظیر نہ ہو۔ اور وہ نادر چیز ہو۔ جیسے نذر یتیم۔ نادر قسم کا عمدہ ہیشمال ہوتی۔ مسکینوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ مسکین اس شخص کو کہتے ہیں جس کا خرچ اس کی آمدنی سے پورا نہ ہوتا ہو۔ بیچارہ کثیر العیال، محنت، مشقت کرتا ہے مگر جو کچھ کماتا ہے۔ اس میں گزراوقات نہیں ہوتی۔ ایسا شخص بھی حسن سلوک کا مستحق ہے۔ اس کی مدد کرنی چاہیے۔ محتاجوں میں ایک قسم فقیر کی بھی ہے۔ اور فقیر ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو بالکل ہی ہلکا ہو، اور جس کے پاس در وقت کاکھانا بھی میسر نہ ہو۔ ایسا شخص بھی محتاج ہے۔ اس کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہیے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے بنی اسرائیل! اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ماں باپ کے حسن سلوک سے ہمیشہ آؤ۔ قرابتداروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

الْعَمَّ

البقرة

درس ہیڈ شیٹ ۲۹

آیت ۱۲ بقرہ

وَإِذَا خَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ قَدْ
وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَقُولُوا
لِلنَّاسِ حُسْنًا وَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ
إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَأَنتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿۱۲﴾

ترجمہ: اور اس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا کہ تم اللہ تعالیٰ
کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔ اور قرابتداروں
کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ اور مسکینوں کے ساتھ۔ اور کمزوروں سے نیک بات
اور نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ پھر پھر کئے تم نے بنی اسرائیل مگر بہت
بھڑے تم میں سے۔ اور تم اعراض کرنے والے ہو ﴿۱۲﴾

ان آیات میں بنی اسرائیل کی خرابیوں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے ان کی جلد سازی
کے ذریعے احکام شریعت سے اعراض کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان کی مفسد باتوں اور انبیاء علیہم السلام
کی ایذا رسانی کا ذکر بھی آیا ہے۔ بنی اسرائیل نے آزادی حاصل کرنے کے بعد غرض شریعت کا مطالبہ کیا
تو اللہ تعالیٰ نے توراۃ عنایت فرمائی۔ پھر خود ہی کہنے لگے کہ تم اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ
نے اُن سے عہد لیا تھا۔ جب انہوں نے بیعت و عمل کیا۔ تو اُن کے سروں پر وہ طوطیوں کے نہیں
ڈرایا گیا۔ اس عہد کی تفصیلات سورۃ الاعراف میں آئی ہیں۔

جیسا کہ گذشتہ درس میں عرض کیا تھا۔ کہ یہ دوسرا عہد ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے تورات کے
ذریعے بنی اسرائیل سے لیا۔ اور وہ یہ تھا کہ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا
کبھی کی عبادت نہ کرنا۔ اور ماں باپ اقربتداروں یتیموں اور مسکینوں سے حسن سلوک سے پیش
آنا۔ اس سلسلے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: حضرت!

كَثْرَةُ عَمَالٍ اَفْضَلُ زِيَادَةٍ مِمَّا يَكُونُ لَكَ مِنْ اَرْشَادٍ فَرِيَا الْعَقْلُ لَوْ قُتِلَتْ
یعنی نماز اپنے وقت پر ادا کرنا۔ اس شخص نے دوبارہ عرض کیا۔ حضور! اس کے بعد کون سا عمل افضل
ہے۔ تو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بِشْرُ الْوَالِدَيْنِ یعنی والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔
کہ یہ بنیادی چیز ہے۔ اُس شخص نے دوبارہ پوچھا کہ اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے، تو آپ نے
فرمایا جہاد فی سبیل اللہ۔

تہذیب اخلاق

اصل بات یہ ہے کہ علم سے دو چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ تہذیبِ اخلاق اور اجتماعی حقوق۔
اخلاق میں آگے دو چیزیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی اصلاح عقیدہ اور اعمالِ صالحہ، جب تک عقیدے کی
اصلاح نہیں ہوگی کوئی بھی عمل مقبول نہیں ہوگا۔ لہذا سب سے پہلے اصلاح عقیدہ ضروری ہے۔ اور
اس میں بنیادی چیز توحید ہے۔ جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ لَا تَقْبُدُونِ اِلَّا اللّٰهَ تَعَالٰی
کے بغیر کسی کی عبادت نہ کرو۔ جب عقیدہ درست ہو جائے تو پھر اعمالِ صالحہ بھی مقبول ہوں گے۔
تہذیبِ اخلاق کا دوسرا جزو اجتماعی حقوق ہیں۔ ان کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اور اس میں
والدین کے ساتھ حسن سلوک کو اولیت حاصل ہے۔ ماں باپ کو اپنے بچوں کی اچھی تربیت کا صلہ
منا چاہیے۔ اولاد کی پرورش کے لیے والدین کو بڑی تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اس کی کفایت
یہ ہے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ قرآن پاک کی بیشتر سورتوں میں والدین کے ساتھ
حسن سلوک کے احکام موجود ہیں۔

اجتماعی حقوق میں قربتداروں کا حق بھی ہے۔ اس کے بعد یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ
حسن سلوک کی تاکید ہے۔ یہ لوگ اپنے گھر کے ہوں، گلی محلے یا شہرِ ملک کے۔ سب کے سب
اجتماعی حقوق میں آتے ہیں۔ چونکہ یہ بھی انسان کے ساتھ احسان کرتے ہیں۔ اس لیے اجتماعی طور
پر اس کا بدلہ دینا بھی ضروری ہے اس کو عدل کہتے ہیں۔ عدل اور احسان لغوی کے دراجزا ہیں
لہذا یہ سب چیزیں تہذیبِ اخلاق میں آ جاتی ہیں۔ یہ ایک بنیادی تعلیم ہے۔ جو محض بنی اسرائیل
کے لیے خاص نہیں ہے۔ بلکہ ہماری اُمت کے لیے بھی یکساں طور پر قابلِ عمل ہے۔

حسن کلام

الغرض! آیت زیرِ درس کے پہلے حصے کی تشریح گذشتہ درس میں پیش کر دی تھی جس میں
دو چیزوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ والدین، قربتداروں

یقینوں و یسینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ اُن آیت کے دوسرے حصہ کا ذکر ہے۔ **وَقُولُوا**
لِللّٰهِ میں **حُسْنًا** اور کو لوگوں کے لیے اچھی بات، مفسرین کرام فرماتے ہیں: کہ کوئی فرد واحد عام
 لوگوں کے ساتھ نہ بدنی نیکی کر سکتا ہے، اور نہ مالی نیکی کر سکتا ہے۔ ایسے افعال و دعوے لوگوں کے
 ساتھ ہی انجام دے سکتے ہیں مثلاً والدین کی خدمت، مال اور بدنی دونوں طریقوں سے کر سکتا ہے۔
 اس طرح قربتداروں اور دوستوں کی مالی اعانت کر سکتا ہے۔ مگر یہ دونوں چیزیں عوام ان کے
 لیے انجام دنیا ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ اجتماعی نیکی حاصل کرنے کے لیے **قُولُوا لِلّٰهِ حُسْنًا**
 کا حکم دیا۔ کہ اگر تم بدنی اور مالی خدمت نہیں کر سکتے۔ تو عام لوگوں کو اچھی بات ہی کہہ دو۔

اچھی بات کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ مثلاً حضور علیہ السلام فرماتے ہیں: جب آپس میں
 بڑو۔ تو ایک دوسرے کو سلام کرو۔ اور پھر اچھا کلمان دو ہے جو سلام کرنے میں سہل کرنا ہے۔ **عَلٰی**
مَنْ عَرَفْتُ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ جس کو پہچانتے ہو اس کو بھی سلام کرو۔ اور جس کو نہیں پہچانتے
 اس کو بھی سلام کرو۔ بخاری شریف اور مسلم شریف کی روایتوں میں آتا ہے۔ کہ سلام جو ہے۔ یہ **مِنْ**
خَيْرِ خِصَالٍ اَوْ يُمْكِنُ اَوْ قَالَ اسلام ایمان کی بہترین خصلتوں میں سے ہے۔ یا فرمایا اسلام
 کی بہترین خصلتوں میں سے۔ سلام کرنے کی حکمت بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی کہ ایسا
 کرنے سے محبت بڑھتی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں مقام عطا کرے گا
 جب کوئی سلام کرے تو اس کو اچھے طریقے سے جواب دو۔ قرآن پاک میں موجود ہے **”رُدُّوْهُ“**
 سلام کا جواب ویسے ہی لوٹا دو یا اُس سے بہتر لوٹاؤ۔ فرمایا **الرَّايِبُ** شخص تمہیں **السَّلَامُ عَلَيْكُمْ**
 کہتا ہے تو تم سے بہتر لوٹاؤ اور کو **وَعَلَيْكُمْ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ** صرف
السَّلَامُ عَلَيْكُمْ کہنے والے کو دس نیکیاں ملیں گی اور **وَعَلَيْكُمْ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ**
وَبَرَكَاتُهُ کہنے والے کو تیس نیکیاں حاصل ہوں گی۔

کسی کی نیکی کی طرف راہنمائی کرنا اور بڑائی سے روکنا یہ بھی حسن کلام میں داخل ہے جب

۱۔ تفسیر غزالی فارسی ص ۳۱۲ پرہ ما ۲۔ ترمذی ص ۲۸۵ ابو داؤد ص ۲۸۵ بخاری ص ۹۲ مسلم ص ۳۸

۳۔ بخاری ص ۹۲ مسلم ص ۳۸ ۴۔ ترمذی ص ۳۸۵ ابو داؤد ص ۲۸۵

دُشمن آپس میں تو نرمی کے ساتھ نیکی کی دعوت دیں۔ آپس میں دوستی کا اظہار کریں۔ اور ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کریں۔ جب ایک مسلمان دوسرے کو پکارتے، تو اچھے لقب سے پکارے قرآن پاک میں موجود ہے: وَلَا تَنَادُوا بِالْأَلْقَابِ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے مت پکارو۔ یہ سب باتیں قول اللہ تعالیٰ میں داخل ہیں۔

اسی طرح فرمایا کسی غیر حاضر بھائی کا ذکر کرنا تو اچھے طریقے سے کر دو۔ اس کو برائی کیساتھ یاد نہ کر دو۔ اگر کوئی مسلمان تم سے مشورہ طلب کرے۔ تو اس کو صحیح صحیح مشورہ دو۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے: الْمُشَارُ مَوْثِقٌ جس سے مشورہ طلب کیا جائے اُسے امین سمجھا جاتا ہے۔ اگر وہ غلط مشورہ دے گا۔ تو خائن مقصود ہو گا۔ اگر کسی کو دیکھو کہ وہ نادانستہ طور پر سخاوت میں پڑا ہوا ہے۔ تو اُسے حسن اخلاق کے ساتھ روکنے کی کوشش کرو۔ مگر اس سلسلے میں سختی نہیں کرنی چاہیے۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ سختی اور نرمی دونوں اپنے اپنے مقام پر روا ہیں تبلیغ و تعلیم کرتے وقت ہمیشہ نرم رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ قرآن پاک کا مطالعہ کیجئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف تبلیغ کے لیے بھیجا۔ تو فرمایا: فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا اس سے نرم لہجے میں بات کرنا۔ لَعَلَّهُ يَذَّكَّرُ اور بخشنی شاید کہ وہ نصیحت پکڑے یا اس کے دل میں خوف خدا پیدا ہو جائے۔ خوب حضور علیہ السلام کے متعلق قرآن پاک نے بیان کیا ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ نرم مزاجی میں نہ لو کہنت فظاً غَلِيظَ الْقَلْبِ اگر آپ سخت مزاج ہوتے تو لافضولاً من حولہ نہ تو لوگ آپ کے ارد گرد سے پھر جاتے۔ کیونکہ سخت مزاج شخص سے لوگ دور رہنا پسند کرتے ہیں مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے آپ کو نرم مزاج بنایا۔ آپ کو حسن کلام کی توفیق بخشی اور اس طرح لوگوں کو آپ کے گرد جمع کیا۔

جب کسی کے ساتھ بحث و تمحیص کی نوبت آجائے۔ تو فرمایا: ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ حَسَنٌ تو اچھے طریقے سے دفاع کر دو۔ مناظرے کے وقت بھی اخلاق کا دامن نہ چھوڑو۔ اخلاق سے گری

ہوئی است نہیں ہونی چاہیے۔ نہ ہی کالی کھوج تہ نہ نوبت پہنچی چاہیے۔ بلکہ نہایت احسن طریقے سے گفتگو ہونی چاہیے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد کرامی ہے مَا دَخَلَ الرَّفِيقُ فِي مُشَىءٍ إِلَّا دَانَهُ جِسْمٌ فِيهِ زَمِيٌّ أَمَلَهُ كِيٌّ وَهُوَ زَيْنٌ نَخْتَهُ كِيٌّ۔ اور جس چیز میں شیئ اُسے کی۔ وہ اُسے عیب دار کر دیگی۔ (مَا دَخَلَ الْخَرَقُ فِي مُشَىءٍ إِلَّا شَانَهُ)

فرمایا ہر جگہ زمی ہی سے ہم نہیں چلے گا۔ بلکہ بعض مقامات پر سختی کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ مثلاً تعزیر کے طور پر سزا مطلوب ہو یا جہاد میں کفار سے مقابلہ ہو تو وہاں پر سختی کرنا پڑے گی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کو حکم دیا جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ۔ آپ کافروں کے ساتھ جہاد کریں۔ وَاعْلُظْ عَلَيْهِمْ۔ اور اُن پر سختی کریں۔ کفار کے ساتھ جہاد ظوار کے ذریعے ہوگا اور منافقوں کے ساتھ زبانی طور پر۔ یعنی اُن کے نفاق کو کھول کر بیان کریں تاکہ دوسرے مسلمان اُن سے بچ سکیں۔ یہ درزوں طریقے سختی کے ہیں۔

بیاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ زمی ملحوظ رکھتے ہوئے شریعت کی حدود کا بھی خیال رکھا جائے۔ زمی بھی اس وقت تک ہی گوارا ہے جب تک شریعت کی حدود کے اندر ہو۔ اگر ایسی زمی برتنے سے شریعت کے اتباع میں فرق آتا ہو۔ تو ایسی زمی جائز نہیں۔ اگر ایسا کرنے لگ جائیں گے۔ تو شریعت کے احکام پر عمل ناممکن ہو جائے گا۔ ایسی زمی جس سے دین میں مہنت پیدا ہوتی ہو تو وہ حرام ہے

اہم محمد باقرہ قزوینی اللہ سے حُسنًا کا معنی یہ کرتے ہیں کہ لوگوں سے ایسی اچھی بات کہو، جو تمہیں خود بھی پسند ہے۔ جو خود پسند نہیں کرتے وہ بات دوسروں کو کیوں کہتے ہو۔ فرماتے ہیں کہ اچھی بات میں دعوت الی اللہ، دعوت الی التوحید، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر شامل ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد الہی ہے: وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ خود نیک عمل کرتا ہے اور زبان سے یوں کہتا ہے کہ

اللہ تعالیٰ کا مطیع اور فرمانبردار ہوں۔ گویا یہ سب آپ کی بات ہے۔ اسی کو فرمایا: قُولُوا لِلّٰہِ حُسْنًا
 جب بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خیبر میں مجنّدہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ میں
 دیا تو فرمایا: قُولُوا لِلّٰہِ لَا نَیْہِدِی اللّٰہُ بِکَ رَجُلًا وَاحِدًا حَتّٰی تَمُوتَ مِنْ اَنْ یَّکُوْنَ لَکَ
 حُمْرَ النَّعَمِ۔ یعنی اے علی! اگر تمہاری وجہ سے ایک آدمی کو بھی ہدایت نصیب ہو جائے۔
 تو یہ بات تمہارے لیے عمدہ قسم کے اونٹوں سے بہتر ہے۔ مقصد یہ کہ لڑائی اصل مقصود نہیں بلکہ
 اس کے ذریعے اسلام کے راستے میں درپیش رکاوٹوں کو دور کرتا ہے۔ یعنی ”وَقَتْلُوهُمْ
 حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةً لِّکُمْ“ سے اس وقت تک جنگ کرو جب تک تمام فتنے ختم نہ ہو جائیں
 گویا لوگوں کو ایمان کی دعوت دینا بھی قُولُوا لِلّٰہِ حُسْنًا میں داخل ہے۔

نماز اور زکوٰۃ

بنی اسرائیل کے عمدہ کاموں میں تھوڑا سا حصہ یہ تھا: اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَآتُوا الزَّکٰوۃَ۔ یعنی
 نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ نماز بنی عبادت ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ نماز اَقْرَبُ الْعِبَادَاتِ
 لِعُقْرِیْبَةِہِ ہے۔ یعنی جو عبادت انسان کو اللہ تعالیٰ سے قریب تر کرنے والی ہے۔ ان
 کی بنیاد اور جڑ نماز ہے۔ نماز کے ذریعے تعلق باللہ استوار ہوتا ہے۔ انسان دن میں پانچ مرتبہ اپنا
 تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم کرتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ نماز کو قائم کرو۔ اس میں کوتاہی نہیں کی جائے
 مالی عبادتوں میں زکوٰۃ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں پاکیزگی اور طہارت کا مفہوم
 پایا جاتا ہے۔ زکوٰۃ بخل کو دور کر کے غریب اور مسکین سے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ جو کہ
 تہذیب اخلاق کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اتفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت قرآن پاک کی اس آیت
 سے واضح ہوتی ہے: لَکِنْ تَسْأَلُوْا الْیَتٰرَ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِنْ مَّا یُحِبُّوْنَ۔ یعنی تم اُس
 وقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ جب تک اپنی محبوب چیز خرچ نہ کرو۔ اور یہ مقصد زکوٰۃ سے
 بھی حاصل ہوتا ہے۔ بشرطیکہ مال کمانے اور اس کے خرچ کرنے میں حلال و حرام کی تمیز روا
 رکھی جائے۔ اگر یہ تمیز اٹھ جائے۔ تو ردعائیت کیسے آئے گی۔ ہمارے ملک میں سارا معاشی نظام
 سرمایہ دارانہ ہے۔ جس میں سود کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ سود کی موجودگی میں تقویٰ کیسے حاصل

ہوگا۔ اور پاکیزگی کیسے پیدا ہوگی۔

دوسری طرف کفر و الحادیہ ہے جس کی بنیاد انکارِ خدا پر ہے۔ ہر دو نظام ہائے معاش کا مقصد حصول دولت، عیاشی اور فحاشی ہے۔ سب کی سوچی دنیائیک ممدود ہے۔ مسفت و حضرت بائس اور ٹیکنالوجی غرض مادی ترقی منتہی مقصود ہے۔ لہذا انیس انسانیت کی ترقی کا کوئی علم نہیں کہ وہ کیسے حاصل کی جاسکتی ہے جس پر آخرت اور دائمی زندگی کا دار و مدار ہے۔

بہر حال یہاں پر نماز اور زکوٰۃ دونوں عبادات کا ذکر ہے۔ ایک جسمانی عبادت ہے اور دوسری مالی عبادت۔ قرآن پاک میں ان دونوں کا اکٹھا ذکر قبیس مرتبہ آیا ہے۔ بنی اسرائیل کو بھی تاکید تھی کہ ہر حالت میں نماز پڑھو اور اگر مال نصب تک پہنچ جائے۔ تو اس کی زکوٰۃ بھی ادا کرو۔ نماز کی اس قدر تاکید ہے کہ کسی حالت میں بھی معاف نہیں ہے۔ "فَإِنْ خِفْتُمْ فِرْجَاءَ أَوْ رُكْبَانًا" پس اگر کسی قسم کا خوف ہو تو بھی نماز معاف نہیں ہے۔ تم پیدل ہو یا سواری پر ہو۔ نماز بہر حال پڑھنی پڑے گی۔ سورہ مائدہ میں بنی اسرائیل سے یہی فرمایا "لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَآمَنْتُمْ بِرُسُلِي وَهَدَرْتُمُوهُمْ" یعنی اگر تم نماز قائم کرتے رہو گے، زکوٰۃ ادا کرتے رہو گے۔ اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی مدد کرو گے۔ تو میری مہربانیاں تمہارے شامل حال رہیں گی مگر بنی اسرائیل نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی نہ کی۔ بلکہ "فَتَوَلَّيْتُمْ مِمَّا رَّبِّي أَمْرًا قَلِيلًا مِّنْكُمْ" مگر تم میں سے بہت گھوٹے ایسے تھے جو اس عہد پر قائم ہے۔ "وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ" اور تم اعراض کرنے والے ہو۔ تم نے اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کے احکام سے اعراض کیا۔ اور آج بھی ایسا ہی کر رہے ہو۔ تمہیں علم نہیں کہ اس کا نتیجہ کتنا بُرا نکلتے گا۔ اور تمہارا حشر کتنا عبرتناک ہوگا۔

وَلَا تَأْخُذْ بَاِمْثَالِكُمْ لَا تَنْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تَخْرُجُوْنَ
 اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرُرْكُمْ وَاَنْتُمْ تَتُهَدُّوْنَ
 (۸۵) ثُمَّ اَنْتُمْ مُّوَلَّآءُ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُرْجَوْنَ
 فَرِیْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظْهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِاِلٰهٍ ثُمَّ
 وَالْعُدُوَّ اِنْ رَاْنِیَا لَوْ كُمْ اُسْرٰی تَقْدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ
 عَلَیْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ
 بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاؤُ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزٰیٌ
 فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَلِیَوْمِ الْقِیَمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰی اَشَدِّ الْعَذَابِ
 وَمَا لِّلّٰهِ بِمَنَافِعٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۸۶) اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَدَّ
 الْحَبْرُ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ
 وَلَا هُمْ یُنصَرُوْنَ (۸۷)

ج

ترجمہ: اور اس واقعہ کو یاد کرو، جب ہم نے تم سے پختہ عمل لیا تھا کہ آپس
 میں خونریزی نہ کر دو گے۔ اور نہ ایک دوسرے کو اپنے شہروں سے نکال دو گے۔ پھر تم
 نے اقرار کیا۔ اور تم اس پر گواہ ہو (۸۵) پھر تم وہی ہو۔ جو ایک دوسرے
 کو قتل کرتے ہو۔ اور نکالتے ہو تم ان کو وطنوں سے۔ تم چڑھائی کرتے ہو ان پر گناہ اور
 زیادتی کے ساتھ۔ اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی ہو کر آئیں۔ تو مذہب دیکر ان کو چھڑا لیتے
 ہو۔ حالانکہ ان کا مکان بھی تم پر حرام ہے۔ کیا تم کتاب کے بعض حصے پر ایمان لائے
 ہو۔ اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو۔ پس جو کوئی ایسا کرتا ہے تم میں سے۔ تو
 اس کا بدلہ سوائے اس کے نہیں ہے۔ کہ ان کے لیے دنیا کی زندگی میں رسوائی ہے۔
 اور قیامت کے دن سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ان باتوں

سے بے خبر نہیں ہے۔ جو تم کرتے ہو (۸۵) یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے میں خریدا ہے۔ پس ان سے عذاب ہٹا نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی (۸۶)

بنی اسرائیل کی غمہ شکنیوں کا ذکر آ رہا ہے۔ اس سے پیشتر اس عہد کا بیان ہو چکا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے اجتماعی حقوق اور انسانی حقوق سے متعلق بنی اسرائیل سے بذریعہ توراۃ لیا تھا۔ مگر انہوں نے اس عہد کو پورا بھی نہ کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ پھر چند آدمیوں کے ساتھ سب اس عہد سے پھر گئے۔ اور تم تو اصرار کرنے والے ہی ہو۔

خون ناحق اور جلا وطنی بڑے گناہوں میں سے ہیں۔ ان دو باتوں سے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے توراۃ میں عہد لیا تھا۔ کہ ان گناہوں کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ مگر یہ قوم اس عہد پر بھی قائم نہ رہی۔ ارشاد ہوتا ہے۔ فَاذْخِذْنَا هَيْثَ أَفَكْتُمْ جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا لَا تَنْفِكُونِ دِمَاءَ كُمُ کہ تم ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے۔ یعنی اپنے ہی بھائی بندوں اور اپنے ہم مذہب اور اپنی ہی ملت والوں کا قتل ناحق نہیں کرو گے۔ جس طرح یہ حکم آج تک بائبل میں موجود ہے۔ یہی حکم قرآن پاک میں موجود ہے۔ آگے سورۃ نساء۔ سورۃ بنی اسرائیل اور سورۃ فرقان میں آئے گا۔ کہ ایک دوسرے کا خون نہ بہاؤ۔ یہ قطعاً حرام ہے اور اکبر الکبائر یعنی سب سے بڑے گناہوں میں شمار ہوتا ہے۔

توراۃ میں دوسرا حکم یہ تھا لَا تَحْبِرْ جُؤَانَ الْفُسُكَةِ مِنْ دِيَارِكُمْ یعنی تم اپنے ہم مسلک لوگوں کو ان کے گھروں سے نہیں نکالو گے۔ مگر تم نے اس عہد کا بھی پاس نہ کیا۔ فرمایا اَقْرَبْتُمْ یہ الفاظ توراۃ میں موجود ہیں۔ کہ اے بنی اسرائیل! تم نے اقرار کیا کہ وعدہ کو ایفاء کریں گے۔ اور توراۃ کے حکام کی پابندی کریں گے۔ وَأَنْتُمْ فَشَقَّ كُفُّنَ اور تم خود اس بات کے گواہ ہو کہ ایسا ہی ہوا تھا۔ تم نے اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ اقرار کیا تھا۔ کہ تم اپنے بھائیوں کا خون نہیں بہاؤ گے اور نہ ہی انہیں جلا وطن کر دو گے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ کہ اے بنی اسرائیل! تم ان قلم تر و عددوں کے باوجود لَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ الْفُسُكَةَ یہ تمہیں ہی ہوا جو ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو بنی اسرائیل کی غمہ شکنی

ماتق خون بہاتے ہو۔ وَتُخْرِجُونَ فِرْيَاتًا مِنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ اور ایک گروہ کو ان کے گھروں سے بھی نکالتے ہو۔ یہی نہیں بلکہ ظہر رُودًا عَلَيْهِمْ بِالْأَشْمِ وَالْعُدُوانِ تم ان پر چڑھائی کرتے ہو گناہ اور تعدی کے ساتھ۔ کسی پر حملہ کرنا انیس جاتی اور مالی نقصان پہنچانا گناہ بھی ہے۔ اور مظلوموں کے ساتھ زیادتی بھی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کر کے گناہ کے مرتکب ہوئے۔ اور خلق خدا کے حقوق منہاج کر کے زیادتی کا ارتکاب کیا۔ یہ اُمم اور مردان میں آتا ہے۔

فرمایا تمہاری عجیب ذہنیت ہے کہ جن لوگوں کو تم جلا وطن کرتے ہو وَإِنْ يَأْتُوكُمُ اسْلَویٰ جب یہی لوگ تمہارے پاس قیدی بن کر آتے ہیں فَغَدُوهُمْ تم انہیں فدیہ دیکر چھڑا لیتے ہو۔ پہلے خود ہی انہیں گھروں سے نکال کر اور پھر ان کا معاوضہ دیکر انہیں واپس لیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَهُوَ مُحَرَّرٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ان کا جلا وطن کرنا ہی تم پر حرام تھا تمہیں ایسا کام کرنا ہی نہ چاہیے تھا۔ جس کی وجہ سے تمہیں فدیہ کا مالی بوجھ بھی برداشت کرنا پڑا۔ دراصل بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے تھے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے نہیں قیدیوں کی رہائی کی تلقین کی تھی۔ اور یہ اچھی بات تھی مگر جہاں یہ لوگ اس حکم پر عمل کرتے تھے وہاں دوسرے دو احکام یعنی قتل ناحق اور جلا وطنی کے معاملہ میں عمل نہیں کرتے تھے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَفْتَوْا مِنْهُنَّ بَعْضُ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُ مِنْ بَعْضٍ کیا تم کتاب کے بعض احکام پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا انکار کر دیتے ہو؟

فرمایا جو لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرتے ہیں کہ جس حصے پر چاہا عمل کر لیا۔ اور جس کو چاہا چھوڑ دیا۔ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ تَمَّ مِنْ سِیِّئِہِمْ کرنے والوں کی جزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ اَلْاِخْزَیٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا میں انکی جزا ذلت ہوگی۔ وَلِیَوْمِ نَقِیْمَہِ یُرَدُّوْنَ اِلَیْ اَشَدِّ الْعَذَابِ اور قیامت کے روز سخت عذاب کی طرف واپس جائیں گے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ یہودیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ یہود۔ بنو قریظہ، بنو نضیر اور خیبر واسے سب ذیل و غار ہو کر مغلوب ہوئے۔ بنو قریظہ سخت سازشی قسم کے لوگ تھے۔ ان کا حشر بہت بُرا ہوا بعض قتل ہوئے اور بعض کو جلا وطن کیا گیا۔ اسی طرح قبیلہ بنو قینقاع والوں نے بھی ذلت و رسوائی کا منہ دیکھا۔ اس کا ذکر سورۃ حشر میں

تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تو ان کی زندگی میں عذاب ہوا۔ فرمایا آخرت کا عذاب تو سخت ترین ہو گا۔ اور یہ لوگ اس میں بھی مبتلا ہو گئے۔

یہودیوں کی
بامی لڑائیاں

ان آیات میں یہودیوں کی جس بامی جنگ و جدل اور جلا وطنی کا ذکر ہے۔ اس کے متعلق حضرت شیخ المنہ حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ مدینہ کے دو بڑے قبیلے اوس اور خزرج تھے۔ جو اکثر آپس میں دست درگوبی کرتے تھے۔ ان کی آبادی ہزاروں کی تعداد میں پہنچی تھی۔ جب مدینہ میں اسلام کی شمع روشن ہوئی تو انصار مدینہ کی اکثریت بھی انہیں دو قبا میں سے تھی۔ اب بنو قریظہ قبیلہ اوس کے حامی تھے۔ اور بنو نضیر قبیلہ خزرج کے طرفدار تھے۔ گویا یہودی اس طریقے سے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے ان میں اکثر جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ جب ایک قبیلہ دوسرے پر غالب آتا، تو وہ مغلوب کو جلا وطن کر دیتا یا ان کو قتل کر دیتا اور ان کے مکانوں کو گرا دیتا۔ یہ سب ہم مذہب تھے۔ مگر دوسرے قبیلے کے ساتھ منسلک ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ پھر یہی لوگ جنہوں نے انہیں جلا وطن کیا تھا مال اکٹھا کرتے اور ان کا معاوضہ ادا کر کے انہیں قید سے رہائی دلاتے۔ یہ لوگ قیدی کو چھڑانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ مگر کشت و خون اور جلا وطنی کے احکام کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اسی خصلت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مفسرین کرام مشرکین کی ایک دوسری لڑائی کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ جسے حرب بعاث کہا جاتا ہے۔ یہ لڑائی چالیس سال تک جاری رہی۔ اس لڑائی میں بھی یہودی مختلف گروہوں میں منقسم تھے۔ یہودیوں کا ایک قبیلہ ایک فریق جنگ کے ساتھ تھا۔ جب کہ دوسرا قبیلہ دوسرے کے ساتھ تھا۔ اس جنگ میں بھی یہودیوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا۔ اگر کوئی ہم مذہب بھی سامنے آگیا اُسے بھی مار ڈالتے تھے۔

امام ابن کثیرؒ نے بھی ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں مکه ایران کی طرف کسی جہاد میں مصروف تھے۔ اسلامی فوج میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ بھی شامل تھے۔ جو ایک یہودی عالم تھے مگر اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دولت سے مشرف کیا تھا۔ جب جہاد میں مکه

کو فتح حاصل ہوئی۔ تو بہت سے قیدی بھی ہاتھ آئے۔ جن میں دو یہودی بھی شامل تھے۔ جو کہ مجوسیوں کی طرف سے جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ ان میں ایک یہودی عورت لونڈی بن کر آئی۔ جسے حضرت عبداللہ بن سلامؑ نے فوراً درہم میں خرید لیا۔ جب آپ کو فریسی واپس آئے۔ تو وہاں کے ایک مشہور و معروف یہودی اس الجالوت سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے یہودی کو وہ لونڈی فروخت کرنے کی پیش کش کی۔ وہ رضامند ہو گیا۔ اور قیمت دریافت کی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اسے نو سو درہم میں خریدا ہے۔ مگر اب میں چار ہزار درہم سے کم پر نہیں دوں گا۔ پہلے تو اس الجالوت اتنی بڑی رقم لینے پر تیار نہ ہوا۔ پھر حضرت عبداللہ بن سلامؑ نے اس کے کان میں توراۃ کی وہی آیت پڑھی **وَإِنْ يَأْتِوكُمُ اسْرٰی تَفْدُوْهُمْ عَمَّا مَعٰی** جب تم مارا کوئی عیسائی قیدی بن کر آئے تو اسے چھڑا دو۔ یہ سن کر یہودی مجبور ہو گیا۔ اور اس نے چار ہزار کے بدلے میں ہی خریدنا منظور کر لیا۔ مگر حضرت عبداللہ بن سلامؑ نے دو ہزار درہم سے لے کر باقی دو ہزار واپس کر دیے۔ اور اس طرح لونڈی اس کے پاس فروخت کر دیں۔ معتصد یہ کہ یہودی قیدیوں کو چھڑانے والے حکم پر سختی سے کار بند تھے۔ اگرچہ در سکرا احکام کی پروا نہیں کرتے تھے۔

مسلمانوں کی
حالتِ زار

یہودیوں کے جزوی ایمان کا جو نقشہ قرآن پاکؑ نے ان آیات میں کھینچا ہے۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے۔ تو آج کل مسلمانوں کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں۔ آج مسلمانوں کی حالت بھی یہی ہے۔ کہ قرآن پاکؑ کے کسی حصہ پر ایمان لاتے ہیں۔ اور بعض احکام کو نہیں مانتے۔ اسی لیے تو دنیا میں رسوا ہو رہے ہیں۔ غلامی سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے تہذیب مٹ جاتی ہے۔ دیکھیے کابل والوں کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ افغانستان پر غیر کا قبضہ ہو چکا ہے۔ یہی حال اس سے پہلے کمرون اور بنجا کا راقا فلسطین میں کیا ہو رہا ہے۔ بنگالیوں کو کون سی عزت نصیب ہو رہی ہے۔ یہ سب ذلت و رسوائی نہیں تو اور کیا ہے؟

وجہ یہی ہے کہ مسلمانوں نے بھی یہودیوں کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ جو حکم ان کی خواہش کے مطابق ہوتا ہے۔ اُسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور جو ان کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے۔ اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ معاملہ نکاح و عداوت کہ سو یا سیاہی نوعیت کا ہو۔ اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے قانون کی پروا نہیں کرتے۔ عدل احسان اور تقویٰ کو فراموش کر دیتا ہے۔

محض نفسانی خواہشات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ لہذا مسلمانوں کا شرعی یودیوں سے مختلف نہیں ہے۔ جب انگریز نے ہندوستان میں تسلط قائم کیا، تو انہوں نے مسلمانوں سے بھی پوچھا تھا کہ تم اپنے ذاتی معاملات میں شرعی قوانین کا اطلاق چاہو گے۔ یا مقامی رواج کے مطابق اپنے مسائل کا حل کر سکتے ہو؟ مسلمان ہیں جنہوں نے لکھ کر دے دیا تھا کہ ہمیں شریعت کا قانون وراثت منظور نہیں ہے۔ ہمارا فیصلہ رواج کے مطابق کیا جائے۔ حالت آج بھی یہی ہے۔ دعویٰ یہی ہے کہ بسم قرآن و حدیث کو برحق مانتے ہیں۔ مگر ان کے احکام پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ عبادت تو تھوڑی بہت کر لیتے ہیں۔ مگر تعزیرات کے قانون پر کیوں عمل نہیں کرتے۔ جہاد جیسی اہم چیز کو نہیں اپناتے۔ جس کے لیے قرآن و حدیث کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں سیودی اور مسلمان برابر ہیں۔ نہ ان کا اپنی شریعت پر عمل ہے۔ اور نہ مسلمانوں کو احکام کا پاس ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی دروغی کا نتیجہ سوائے تباہی و بربادی کے اور کیا ہو گا۔

فرمایا وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ جو کچھ تم کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اُس سے غافل نہیں ہے۔ تم جو کچھ بھی کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ وہ تمہارے دلوں میں مخفی ارادوں تک سے واقف ہے۔ اُس لیے وہ اسی کے مطابق جزائے گا۔ جب خدا تعالیٰ کی گرفت آئے گی۔ تو سخت عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی ان کرتوتوں کی وجہ سے آخرت کی دائمی زندگی کے بدلے دنیا کی عارضی اور حقیر زندگی کو خرید لیا ہے۔ اِس لیے لوگوں کا حال یہ ہو گا کہ جب وہ عذاب میں جکڑے جائیں گے فَلَا يَخَفُّ عَنْهُمْ الْعَذَابُ تو پھر ان کے عذاب میں تخفیف بھی نہیں ہوگی وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ اور نہ ہی کسی طرف سے انہیں امداد پہنچ سکے گی۔

اللہ تعالیٰ
عالم غیب ہے

الْمَآءِ

درستی و درشتی

البقرة ۲

(آیت ۸۷، ۹۰)

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ رَافِعِينَ مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ وَأَتَيْنَا
 نِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيْتَ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ
 رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَى أَنْفُسُكُمْ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ
 وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ﴿٨٧﴾ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ
 بِكُفْرِهِمْ فَهُمْ قَلِيلٌ مَّا يُوْمِنُونَ ﴿٨٨﴾ وَلَمَّا جَاءَهُمْ
 كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ
 يَسْتَفْهِمُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ مَّا جَاءَهُمْ مَّا عَرَفُوا
 كَذِبًا أُولَئِكَ فَلَعَنَ اللَّهُ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٨٩﴾ بِسْمَا أَشْرَوْا بِهِ
 أَنْفُسَهُمْ أَنْ تَكْفُرُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ بَغْيًا أَنْ يَنْزِلَ اللَّهُ
 مِنْ فَضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ فَبَاءُوا وَبَغَضِبَ عَلَى
 غَضِبٍ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿٩٠﴾

ترجمہ: اور اب اسے تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی۔ اور ہم نے ان کے
 پیچھے بہت سے رسول بھیجے۔ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو نبیات (واضع اور کھلی باتیں)
 دیں۔ اور ہم نے ان کی پاک روح کے ساتھ تائید کی۔ کیا جب بھی تمہارے پاس رسول
 کوئی ایسی چیز لے کر آیا، جسے تمہارے نفس نہیں چاہتے تھے۔ تو تم نے ٹھکرایا پس
 ایک فرقہ کو تم نے مٹا دیا، اور ایک کو قتل کر دیا ﴿۸۷﴾ اور انہوں نے کہا، ہمارے
 دل غلافوں میں ہیں۔ ہمیں بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ہے۔ ان کے کفر کی وجہ سے
 پس بہت تھوڑے ہیں جو ایمان لاتے ہیں ﴿۸۸﴾ اور جب ان کے پاس اللہ تعالیٰ
 کی کتاب آئی، اس چیز کی تصدیق کرنے والی، جو ان کے پاس ہے۔ اور اس سے
 پہلے وہ کافروں پر فتح مانگتے تھے۔ اور جب ان کے پاس وہ چیز آئی، جسے

انہوں نے پہچان لیا، تو اس کے ساتھ کھڑا کیا، پس کھڑے کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے (۸۸) وہ بری چیز ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنے انسوں کو بیچا ہے۔ کہ کھڑے کرتے ہیں اس چیز پر جس کو لٹھنے آتا ہے۔ سرکشی کرتے ہیں اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اتارتا ہے۔

پس یہ لوگ غضب پر غضب بے کرونے اور کافروں کے لیے ذلت ناک خدایا (۸۹)

اس سے پہلے بنی اسرائیل کے مختلف عہدوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ جن کی پابندی کرنے

کے یہ قوم قاصر رہی۔ اب بعض اوستہ انعامات کا تذکرہ ہو رہا ہے جو بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ

نے کیے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ہم خدا ان انعامات کے ایک یہ بھی تھا کہ وَلَقَدْ

آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ یعنی بے شک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب توراہ عطا فرمائی تاکہ

بنی اسرائیل اُس کے ذریعے ہدایت اور راہنمائی حاصل کر سکیں۔ اور پھر یہ کہ صرف کتاب پر ہی اکتفا

نہیں کیا۔ بلکہ کتاب میں مذکور احکام کی یاد دہانی کے لیے وَقَفْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ

اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد پہلے درپے رسول بھیجے۔ جو توراہ کی تعلیم کو تبلیغ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ

کی طرف سے پیغمبر کا مبعوث ہونا بنی نوع انسان پر اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی اور شفقت ہے

انبیاء علیہم السلام لوگوں کی مشکلات کا حل پیش کرتے ہیں۔ اور ان کی راہنمائی فرماتے ہیں حضرت

موسیٰ علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس قدر پیغمبر بھیجے ان میں سے بعض کا نام بھی قرآن پاک نے

ذکر کیا ہے۔ جیسے حضرت داؤد علیہ السلام سلیمان علیہ السلام۔ یونس علیہ السلام۔ زکریا علیہ السلام۔ یحییٰ علیہ السلام

اور پھر سلسلہ بنی اسرائیل کے آخری رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ اسی طرح توراہ اور یہودیوں کی دیگر کتب

میں بھی بہت سے انبیاء علیہم السلام کا ذکر ملتا ہے۔ مفسرین کلام فرماتے ہیں کہ مجموعی طور پر تقریباً ہزار

پیغمبر بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے سلسلہ بنی اسرائیل کے آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ آپ
صاحب کتاب اور اللہ تعالیٰ کے عظیم المہرت رسول ہیں چنانچہ آپ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے
حضرت عیسیٰ علیہ السلام
و معجزات

وَتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيْتَاتِ اور ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں عطا کیں۔ اور ان سے مراد وہ معجزات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کئے۔ اور جو قرآن پاک میں مذکور ہیں مثلاً مردوں کو زندہ کرنا۔ کوڑی کو تہہ بست کر دینا۔ اور مٹی کا پرندہ بنا کر اس میں پھونک مارنا اور اُسے ہوا میں اڑا دینا۔ وغیرہ وغیرہ۔ بیانات سے احکام اور دلائل بھی مراد لیا جاتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے سنت عیسیٰ علیہ السلام و احکام میں دیے تھے اور دلائل بھی دیے تھے۔

عیسیٰ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ عیسیٰ۔ یسوع یا یسوع کا معنی مبارک ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نام مریم رضی اللہ عنہا تھا۔ آپ کی نالی نے تدرمانی معنی کہ اگر اللہ تعالیٰ اُسے بیٹا عطا کر لیا۔ تو وہ اُسے بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقت کر دیگی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت کہ اُس نے بیٹے کی بجائے بیٹی عطا کی۔ آپ کو پریشانی لاحق ہوئی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمہیں بیٹی عطا کی ہے۔ ہم نے اُسے بہت برگزیدہ اور پاکیزہ بنایا ہے۔ بیٹا اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ حضرت مریم کی فضیلت اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک میں بیان فرمائی ہے: **يُصْرِيحُ** **اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكَ وَطَهَّرَكَ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ** یعنی اے مریم! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا۔ اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھے برتری عطا کی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن پاک میں جہاں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہوگا۔ عموماً عیسیٰ ابن مریم کا نام ہوگا۔ آگے سورۃ مائدہ میں آئے گا۔ کہ آپ کے حواری بھی آپ کو عیسیٰ ابن مریم کے نام سے جانتے تھے، اور اسی نام سے خطاب کرتے تھے۔ وہ ابن اللہ کے نام سے یاد نہیں کرتے۔ نہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خود خدا تصور کرتے تھے۔ بلکہ یہ غلط عقیدہ تو بعد میں ایک عیسائی پادری پولس کا پیدا کردہ ہے۔ کہ حضرت مسیح علیہ السلام خود خدا، خدا کے بیٹے یا مینوں میں سے تیسرے ہیں۔ یہ بالکل کفریہ عقیدہ ہے۔

روح القدس

فرمایا ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں عنایت کیں۔ اور اس کے ساتھ **وَاَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ** اس کی تائید ہم نے پاک روح سے کی۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ روح القدس سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ یعنی ہم نے جبرائیل کے ذریعے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد کی۔ اس بات کی تائید قرآن پاک کے دوسرے مقام پر بھی ہوتی ہے۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۖ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ
 مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝۱۰۱ اس قرآن پاک کو روح الامین یعنی جبرائیل علیہ السلام نے آپ کے قلب
 مبارک پر نازل کیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام اپنے شاعر حسان بن ثابت کو
 حکم فرماتے۔ تو وہ مشرکین کو شعروں میں جواب دیتے اور فرماتے روئے الامین کی تائید مقامے ساتھ
 ہوگی۔ تم ان کا فزوں کو جواب دو۔ تو یہاں بھی روئے الامین سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہی ہیں۔
 بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ روح القدس سے مراد اسمِ عظیم ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء
 میں سے ایک اسم ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے انسان کی دعا قبول ہو
 جاتی ہے اور اسی اسمِ عظیم کی برکت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر معجزے کا انبار ہوا تھا جب
 آپ مرنے کو زندہ کرتے تھے۔ یا مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتے تھے۔ تو یہ اسمِ عظیم کی
 برکت سے ہوتا تھا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ روح القدس ملاء الاعلیٰ کے فرشتوں کی
 مسلسل توجہ کا نام ہے۔ ان کی حکمت کے مطابق ملاء الاعلیٰ کے فرشتوں کا حظیرۃ القدس
 جیسے پاک مقام پر توجہ کرنا روح القدس کے آداب ہے۔

انبیاء علیہم السلام
 کے ساتھ سلوک

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرے کے بعد بنی اسرائیل کے
 اپنے پیغمبروں کے ساتھ عام طرزِ عمل کا ذکر کیا کہ اے بنی اسرائیل! اَفْكَمًا جَاءَ كُمْ
 رَسُولٌ اٰمَنًا يٰۤهٰٓؤُلَاۤءِ يٰۤهٰٓؤُلَاۤءِ اَفْكَمًا جَاءَ كُمْ رَسُولٌ اٰمَنًا يٰۤهٰٓؤُلَاۤءِ اَفْكَمًا جَاءَ كُمْ رَسُولٌ اٰمَنًا
 جسے تمہارے نفس پسند نہیں کرتے تھے اُسْتَكْبَرْتُمْ تَوَقُّمًا تَجَرُّمًا تَجَرُّمًا تَجَرُّمًا
 اسرائیلیوں میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ احکام کی نافرمانی تجرمانہ سرشی کی وجہ سے ہوتی ہے۔
 فرمائیے بنی اسرائیل! تمہارے اسی تکبر کی وجہ سے فَفَرِّقْنَا كَذٰلِكَ اَنْبِيَآءَ عَلَیْہِمُ السَّلَامُ
 کے ایک گروہ کو تم نے جھٹلایا وَفَرِّقْنَا فَنَقَلْتُمْ اَوَّلَ اَیْمَانٍ زُرِدَہ کو قتل کیا۔ قرآن پاک
 میں حضرت زکریا علیہ السلام کا تذکرہ موجود ہے۔ حدیث شریف میں تو ایسے سینکڑوں نبیوں

ذکر کرتا ہے۔ جنہیں اسرائیلیوں نے قتل کیا۔ کیونکہ وہ ان کی مرضی کے خلاف اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچاتے تھے۔ جو بنی اسرائیل کے موافق نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک دگ فغانی خواہشات کی اتباع اور خدا کی قانون کی خلاف ورزی کرتے رہیں گے انہیں فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ الغرض! اسرائیلیوں میں یہ دو بیماریاں یعنی اتباع خواہشات اور تکبر پائی جاتی تھیں۔ جن کی وجہ سے انہوں نے بعض نبیوں کو جھٹلایا اور بعض کو قتل کر دیا۔

یہودیوں کا
زعم باطل

یہودیوں کو ایک اور غلط زعم تھا کہ وہ صاحب علم ہیں۔ ان پر کسی بیرونی تبلیغ کا اثر نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک کے الفاظ میں ان کا دعویٰ تھا وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ کہ ہمارے دل غلافوں میں بند ہیں، یہ ان کی خود ستائشی تھی کہ صاحب کتاب ہونے کی وجہ سے وہ ہر قسم کے اثرات سے محفوظ ہیں۔ لہذا وہ اپنے دین پر پختہ ہیں۔ اس میں کوئی بگاڑ پیدا نہیں کر سکتا۔ مقصد یہ کہ جس طرح غلاف میں بند کوئی چیز بیرونی اثرات اور تغیر و تبدل سے محفوظ ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کے دل بھی غلاف میں بند ہیں۔ اور ان کے اختیار کردہ دین میں کسی قسم کا بگاڑ پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا یہ نظریہ واقعی مبنیٰ پایہ تھا۔ بشرطیکہ ان کے پاس صحیح علم ہوتا، ان کے عقائد درست ہوتے اور وہ اپنے صحیح دین کو محفوظ کر سکتے۔ مگر حقیقت اس کے برخلاف تھی۔ وہ تو خود اپنا دین بگاڑ پٹے تھے۔ غلط عقائد اختیار کر چکے تھے اور پھر ان پر اصرار کرتے تھے۔ جب بھی ان کے پاس حق بات ملے کہ انہیں علیہم السلام آتے۔ وہ انہیں جھٹلاتے یا قتل کر دیتے۔

یہودیوں پر اللہ تعالیٰ
کی لعنت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہودیوں کا یہ دعویٰ کہ ان کے دل محفوظ ہیں۔ درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے بَلْ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ حَقًّا۔ مسلمان کے گھر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی ہے۔ اور انہیں اپنی رست سے زور کر دیا ہے۔ ان کے قلب مٹا دیے ہوئے ہیں۔ اور فہم الٹ گئے ہیں۔ یہ حق بات کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے فَقِيلَ مَا يُوَسُّوْنَ وَاَنْ كُنْ بِتَقِيلٍ تَعِدُّوْا اِيْمَانًا ۝۱۰۰ سورۃ مائدہ میں کسی چیز کو فرمایا وَاَنْ كُنْ بِتَقِيلٍ یعنی تم میں سے اکثر منافق ہیں۔ اگرچہ سارے کے سامنے نافرمان نہیں تھے۔ بائیں ہاتھ سے نہیں ہٹتے۔ لٰكِنَّمَا تَتَّبِعُونَ الْاَوَّلَیْنَ اَلَمْ يَكُنْ لَكُمْ اٰیٰتٌ ۙ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۱ یعنی ان کی روایت چننے والوں کے پاس

یہود اور
نزدول قرآن

یہ تذکرہ تو زور کی اپنی کتاب توروہ تھا کہ انہوں نے اس کے احکام کی اس مذہب پابندی کی۔ اب اس بات کا بیان ہے کہ جب قرآن پاک کا نزول ہوا تو اس کے سارے نبیوں نے کیا رویہ اختیار کیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ رَبِّهِمْ لَقُواْ كَافِرًا۔ ان کے پاس وہ کتاب آگئی۔ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ جو ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ جو ان کے پاس موجود ہیں۔ مصدق کتاب سے مراد قرآن پاک ہے۔ اور سابقہ کتب میں زبور، توروہ، انجیل اور دیگر صحیفہ کاریہ ہیں۔ یعنی جب قرآن پاک نازل ہوا۔ کفر کو واپس نہ تو بنی اسرائیل نے اس کا بھی انکار کر دیا۔ بلکہ قرآن پاک ان کے پاس موجود سابقہ کتابوں کی تصدیق کر رہا ہے۔

لفظ "كَفَرُواْ بِهٖ" بعد میں آتا ہے۔ ایت کے درمیانی حصہ میں یہودیوں کی ایک روایت کا ذکر ہے۔ وَكَانُواْ مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُواْ۔ یعنی نزول قرآن سے پہلے وہ کفار پر فتح مانگتے تھے۔ مغربین کہتے ہیں کہ یسْتَفْتِحُونَ کے درجے کے ہیں۔ فتح کے معنی کھولنے کے ہوتے ہیں۔ تو اس لحاظ سے تھی یہ ہے۔ بنی اسرائیل کفار پر اس بات کو کھولتے تھے۔ یعنی بیان کرتے تھے کہ انہوں نے بنی اور اللہ تعالیٰ کی کتاب آنے والی ہے۔ اُس پر ایمان لانا۔ سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ الَّذِیْ یُحَدِّثُكَ مَکْتُوبًا عِندَہُمْ فِی التَّوْرَةِ وَانِیْجِیْلَ۔ یعنی وہ اپنی کتابوں توروہ اور انجیل میں سچا ہوا پاتے تھے۔ کہ آخری نبی آنے والا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے صحیفہ میں بھی بشارت ہے کہ میں تمہیں میں اُمی نبی بھیجوں گا۔

یَسْتَفْتِحُونَ کا دوسرا معنی فتح یا کامیابی ہے۔ مغربین کا یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے کافروں کے مقابلے میں فتح یا کامیابی طلب کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے۔ یا اللہ ہمیں اس آنے والے نبی کی برکت سے کافروں کے مقابلے میں فتح نصیب فرما۔ تاکہ جب وہ نبی آئے تو ہم اس کی اتباع کر سکیں۔ گویا بنی آخر الزماں کے توسل سے مانگتے تھے

نظریہ توسل ہمارے مذہب میں بھی روا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی مقرب بندے کی برکت سے یا اس کے طفیل سے کوئی دعا مانگی جائے اس میں کوئی عرج نہیں۔ کیونکہ مانگنا تو اللہ تعالیٰ ہی سے ہے۔ صاحب وسیلہ اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ ہے اُس نے ہمیں راہ راست کی تعلیم دی ہے۔ ہمیں اس سے محبت ہے۔ لہذا اس کے طفیل یا اس کی برکت سے خدا تعالیٰ ہماری دعا قبول کرے۔ ہاں شرک اس وقت ہوگا جب اس کے توسل کی بجائے خود اُسی سے مانگنے لگے یا اس کو مشرکوں کی طرح شمع سمجھے یا اس کو مفتاح مطلق سمجھے کہ اسے دعا کے قبول کرنے یا کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

بہر حال پہلے تو یہ لوگ اس قسم کی دعائیں مانگتے تھے۔ اور وعدہ کرتے تھے کہ اے نبی! پڑھنا لا یموت۔ فَلَمَّا جَاءَهُمْ پس جب وہ چیز آگئی جس کے وہ منتظر تھے۔ مَاعَوْفُوًّا اور اُسے انہوں نے پہچان بھی لیا کَفَرُوا بِہ اس کے باوجود اس کا انکار کر دیا ان کی اس مہٹ دھرمی اور کفر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَعَنَہُ اللہِ عَلَی الْکَافِرِینَ ایسے منکرین پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

نبی آخر الزمان
صلی اللہ علیہ وسلم
سے نہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان ظالموں نے ایسی بُری حرکات کر کے کیا کہا۔ بِسْمَا اسْتَعَاذُوا بِہِ اَنْفُسُہُمْ انہوں نے نہایت ہی بُری چیز کے بدلے اپنی جانوں کو بیچا وہ کون سی چیز ہے جو انہوں نے جان کے بدلے فرمائی اَنْ یَّکْفُرُوا بِمَا اَنْزَلَ اللہُ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب، شریعت اور وحی کا انکار کر دیا۔ اور یہ محض اس لیے بَغِیَا شَرَات کرتے ہوئے۔ کہ نبی آخر الزمان دوسری قوم میں کیوں آگیا۔ وہ تو ہماری قوم بنی اسرائیل میں آنا چاہیے تھا۔ وہ بنو اسماعیل میں کیسے آگیا۔ چنانچہ قرآن پاک نے جگہ جگہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہاں کہاں کہ ہے کہ آخری نبی ضرور بنی اسرائیل میں آئے گا۔ فرمایا حقیقت یہ ہے اَنْ یُّنَزَّلَ اللہُ مِنْ فَضْلِہِ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہِ اللہ تعالیٰ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے۔ اتار دیتا ہے۔ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے ہزاروں نبی بھیجے۔ مگر نبی آخر الزمان کی بعثت بنی اسماعیل میں مقدر ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ وہیں تشریف لائے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے آخری نبی کا کوئی وعدہ نہیں کر رکھا تھا۔ اب جب کہ آخری نبی آگئے ہیں۔ تو بنی اسرائیل کا

فرمنا تھا کہ وہ اسے پیٹنے کے باعث فخر سمجھتے ہوئے اس پر ایمان لاتے اور ان کا اتباع کرتے۔ اس کے برخلاف انہوں نے سرکشی کا راستہ اختیار کیا اور اپنے خاندانی تفوق کا دم بھرنے لگے جو ان کے لیے مناسب نہ تھا۔

بنی اسرائیل کی سرکشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَبَاؤُاْ وَبِغَضِبِ عَلٰی غَضِبِ وہ غضب پر غضب لے کر لوٹے۔ ان کا پہلا غضب تو یہ تھا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا۔ بادشاہ نے انہیں سولی پر لٹکانے کا حکم دیا۔ منہ پر محو کا اور حضرت مسیح علیہ السلام کو معاذ اللہ دجال کہا۔ انہیں ایذا پہنچائی۔ کتب کا دیہ میں تحریف کا ارتکاب کیا۔ اور جیلے بانوں سے خدائی احکام کو مالا۔ اور پھر اس غضب پر دوسرا غضب یہ تھا کہ جب بنی آخر الزمان علیہ السلام تشریف لائے اور آخری کتاب نازل ہوئی تو ان کا انکار کر دیا۔ یہ گویا غضب پر غضب ہو گیا۔ اسی لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اَلْيَهُودُ مَعْصُوبٌ وَالنَّصَارَى صَدَلٌ یعنی یود معضوب علیہ ہیں اور نہ ماری گمراہ۔

معضوب اُسے کہتے ہیں جو دیدہ دانستہ احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ آج کا مسلمان بھی جانتا ہے کہ شریعت برحق ہے مگر اس پر عمل نہیں کرتا۔ یہی خرابی بنی اسرائیل میں بھی پائی جاتی تھی۔ وہ پہچانتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اور یہ آخری نبی اور آخری کتاب ہے مگر ایمان نہیں لائے۔ علاوہ ازیں ضلال وہ ہے جسے فہم میں خرابی آجائے۔ اور وہ بھٹک جائے۔ نصاریٰ ضلال ہیں۔ یہ غلطی کرنے والے ہیں۔ فرمایا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ یاد رکھو! انکار کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں دردناک عذاب تیار ہے اگر اس عذاب سے بچنا ہے تو آج بھی راہِ راست پر آجاؤ۔ ورنہ تو تمہارے مقتدر میں ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہودیوں کے حالات منکشف کر کے مسلمانوں کو بھی تنبیہ کر رہا ہے کہ تم بھی یہودیوں کی روش اختیار نہ کر لینا۔ بلکہ ان کی خرابیوں کا ذکر سن کر اپنی اصلاح کر لینا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا تَوُفُّ مِنْ بِنَا أَنْزَلَ
 عَلَيْنَا وَيكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ
 قَدْ فِيهِ تَقْتُنُونَ أَنْبِيَاءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ
 ⑨۱ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَى بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اخْتَلَفْتُمْ الْعِجْلَ مِنْ
 بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ⑨۲ وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا
 فَوْقَكُمْ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا قَالُوا سَمِعْنَا
 وَعَصَيْنَا وَأُتْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ
 بِسْمَايَا مُرْكُمُ بِهِ إِيْمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ⑨۳ قُلْ
 إِنْ كُنْتُمْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ دُونِ
 النَّاسِ فَمَتَمَنُوا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ⑨۴ وَلَنْ
 يَتَمَنَّوهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ
 ⑨۵ وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاتِهِ وَمِنَ الَّذِينَ
 أَشْرَكُوا يُوْذِ أَحَدُهُمْ نَوَيْعَمُ الْفَسْنَةِ وَمَا هُوَ
 بِمُزْحَضٍ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ وَاللَّهُ بَصِيرٌ لِمَا
 يَفْعَلُونَ ⑨۶

مع
عند المعاصرين
=

ترجمہ: اور جب ان (اہل کتاب) سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس
 چیز پر جس کو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے۔ (یعنی قرآن) تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس چیز
 پر ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف نازل کی گئی۔ (یعنی تورات) اور اس کے سوا
 انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ برحق ہے۔ اور تصدیق کرنے والی ہے اس کی جو
 ان کے پاس ہے۔ آپ فرمادیں گے، پس تم کیوں قتل کرتے تھے اللہ تعالیٰ

کے انبیاء کو اس سے پہلے اگر تم ایمان دالے ہو ۹۱) البتہ تحقیق تمہارے پاس
 موسیٰ (علیہ السلام) کبھی نشانیاں ملانے۔ پھر اس کے بعد تم نے کچھ ٹرے کو معبود بنالیا۔
 اور تم ظلم کرنے والے تھے ۹۲) اور جب ہم نے تم سے پختہ عمل لیا۔ اور ہم نے
 تمہارے اوپر کوہ طور کو اٹھایا۔ خبر دو جو ہم نے دیا ہے تم کو مضبوطی کے ساتھ اور سنو۔
 انہوں نے کہا کہ ہم نے سنا اور نہ مانا۔ اور ان کے رب اور میرے کچھ ٹرے کی محبت پڑادی
 گئی ان کے کفر کی وجہ سے۔ آپ کہہ دیجئے کہ وہ بُری بات ہے جس کے لیے تمہارا
 ایمان تمہیں حکم دیتا ہے۔ اگر تم ایمان دالے ہو ۹۳) آپ فرم دیجئے کہ اگر اللہ
 کے نزدیک نہ ت کہ تمہارے لوگوں کے سوا صرف تمہارے لیے غاص ہے
 پس تم موتوں میں نہ کرو، اگر تم پتے ہو ۹۴) اور وہ اس موت کی ہرگز متا نہیں
 نہیں گئے کبھی بھی۔ اس وجہ سے کہ جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔ اور اللہ
 تعالیٰ خوب جانتا ہے ظلم کرنے والوں کو ۹۵) اور البتہ تم ان لوگوں کو زندگی پر
 زیادہ عرصے پاؤ گے لوگوں سے بھی اور ان سے بھی زیادہ عرصے جنہوں نے شرک
 کیا ان میں سے ہر کوئی پسند کرتا ہے کہ اسے ہزار سال عمر دے دی جائے۔ حالانکہ
 عمر اسے خدا کے عذاب سے دور کرنے والی نہیں ہے اگر اس کو اتنی عمر دے
 دی جائے۔ اور اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے جو کچھ یہ کام کرتے ہیں ۹۶)

یہودیوں کی قباحتیں اور ان کی سزائیں بیان ہو رہی ہیں۔ اس سے پہلی آیات میں
 یہودیوں کی بڑائیوں اور ان کے کفر پر اصرار کا ذکر تھا۔ یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ ظلم البتین سب سے عظیم
 کی آمد سے پہلے یہودی ان کے منتظر تھے کہ جب وہ نبی آخر الزمان آئے گا۔ تو اس کا ساتھ دیں
 گے۔ یہودی لوگ آپ کی برکت سے مشرکین پر غلبہ حاصل کرنے کی تمنا بھی کرتے تھے۔ اور اس کے
 لیے دعائیں بھی کرتے تھے۔ مگر جب وہ رسول آگیا جس کا انتظار تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کی آفرین کرنا
 بھی آگئی اور ان لوگوں نے پہچان بھی لیا، تو پھر انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کے دوسرے غضب
 میں مبتلا ہونے۔

ان آیات میں بھی یہودیوں کی مہٹ دھرمی کا ذکر ہے۔ البتہ یہاں ان کو قرآن پاک دعوت ایمان

اور ایمان کی دعوت دے گا۔ ارشاد ہوتا ہے: **وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ امْنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ** جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اس چیز پر ایمان لاؤ۔ جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے۔ یعنی قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ کی فرستادہ کتاب تسلیم کر لو۔ **قَالُوا نَفِذْ مِنْ بَعْدِ مَا أَنْزَلَ عَلَيْنَا ان كِتَابَ** ہوتا ہے نہ تو اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے۔ یعنی توراہ۔ کہتے ہیں کہ ہم تو صرف توراہ کو مانتے ہیں **وَيَكْفُرُونَ بِبَادِرَآءِ ذَٰلِكَ** اور اس کے علاوہ ہر چیز کا انکار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ الحق قرآن پاک برحق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے اور **هٰذَا قَالِمَا مَعَهُمْ** جو کچھ ان کے پاس ہے۔ یعنی توراہ۔ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا توراہ پر ایمان لانے کا دعوے بھی جھوٹا ہے۔ اگر ان بدبختوں کا توراہ پر ایمان ہوتا تو یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لاتے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ لہذا یہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔

یہ ایک اصولی بات ہے کہ جب تک کوئی فرد یا قوم اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ تمام کتابوں پر ایمان نہیں دے گی اور وہ مومن نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ تمام کتب سماویہ کی بنیادی تعلیم تو ایک ہی ہے یعنی ایمانیات اور عبادت کے معاملہ میں تمام کتابیں مساوی ہیں **شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا** یعنی تمہارے لیے بھی وہی دین مقرر کیا گیا ہے۔ جو حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے نبیوں کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ ہاں البتہ مختلف زمان و مکان کے لحاظ سے شریعت میں تھوڑا بہت فرق ضرور ہے۔ **بِمِی فَرِیَا بِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شُرْعَةً وَ مِنْهَا حَآجًا**

قتل انبیاء
علیہم السلام

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے جھوٹے ہونے کی ایک اور دلیل بیان فرمائی ہے۔ ان سے پوچھے کہ اگر توراہ پر تمہارا ایمان ہے **قُلْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوَ أَنْبِيَآءَ اللَّهِ** قَبْلَ أَنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ تو تم نے اس سے پہلے اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کیا ہے۔ قتل انبیاء علیہم السلام تمہاری کون سی کتاب جائز قرار دیتی ہے۔ یہ تو میری کھڑکی اظہاف کی بات یہ ہے کہ بعد میں آنے والے بنی اسرائیل قاتلانِ انبیاء اپنے اباؤ اباء پر فخر کرتے تھے۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو پھر ایسا کیوں ہے؟ ظاہر ہے کہ اپنے نبیوں کے

جرم میں تم بھی شریک ہو۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت یہودی بھی اپنے
 اباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے درپے تھے۔
 اس سلسلہ میں مدینہ کے یہودیوں نے کتنی سازشیں کیں۔ حتیٰ کہ حضور علیہ السلام کو زہر بھی دیا گیا۔ اسی
 لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تورہ پر تمہارا ایمان ہے۔ تو پھر یہ بتاؤ کہ قتل
 انبیاء علیہم السلام تورہ میں کیا لکھا ہے۔ تمہارا دعویٰ ایمان باطل ہے۔ اگر تم ایمان والے ہو
 تو قتل انبیاء علیہم السلام میں کیوں موثر ہوتے ہیں۔

فرمایا تمہارا یہ دعویٰ درست نہیں کہ تم تورہ پر ایمان رکھتے ہو اس کا ثبوت یہ ہے کہ وَلَقَدْ
 جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَاصْحَافًا لِّتُنَاسِئَ لَهَا مَعِيزَاتٍ لِّكَرَائِهِ
 لَقَدْ نَزَّلَ اَنْتُمْ اِيْمَانُ لَا تَكْفُرُ بِهٖ . ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهَا تَمَنُّنًا
 بِمُخْرَجِهِ لَوْ مَجْعُوْدٌ بِنَايَا۔ یہ صریحاً شرک تھا جو تمام آسمانی کتابوں کے مطابق گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے
 وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ اور تم یا تمہارے اباؤ اجداد ظلم کرنے والے تھے۔

دیکھو! تم نے بار بار عہد پیمان کو توڑا۔ از خود شریعت کا مطالبہ کیا اور میری جتنی قانون تمہارے پاس کیا۔ تو جیسے مانتے ہوئے
 مانا یا اور کر دیا کہ اس پر عمل ممکن نہیں۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ وَلَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ
 اَوْ رَجَبٍ اَمْنًا لِّقَوْلِكُمْ الطُّغْيَانُ اور تمہارے سر دلوں پر کوہ طور
 کو معلق کر دیا۔ اور حکم دیا خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا جو کچھ ہم عطا کر رہے ہیں
 اُسے مضبوطی سے تھام لو اور سنو۔ یعنی اس پر کما حقہ عمل کرو۔ مگر تم نے اُن کی ہی جواب دیا فَالْوَا
 سِمَعْنَا وَعَصَيْنَا بظاہر تو عمل کا وعدہ کیا۔ مگر باطن میں کہا کہ ہم نے سن لیا مگر ہم نے
 اُسے تسلیم نہیں کیا۔ یعنی زبان سے اقرار تو کرتے ہیں۔ مگر ہم سے اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ اسی
 وجہ یہ بھی وَأَشْرِكُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ اُن کے دلوں میں پھڑپھڑے کی
 محبت گھر کر چکی تھی۔ یہ ان کے کفر کی وجہ تھا کہ وہ شرک میں مبتلا ہو چکے تھے۔ لہذا انکا
 یہ دعوئے کہ تورہ کو مانتے ہیں۔ غلط ہے۔

فرمایا قُلْ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمائیے بِسْمَا يٰمُرُكُمْ بِهِ
 يَصَانُكُمْ وہ بہت ہی بڑی چیز ہے۔ جس کے لیے تمہارا ایمان تمہیں حکم دینا ہے۔

إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ اگر تم واقعی مومن ہو۔ اور تم کو سالہ پرستی بھی کرتے ہو۔ یہ تو بہت ہی
 بری بات ہے۔ ظاہر ہے کہ خالص ایمان کبھی قتلِ انبیاء علیہم السلام کا حکم نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی
 پچھڑے کی پرستش پر آمادہ کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ توراہ پر مبنی ایمان ہی نہیں ہے۔ ورنہ
 اس قسم کی بری حرکات کے مرتکب نہ ہوتے۔

موت کی آرزو

پہلے آیت گزشتہ ہے۔ اور آگے بھی آئی۔ یہ دو نصاریٰ دونوں اس زعمِ باطل میں مبتلا
 تھے کہ جنت صرف انہیں کے لیے مخصوص ہو چکی ہے۔ کوئی دوسری قوم اس میں داخل نہیں
 ہوگی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا
 اَوْ نَصْرًا اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمْ الدَّارُ
 الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّنْ دُونِ النَّاسِ لَآئِىَ بِنِىِّهِ السَّلَامِ! آپ ان کو فرمادیں کہ اگر
 اللہ تعالیٰ کے نزدیک آخرت کا گھر محض تمہارے ہی لیے ہے۔ تمہارا یہ یقین ہے۔ کہ تم
 ضرور جنت میں جاؤ گے۔ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ تو پھر ذرا موت
 کی تمنا کر دو۔ تمہاری سچائی کا پتا چل جائے گا۔ ظاہر ہے جسے آخرت میں اپنی کامیابی کا یقین
 ہوگا۔ وہ تو چاہے گا کہ کب موت آئے اور کب وہ دائمی آرام و راحت سے مستغنیہ ہو۔ البتہ
 اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سب ان کے زبانی دعوے ہیں۔ کہ ہم جنتی ہیں۔ جنت میں پہنچنے کے
 لیے جس ذریعہ یعنی موت کی ضرورت ہے۔ اس کی کبھی تمنا نہیں کریں گے۔ وَلَكِنْ يَتَمَنَّوُا
 أَبَدًا لِأَنَّهُمْ يَخْلَعُونَ جَنَّتِهِمْ کہ یہاں پر وہ کس قسم کی کر تو میں کر رہے ہیں بِمَا قَدْ مَتُّ
 أَبَدًا لِّهِنَّ ان کے ہاتھوں نے آگے کیا بھیجا ہے۔ اگر اپنی کامیابی پر انہیں یقین ہوتا تو
 ضرور موت کی تمنا کرتے مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ اللہ تعالیٰ
 ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ کہ یہ کیا ظاہر کر رہے ہیں۔ اور ان کے باطن میں کیا پوشیدہ ہے۔
 حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر یہ لوگ قرآن پاک کا چیلنج قبول
 کر کے مہوٹ موت بھی موت کی تمنا کر بیٹھتے تو ہلاک ہو جاتے۔ اس لیے انہوں نے ایسا نہیں

کیا۔ قرآن پاک اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو یہ بہت بڑا ثبوت ہے۔ کہ یہودیوں نے قرآن پاک کا چیلنج قبول نہ کیا۔ وہ لوگ تو موت سے سخت خوفزدہ تھے۔ وہ اس کی تمنا کیسے کر سکتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کہ اسرائیلوں کا ایک گروہ بھی مباہلے کے لیے آیا تھا۔ اگر وہ بھی مقابلے میں آجاتا اور ہار کر مہینتا، تو وہ خود اور ان کے گھر بار سب دھوک ہو جاتے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہودیوں کی موت کی تمنا کبھی نہیں کریں گے۔ بلکہ یہ طویل العمری کے خواہشمند ہیں۔ وَلَيَجِدُنَهُمْ آخِرِينَ الشَّاسِ عَلَى حَيَاةٍ أَبَدٍ آپ انہیں زندگی پر لوگوں سے زیادہ حرص پائیں گے وَمِنْ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَن لَّوْگُوں سے بھی زیادہ حرص جو مشرک ہیں۔ مشرک کے نزدیک آخرت کا کوئی تصور نہیں۔ لہذا ان کا زندگی پر حرص کرنا تو واضح ہے۔ مثلاً یہ یہودی آخرت کو ملتے ہوئے بھی دنیوی زندگی کی خواہش کرتے ہیں۔ اور موت سے ڈرتے ہیں۔ عارضہ جو لوگ صاحب ایمان ہیں وہ موت سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ کسی بے کراہ کے حالات بہانے ملنے ہیں۔ وہ تو موت کو اپنی راحتوں کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ اور ہر وقت موت کے انتظار میں رہتے تھے۔ کہ کب اس پل کو عبور کر کے جنت کی داریوں میں پہنچ جاؤں۔ آخرت مددِ واجب مرض الموت میں مقبل ہونے کو کہتے تھے۔ جَلَدٌ حَبِيبٌ عَلَى فَنَاءٍ۔ ضرورت اور حاجت کے وقت آنے والی چیز یعنی موت آگوار ہے۔ لَا أَفْلَحَ لِيَوْمَ مَرَدٍّ مَّا نَ جَوَادِمَ ہُوکا۔ اُسے کبھی فلاح نصیب نہیں ہوگی۔ گویا ہم موت سے ڈرتے نہیں مگر اس سے محبت کرتے ہیں۔ کہ یہ تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے۔ اس کے بغیر فدا کے لئے مداخلت نہیں ہو سکتی۔

جنتِ معصین میں حضرت علیؑ چغہ پسنے ہوئے تھے۔ تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ حضرت حسنؑ نے کہا کہ اے تاجان! یہ لباس جو آپ نے پہن رکھا ہے۔ یہ جنتی لباس تو نہیں ہے۔ ذرا نئے لٹے تاج بیٹے! مجھے اس چیز کا خوف نہیں ہے۔ کہ موت مجھ پر گرتے یا میں موت

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ
 اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ
 ۹۷ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَلَ
 فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ ۹۸ وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ
 وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ ۹۹ أَوْ كَلَّمَآ عَهْدًا وَعَهْدًا تَبْذُرُهُ
 فَرِيقٌ مِنْهُمْ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۱۰۰ وَلَمَّا جَاءَهُمْ
 رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ
 الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ
 لَا يَعْلَمُونَ ۱۰۱

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے جو شخص جبرائیل علیہ السلام کا دشمن ہے۔ پس بے شک یہ
 (قرآن پاک) اُسی نے آپ کے دل پر نازل کیا، اللہ کے حکم سے۔ یہ تصدیق کرنے
 والا ہے ان کتابوں کی۔ جو اس سے پہلے ہیں۔ اور یہ اہل ایمان کے لیے ہدایت
 اور خوشخبری ہے ۹۷ جو شخص دشمن ہو، اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کے
 رسولوں کا اور جبرائیل کا اور میکائیل کا۔ پس بے شک اللہ تعالیٰ کافروں کے ساتھ
 دشمنی رکھنے والا ہے ۹۸ اور اللہ تحقیق ہم نے آپ کی طرف واضح نشانیاں نازل
 کیں۔ اور اس کے ساتھ نہیں کفر کرتے مگر منافقان لوگ ۹۹ کیا جب بھی انہوں نے
 کوئی عہد کیا۔ اس کو ان میں سے ایک گروہ نے پھینک دیا۔ بلکہ ان میں سے اکثر
 ایمان نہیں لائے ۱۰۰ اور جب اُن کی طرف اللہ کی طرف سے رسول آیا۔ جو
 تصدیق کرتا ہے۔ اُس چیز کی جو اُن کے پاس ہے۔ تو کتاب یا فتنہ لوگوں میں سے
 ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اپنی پشتوں کے پیچھے ڈال دیا۔ گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں ۱۰۱

یہودیوں کی خرابیوں کا تذکرہ تسلسل کے ساتھ چل رہا ہے۔ آیات زیر درجہ کے شان نزول کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت بنی علیہ السلام کی ہجرت مدینہ کے وقت مدینہ کے گرد و نواح میں بہت سے یہودی آباد تھے۔ یہودی علماء میں سے صرف ایک عالم حضرت عبداللہ بن سلام ایمان لائے باقی سب محروم ہی رہے۔ ان میں سے ابن صوریہ ایک چشم تھا۔ وہ بعض دوسرے یہودیوں کے ہمراہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے آیا۔ اور آپ سے مختلف سوال کیے۔ اُس نے کہا کہ آخری نبی کے خواب سے متعلق ہماری کتابوں میں بعض نشانیاں موجود ہیں۔ آپ اپنے خواب کی کیفیت بیان فرمائیں۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا اِنَّ عَيْنِي تَنَامَانِ وَلَا يَنَامُ قَلْبِي یعنی میری آنکھیں تو میٹک سوتی ہیں۔ مگر دل کبھی نہیں سوتا۔ اس کی اُس نے تصدیق کی کہ آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔ ہماری کتابوں میں بھی نبی آخر الزمان کی یہی نشانی بتائی گئی ہے۔

اس شخص نے دوسرے سوال کیا کہ رحمہ در میں جنس کی تفریق کیسے ہوتی ہے۔ یعنی بچے اور بچی کی پیدائش میں کون سے عوامل کار فرما ہوتے ہیں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مرد کا مادہ منورہ سفید رنگ کا ہوتا ہے۔ اور عورت کے رحم کی رطوبت زرد رنگ کی ہوتی ہے۔ فرمایا با شریعت کی بات جس مادہ کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ بچے کی شکل و صورت اس کے موافق ہوتی ہے۔ باقی یہ بات کہ غلبے سے کیا مراد ہے۔ مقدار میں غلبہ ہوتا ہے۔ یا خورن میں سبقت ہوتی ہے۔ یا کسی وقت میں غلبہ ہوتا ہے یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی بتایا کہ مرد اور عورت میں سے جس کے مادہ میں غلبہ ہوتا ہے۔ وہ مشابہت میں بچے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یہودیوں نے کہا کہ یہ بھی آپ نے درست جواب دیا۔ ہماری کتابوں میں بھی ایسا ہی لکھا ہے۔

حضور علیہ السلام نے ان یہودیوں سے فرمایا کہ جب تم میرے جوابات سے مطمئن ہو تو پھر ایمان کیوں نہیں لاتے۔ کہنے لگے ہم ایک اور سوال پوچھیں گے حضرت! یہ فرمائیے۔

کہ جو لوگ بہشت میں داخل ہوں گے، انہیں سب سے پہلے کوئی خوراک پیش کی جائیگی، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جہنموں کی اولین خوراک مچھلی کے بچر کا زامہ حصہ ہوگا۔ اور پھر دوسرے نمبر پر ان کو بیل کا گوشت پیش کیا جائے گا۔ جو جنت کے اطراف میں چرتا ہے یہودیوں نے کہا: کہ یہ بھی آپ نے درست فرمایا ہے۔

اب حضور علیہ السلام نے فرمایا: کہ جب تم نے آخری نبی کی تمام علامتیں پہچان لی ہیں۔ تو پھر ایمان کیوں نہیں لاتے۔ انہوں نے کہا کہ اچھا ایک بات اور بتائیے۔ کہ آپ کے پاس وحی کون لاتا ہے۔ آپ نے فرمایا، مجھ پر جبریل علیہ السلام وحی لاتے ہیں۔ وہ کہنے لگے جبرائیل تو ہمارا دشمن ہے۔ اگر وہ وحی لاتا ہے تو ہم اس کو نہیں مانتے۔ ہاں اگر میکائیل وحی لاتا تو ہم مان لیتے۔ کہنے لگے جبرائیل کو دو وجوہات کی بنا پر ہم تسلیم نہیں کرتے۔ اول یہ کہ یہ قومیں پر عذاب لاتا ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اس نے ہمارے دشمن بخت نصر کی حمایت کی تھی۔ اس کی تائید انہوں نے یوں بیان کی کہ ہمارے پیغمبروں نے ہمیں بتایا تھا کہ بخت نصر نامی بادشاہ ہمیں تباہ و برباد کرے گا۔ لہذا اُسے پھپھن میں جی قتل کر دینا۔ پیغمبروں نے اس کی نشانیاں بتائیں۔ یہ بھی بتایا کہ وہ اوائس عمر میں فلاں جگہ پر ملے گا۔ اور فلاں کام کرتا ہوگا۔ چنانچہ ہمارے سرور نے بخت نصر کی تلاش میں چاروں طرف آدمی بھیج دیے۔ اور انہوں نے شہر بابل میں انہی نشانیوں کے ساتھ بخت نصر کو تلاش کر لیا۔ جب اُسے ہلاک کرنے لگے تو جبرائیل علیہ السلام سامنے آکھڑے ہوئے اور کہنے لگے تم اس کو کیوں مارتے ہو۔ ہم نے کہا کہ یہ ہمارا قاتل ہے۔ اور ہماری تباہی کا باعث بنے گا۔ تو جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ اگر یہ واقعی قاتل ہے۔ تو تم اُسے ہلاک نہیں کر سکو گے۔ اور اگر یہ تمہارا قاتل نہیں ہے۔ تو خواہ مخواہ خون ناحق کے متکب ہوتے ہو۔ اس طرح جبرائیل علیہ السلام نے بخت نصر کو ہلاک ہونے سے بچا لیا۔ وہی بخت نصر جب بڑا ہوا۔ تو اُس نے شام اور فلسطین کے علاقوں میں بڑی تباہی مچائی۔ اور بیت المقدس کو محرق کر دیا۔ توراہ کو جلایا۔ یہودیوں کو قتل کیا اور ان کو غلام اور لونڈیاں بنایا۔ چنانچہ یہ لوگ سو سال تک غلامی میں مبتلا رہے اور بڑی ذلت و رسوائی اٹھائی۔

یہودیوں نے کہا کہ جبرائیل علیہ السلام پر ہمارا اور اعتراض یہ ہے۔ کہ یہ آپ کے

ہاں ہماری جفیاں کھاتے ہیں۔ ہماری ساری باتیں آپ کو بتا دیتا ہے۔ لہذا اس کے ذریعے نازل ہونے والی وحی کو ہم ماننے کے لیے تیار نہیں۔ یہودیوں کے ان اعتراضات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ اور ان کی گندی ذہنیت کا رد فرمایا۔ اور بتایا کہ جبرائیل علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے ہیں۔ وہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے کرتے ہیں۔ لہذا ان کے ساتھ دشمنی رکھنا کفر کے مترادف ہے۔

جبرائیل، سرف ان تینوں لفظوں کا معنی عبد، بندہ یا مردِ خدا ہے۔ اور ایل عبرانی زبان میں اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ گویا دونوں لفظ مل کر عبد اللہ کا معنی دیتے ہیں۔ اس طرح جبرائیل میکائیل اور اسرافیل کا معنی اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوا۔ ان میں عزرائیل کا نام شامل نہیں ہے۔ بعض کتبوں میں مذکور ہے کہ عزرائیل ملک الموت کا لقب ہے۔

الغرض! جب یہودیوں نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو اپنا دشمن قرار دیا۔ تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجِبْرِیْلِ كَمَا یُحِبُّ جِبْرِیْلٌ عَلَیْہِ السَّلَامُ كَا دُشْمَنٍ هُوَ۔ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰی قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ اس نے تو قرآن پاک آپ کے قلب مبارک پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اتارا ہے۔ اس کے ساتھ کسی کی دشمنی کا کیا جواز ہے۔

نزدول وحی کی مختلف صورتیں ہیں۔ عام صورت تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبرائیل علیہ السلام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لاتے تھے۔ تو حضور علیہ السلام کے قلب کے ساتھ رابطہ قائم ہو جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح آج کل ٹیلیفون کا کنکشن مل جاتا ہے یہ خاص قسم کی رو ہوتی تھی جس کے ذریعے پیغمبر علیہ السلام اپنے کانوں سے اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے۔ اور اُسے خوب سمجھتے تھے۔ اور اس کے الفاظ کو جانتے تھے۔ اور بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کوئی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ خواب بتا دی جاتی تھی یا بعض دفعہ فرشتہ کسی شکل میں متشکل ہو کر آتا تھا۔ اور کلام الہی پیش کرتا تھا۔ تاہم عام طور پر پہلی صورت میں یعنی قلب مبارک سے رابطہ قائم ہوتا تھا۔

نزدول وحی کی
مختلف صورتیں

ایک دفعہ حضور علیہ السلام نے جبرائیل علیہ السلام سے فرمایا: کہ ہم آپ کی آمد کے منتظر رہتے ہیں۔ آپ کثرت سے کیوں نہیں آتے تو جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا: مَا نَنْزِلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ تَبَّ تَوَسَّفَ آپ کے رکے حکم سے نازل ہوتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔ ہم حاضر ہو جاتے ہیں ہم اپنی مرضی سے نہیں آسکتے۔

حدیث شریفین میں آتا ہے: کہ ایک دفعہ جبرائیل علیہ السلام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو آپ کو بتایا کہ اب کی دفعہ میں اللہ تعالیٰ کے بہت ہی قریب پہنچ گیا۔ آپ نے دریافت کیا کہ جبرائیل یہ تو بتاؤ کہ تم اللہ تعالیٰ کے کس قدر قریب پہنچ گئے عرض کیا کہ میرے اور اللہ کے درمیان صرف ستر ہزار پردوں کا حجاب رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ کے اتنا قریب پہنچ گیا۔ اسی لیے ان کو اللہ تعالیٰ کے مقربین فرشتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے: کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبرائیل علیہ السلام کو ہر روز اجازت ہوتی ہے کہ جنت کی سرکونڈ میں غوطہ لگائیں۔ چنانچہ جبرائیل علیہ السلام ہر روز ایسا ہی کرتے ہیں جس کی وجہ سے غیر محدود روحانیت حاصل ہوتی ہے۔ آپ کے مختلف القاب میں ناموس عظیم، روح عظیم، روح القدس اور روح الامین وغیرہ شامل ہیں۔ جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے سب سے مقرب فرشتے ہیں۔ تمام انبیاء علیہم السلام پر حق حضرت جبرائیل علیہ السلام کے توسط سے ہی آتی رہی ہے۔

میکائیل علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دو ستر تکوینی امور کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ جیسے بنی نوع انسان کی روزی رسانی اور بارش کا نزول وغیرہ اسی طرح حضرت اسرافیل علیہ السلام عالم کے فتنے کے لیے بھل بجانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور عزرائیل علیہ السلام جن کا لقب ملک الموت ہے وہ جانداروں کی روح قبض کرنے پر آمادہ ہیں قُلْ يَتُوفِكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ شاہ رفیع الدین محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ کہ

۱۔ بخاری ص ۶۹۱۔ ۲۔ زباجۃ المصابیح ص ۲۵۹۔ مشکوٰۃ ص ۲۵۹۔ ۳۔ تغیر عزیزی ندوی ص ۲۵۹

۴۔ تغیر عزیزی ندوی ص ۲۵۹۔ ۵۔ مجموعہ رسائل حضرت شاہ رفیع الدین ص ۳

حیث میں جن چار مہینوں فرشتوں کا ذکر ہے۔ وہ یہی فرشتے ہیں۔ قیامت کے دن ہر شے الٹی کر
تھکنے والے آٹھ فرشتے ہوں گے۔ ان چار کے ساتھ چار اور معاون ہو جائیں گے۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام
سے دشمنی

الغرض فرمایا۔ سے بنی اسرائیل، جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ تمہاری دشمنی بلا وجہ ہے
قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجَبْرِیْلَ آپ فرمائیجئے۔ جو جبرائیل کا دشمن ہے۔ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ
عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ اُس نے تو یہ کلام الہی تمہارے قلب مبارک پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے نازل
کیا ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم بجالاتا ہے۔ خواہ وہ پیر تمہاری موافقت میں جائے یا مخالفت
میں جائے۔ اور پھر یہ کلام بھی ایسا ہے۔ جو قطعاً تمہاری مخالفت نہیں کرتا۔ بلکہ یہ تو مصدقاً
لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور اس لحاظ سے یہ سبقت
سب کی تعلیمات کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ دوسرے مقام پر مُفَصِّلًا کا لفظ آتا ہے۔
قرآن پاک سابقہ کتب کا محقق ہے۔ ان کا پورا اس آخری کتاب میں آگیا ہے۔ اسی طرح
پہلی کتابوں میں جو حادثات ہو چکے ہیں۔ ان کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ لہذا ایسی پاک کتاب کا کار
اور اس کے لئے دے دے دشمنی رکھنا کیسے جائز ہے۔ بلکہ یہ تو نہایت ہی قیمتی فعل ہے۔
یہ تو ایسی عظیم الشان کتاب لانا ہے۔ جس کے لیے نُوحِ الْإِنسَانُ ہمیشہ دعا گو رہا ہے۔ کہ
اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ اے اللہ! ہم کو راہِ راست دکھا دے اور اس پر چلا دے
فرمایا یہ کلام ایسا ہے۔ جو کہ وَهْدَىٰ وَبَشَّرَ لِلْمُؤْمِنِينَ ہے اس کے ذریعے
اللہ نوحِ انسان کو بہایت بخشتا ہے۔ اور پھر اس بہایت کی روشنی میں جو لوگ ایمان قبول کر
لیتے ہیں۔ ان کے لیے دائمی کامیابی کی بشارت بھی سناتا ہے۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے
بَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اہل ایمان اور اعمالِ صالحہ کرنے والوں
کو خوشخبری دے دیں۔ کہ کن کن نعمتوں کی خوشخبری اس کا ذکر قرآن پاک نے بار بار کیا ہے۔ کہیں
فرمایا أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ان کے لیے باغات ہیں جن
کے نیچے نہریں رواں دواں ہوں گی۔ کہیں فرمایا فِي مَقْعَدٍ صَدُوقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ
مُقْتَدِرٍ وہ اللہ رب العزت کی بیٹھک یعنی اس کے حضور میں بیٹھے ہوں گے، دوسری
جگہ بشارت اس طرح ہے فَإِنْ تَطِيعُوا أَوْتِكُمْ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا اگر اطاعت

اہل ایمان کے
لیے بشارت

کر دے، تو اللہ تعالیٰ بہترین اجر عطا فرمائیں گے۔ بہر حال اہل ایمان کو اصلاح اور کامیابی کی بشارت سنائی گئی ہے۔ اب بتاؤ ایسا پاک کلام لانے والے جبرائیل علیہ السلام سے دشمنی کا کیا معنی ہے۔

فرشتوں سے
دشمنی اللہ تعالیٰ
سے دشمنی ہے

فَرَمَا مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ
فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ یعنی اللہ تعالیٰ کے فرشتوں جبرائیل، میکائیل وغیرہ سے
دشمنی رکھنا تو خود اللہ تعالیٰ سے دشمنی ہے۔ گویا یہ لوگ فرشتوں کے دشمن نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ
کے دشمن ہیں۔ فرمایا اگر ایسی بات ہے۔ تو پھر مَن لو کہ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ اللہ تعالیٰ
بھی کافروں کا دشمن ہے۔ ظاہر ہے کہ ملائکہ یا انبیاء علیہم السلام تو عالم بالا یعنی حظیرۃ القدس
کے ترجمان ہیں۔ ان کے ساتھ دشمنی بڑی منگی پڑے گی۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ سے دشمنی کے مترادف ہے۔
لفظ ملائکہ ملوکہ یا ملوک سے مشتق ہے۔ اور ملوک عربی میں پیغام کو کہتے ہیں۔ اس کا ثبوت
عرب کے قدیم شاعر عدی بن زید عبادی کے کلام سے ملتا ہے۔ اُسے نعمان شاہ عراق نے کسی
بات پر خفا ہو کر قید میں ڈال دیا۔ بادشاہ اس کا رشتہ دار بھی تھا۔ بہر حال اس نے اپنے شعروں
میں نعمان کو پیغام بھیجا تھا۔

۱۔ أَبْلَغَ النُّعْمَانَ عَنِّي مَا لَمْ يَكُنْ يَنْتَفِعُ بِرِيٍّ

نعمان کو میرا پیغام پہنچا دو۔ اس نے بلا وجہ مجھے اپنی قید میں ڈال رکھا ہے۔ میں اس کے
حکم کا منتظر ہوں۔ کہ کب رہائی ملتی ہے۔ یہ کافی لمبا قصیدہ ہے۔

عرب کے ایک شاعر کے کلام میں بھی ایسا ہی ملتا ہے۔ عربوں میں بہت مشہور تھا۔
اور اُسے عربوں کا ہاتھ کھاتا تھا۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا شعر بہت شہرت حاصل کرتا تھا۔ اور
پورے عرب میں فوراً پھیل جاتا تھا۔ اُس نے حضور علیہ السلام کا زمانہ نبیاً ہے۔ وہ شخص ایمان
لانے کے لیے حضور علیہ السلام کی خدمت میں آ رہا تھا۔ کہ کفار نے مدینہ کے ذریعے اُسے راستے
میں ہی روک لیا۔ وہ اپنے گاؤں میں بھی واپس نہ پہنچ سکا۔ بلکہ دورانِ سفر ہی اونٹ سے گر کر
ہلک ہو گیا۔ وہ بھی کتا ہے۔

۲۔ أَبْلَغَ يُزَيْدَ بَنِي شَيْبَانَ مَا لَمْ يَكُنْ يَنْتَفِعُ بِأَشْيَبٍ

یزید بنی شیبان سردار قبیلہ تک میرا یہ پیغام پہنچا دو کرے ابو ثیب کی تو ہمیشہ غلط بیانی ہی کرتا ہے گا۔ مطلب یہ کہ ناکا یا ملو کہ یا لو کہ کا معنی پیغام ہے۔ اور ملائکہ بھی اسی کے مشتق ہے۔ جس کا معنی پیغام لانے والے کے ہیں۔

مقربین کا عذری
معنی ہے

الغرض! جو کوئی اللہ تعالیٰ کے فرشتوں اور اس کے رسولوں سے دشمنی رکھتا ہے۔ وہ گویا اللہ تعالیٰ سے دشمنی مول لیتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے مقربین سے عداوت رکھنے والا معنی ہے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ مقربین الہی اور صالحین سے عداوت رکھنے والا شخص ہمیشہ سبقت میں مبتلا رہتا ہے۔ گویا وہ ہمیشہ جنابت کی سی حالت میں ہے۔ اور یہ چیز موجب لعنت ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم علیہ السلام کی زبان مبارک سے کھلوا یا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ مَنْ عَادَى لِي وَلِيًّا جُوِ مِرَّ كَيْ يَدِيَّ دَوَسَتْ سَ دُشْمَنِي رَكَّحَتْ سَ۔ اُسے میرا چیلنج ہے۔ کہ وہ میرے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ کون جنگ کر سکتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ایسا شخص ملعون ہے۔

واضح ثبوت

جس وقت حضور علیہ السلام مدینہ منورہ میں تشریف لائے۔ تو اُس زمانے میں مدینہ کے قریب جوار میں یہودیوں کے دس بڑے عالم تھے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر یہ عالم ایمان لے آئیں۔ تو کوئی یہودی باقی نہ رہے۔ سب ایمان لے آئیں۔ ان میں سے صرف عبد اللہ بن سلام ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے۔ باقی سب بے ایمان ہی رہے۔ انہی میں ایک عالم ابن صوریہ تھا۔ اُس نے حضور علیہ السلام سے کہا کہ آپ نبی آخر الزمان ہونے کے دعویدار ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں آپ ہمیں کوئی واضح ثبوت بتائیں جسے ہم پہچانتے ہوں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِتَبَيِّنٍ عَ یعنی ہم نے آپ کی طرف واضح ثبوت نازل کی ہیں جس شخص میں ذرہ بھر بھی انصاف ہو گا۔ وہ ان ثبوتوں کا انکار نہیں کر سکے گا۔ فرمایا وَمَا يَكْفُرُ بِهَا اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ اِن کھلی ثبوتوں کا انکار صرف نافرمان لوگ ہی کریں گے۔

کتاب اللہ
صحیح بخاری

فرمایا ان کتبہن کی فطرت: یہ بن چکی ہے کہ أَوْ كَلَّمَاعَهُمْ وَأَعَاهَدَ ان میں سے جب بھی کسی نے کوئی عہد کیا تبذہ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ ان میں سے ایک فریق نے اس عہد کو توڑ دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ان کی اکثریت ایمان لانے سے قاصر رہی ہے۔ حقیقہ کہ وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ جب ان کے پاس رسول عظیم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ جو اس چیز کی تصدیق کرنے والے ہیں جو ان کے پاس ہے یعنی زبور، توراۃ، انجیل۔ دیگر تمام صحیف سماویہ۔ شرائع الیہ وغیرہ۔ تو پھر یہ ہوا کہ مَبْذُورٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے پھینک دیا۔ كِتَابَ اللَّهِ اللہ کی کتاب کو وَدَّأَوْ ظُهُورَهُمْ پس پشت۔ یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب توراۃ سے روگردانی اختیار کر لی۔ اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو کسی درجے میں بھی تسلیم کرتے۔ تو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے اور قرآن پاک کو بھی مان لیتے۔ مگر انہوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا یعنی اس میں تحریف کے مرتکب ہوئے۔ اس کے الفاظ کو تبدیل کر دیا یا الفاظ کے معنی الٹ دے اور یہ سب کچھ انہوں نے اس طرح کیا كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ گروہ وہ جانتے ہی نہیں کہ کتاب اللہ میں کیا پیش گوئیاں ہیں۔ اور کون سی علامتیں بتائی گئی ہیں۔ جن کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اور آخری رسول علیہ السلام کی پہچان ہو سکتی ہے۔ اگر ان میں کوئی بھی منصف مزاج آدمی ہوتا تو وہ دونوں چیزوں کو بلا شک و شبہ پہچانی لیتے۔ اس کے بعد یہودیوں کے بحر وغیرہ کا ذکر آئے گا۔

وَاتَّبِعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيْطَانُ عَلَىٰ مُلْكٍ سُلَيْمٍ ۖ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٌ
وَلَكِنَّ الشَّيْطَانَ كَفَرُوا يَعْلَمُونَ النَّاسَ السَّحَرَةَ وَمَا نُزِّلَ عَلَى
الْمَلَكَيْنِ بِبَابِ هَارُوتَ وَما رُوتَ وَمَا يَعْلَمُ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى
يَقُولَا إِنَّمَا خُنْ فِتْنَةً فَلَا تَكْفُرْ فَيَعْلَمُونَ مِنْهُمَا مَا يَفْزِقُونَ
بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ
إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَعْلَمُونَ مَا يُضْرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ
عَلَّمُوا لَعْنِ اشْتَرَاهُ مَا لَدَىٰ الْآخِرَةِ مِنْ خَدَقٍ وَلَبِئْسَ
مَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿١٠٢﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا
وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرٌ لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿١٠٣﴾

فترجمہ: اور انہوں نے اُس چیز کا تابع کیا، جو شیاطین سیمان (عبد السلام) کی بادشاہی میں پڑھتے تھے۔ اور سیمان (عبد السلام) نے کفر نہیں کیا، بلکہ شیاطین کفر کرتے تھے۔ اور لوگوں کو جادو دکھاتے تھے۔ اور وہ چیز جو تاریکی کی بابل کے مقام پر دو فرشتوں (اروت اور ماروت) پر۔ اور وہ کسی کو نہیں سکھاتے تھے۔ یہاں تک کہ دونوں کہتے تھے۔ بیشک ہم تو آزمائش ہیں۔ پس تم کفر نہ کرنا۔ پس لوگ ان دونوں سے ایسی چیزیں لیتے تھے۔ جس کے ذریعے مرد اور عورت کے درمیان مہائی ڈالتے تھے۔ اور وہ اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ مگر اللہ کے حکم سے۔ اور وہ ان سے ایسی چیزیں لیتے ہیں جو ان کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ ورنہ وہ ہمیں پہنچاتی رہتے۔ البتہ تحقیق انہوں نے جان یا اس شخص کو جس نے اس (سحر) کو خریدا ہے۔ اُس کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں اور وہ بُری چیز ہے۔ جس کے بارے میں سنوں نے اپنی جانوں کو بیچا ہے۔ اگر ان کو سمجھ جوتی (۱۰۲) اگر یہ لوگ ایمان لاتے

اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ثواب اور بہتر اجر تھا۔ اگر

یہ سمجھتے (۱۰۳)

شیطان کا
اتباع

ان آیات میں بنی اسرائیل کی انتہائی پستی اور ان کے انحراف کا ذکر ہو رہا ہے۔ گذشتہ آیت میں یہ بات بیان کی گئی تھی کہ بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اس طور پر پشت ڈال دیا کہ اُس سے بالکل لا تعلق ہو گئے۔ گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں کتاب اللہ کی تلاوت اور اس پر عمل درآمد کی بجائے وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكٍ سُلَيْمٰنٍ انہوں نے اس چیز کی پیروی کی جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں جنوں اور انسانوں کا اختلاط ہوتا تھا۔ کیونکہ جن بھی آپ کے ماتحت تھے۔ لہذا اس دور میں جو کلام یا دیگر چیزیں جن پڑھتے تھے۔ بنی اسرائیل نے ان کا اتباع کیا۔ اس طرح کھریا جادو انسانوں تک پہنچ گیا۔ اسی بات کو اس آیت میں یوں بیان فرمایا کہ بنی اسرائیل شیاطین یا جنوں کی تلاوت کی۔ وہ چیزوں کی پیروی کرنے لگے۔ گویا جادو میں ملوث ہو گئے اور کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام
پر جادوگر بونٹا الزام

جادو کو شیطانی کھیل جان کر کھلتے بستے تو اور بات تھی مگر بنی اسرائیل نے ستم بالائے ستم یہ کیا کہ اس جادو کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا۔ حالانکہ سحر پر اعتقاد رکھنا اور اس پر عمل کرنا صریحاً کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی برأت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا وَمَا كَفَرُ سُلَيْمٰنٌ سُلَيْمٰنٌ عَلَیْہِ السَّلَامُ نے کفر نہیں کیا۔ یعنی انہوں نے یہ جادو وغیرہ نہیں نہیں سکھایا۔ وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِیْنَ كَفَرُوا بَكْرَیَہِ تَرِشِیَطَانُوں نے کفر کا ارتکاب کیا۔ جنہوں نے لوگوں کو جادو سکھایا ہے۔

سحر کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کرنا بنی اسرائیل کو قبیح فعل ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کے نبی اور صاحب طریقت رسول تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جن اور شیاطین کو آپ کے مطیع کر دیا تھا۔ اور ہوا کو آپ کے سحر کر دیا تھا فَسَحَرْنَاآلَیْسَیْہِمْ اَنْہُمْ اَنْہُمْ اَنْہُمْ آپ ان چیزوں سے سب فساد کام لیتے تھے۔ وہ کیسے جادو سکھا سکے تھے۔ اور بن جریر نے ایک روایت

سے تفسیر طبری ص ۲۵۱

بیان کی ہے۔ قَالَ بَعْضُ أَحْبَابِ الْيَهُودِ يَهُودِيَّوْنَ كَمَا لَا تَعْجَبُونَ مِنْ مُحَقِّدِ لُغُو! تم محمد پر تعجب نہیں کرتے۔ يَزْعُمُ أَنَّ ابْنَ دَاوُدَ كَانَ نَبِيًّا جَوِي سَكْتِے ہیں۔ کہ ابن داؤد (سیمان علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے نبی تھے۔ علائکہ مَا كَانَ إِلَّا سَاحِرًا وہ تو جادوگر تھے۔ گویا یہودیوں کا حضرت سیمان علیہ السلام کے متعلق یہ اعتقاد تھا۔ اس لیے فرمایا کہ سیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا۔ بلکہ شیاطین نے کفر کیا۔ جو کہ يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السَّحَرَ لوگوں کا جادو کا علم سکھاتے تھے۔ اس بات کو حضرت سیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کرنا صریح کفر ہے۔

جادو کے
ذرائع

مفسرین کرم فرماتے ہیں کہ جادو دُوزخ سے دنیا میں آیا۔ اس کا پہلا ذریعہ توجنات ہیں۔ یعنی حضرت سیمان علیہ السلام کے زمانے میں جادو شیاطین سے انسانوں میں رائج ہوا۔ جادو کا دوسرا ذریعہ ہاروت اور ماروت دو فرشتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے لیے دنیا پر بھیجا۔ اسی کے متعلق فرمایا وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ عام مفسرین نے یہی لکھا ہے۔ کہ ہاروت اور ماروت دو فرشتے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے لیے بابل کے مقام پر اتارا۔ یہ بابل شرابی ہے۔ جو کلدانیوں کا دارالسلطنت اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جلائے پیدائش ہے۔ وہاں سے ہجرت کر کے آپ شام اور فلسطین پہنچے۔ اور پھر حجاز میں خانہ کعبہ کی تعمیر کی۔ بہر حال لفظ مَلَکَیْنِ سے مراد دو فرشتے ہی ہیں کیونکہ مَلَکَیْنِ فرشتے کو کہتے ہیں۔

ہاروت اور
ماروت کون تھے

تفسیری روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام یا کسی اور نبی کے زمانہ میں دنیا پر مصیبت عام تھی۔ لوگ فسق و فجور میں مبتلا تھے، تو آسمان پر فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور شہادت کی کہ مولا کریم! تو نے یہ کیسی مخلوق پیدا کی ہے جو اس قدر گناہ میں ملوث ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے انسان میں مختلف قوتیں پیدا کی ہیں جیسے قوت شہوانیہ، قوت ہیمیہ اور قوت غضبیہ وغیرہ وغیرہ اور ان کے ساتھ ساتھ نیکی کرنے کی طاقت بھی عطا کی ہے اس لیے

تم دیکھتے ہو کہ کچھ لوگ اگر گناہ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تو کچھ نیکو کار بھی ہیں۔ یہ کون کون ان کے اندھ ساری قوتیں موجود ہیں۔ برخلاف اس کے فرشتوں کو میں نے قوت ملکوتی سے نوازا ہے۔ اگر تم تجربہ کرنا چاہتے ہو تو میں تم کو زمین پر بھیجتا ہوں۔ تم اپنے میں سے دو فرشتے منتخب کرو۔ پھر دیکھیں گے کہ وہ کس طرح گناہ سے بچتے ہیں۔ انفرض فرشتوں نے اس آزمائش کے لیے ہاروت اور اودوت کو منتخب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں قوت شہوانیہ بھی رکھ دی۔ اور پھر انہیں بابل کے مقام پر اتار دیا۔ انہیں خاص طور پر نصیحت کی گئی کہ بُرائی سے باز رہنا۔ زنا اور دیگر معصیت سے اجتناب کرنا اور عدل و انصاف سے وقت گزارنا۔

ایک دفعہ ایسا واقعہ پیش آیا۔ کہ ایک خوبصورت عورت ایک چمکڑے پر سوار جا رہی تھی۔ اُس نے کسی ضرورت کے تحت منہ سے کپڑا بٹایا۔ تو اُسے دیکھ کر فرشتے بے قابو ہو گئے۔ یہ ان کی آزمائش کا مرحلہ تھا۔ انہوں نے اُس عورت سے فرصت میں ملاقات کی خواہش کی۔ جسے اُس نے منظور کر لیا۔ بوقت ملاقات فرشتوں نے اُس سے لفظی خواہش کی۔ کی تکمیل کی درخواست کی۔ اُس عورت نے اس خواہش کی تکمیل کے لیے یہ شرط پیش کی کہ مجھے وہ اسمِ عظیم سکھی دو جسے پڑھ کر تم آسمانوں پر چلے جاتے ہو اور پھر واپس آ جاتے ہو۔ فرشتوں نے اسمِ عظیم اُس عورت کو سکھا دیا۔ پھر اس نے کہا کہ میرے ساتھ یہ لڑکا ہے۔ اس کو قتل کر دو۔ ورنہ یہ ہمارا زنا فاش کر دے گا۔ فرشتوں نے ایسا کرنے سے معذرت کی۔ عورت نے کہا۔ اچھا یہ شراب ہی پی لو۔ یہ بڑی لذیذ چیز ہے۔ فرشتوں نے شراب پی لی۔ پھر نٹے میں آکر انہوں نے لڑکے کو بھی قتل کر دیا اور زنا کے مرتکب بھی ہوئے۔ گویا مدے معاصی میں مبتلا ہو گئے۔ عورت تو اسمِ عظیم پڑھ کر اوپر چلی گئی کتے ہیں کہ زہر دتا ہے میں جا کر باور ہو گئی اور فرشتے سزا میں مبتلا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ ان گناہوں کی سزا دنیا میں بھگتنا چاہتے ہو یا آخرت میں انہوں نے دنیا کی سزا کو پسند کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شکلیں مسخ کر کے انہیں کسی تاریک اور عیسق کنوئیں میں ڈال ڈالا۔ آج تک وہ اُسی میں لٹکے ہوئے ہیں ان کے تنچے سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔ اور وہ سخت اذیت پہنچ رہے ہیں۔ جب قیامت آئے گی۔ تو اس وقت وہ اس عذاب سے نجات پائیں گے۔ دیگر اسرائیلی رشتہ مندوں کی طرح یہ بھی ایک اسرائیلی مدیت ہے

تاجم اس کی سچائی پر یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

ہاروت اور روت
کی معنی شادیت

امام ابن منذرؒ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک موقع پر ایک بوڑھا آدمی عبدالملک بن مرداسی کے ساتھ تھکے پر بیٹھا تھا۔ نووار دنے تعجب کیا کہ یہ کون آدمی ہے۔ جو خلیفہ کے ساتھ بیٹھا ہے۔ تو انہوں نے بتایا کہ یہ آدمی ہاروت اور روت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہے۔ لہذا اس کی عبرت افزائی کی گئی ہے۔ اُس شخص نے آگے بڑھ کر بزرگ آدمی کو سلام کیا اور عرض کیا حضرت ہاروت اور روت سے ملاقات کا کچھ حال مجھے بھی سناؤ۔ اس پر اس شخص کے آنسو جاری ہو گئے۔ اور اُس نے واقعہ یوں سُنا شروع کیا کہ بھائی! میں ابھی بچہ تھا۔ گھر میں مال و دولت کی فراوانی تھی۔ جسے میں فرائض الی سے خرچ کرتا۔ جب باپ فوت ہو گیا۔ تو ماں سے دولت حاصل کرتا اور خوب اُڑاتا۔ ایک دن میں نے ماں سے دریافت کیا کہ ماں یہ تو بتائیں کہ ہمارے پاس یہ مال و دولت کہاں سے آیا تھا۔ جو اتنا خرچ کرنے سے بھی کم نہیں ہوتا۔ ماں نے کہا بیٹا تم جتنی چاہو دولت لٹاؤ یہ ختم ہونے والی نہیں ہے۔ پھر اُس نے مجھے دولت سے بھرے ہوئے گھرے دکھائے۔ لڑکے میں شعور پیدا ہو چکا تھا۔ اُس نے دوسرے سوال کیا کہ میرے باپ نے یہ مال کس طریقے سے کمایا تھا۔ ماں نے بتایا کہ تیرا باپ ساحر تھا اور اس نے یہ ساری دولت سحر کی وجہ سے کمائی۔ لڑکے کو خیال آیا کیوں نہ میں بھی وہی چیز سیکھ لوں جس کی وجہ سے میرے باپ نے اتنا مال پیدا کیا۔ اُس نے سوچا کہ سحر کا علم اس کے باپ نے اپنے کسی شاگرد کو بھی سکھایا تھا۔ اس کا پتہ کر کے اُس سے یہ علم سیکھنا چاہیے۔ چنانچہ تلاش کرنے پر اُسے ایک شخص مل گیا۔ جو اُس کے باپ کا شاگرد تھا۔ لڑکے نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ تو وہ کہنے لگا یہ بڑا خطرناک علم ہے۔ اسے نہ ہی سیکھو تو بہتر ہے لڑکے نے اصرار کیا تو اُس نے کہا کہ اچھا اگر تم ضرور ہی یہ علم سیکھنا چاہتے ہو۔ تو میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔ مگر یاد رکھو جہاں ہم جا رہے ہیں۔ وہاں جا کر خدا کا نام نہ لینا۔

لڑکا بیان کرتا ہے کہ میں اپنے باپ کے شاگرد کے پیچھے ہوں۔ حتیٰ کہ ہم ایک غار پر پہنچے اور اس میں اتر گئے۔ ہم تین سو سیڑھیاں نیچے اترے تو وہاں ایک کنواں نظر آیا۔

کنوئیں کے اندر دو شخص نظر آئے۔ جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے اپنے ٹک ہے تھے، ان کی شکلیں عجیب و غریب تھیں، ان کی آنکھیں ڈھال کی طرح بڑی بڑی اور بڑی چمکدار تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر میرے دل میں خوف پیدا ہوا اور میری زبان سے بے ساختہ کلمہ لا الہ الا اللہ نکل گیا۔ یہ کلمہ سن کر وہ شخص اور زیادہ مضطرب ہوئے۔ میں پھر گجھڑیا اور میرے منہ سے پھر وہی کلمہ نکلا۔ دو تین دفعہ ایسا ہی ہوا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا۔ پھر میں نے ان سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اور اس حال میں کس وجہ سے ہو؟ اس پر انہوں نے بتایا کہ ہم ہر دوت اور مار دوت ہیں۔ اور یہاں سزا جگت ہے ہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ تم کس امت میں ہو۔ تو میں نے بتایا کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہوں۔ انہوں نے دریافت کیا کہ کیا آخری نبی کا ظہور ہو گیا ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ انہوں نے کچھ علامتیں بھی دریافت کیں۔ جو میں نے ان کو بتائیں۔ وہ دونوں بعض علامات پر خوش ہوئے۔ اور بعض پر ناراض ہوئے۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ ہم ان علامات پر خوش ہوئے ہیں، جو قرب قیامت سے متعلق ہیں، کیونکہ قیامت برپا ہونے پر ہم اس عذاب سے رہائی پالیں گے۔

الغرض! وہ لڑکا اللہ تعالیٰ کا نام لینے کی وجہ سے سحر سے تو محروم ہو گیا، مابہم نے حقیقت معلوم ہو گئی۔ اور وہ ہر دوت، مار دوت کا یعنی شاہ بن گیا۔

ہر دوت مار دوت
کے واقعات

بعض مفسرین کرم فرماتے ہیں۔ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِ هَارُوتَ وَمَارُوتَ میں لفظ ہا، فہ ہے۔ یعنی بابل کے مقام پر ہر دوت، مار دوت پر کوئی چیز نہیں اتاری گئی۔ یہ سب جھوٹے قصے ہیں۔ جو بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ ان مفسرین کی ذاتی تھقیق ہے۔ بعض اصحاب یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ ہر دوت، مار دوت کا سارا قصہ کہانی محض ہے چنانچہ بشار بن برد شاعر سے کسی نے پوچھا کیا آپ نے ال سیمان سادات خاندان کے متعلق بھی کوئی قصیدہ لکھا ہے؟ یہ اپنے رب سے شاعر تھا۔ کہنے لگا۔ اُس خاندان کے متعلق کچھ زیادہ

ترنیں لکھا۔ صرف یہ دو شعر کہ ہیں:

وَيَنَارُ آلَ سُلَيْمَانَ وَدَرَاهِمُهُمْ كَبَابِلَيْنِ خَفَا بِالْعَفَارِ يَت
لَا يُرْجِيَانِ وَلَا يُرْجَىٰ لَوْ أَلْفُهَا كَمَا سَمِعْتَ بِهَارُوتَ وَمَارُوتَ
آل سلیمان بڑے کنوس لوگ ہیں۔ ان کے درہم و دینار ایسے ہیں۔ جیسے دو بابلیوں کے ارد گرد
بست سے بھوت جمع ہوں۔ اور وہ کسی کو نظر بھی نہ آئیں۔ اس طرح آل سلیمان کا مال و دولت
بھی کسی کو نظر نہیں آتا۔ نہ ان سے کسی عیٹے کی توقع ہے۔ اور نہ ان کے درہم و دینار کو دیکھنے
کی امید۔ ان کی دولت ایسے ہی ہے جیسے تم نے ہاروت ماروت کا نام تو سن رکھا ہے۔
مگر ان کی حقیقت کچھ نہیں۔ غرضیکہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں۔ جو ہاروت ماروت کے قصے کو
افسانے زیادہ حیثیت نہیں دیتے

سحر کی ہے

آہم اکثر مغربین کہتے ہیں۔ کہ ہاروت ماروت فرشتے تھے۔ اگرچہ زہرہ والا واقعہ
مصدقہ نہیں ہے۔ مگر ان فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے سحر کا علم دیکر نازل کیا تھا۔ تاکہ سحر اور
مہجرت میں فرق قائم کیا جاسکے۔ لغوی اعتبار سے سحر کا معنی لطیف، باریک یا مخفی شئی ہے۔
سحر میں چونکہ کوئی چیز ظاہری طور پر نظر نہیں آتی۔ اس لحاظ سے اُسے سحر کہتے ہیں۔

سحر کا دوسرا معنی غذا ہے۔ جب انسان کوئی بھی غذا کھاتا ہے تو ہضم ہو کر باریک باریک
رگوں کے ذریعے جسم کے ہر حصہ میں پہنچتی ہے۔ یہ لطیف بھی ہوتی ہے کہ نظر نہیں آتی۔ گویا
اس میں انفار اور پیچیدگی بھی پائی جاتی ہے۔ زمانہ جاہلیت کے ایک مشور شاہ عوام القیس کا کہنا ہے
اَرَانَا مُوَضِّعِينَ لَا مُرْغَبِينَ وَنَحْنُ بِالطَّعَامِ وَبِالشَّرَابِ

ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اپنی سواریاں دوڑا رہے ہیں۔ مگر کسی ایسی منزل کی طرف۔ جس کا ہمیں علم
نہیں۔ یعنی پردہ غیب میں ہے اور اُدھر ہم پر کھانے پینے کے ذریعے سحر کیا جاتا ہے۔ یعنی
خوراک کھا کر ہم غافل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ جسم میں تیز رفتاری سے سواریاں دوڑا رہے ہیں۔
جسم کی مشینری اتنی تیزی سے کام کر رہی ہے گویا ہزاروں میل کی رفتار سے چلنے والے ہوئی جہاز

سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے۔ لیکن یہ سب کچھ پردہ غیب میں ہے۔
اسی طرح ایک شخص یوں کہتا ہے۔

لَ فَإِنْ تَسْلِينَا فَيَمَّ عَنَّا فَأَنَّا عَصَا فَيُؤْمِنُ هَذَا الزَّانِمُ الْمُسْتَعْرِ

اگر تو ہم سے پوچھے کہ ہم کس حال میں ہیں۔ تو میں کہوں گا کہ ہم تو محرز وہ مخلوق میں سے جڑیوں کی مانند ہیں۔ جو کھانے پینے کے ذریعے اڑتے پھرتے بستے ہیں۔

عربی زبان میں سحر کا ایک معنی بھیچڑا بھی ہوتا ہے۔ وہ بھی مخفی ہوتا ہے۔ نظر نہیں آتا۔ لہذا اس لحاظ سے بھی سحر میں اخفا کا معنی پایا جاتا ہے۔

کیا ہاروت ماروت
انسان تھے؟

بعض فرماتے ہیں کہ ہاروت ماروت فرشتے نہیں بلکہ انسان تھے اور نیک آدمی تھے ان کے متعلق رَجُلَيْنِ صَالِحَيْنِ کے لفظ آتے ہیں۔ وہ بابل میں بستے تھے۔ اور سحر کا علم جانتے تھے۔ تاہم جب وہ لوگوں کو یہ علم سکھاتے تھے۔ تو انہیں خبردار بھی کرتے تھے کہ یہ علم اچھا نہیں ہے۔ اس سے بچ جاؤ تو بہتر ہے۔ ورنہ ایمان ضائع کر بیٹھو گے۔ کیونکہ سحر پر اعتقاد رکھنا اور اس پر عمل کرنا کفر میں داخل ہے۔ تاہم اس علم کے نزول میں کوئی خاص قباحت نہیں ہے۔ یہ ایک علم ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ہاروت ماروت مَلَکَيْنِ (فرشتے) نہیں بلکہ مَلَکَيْنِ یعنی بادشاہ تھے۔ اور بڑی سطنت کے مالک تھے۔ ان کے پاس یہ علم تھا۔ ان کا خیال یہ ہے کہ مَلَکُ کا اطلاق فرشتوں کے علاوہ نیک آدمیوں پر بھی ہوتا ہے جیسے سیدہ یوسف میں مَلَکُ کا لفظ یوسف علیہ السلام کے لیے بھی بولا گیا ہے اِنْ هَذَا اِلَّا مَلَکٌ کَرِیْمٌ وہ انسان نہیں بلکہ بزرگ فرشتہ ہے۔

امام ابو منصور ماتریدیؒ اور ابوالحسن اشعریؒ تیسری چوتھی صدی کے مجدد پایہ اہم گذرے ہیں۔ کیا سارا جادو یہ اہم عظیم کے شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ آپ بڑے حکم ہیں اور علم کلام میں آپ کو بڑا مرتبہ حاصل ہے۔ امام ابو منصور ماتریدیؒ فرماتے ہیں کہ سحر کو مطلقاً کفر کننا درست نہیں۔ کیونکہ اسکی

عملیات پر رہ گیا ہے۔ اس کام کے لیے یہ عمل کر لو۔ اس کام کے لیے وہ وظیفہ کافی ہے
علم و عمل ختم ہو چکا ہے۔ علمائے حق کا ایک مدہم سادیا ٹھمکا ہوا ہے۔ در نہ ساری دنیا کفر و
ضلالت کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی ہے۔

اہل کتاب کی طرح ہماری امت میں بھی حق و باطل غلط ملط ہو چکا ہے۔ صحیح اور غلط
کی پہچان ایک عام شخص کے لیے مشکل ہو چکی ہے۔ دیہات میں حالات اور بھی خراب ہیں
جہاں کے اہم کے فرائض میں نماز پڑھنا بھی ہے۔ اور مرنے کو غسل دینا بھی۔ بچے کی پیدائش
پر کان میں اذان بھی دینی کہتے ہیں۔ حقیقت کے لیے جانور ذبح کرنا ہو۔ تو اہم صاحب کو بلایا جاتا
ہے۔ اور اگر تعویذ گنڈے کی ضرورت پڑ جائے تو بھی میاں صاحب دیں گے۔ ان کا علم خطبہ
جموہی تعارفی مسائل تک ہوتا ہے۔ دین کے علم سے بچے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ غرض یہ
حالات یہودیت سے مشابہت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت بھی
پیسے لوگوں کے نقش قدم پر بالکل اسی طرح چلے گی۔ جس طرح ایک جوتا دوسرے کے مشابہ
ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

بعض علاقوں میں چار چار گاؤں کا ایک ہی اہم ہے۔ بلکہ ہم نے خود سفر میں ملاحظہ کیا۔ کہ
ایک علاقہ میں پندرہ سات گاؤں کا ایک ہی اہم تھا۔ کہیں نکاح کرنا ہو۔ جنازہ پڑھنا ہو۔ وہی
مولوی صاحب انجام دیں گے۔ تعویذ گنڈے کا کاروبار چل رہا ہے۔ نقش سلیمانی والی کتابیں ہیں۔
لکھنؤ والے کی کتاب نفع المخلاتی ہے۔ یہ تعویذ گنڈے والی دہلوی کی کتاب۔ فائدہ ہے۔
کسی مسئلہ کا حل غلوب ہو۔ کتاب کھول کر معلوم کر لو۔ حتیٰ کہ چوری تک کی تفتیش عملیات کے
ذریعے ہوتی ہے۔ یہ کالا علم جھاڑ چھونک وغیرہ سفلی عملیات ہیں۔ یہی چیزیں یہودیوں میں رائج
تھیں اور آج ہم میں بھی یہی پائی جاتی ہیں۔ جس سے صحیح وظائف بھی ہیں۔ جیسے سورۃ یسین کا ورد
ہے۔ سورہ منزل کی روزانہ تلاوت ہے۔ رزق کی فراوانی۔ کسی جائز چیز کے حصول یا کسی
منیبت سے رہائی کے لیے کسی کو کوئی اچھی بات بتادی۔ مگر عام طور پر یہ گنڈے تعویذ
یہودیوں والے ہیں۔ ذرا کھوم پھر کے دیکھ لیں۔ ماہرین عملیات کے ہاں غورتوں کی جہاز ہے
کوئی نہیں دیکھا کہ مقصد جائز ہے۔ یا ناجائز۔ کھر بے یا شرک۔ سب ایک ہی گاڑی میں

سوار چلے جائے ہیں۔ یہی یہودیت کی موافقت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَآتَيْنَهُم مِّنْ لَّدُنَّا فَسْخًا مِّنَ الْعَذَابِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذَا ظَاهَرُوا لِلْإِسْلَامِ لَمْ يَمْلِكُوا إِلَىٰ أَن يَنْتَهِبُوا الْعِمَادَ لَبَسُوا بِكُفْرِهِمْ إِيْمَانًا وَلَٰكِن تَقَوَّيْنَا لَأَخَذُ الْبَاطِلَ مِنْ يَدِهِمْ وَخُتِمَ عَلَيْهِمْ قُلُوبُهُمْ ۚ وَلَٰكِن لَّا يَتَذَكَّرُونَ ۚ وَلَٰكِن لَّيْسَ بِكُفْرِهِمْ بِأَمْرٍ عَظِيمٍ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذَا ظَاهَرُوا لِلْإِسْلَامِ لَمْ يَمْلِكُوا إِلَىٰ أَن يَنْتَهِبُوا الْعِمَادَ لَبَسُوا بِكُفْرِهِمْ إِيْمَانًا وَلَٰكِن تَقَوَّيْنَا لَأَخَذُ الْبَاطِلَ مِنْ يَدِهِمْ وَخُتِمَ عَلَيْهِمْ قُلُوبُهُمْ ۚ وَلَٰكِن لَّيْسَ بِكُفْرِهِمْ بِأَمْرٍ عَظِيمٍ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذَا ظَاهَرُوا لِلْإِسْلَامِ لَمْ يَمْلِكُوا إِلَىٰ أَن يَنْتَهِبُوا الْعِمَادَ لَبَسُوا بِكُفْرِهِمْ إِيْمَانًا وَلَٰكِن تَقَوَّيْنَا لَأَخَذُ الْبَاطِلَ مِنْ يَدِهِمْ وَخُتِمَ عَلَيْهِمْ قُلُوبُهُمْ ۚ وَلَٰكِن لَّيْسَ بِكُفْرِهِمْ بِأَمْرٍ عَظِيمٍ ۚ

ہوتے۔ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ اگر انہیں علم ہوتا۔

البقرة

آیت ۱۰۴

الف

درس پیل و دو

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا
وَالْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۱۰۳ مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ
الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ
رَبِّكُمْ وَاللَّهُ يَخْتَصِرُ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ
الْعَظِيمِ ۝۱۰۴ مَا نَسَخَ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا
أَوْ مِثْلَهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۱۰۵
أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا لَكُمْ
مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝۱۰۶

ترجمہ: اے ایمان والو! امت کو راعن کہو بلکہ کہو انظرنا اور سنو اور کفر کرنے

والوں کے لیے دردناک عذاب ہے ۝۱۰۳ اہل کتاب اور مشرکین میں سے

جنہوں نے کفر کیا، وہ نہیں پسند کرتے، کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی

بھلائی اتاری جائے۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے، اپنی رحمت کے ساتھ اس

کو کتاب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے ۝۱۰۴ جو ہم کسی آیت کو

منسوخ کرتے ہیں یا بھلایتے ہیں تو ہم اس سے بہتر یا اس جیسی

آتے ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۝۱۰۵

کیا آپ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کی

بادشاہی ہے اور تمہارے لیے اس کے سوانہ کوئی حمایتی ہے اور نہ مددگار ۝۱۰۶

گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کی پستی اور غلطی کا ذکر تھا۔ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی
کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔ دین کی سر بلندی کے کام کو ترک کر دیا۔ جہاد سے منہ موڑ گئے
اور سحر جادو ٹوٹنے ٹوٹنے جیسے سفلی اعمال کو ہی اپنا سب کچھ سمجھ لیا۔ انہوں نے ان برائیوں

رابطہ آیات

خاص طور پر پھر کو انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب کیا۔ جو کہ ان کی ذلت کا انتہائی درجہ تھا۔
 ان آیات میں اللہ جل شانہ نے بنی اسرائیل کی اخلاقی پستی کا ذکر فرمایا ہے جس کے
 ذریعے وہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء علیہم السلام کو ذہنی تعظیم پہنچاتے تھے۔ یہودیوں نے اپنی
 اس ذلیل حرکت کا ارتکاب نہ صرف سابقہ انبیاء علیہم السلام کے زمانے میں کیا۔ بلکہ حضور
 خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں بھی اس حرکت سے باز نہ آئے۔ اور آپ
 کو مختلف طریقوں سے ایذا پہنچائی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اس حرکت کا تذکرہ کر کے
 اہل اسلام کو خبردار کیا۔ کہ وہ کبھی کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے معاذ اللہ نبی علیہ السلام کی توحید
 کا پہلو نکلتا ہو۔

بنی اسرائیل کی
 اخلاقی پستی

اس مقام پر جس خاص بات کی طرف اشارہ ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ جب یہودی آپ کی
 مجلس میں آتے تھے۔ تو آپ کی توجہ بند دل کرنے کے لیے رَاعِنَا کا لفظ استعمال کرتے تھے
 جو کہ اُنْظُرْنَا کا ہم معنی ہے مطلب یہ ہے کہ آپ ہماری رعایت کریں یعنی ہماری طرف
 توجہ فرمائیں۔ اُنْظُرْنَا کا معنی بھی یہی ہے آپ ہماری طرف نہ دیکھیں، نظر کریں۔ ہماری بات
 غور سے سنیں۔ بظاہر دونوں الفاظ کا معنی ایک ہی ہے۔ مگر یہودی اپنی گندی ذہنیت کے
 اظہار کے لیے رَاعِنَا کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ اور پھر اس لفظ کو کھینچ کر اور گھما کر رَاعِنَا
 بولتے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ لَيَّا بِأَلْسِنَتِهِمْ زَبَانَ مِمْسِرٍ پھر کر کے لفظ لَوَا
 کرتے تھے جس کی وجہ سے رَاعِنَا کہتے یعنی ہمارا چرواہا۔ مزید برآں یہودیوں کی زبان میں
 یہ لفظ گالی کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ جس کا معنی احمق اور بیوقوف ہے۔ گویا اس طرح یہ
 لوگ اپنی گندی ذہنیت کا اظہار کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خبردار کیا۔ کہ تم اہل کتاب کی پیروی نہ کرنا۔ ارشاد ہوتا ہے
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا ۖ اٰیْمَانُ وَالْوَاۡجِبُ تَمَّ نَبِیْ عَلَیْہِ السَّلَامُ کی توجہ
 اپنی طرف مبذول کرنا چاہو۔ تو رَاعِنَا کا لفظ استعمال نہ کرو کیونکہ اس سے نفوذ باللہ نبی علیہ السلام

مذہب علی ہدیہ
 اہل اسلام

کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ اور نبی کی توہین کفر کے مترادف ہے۔

سورۃ مجادلہ میں یہودیوں کی ایک اور قبیح حرکت کا بھی ذکر آتا ہے جب یہ بد بخت حضور علیہ السلام کی مجلس میں آتے تھے تو السلام علیکم کی بجائے السّام علیکم کہتے تھے۔ سام کا معنی موت یا ہلاکت ہے۔ گویا السلام کا لفظ مجاہد کر السّام کہتے تھے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا: کہ جب یہودی سلام کریں ان کے سلام کا جواب دے لیں السلام کی بجائے صرف علیکم دیا کرو۔ جس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ جو کچھ تم نے کہا۔ وہ تم پر ہی ہو۔ یعنی اگر السلام کی بجائے السّام بولا جائے۔ تو یہ ہلاکت تمہیں نصیب ہو۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اسی حرکت کے متعلق فرمایا حَتَّىٰ تَكُونَ لَكُمْ مِجْنَاتُ يَوْمَ تَقُولُ بِمِ اللَّهِ تَعَالَىٰ لَوْ كُنَّا نَعْلَمُ سِرَّ آلِ إِبْرَاهِيمَ لَعَلَّآ نَكُونُ مِنْكُمْ مُّؤْمِنِينَ۔ جو اللہ تعالیٰ نے نہیں دی۔ ہر حال اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو متنبہ فرمایا کہ حضور علیہ السلام کے لیے کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کریں۔ جس سے آپ کی شان اقدس میں فرق آنے کا احتمال ہو۔ وَقُولُوا انْظُرْنَا وَرَاعِنَا کی بجائے انْظُرْنَا کہو۔ یعنی ہماری طرف نظر کر رہے ہو۔

اہل ایمان
کو خطاب

سورۃ بقرہ میں یہ پہلا موقع ہے جس میں اہل ایمان کو خطاب کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے عام لوگوں کو خطاب ہوتا رہا ہے۔ جیسے یَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمْ۔ اے نوح انسان! اپنے رب کی عبادت کرو۔ یا بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا یٰبَنِي إِسْرَٰءِیْل اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ یعنی اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی۔ اب یہاں سے اہل ایمان سے خطاب ہو رہا ہے۔ اور پورے قرآن پاک میں اٹھائی مرتبہ اہل ایمان کو خطاب کیا گیا ہے۔ شاد عبد العزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ سابقہ کتب سماویہ میں اہل ایمان سے براہ راست خطاب نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ انبیاء علیہم السلام سے خطاب ہوتا تھا۔ جو آگے اپنی اپنی امت تک حکم الہی کو پہنچاتے تھے۔ یہ صرف آخری امت کو شرف حاصل ہوا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے براہ راست اہل ایمان کو خطاب کیا ہے۔

زولمزمند احمد میں یہ رویت ہے۔ اور اہم تہمتی نے اسے شعب الایمان میں بھی بیان کیا ہے۔
 کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ حضور! مجھے کوئی نصیحت
 فرمائیں۔ آپ نے فرمایا۔ اے عبداللہ! جب تم قرآن میں یہ خطاب پڑھو **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا**
 تو پورے دل کے ساتھ متوجہ ہو جاؤ۔ یہ سمجھ لیا کرو کہ اللہ تعالیٰ تم سے براہ راست خطاب فرماتے
 ہیں۔ اس سے بڑی نصیحت اور وصیت کیا ہو سکتی ہے۔ مقصد یہ تھا۔ کہ یہ ایسی اعلیٰ چیز ہے۔ کہ
 پوری توجہ کے ساتھ ہمہ تن گوش ہو کر سنا کرو کہ اللہ تعالیٰ کیا حکم فرما رہے ہیں۔ کس چیز کے کرنے کا
 حکم ہے۔ اور کس چیز سے نکل جانے کی بات ہے۔

الغرض! اس خطاب میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام کی توجہ بند دل کھلنے
 کے لیے **رَاعُوا** کا لفظ استعمال نہ کرو جبکہ **انظرونا** سے خطاب کیا کرو اس خطاب میں
 امر اور نہی دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تاکید فرمادیا **وَأَسْمَعُوا** یعنی جو حکم ہو
 رہا ہے۔ اُسے خوب غور سے سنو۔ کیونکہ یہ ایک بڑا اہم حکم ہے۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ عام گفتگو میں مشتبہ الفاظ استعمال نہ کرو۔ کوئی شخص اپنے
 غلام یا لونڈی کو عبیدی اور اہلی کہہ کر نہ پکارتے۔ لفظ **عبد** سے شبہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ
 پکارنے والا شاید اپنے آپ کو معبود سمجھ رہا ہے۔ حالانکہ معبود تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے
عبد کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے۔ مگر معاملہ بالکل واضح ہونا چاہیے۔ کسی قسم کا شبہ نہیں رہنا
 چاہیے۔ اسی طرح لونڈی کو بندی کہہ کر پکارتے کی بجائے لونڈی کہہ کر پکارو۔ غلام اور لونڈی کو
 فتائی اور فتاة کہہ کر بھی بلایا جاسکتا ہے۔ یعنی اے جوان یا اے لونڈی۔ حضور علیہ السلام نے
 فرمایا۔ عبد کا لفظ اس لیے مناسب نہیں کہ **كُلُّكُمْ عَبْدُ اللَّهِ** کہ تم اللہ تعالیٰ کے بند
 ہو۔ اسی طرح ساری عورتیں اللہ تعالیٰ کی بندیاں ہیں۔ یہ کسی انسان کے بندے یا بندیاں نہیں ہیں۔
 لفظ **مولى** بھی مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کو بلا تخصیص ہر جگہ استعمال کرنا
 اشتباہ پیدا کر سکتا ہے۔ مولى کے کئی معنی ہیں جیسے دوست، صاحب، آقا، غلام، غلام

مشتبہ الفاظ کے
 استعمال کی ممانعت

آزاد کرنے والا وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سمجھائی کہ اس لفظ کو عطا طور
 مت استعمال کرو۔ جس سے شبہ پیدا ہوتا ہو۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے: حضور علیہ السلام
 نے فرمایا لَا تَقُولُوا لِلْعَنْبِ الْكَرْمُ یعنی انگور کو کرم مت کہو بلکہ عنب کہو۔ یا جلد کہہ سکتے ہو۔
 اس کی وجہ یہ ہے کہ کرم تو مومن کا بدلہ ہے جس میں ایمان پایا جاتا ہے۔ اور جس میں اخلاق خرد
 ہوتے ہیں۔ ایسی چیز کو انگور کے معنوں میں استعمال کرنا درست نہیں۔ انگور سے عام طور پر شراب
 تیار کی جاتی ہے۔ جب لوگ شراب کی تعریف کرتے ہیں تو اس میں جب کرم کا نام آتا ہے
 تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شراب کرم یعنی بخشش اور فیاضی سے کشیدہ کی گئی ہے۔ گویا اس
 لفظ سے بالواسطہ شراب کی تعریف ہوتی ہے۔ لہذا انگور کے لیے کرم کا لفظ استعمال کرنے
 سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم
 کے لیے لفظ یذر
 کا استعمال درست
 نہیں

یذر کا لفظ انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی رہنمائی کرنے والا ہے۔ بلاشبہ پیغمبر بھی امت
 کی رہنمائی کرتے ہیں۔ مگر یہ ایک ایسا لفظ ہے جو ہر قسم کے رہنما کے لیے استعمال ہوتا ہے۔
 عام طور پر اس کا اطلاق سیاسی لوگوں پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ اخلاقی اقدار اور دیانتداری سے بے بہرہ
 ہوں اور خواہ ان کی فکر بھی فاسد ہو۔ اہل اسلام میں سے ہوں یا غیر مسلم۔ متقی ہوں یا فاسق۔ فاجر
 یہ لفظ سب کے ساتھ یکساں طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور بین الاقوامی طور پر یہ لفظ چرچل، برٹین
 ڈیگال، ریجن وغیرہ قسم کے لوگوں پر بولا جاتا ہے۔ لہذا اس قسم کا مشتبہ لفظ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ
 وسلم کے ہرگز شایان شان نہیں۔ ہمارے زمانے کے بعض مفسرین نے اپنی تصانیف میں یہ لفظ
 حضور علیہ السلام کے لیے استعمال کیا ہے۔ جو قطعاً نامناسب ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا
 کہ مشتبہ لفظ کسی عام چیز کے لیے بھی استعمال نہ کیا جائے چہ جائیکہ خود حضور والاصفات علیہ السلام
 کی ذات اقدس کے لیے ایسا لفظ بولا جائے۔ پیغمبر کے لیے انگریزی کے متبب دل الفاظ
 MESSENGER پیغمبر یا پرافٹ (PROPHIT) وغیرہ استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

الغرض فرمایا کہ نبی علیہ السلام کی ذات کے متعلق کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کر۔ جو آپ کی شان کے خلاف ہو۔ اگر
 کوئی ایسا کرے تو یاد رکھو وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ کلمہ کفر کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے دردناک عذاب
 تیار کر رکھا ہے۔

فَرَا مَا يَعِدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ
 عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ هَذَا اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے وہ
 نہیں پسند کرتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بہتری کی چیز اتاری جائے۔ مشرکین کو
 میں ابو جہل، ابولسب، عتبہ اور شیبہ جیسے بڑے بڑے سردار تھے۔ وہ حضور علیہ السلام سے حسد
 کرتے تھے کہ اگر وہ آپ کو نبی تسلیم کر لیتے تو ان کی سرداری حضور علیہ السلام کو منتقل ہو جاتی تھی۔ اور وہ
 بزعم خویش ناپسند ہو کر رہ جاتے تھے۔ دوسری طرف اہل کتاب تھے جو امید لگائے بیٹھے تھے کہ نبی
 آخر الزمان بنی اسرائیل میں آئے گا۔ جب آخری نبی ہونے کا دعویٰ بنو اسماعیل کے قبیلہ قریش
 میں سے ہوا۔ تو وہ بھی حسد کی آگ میں جلنے لگے لہذا انہوں نے آپ کو اللہ تعالیٰ کا آخری نبی تسلیم
 کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی رکوع میں آگے آئے گا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ
 انہوں نے حسد کیا اور ایمان کی دولت سے محروم ہے اسی لیے فرمایا کہ اہل کتاب در مشرکین
 نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ کا قرآن پاک آپ پر نازل ہو۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہاں پر تمہاری خواہشات اور
 توقعات کی بات نہیں بلکہ واللہ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ اللہ تعالیٰ
 جسے چاہے اپنی رحمت کیلئے ماس لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے اس نے یہ پسند کیا کہ اپنی رحمت
 خاصہ بنو اسماعیل میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس پر نازل فرمائے۔ اس سے پہلے
 اللہ تعالیٰ بنو اسماعیل پر بے شمار رحمتیں نازل کر چکا ہے۔ اس قوم میں بڑے بڑے بادشاہ اور
 جلیل القدر رسول بھیجے۔ اِذْ جَعَلْنَا فِيكُمْ رُسُلًا وَجَعَلْنَا بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الْكُفَّارِ
 تفصیل تذکرہ کسی گزشتہ درس میں گزر چکا ہے۔ اس قوم میں اللہ تعالیٰ نے ہزاروں نبی
 مبعوث فرمائے۔ اور کتنوں کو بادشاہت بھی عنایت کی۔ ایسی حکومت اور بادشاہت
 جو دنیا میں کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ تو اب کیا اللہ تعالیٰ نے کوئی وعدہ کر رکھا ہے
 کہ نبوت بنو اسماعیل سے باہر نہیں جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اسی میں ہے کہ سلسلہ نبوت

کو بنو اسماعیل پر ختم کرنا تھا۔ لہذا اس میں بوجہ حق کے لیے حسد کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

تفسیر آیات
کی وجوہات

بنی اسرائیل اور مشرکین کا ایک اعتراض یہ تھا کہ جب قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ پہلی کتابوں کا معنی قہر ہی ہے۔ تو پھر یہ سابقہ کتب کے احکام کو منسوخ کر کے نئی تربیت کیوں نافذ کرتا ہے۔ نیز اپنے ہی احکام کو بعض اوقات تبدیل کر دیتا ہے۔ بقول ان کے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ معاذ اللہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کو معاملے کا پوری طرح علم نہیں ہوتا تو حکم جاری کر دیتا ہے۔ مگر جب اس کا پوری طرح علم ہو جاتا ہے۔ تو حکم میں ترمیم کر دیتا ہے۔

دیانندہ سرسوتی ہندوؤں کی آریہ سماج تنظیم کا مشہور لیڈر ہوا ہے۔ اپنی نوعیت کا شریعت پسند آدمی تھا۔ یہی اعتراض — اُس نے اپنی کتاب میں بھی کیا تھا کہ کسی پسند ہی حکم کو منسوخ کر دینا جہالت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کا جواب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دیا تھا کہ احکام کی تفسیر جہالت کی بنا پر نہیں بلکہ حکمت کی بنا پر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ عظیم و حکیم ہے۔ اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر حکم حالات کے تقاضوں کے مطابق جاری ہوتا ہے۔ جب حالات متقاضی ہوتے ہیں۔ تو پہلا حکم منسوخ کر کے دوسرا جاری کر دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال اس طرح بیان کی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹر یا حکیم کسی مریض کو صبح کے لیے اور دوا دیتا ہے اور شام کے لیے دوسری۔ یا ایک ہفتہ ایک دوا استعمال کراتا ہے تو دوسرے ہفتے کے لیے کوئی اور تجویز کرتا ہے۔ کیا ڈاکٹر بوقوف ہے یا جاہل جو مختلف اوقات کے لیے مختلف دوا تجویز کرتا ہے۔ بلکہ ڈاکٹر مریض کے حالات کے مطابق دوا کو منسوخ کر دیتا ہے یا تبدیل کر دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی کسی قوم کے حالات کے تقاضے کے مطابق احکام نازل فرماتے ہیں۔ جیسا کہ ضرورت ہوتی ہے۔ بعض احکام کو تبدیل کر دیتے ہیں یا اپنی حکمت کی بنا پر احکام میں ترمیم کرتے ہیں۔ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو کہ تمام اقوام کے لیے یہاں طور پر نافذ العمل ہے۔ لہذا اس نے

پیغمبر علیہ السلام کے ذہن سے محو کر دیا جاتا ہے۔ فَرَأَى الْآلَمَ تَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنی حکمت اور فشار کے مطابق آیت نازل کرتا ہے۔ بعض کو قائم رکھتا ہے۔ اور بعض کو منسوخ کر دیتا ہے پھر اُن سے بہتر یا اُن جیسی اور نئے آتا ہے۔ ایسا کرنا نقل و نقل کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ اس پر اعتراض کرنا حماقت کی نشانی ہے۔

پھر فَرَأَى الْآلَمَ تَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اے مخاطب! کیا تم جانتے نہیں کہ زمین و آسمان کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے۔ جب وہ مالک الملک ہے تو کیا اُسے یہ اختیار حاصل نہیں کہ کسی حکم کو منسوخ کر دے یا تبدیل کر دے۔ معاذ اللہ کیا وہ مجبور ہے کہ ہر حالت میں ایک ہی حکم کو جاری رکھے۔ اگر ایسا تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کی حاکمیت کو ثابت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ لہذا وہ تینے احکام پر پلیدی طرح قادر ہے۔ اور یہ اس کا حق بھی ہے۔

فرمایا یاد رکھو! کہیں جھک نہ جانا، وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ اس کے سوا اعتبار کوئی حمایتی اور مددگار نہیں ہے۔ ولی کا معنی عام طور پر سرپرست ہوتا ہے۔ ام بیضادی فرماتے ہیں کہ بعض اوقات سرپرست کمزور بھی ہوتا ہے۔ جو کہ مدد کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ مگر نصیر وہ ہوتا ہے۔ جو فی الواقع مدد کے قابل ہو۔ دوسرے الفاظ میں اُسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ولی وہ ہوتا ہے جو زبانی طور پر مدد کرتا ہے۔ در نصیر وہ ہے جو عملی طور پر مددگار ثابت ہو۔ گویا اللہ تعالیٰ ان دونوں صفات کا مالک ہے۔ وہ اپنی مخلوق کا ہر طرح مددگار ہے۔ وہ قادر مطلق بھی ہے اور عظیم کل بھی ہے۔ جو نہ حکم چاہے نافذ کرے اور جسے چاہے منسوخ کر دے اس کے ارادہ اور قدرت میں کوئی دوسرا مغل نہیں ہو سکتا۔ وہ خود ہی احکام جاری کرتا ہے۔ اور اپنی ہی مشیت سے بعض کو منسوخ کر دیتا ہے۔ اس پر اعتراض ناممکن ہے۔

أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سَأَلَ مُوسَى مِنْ قَبْلُ
وَمَنْ يَتَّبِدَلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ
⑩ وَكَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُّوْكُمْ مِّنْ بَعْدِ
إِيمَانِكُمْ كَفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنْفُسِهِمْ مِنْ بَعْدِ
مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ
إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ⑪ وَأَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ
وَمَا تُقَدِّمُوا مِنْ أَنْفُسِكُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ اللَّهِ
إِنْ أَنْتُمْ تَعْمَلُونَ بِصِرٍّ ⑫

ترجمہ: کیا تم یہ ارادہ کرتے ہو کہ اپنے رسول سے اسی طرح سوال کرو جس
طرح اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا گیا۔ اور جو شخص ایمان کے بدلے میں کفر
اختیار کرے گا وہ سیدھے راستے سے گمراہ ہو گیا ⑩ اہل کتاب میں سے بہت
سے پسند کرتے ہیں کہ مومن ہونے کے بعد تمہیں کفر کی طرف پٹا دیں۔ اپنے
نفوس میں حسد کرتے ہوئے۔ بعد اس کے کہ ان کے لیے حق ظاہر ہو گیا ہے۔
پس درگزر کرو اور معاف کر دو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لائے۔ جسکے تحت
ہر چیز پر قادر ہے ⑪ اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے ہو اور بھلائی میں سے
جو کچھ تم اپنے نفوس کے لیے آگے بھیجو گے۔ اس کو اللہ کے پاس پا لو گے۔
اللہ تعالیٰ تمہارے ہر کام کو دیکھنے والا ہے۔ ⑫

بنی اسرائیل کی نرابیوں کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ
نے اہل ایمان کو راعنا کا لفظ استعمال کرنے سے منع فرمایا تھا۔ اس کی بجائے اُنظُرْنَا
استعمال کرنے کا حکم دیا تھا۔ کیونکہ یہودی دید و دانستہ راعنا کا لفظ بولتے تھے۔ جس سے

ربط آیات

معاذ اللہ تعالیٰ علیہ السلام کی توہین کا سہل و سہل تھا۔ گذشتہ درس میں اس بات کا انکشاف بھی کیا تھا کہ اہل کتاب اور مشرکین میں سے کوئی نہیں چاہتا کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان پر کوئی بہتر چیز نازل فرمائے۔ یہ لوگ نبی کے ساتھ حسد کرتے تھے۔ پھر انہوں نے نسخ آیات کا مسئلہ بھی اٹھایا کہ اللہ تعالیٰ ایک حکم جانی کرنے کے بعد اُسے منسوخ کیوں کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ ایا کسی لاعلمی یا جہالت کی بنا پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ جس طریقے پر نوبہ انسانی کی بھلائی چاہتا ہے۔ اس کے مطابق شریعت نازل فرماتا ہے۔ اسکی مثال ایسے ہی ہے۔ جیسے ایک ڈاکٹر کسی مریض کو مختلف اوقات میں مختلف دوائیں دیتا ہے۔ کسی کو منسوخ کر دیتا ہے۔ کسی کو تبدیل کرتا ہے اور کسی کو جاری رکھتا ہے۔ یہ مریض کے حالات پر منحصر ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی لوگوں کے حالات کے مطابق شریعت میں رد و بدل فرماتے ہیں۔ وہ ملک الملک جس طرح چاہتا ہے حکم نازل فرماتا ہے۔ اس کے کسی حکم پر اعتراض کرنا اس کے قادر مطلق ہونے پر اعتراض کرنے کے مترادف ہے۔

یہودیوں کے
سوالات

ان آیات میں یہودیوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تم نبی آخر الزمان سے ایسے سوالات نہ کرتے ہو جیسے تمہارے آباء و اجداد نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیے۔ ارشاد ہوتا ہے اَهْرَ تَرْفِدُوْنَ اَنْ تَسْأَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سَآلَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ مُمْضِرِّیْنَ کَرَامِ فِرْمٰتِہِ ہیں لہٰذا اس آیت میں روئے سخن اہل کتاب کی طرف ہی ہے۔ یہی لوگ حضور علیہ السلام سے طرح طرح کے یہودہ سوالات کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم ان سے سوال کرتی ہے۔ اُنْکَ سُوْرَةُ نَارِیْنَ اِسْ کِی تَفْصِیْلَ اَسْکَیْکَ یَسْأَلُکَ اَهْلُ الْکِتَابِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْہِمْ کِتَابًا مِّنَ السَّمَآءِ اِہْلِ کِتَابِ اَپْ تَ سَوَالِ رَسُوْلِہِ ہیں۔ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی کتاب بیک وقت اکھن کیوں نہیں لاتے۔ جیسا کہ توراۃ مکمل طور پر نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ آپ ان کے سوالات کو فاجرین نہ لائیں۔ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰی اَکْبَرُ مِنْ ذٰلِکَ اَنْ یُّنْزِلَ عَلَیْہِمُ

نے تو موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑا سوال کیا۔ کہنے لگے اَرِنَا اللّٰهَ جَهَنَّمَ اَیُّ الشَّیْءِ
سے ہماری بالمشافہ ملاقات کرائیں۔ تب ہمارے ہم نامیوں نے آپ پر کتاب اتاری ہے
سورۃ بقرہ میں بھی اس قسم کے سوالات گزر چکے ہیں۔

مشرکین کے
سوالات

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت کے مخاطبین اہل کتاب کے علاوہ مشرکین
بھی ہیں۔ ان کے یہود و سوالات کا تذکرہ بھی قرآن پاک کے مختلف مقامات میں موجود ہے۔
سورۃ بنی اسرائیل کے مطابق انہوں نے نبی علیہ السلام سے فرشتہ کی کہ آپ یسویٰ لگا کر ایمان
پر چڑھ جائیں۔ اور پھر وہاں سے کتاب لائیں۔ مکتے کی سرزمین کو باغات میں تبدیل کر دیں۔
آپ کے ارد گرد فرشتوں کی جماعت ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ خود ہمارے سامنے آکر
آپ کی رسالت کی تصدیق کرے وغیرہ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے تمام سوالات
کا ایک ہی جواب دیا۔ قَدْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلُکُمْ یعنی
میں انسان ہوں اور اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ میں نے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ کہ میں قادر مطلق
ہوں اور جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ ہے۔ وہ جو چاہے کرتا
ہے۔ مقصد یہ کہ یہود کی طرح مشرکین بھی طرح طرح کے سوال کرتے تھے۔ اس قسم کے سوالات
کا مقصد محض ختمہ چینی ہوتا ہے اور کسی بات کو تسلیم نہ کرنے کا ایک بہانہ ہوتا ہے

صریح گمراہی

فرمایا اس طرح کے بے معنی سوالات نہ کیا کرو۔ کیونکہ اس کا نتیجہ بہت ہی بُرا ہو گا۔
وَمَنْ یَّتَّبِعْ اِلَکَ الْکَافِرَ بِالْاِیْمَانِ جو کوئی ایمان کے بے میں کفر اختیار کرے گا۔
فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا گمراہ ہو گیا۔ کیونکہ
اعتراض برائے اعتراض اور وہ بھی ایذا رسانی کے لیے کھلی گمراہی اور کفر ہے۔ یہاں پر
اگر یہ روئے سخن اہل کتاب اور مشرکین کی طرف ہے۔ تاہم بات اہل ایمان کو بھی سمجھائی
جاری ہے کہ جو بھی اس قسم کے یہود و سوالات کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو تسلیم نہیں کرے گا۔ وہ بہر حال راستے سے بھٹک جائے گا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اَمْرٌ تَرْيِدُونَ کے مخاطب اہل ایمان میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو یہود اور مشرکین کی روش سے خبردار کیا ہے۔ کہ تم ان کے طریقوں کو نہ اپنانا یعنی تم بھی اپنے نبی آخر الزماں علیہ السلام بلا وجہ سوالات نہ کرنا جس طرح اس سے پہلے اہل کتاب لے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیے اور ان سوالات کی وجہ انہیں طرح کی تکالیف برداشت کرنا پڑیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ غزوہ جین کے موقع پر حضور علیہ السلام نے دیکھا کہ مشرکین ایک خاص قسم کے درخت کو تبرک خیال کرتے ہیں۔ اس درخت کے ساتھ اپنے اسلحہ جات لٹکاتے تھے۔ اس کو ذات انواط کہتے تھے۔ یہ دیکھ کر صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا۔ حضرت! اجْعَلْ لِّذَاكَ الْنَوَاطِیْ بِمَا سِیَئِلُہِیْ کِی درخت کو ذات انواط مقرر فرما دیں جس پر ہم اپنے ہتھیار لٹکایا کریں۔ جیسا کہ مشرک کرتے ہیں۔ آپ یہ سن کر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا سُبْحَانَ اللہ یہ تو اس قسم والی بات ہوگئی۔ جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معیت میں بحیرہ قلزم عبور کیا تو وہاں ایک تہ کو پہنچے۔ یَعْلَمُونَ عَنْ اَمْنَابِہِمْ عُرْفًا جُوینے معبودوں پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کی پوجا کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر بنی اسرائیل نے بنی حضرت موسیٰ علیہ السلام

سے عرض کیا یٰمُوسٰی اجْعَلْ لِّذَا الْہٰکُمَا لَہُمَا الْہِمَّةُ جس طرح ان لوگوں نے اپنے معبود بنائے تھے میں اسی طرح ہمارے لیے بھی معبود مقرر کر دیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے ناراض ہوئے اور کہنے لگے یہ قوت قوم! یہ لوگ تو کفر میں مبتلا ہیں۔ کیا تم بھی اسی ہلاکت میں پڑنا چاہتے ہو۔ ابھی اللہ تعالیٰ نے تمہیں طاقتور دشمن سے آزادی دلائی ہے۔ تو پھر کفر و شرک میں مبتلا ہونا چاہتے ہو۔ بلا وجہ ناجائز سوال نہ کیا کرو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ بہت کم سوال کیا کرتے تھے۔ کیونکہ سورۃ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے کثرت سوال سے منع فرمادیا۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر ص ۱۵۲ تفسیر کبیر ص ۲۲۵ ۲۔ تفسیر ابن کثیر ص ۲۲۵ تفسیر ابن کثیر ص ۱۵۲

۳۔ تفسیر ابن کثیر ص ۱۵۲

لَا تَسْأَلُوهُنَّ عَنْ شَيْءٍ اِنْ سَبَدَ لَكُمْ تَسْأَلُوهُنَّ وَاِنْ تَسْأَلُوهُنَّ عَنْ شَيْءٍ
الْقُرْآنُ تَسْأَلُوهُنَّ یعنی نزول وحی کے زمانے میں سوال نہ کیا کرو۔ اگر بعض چیزوں
کے متعلق سوال کرو گے، تو وہ ظاہر کر دیا جائے گا۔ اور تم کو ناگوار گزرتے گو۔ مہاتے سے
بدنامی کا باعث ہوگا۔ اس لیے صحابہ کرام کثرت سوال سے اجتناب کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہی کا بیان ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اصحاب محمد
صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر کوئی قوم نہیں دیکھی۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال نہیں کیا
کرتے تھے۔ ایسا کرنے سے ڈرتے تھے۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ باہر کا کوئی اسرائیلی سوال
کرسے تو وہ بھی مستفید ہوں۔ خود سوال کرنے میں بہت محتاط ہوتے تھے۔ قرآن پاک میں کل
بارہ سوالات کا ذکر آتا ہے۔ جو صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ السلام سے کیے۔ ان میں یَسْأَلُونَكَ
عَنِ الْخَمْرِ اور یَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَسْمِیْنِ یَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ وغیرہ ایسے
سوالات شامل ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا رشا دگر میٹتے۔ اسے لوگو فضول
اور بے مقصد سوال نہ کیا کرو۔ کیونکہ پہلی امتیں بھی اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں کَثْرَةُ مَا یَسْأَلُونَ
وَلَا خُتَّةَ فِیْهِمْ عَلٰی اَنْ یَسْأَلُوْا کَثْرَتِ سَوَالِ کِی وجہ سے انہوں نے انبیاء علیہم السلام سے
اختلاف کیا اور ہلاک ہوئے۔ لہذا کثرت سوال سے بچو۔ ہاں! کسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے یا کسی
کام کے جواز یا عدم جواز کے لیے سوال کرنے کی ممانعت نہیں۔ زیادہ سوال کرنے میں قباحت
یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس سوال کا جواب تمہیں ناگوار گزرسے یا بدنامی کا باعث ہو۔ اکثر
سوال محض نکتہ چینی یا ایذا رسانی کے لیے کیے جاتے ہیں۔ اس لیے منع کیا۔ کہ اے اہل ایمان!
تم یہود کی روش پر نہ چلو اور کثرت سوال سے اپنے آپ کو بچنا

مسلمانوں کو سوالات کی ممانعت کی ایک وجہ تھی کہ اہل کتاب مسلمانوں کو اکستے تھے
کہ اپنے نبی سے یہ سوال پوچھو، اور اس سے ان کا مقصد فتنہ پر بازی ہوتا تھا۔ اہل ایمان کو
یہ بھی نصیحت ہے کہ وہ یہودیوں کی باتوں پر اعتماد نہ کریں۔ پہلے گندہ چاہے کہ لوگ

سحر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی فضول باتیں کرتے تھے جس سے مسلمانوں کے دلوں میں
شہ ڈال مقصود تھا۔ تاکہ اہل ایمان اسلام سے دستبردار ہو جائیں۔ ان کی سازشوں سے محفوظ
ہونے کے لیے فرمایا کہ ان پر اعتماد کرتے ہوئے ابے معنی سوال نہ پوچھا کرو۔

اہل کتاب کے
باطنی ارادے

مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ یہودیوں کے ارادے بڑے خطرناک ہیں وَذَكِّرْهُمْ
مَنْ أَهْلَ الْكِتَابِ لَوْ يُرِيدُونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كَفَّارًا۔ بات سے اہل کتاب
چاہتے ہیں کہ تمہیں پھر ایمان سے کفر کی طرف لوٹادیں۔ وہ ہر وقت اسی کوشش میں لگے
ہوتے ہیں کہ کسی طرح مسلمان کمزور ہو جائیں۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں۔ وہ بھی اپنے سابقہ دین
پر پٹ بائیں۔ یہ تو نازل قرآن کے زمانہ کی بات ہے۔ کہ اہل کتاب مسلمانوں کو پھٹا چھوڑنا
نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی یہ کوشش کج نامہ جاری ہے۔ کہ کسی طرح مسلمانوں کو دوبارہ
کفر کی طرف لوٹا دیا جائے۔ دنیا میں جتنی مشنریاں کام کر رہی ہیں۔ یہ سب اسی کام کے لیے
ہیں۔ دوسرے مقام پر آتمے فَتَكُونُونَ سَوَاءً۔ سب برابر برابر ہو جائیں۔ جس طرح
وہ خود گمراہ ہیں۔ اسی طرح مسلمان جی ان کی روش پر چل نہیںیں۔ جس طرح انسانوں نے اللہ تعالیٰ
کی کتاب اور انبیاء علیہم السلام کا انکار کیا۔ اسی طرح مسلمان کی کرنے لگیں۔ اہل کتاب کی دل
خواہی یہی ہے۔

فرمایا اہل کتاب کی اس گندنی ذہنیت کے نیچے ن کی ایک اور خباثت کا ذکر فرما۔
يَعْنِي حَذَرَ امْنٍ عِنْدَ انْفِيسِهِمْ۔ ان کے نفسوں میں چھپا ہوا حسد ہے۔ جو انہیں مسلمانوں
کے خلاف ابھار رہا ہے۔ اور پھر یہی ہے کہ وہ ایسا کسی غلط فہمی یا لاعلمی کی بنا پر نہیں
کرتے۔ بلکہ مَنْ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ۔ یہ سب کچھ حق کے اظہار کے بعد
کہہ رہے ہیں۔ انہیں حق اور باطل میں تمیز ہو چکی ہے۔ مگر حسد اس بات پر کرتے ہیں کہ نبی
آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نواسعیل کی بجائے نوحا حق میں کیوں نہیں آیا۔

حسد بدترین
بیماری ہے

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حسد و بدوہ کی بنا پر ہوتا ہے۔ اولاً یہ کہ فلاں نعمت فلاں

لو کہوں لی ہے اور پھر اس کے زوال کی تمنا کی جاتی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ فداں نعمت اس کی بجائے مجھے ملنی چاہیے، ایسی خواہش کرنا حرام ہے۔ یہ اخلاقی بیماری ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں: **إِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا يَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ** یعنی حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح خشک لکڑی کو آگ کھا جاتی ہے۔ حسد اتنی بڑی چیز ہے۔

امیر بن ابی صلت عرب کا عظیم شاعر اور حکیم تھا۔ خدا کو مانتا تھا۔ قیامت کا تصور ذہن میں موجود تھا۔ اسی لیے سچے مذہب کا متلاشی تھا۔ کبھی تو رات کا مطالعہ کرتا کبھی انجیل پڑھتا کبھی اہل کتاب سے گفتگو کرتا۔ تاکہ حق کو پاس کے ملے جب اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا تو یہ شخص حسد کی آگ میں جلنے لگا۔ یہ بات تھا کہ وحی اس پر نازل ہوتی۔ محض حسد کی وجہ سے دین خاص کا مخالف ہو گیا۔ اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہوئی۔

حسد کو قطعاً حرام ہے۔ البتہ غبطہ یا رشک جائز ہے۔ غبطہ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کے پاس نعمت دیکھ کر تمنا کرے کہ اللہ تعالیٰ اُسے بھی ایسی نعمت سے سرفراز فرمائے حسد کا معنی تو یہ ہے کہ جس کو کوئی بستی ملی ہے وہ اس سے محروم ہو جائے، مگر غبطہ میں کسی کے زوال کی تمنا نہیں ہوتی بلکہ اس کے حصول کی خواہش ہوتی ہے۔

بزرگان دین فرماتے ہیں مَا خَلَقَ جَعْدًا عَنْ حَسَدٍ عَامٍ طَوْرٍ بِرِ كَوْنٍ جَسَمٍ حَسَدٍ عَالِيٍّ نِیْلٍ بَوْنًا۔ اسی لیے تو زکی تمقین کی گئی ہے: **وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ** اے اللہ میں عاسد کے حسد سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ ہر حال حسد ایک بہت بڑی بیماری ہے اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔

جیسا کہ عرض کیا، غیر مسلم اقوام میں مسلمانوں کے خلاف حسد کی آگ نزول قرآن کے زمانے سے لے کر آج تک برابر بجھ کر رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت امریکہ، برطانیہ، جرمنی اور فرانس وغیرہ کی عیسائی طاقتیں اربوں روپیہ اس مقصد کے لیے خرچ کر رہی ہیں

غیر مسلم
عاسد اقوام

کہ کسی طرف سے قوم کا تعلق قرآن پاک سے منقطع کر دیا جائے۔ مستشرقین کا فتنہ اسی مقصد کے لیے کام کر رہا ہے۔ امیر شکیب ارسلانؒ نے الحاضری العالم الاسلامی جو ان کی مشہور کتاب ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ یورپی عیسائیوں اور یہودیوں نے بغیر اصلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو نسخہ کرنے کو قرآن پاک کی تردید میں چھ لاکھ کی تعداد میں کتابیں شائع کی ہیں تاکہ مسلمان اسلام سے بدظن ہو جائیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اگر عیسائیت نہ بھی قبول کریں تو کم از کم مسلمان کی حیثیت میں باقی نہ رہیں۔ مشنری سکول، ہسپتال وغیرہ سب اسی مقصد کے لیے چل رہے ہیں۔ لوگوں کو لالچ و بیکہ عیسائیت کی طرف مائل کیا جا رہا ہے۔ یہ اسی حسد کی بنا پر چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کا تعلق اپنے نبی سے کٹ جائے۔ اور یہ قرآن پاک کی تعلیمات کو چھوڑ دیں۔

مذہب
پر اعتراض

مذہب کا انکار بھی یہودیت کا شاخ نہ ہے۔ اس شخص کی خباثت کی داد دوس نے فیڈرل شریعت کورٹ میں دعویٰ دائر کیا ہے۔ کہ مذہب کی سزا کو کالعدم قرار دیا جائے۔ کیونکہ بقول اس کے یہ شرعی مذہب نہیں ہے۔ مقصد یہ کہ لوگ شوک و شبہات میں مبتلا ہو کر دین سے بیزار ہو جائیں۔ غارتیوں نے بھی یہی اعتراض کیا تھا۔ اور آج کے زمانے کے پرویزی اور چکراوڑی بھی اسی فاش سے ہیں۔ کہتے ہیں کہ قرآن پاک میں مذہب کی سزا نہیں ہے۔ ہمیں! صحیح سنت میں تو موجود ہے۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں مذہب کے متعدد گیس ہوئے۔ صیہ کہ ام غم کے زمانے میں مذہب کی سزا دی گئی۔ اگرچہ عام طور پر مذہب کی سزا قرار مجرم پر ہی دی گئی۔ تاہم اکتے دسے ایسے واقعات بھی پیش آئے۔ جن میں گواہی کی بنیاد پر مذہب کی سزا دی گئی۔ اس زمانے میں کسی کو مذہب کی سزا ملی ہو یا نہ۔ یہ الگ بات ہے۔ مگر اس کے شرعی نہ ہونے سے مجال انکار نہیں ہو سکتا۔

قرآن پاک کے
خلاف سازش

مستشرقین جنہیں محقق اور ریسرچ سکالر کا نام دیا جاتا ہے۔ انہوں نے قرآن پاک اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ختمہ چینی کی ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ کسی طرح مسلمان اپنے دین سے بدظن ہو جائیں۔ فیمڈسٹون نے برطانیہ کی پارلیمنٹ میں بر ملا کہا تھا کہ محمد کی کتاب قرآن اور ان کی قوارانسائیت کی دشمن ہیں (العیاذ باللہ) اس نے قرآن پاک ہاتھ میں لیکر کہا تھا۔ جب تک یہ کتاب دنیا میں موجود ہے۔ یہ دنیا مذہب نہیں بن سکتی۔ لہذا

اس کی عزت و توقیر لوگوں کے دلوں سے مٹانا ہوگی۔ اس کا مطلب یہی تھا۔ کہ قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے۔ جو فحاشی سے روکتی ہے۔ اور فحاشی اور عیاشی کے بغیر تہذیب نہیں آسکتی۔ ان کے نزدیک انسان مہذب نہیں کہلا سکتا۔ لہذا ان کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے۔ کہ کسی طرح قرآن پاک کو دنیا سے محو کر دیا جائے۔

فرمایا بہت سے اہل کتاب یہ پسند کرتے ہیں کہ تمہیں کفر کی طرف پٹا دیں۔ ایمان کے بعد احمد کرتے ہوئے بعد اس کے کہ حق واضح ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود مسلمانوں کو یقین کی جا رہی ہے۔ کہ اہل کتاب کے خلاف کسی قسم کا انتقامی جذبہ ذہن میں نہیں رکھنا۔ بلکہ فَاَعْنُوْا بِسُحُوْرٍ اور وَاَصْحٰوْا اور وَرٰكُزْ کر دو وَحٰثٰی يَاۤاَيُّهَا اللّٰهُ بِاَمْرِهِ۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لے آئے۔ گویا مسلمانوں کو انتقامی کارروائی کی بجائے حکم الہی کا انتظار کرنے کو کہا گیا تھا۔ آخر اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا۔ اور مدینہ طیبہ بلکہ پورے عرب کو یہودیوں اور نصاریوں سے پاک کر دیا گیا۔ فَرٰمٰاَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وقت آنے پر وہ ان بدبختوں سے مواخذہ کرے گا۔

نماز اور زکوٰۃ

اہل کتاب کی طرف سے جو کس بننے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے فرائض پر کار بند بننے کی تلقین بھی فرمائی۔ وَارْقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاَتُوا الزَّکٰوۃَ نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔ تمہاری طاقت کا منبع یہی دو چیزیں ہیں۔ انہیں مضبوطی سے تھام لو۔ تمہاری تمام تر قوت کا دار و مدار تعلق باللہ پر ہے۔ اور نماز۔ زکوٰۃ اس کا مظہر ہے نماز کسی حالت میں بھی معاف نہیں، اسے وقت پر ادا کرتے رہو۔ اور اگر صاحب نصاب ہو تو زکوٰۃ ادا کر دو۔ بخل جیسی۔ قبیح بیماری کا یہ بہترین علاج ہے۔ اسے کبھی نظر انداز نہ کرو۔ غیر مسلم اقوام مادی ترقی میں پیش پیش ہیں۔ اس معاملہ میں وہ تمہیں اپنے برابر نہیں آنے دیں گی۔ اگر تم یہ ہدف قائم کرو کہ چاس برس میں امریکہ کے برابر مادی ترقی حاصل کر لو گے۔ تو ممکن نہیں۔ کیونکہ اس وقت تک مہرہ تم سے پچاس سال مزید آگے نکل چکا ہو گا۔ لہذا تمہاری طاقت کا سرچشمہ مادی وسائل کی بجائے نُصُوْرَةُ دِزْکُوٰۃ ہے۔ انہیں کے ذریعے اندر ایمان اور وضاحت پیدا ہوگی تعلق بانہ قائم ہو۔ جو طاقت کا اصل سرچشمہ ہے۔

فرمایا، یاد رکھو، وَمَا تَقْدَمُوا مِنْ خَيْرٍ سَجْدًا وَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ
 تم اپنے نفسوں کے لیے جو بھی بھلائی آگے بھیجو گے۔ کوئی نیکی، کوئی عمل، صدقہ خیرات کر دو گے
 نماز ادا کر دو گے، اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ کسی کا عمل ضائع نہیں کرتا۔ اس کا واضح
 اعلان ہے: مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ایک ذرے کے برابر کیا ہوا عمل بھی ضائع نہیں
 ہوگا۔ بلکہ انسان اپنا برا چھاپا برا عمل قیامت کے دن دیکھ لے گا۔ یہاں جی فرمایا کہ جو کچھ تم
 اعمال کے ذریعے آگے بھیجو گے سَجْدًا وَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ اُسے اللہ کے ہاں پالو گے۔ ہر چیز
 کا نتیجہ سامنے آجائے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر فعل کو
 دیکھ رہا ہے۔ کوئی چیز اس کی نظروں سے مخفی نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تم کوئی کام کس
 نیت اور ارادے سے انجام دے رہے ہو۔

آلہ

درس چل و چار

البقرة

(آیت ۱۱۲ تا ۱۱۳)

وَقَالُوا لَوْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَى تِلْكَ
 أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١١١﴾ بَلَىٰ
 مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرٌ عِنْدَ رَبِّهِ
 وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١١٢﴾

الترجمہ

مع

ترجمہ: اور کہتے ہیں کہ ہرگز نہ داخل ہرگہ جنت میں مگر وہ جو یہودی ہو یا
 نصرانی ہو۔ یہ ان کی خواہشات ہیں۔ اے پیغمبر! کہہ دیجئے، لاؤ اپنی دلیل اگر تم مجھے ہر
 ﴿۱۱۱﴾ کیوں نہیں۔ جس نے اپنی ذات کو اللہ کے سامنے جھکا دیا۔ اور وہ نیک کام
 کرنے والا ہو۔ پس اس کے لیے اس کے رب کے ہاں بدلہ ہے یوں لوگوں پر
 نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۱۱۲﴾

اہل کتاب کی خرابیوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ انبیاء علیہم السلام سے فضول سوال کرتے
 تھے۔ ”پر پھر ان سے اختلاف بھی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو ان کی روش سے
 منع فرمایا۔ کہ تم یہودیوں دے کام نہ کرنا۔ اور ان کے بکاوے میں آکر دین میں شک نہ کرنے
 لگنا۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ اہل ایمان پھر کفر کی طرف پلٹ آئیں۔ اہل کتاب حاسد ہیں۔ اسی بنا پر
 پر وہ انبیاء علیہم السلام پر ہتکتے چینی کرتے ہیں۔ اور قرآن پاک میں نقص نکالتے ہیں۔ تاکہ مسلمان
 اپنے دین سے برگشتہ ہو جائیں۔ الغرض: بنی اسرائیل کی یہ ضربیاں ”یَسْبِيْنَ رَاْسُودًا يَمْلِكُ
 اُذْكُرُوا الْفَصْحَةَ الَّتِي“ سے لے کر لکھے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام۔ ان کی ملت
 اور خانہ کعبہ کے ذکر تک چلی گئی ہیں۔ ساتھ ساتھ اہل ایمان کو ان خرابیوں سے بچنے کی تلقین کی
 جا رہی ہے۔

ربطیات

یہودی نصاریٰ اہل کتاب میں یہودی اور نصرانی دونوں فرقے پائے جاتے ہیں۔ یہودیوں کی نسبت
 حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ کی

ظرف منسوب کرتے ہیں۔ محض حقیقت یہ ہے کہ نہ ان کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کامل ایمان ہے اور نہ تورات کو اللہ تعالیٰ کی کتاب تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے کتاب اللہ میں تحریر کر کے اس کا علیحدہ بگاڑ دیا۔ اس بات کا تذکرہ گذشتہ دروس میں آچکا ہے۔ آج کل یہودیوں کو صیہون بھی کہا جاتا ہے۔ صیہون ایک پہاڑ کا نام ہے۔ جو بیت المقدس کے قریب واقع ہے۔ ان نسبت سے انہیں صیہونی کہتے ہیں۔

نصاری اپنی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی طرف کرتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی بستی کا نام ناصروت ہے۔ جس کی وجہ سے یہ لوگ نصاریٰ کہلاتے ہیں۔ تاہم مسلمان مغربین کو یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک موقع پر کہا تھا مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ يَعْنِي اللَّهُ كَيْ رَاسْتِي فِي مِيرِي كُون مَد كَرَسِي كَا۔ تو حواریوں نے کہا تھا بَخْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ بِمِ اللَّهِ كَيْ دِينَ كِي مَد كَرَسِي دَلَسِي هِي۔ اس لحاظ سے انہیں نصاریٰ کہا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نصاریٰ نہ تو اللہ کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں۔ اور نہ انجیل پر ایمان ہے انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو عبد اللہ (اللہ کا بندہ) کہنے کی بجائے ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) کہا۔ بعض تین خداؤں میں انہیں تیسرا کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں عواں کر گیا تھا۔ سورۃ مائدہ میں وضاحت موجود ہے "لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ" یعنی وہ لوگ کافر ہو گئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہی مسیح ہے جو تینوں میں تیسرا ہے۔ وہ قطعی طور پر ملعون ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہنے سے بھی کلمہ کفر ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو اولاد سے پاک ہے "سُبْحَنَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ" اللہ تعالیٰ ایسی تمام شرکیہ چیزوں سے منزہ ہے۔ نصاریوں نے انجیل کو بھی تحریر کے ذریعے بگاڑ دیا ہے اب ایک کی بجائے ایک سو پچیس انجیلیں بن چکی ہیں۔ عام مشہور چار انجیلیں مانی جاتی ہیں۔ متی، مرقا اور مرقس تو بائبل کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس کے علاوہ ایک پانچویں انجیل برناس بھی ہر جگہ دستیاب ہے

اصلاً انجیل سریانی زبان میں نازل ہوئی تھی مگر نصاریوں نے اس کے تراجم کر کے اصل متن کو بالکل ضائع کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی حالت پر قائم نہیں ہے۔

نجات کا دار و مدار

الغرض! یہود و نصاریٰ دونوں نذرانہ کا یہ عقیدہ اور دعویٰ تھا کہ وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَن كَانَ هُودًا اَوْ نَصْرٰی یعنی صرف یہودی اور نصاری ہی جنت میں جائیں گے باقی سب کے لیے جنت کے دروازے بند ہیں۔ وہاں کوئی نہیں جاسکتا۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ہر دوزخ آہیں میں بھی معنی نہیں تھے۔ بلکہ یہودی کہتے تھے کہ جو یہودی ہو گا وہ جنتی ہے۔ اور نصاریٰ کہتے تھے جو سماری پارٹی کا ممبر ہے۔ صرف وہی جنتی ہے۔ اس کے علاوہ جنت پر اور کسی کا حق نہیں ہے۔ اسی دعوے کے جواب میں اللہ جل شانہ نے فرمایا۔ بَلٰکَ اَھٰیثَہُمْ یٰۤاِن کٰی ہٰلِ ذٰلِکَ میں۔ مگر نہ اس دعوے کی حقیقت کچھ بھی نہیں گویا انہوں نے اپنی ذراشات کو عقیدے کا درجہ دے دیا۔ پہلے کسی درس میں بیان ہو چکا ہے کہ جب امت کا علم عمل کا رشتہ پختہ ہو کر کٹ جاتا ہے۔ تو امت کی خواہشات عقیدہ بن جاتی ہیں۔ اس سے پہلے یہودیوں کے ایک اور باطل عقیدے کا بھی ذکر آچکا ہے کہ کوئی اسرائیلی دوزخ میں نہیں جائے گا۔ اگر بالفرض چد بھی گیا تو صرف اتنے ایام کے لیے جائے گا۔ جتنے دنوں ان کے آباء و اجداد نے بچھڑے کی پوجا کی تھی۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس باطل عقیدے کو اسخ کیا تھا۔ اور پوچھا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کس نبی پر وحی کی تھی کہ اسرائیلی جو پاپ ہیں کرتے پھریں۔ وہ چند دن کے زیادہ دوزخ میں نہیں رہیں گے تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے۔

اس مقام پر بھی اللہ تعالیٰ نے وہی بات دہرائی ہے۔ نبی علیہ السلام کو ارشاد ہوتا ہے۔ قُلْ اِن کٰی دَعُوٰی کٰی جَوَابِیْرَ ذٰلِکَ یٰۤاِن کٰی ہٰکُمُوبِذٰلِکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مَّسِدِقٰیْن اگر تم اس دعوے میں سچے ہو تو کوئی دلیل دو۔ ہر مان دلیل یا سند کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع براہین آتی ہے۔ اور دلیل بھی ایسی ہونی چاہیے۔ جسے سمجھ العقل آدمی تسلیم کرے۔ دعویٰ کسی بھی قسم کا ہو۔ جب تک اس کے پیچھے دلیل نہیں ہوگی۔ وہ باطل سمجھا جائے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے متعلق کہنا لَا یُؤْتِہُمْ کٰی دَعٰوٰیہُمْ فَاَنصَحٰہُمْ

عِندَ رَبِّهِمْ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ پس ان کا حساب ان کے رب کے پاس جا کر ہی ہو گا۔ ایسے لوگوں کے پاس نہ کوئی نقلی دلیل ہوتی ہے اور نہ عقلی دلیل۔ زیادہ سے زیادہ یہ لوگ رواج کو بطور دلیل پیش کر بات کہتے ہیں۔ باوجودیوں کہتے ہیں۔ ہمارے قوم کا یہ رواج تھا۔ ہمارے عقیدے اسے اس بات کو پٹاتے تھے۔ برخلاف اس کے تو یہ کہ ہزاروں کہ و ٹروں دلائل آپ کے مشابہہ کے یہ موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یودونفائی کا دعویٰ نجات غلط ہے۔ یہ شخص مخصوص فرقہ کی بنیاد پر جنت میں نہیں جا سکے۔ نجات کا یہ قانون ہرگز نہیں ہے۔

فرمایا جسکی کیوں نہیں یہ نہایت ایجاب ہے۔ اور یہ اپنے سے پہلی بات کی نفی کرتا ہے۔ اتباع خداوندی اپنے دعویٰ تھا۔ یودونفائی کے سوا جنت میں کوئی نہیں داخل ہو گا۔ فرمایا کیوں نہیں ہو گا۔ بلکہ جنت میں داخل ہو گا۔ مَنْ اسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ جس نے اپنے چہرے کو اللہ تعالیٰ کے تابع کر دیا۔ ذکر چہرے کا ہے مگر مراد اس سے ذات ہے۔ کہ جس شخص نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں دے دیا۔ وہ جنت میں ضرور داخل ہو گا۔ وَجْهَهُ کا یہ معنی دوسرے مقام پر بھی آتا ہے جیسے كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ہر چیز فنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ذات خداوندی حقیقی۔ قیوم ہے۔ وہ دائم۔ قائم۔ انلی اور ابدی ہے۔ اس کے علاوہ ہر چیز بے فعل فانی ہے فنا ہو چکی ہے۔ یا آئندہ فنا ہو جائے گی۔ قائم اور دائم ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔

مَنْ اسْلَمَ جس نے تابع کر دیا۔ اسلام کا معنی منقاد ہو جانا یا تابع ہو جانا۔ آگے آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کو فرمایا اسْلِمُوا یعنی طبع ہو جاؤ۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا اسْلَمْتُ لِلَّهِ الْعَلِيِّمِ میں ظاہر باطن طریقے سے اللہ رب العالمین کا فرمانبردار ہوں۔ یعنی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کے لیے سرلمحتیا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے وعدے کو سچ کر دکھایا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا۔ یہاں سے تہمت کر کے قلعیدیں چلے جاؤ آپ نے تعمیل کی۔ اللہ تعالیٰ نے کہا۔ غارتگر تعمیر کرو۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا۔ حاضر ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا بیوی بچوں کو دین

چھوڑ دو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسے ہی کیا۔ گویا انہوں نے اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ میں نے جو اقرار کیا تھا اسے حرف بحرف پورا کر دکھایا۔

نیک نیتی

فرمایا جنت میں جانے کا معیار یہ ہے۔ مَنْ اَسْلَمَ یعنی جو اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو گیا بمقتضہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہر حکم کی تعمیل میں کمر بستہ ہو جانے۔ اس کا اعتقاد درست ہو جانے۔ اس کی فکر پاک ہو جانے۔ اس کا ایمان کمال ہو جانے جس کا تعلق نیت اور عہدیت سے ہے۔ ایمان کا تعلق چونکہ باطن سے ہے۔ اس لیے سب سے پہلے انسان کی باطنی طہارت کی ضرورت ہے اس کے قلب و روح میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سرایت کر جانے۔ نہ اس کی ذات میں کوئی شریک ہے۔ اور نہ اس کی صفات میں کوئی شریک ہے۔ اگر دل کے کسی گوشے میں شرک کا معمولی سا شائبہ بھی موجود ہے تو ایسا شخص مومنہ نہیں ہو سکتا۔ وہ شرک ہے یا منافق ہے یا شک کرنے والا ہے۔ بخاری اور مسلم شریف کی حدیث ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰی صُورِكُمْ وَلَا لَوَانِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِكُمْ وَاَعْمَالِكُمْ یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری شہوں اور رنگوں کو نہیں دیکھتا۔ بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے کسی شخص کے اعمال کا دار و مدار اس کی نیت پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ اللہ کو پکارو۔ نہ اس کی اطاعت کرنے والے ہی جاؤ۔ حدیث شریف میں ہے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ لہذا اپنے باطن کو درست کرو۔ جنت میں داخلے کے لیے یہ اولین شرط ہے۔

امام رزمیؒ نے بنی اسرائیل کے ایک شخص کا واقعہ بیان کیا ہے۔ کہ ایک ایماندار آدمی بھوک میں مبتلا تھا۔ سفر پر جا رہا تھا۔ راستے میں ریت کے بڑے بڑے ٹیلے نظر آئے۔ اُس نے کہا، کاش میرے پاس ریت کے ان ٹیلوں کے برابر آناج ہوتا۔ تو میں سب بھوکوں میں تقسیم کر دیتا۔ چونکہ خود اس وقت بھوکا تھا۔ اُسے بھوک کا تحلیف محسوس ہوئی تو اس نے دستِ بھر کون کو خیال میں لاتے ہوئے یہ بات کی۔ کہنے لگا کہ اللہ تعالیٰ کو کی بات پسند

آئی۔ چنانچہ اس وقت کے نبی پر وہی بھیجی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے تیری اس خالص نیت کو قبول کر کے تجھے ریت کے ٹیلوں کے برابر غلہ تقسیم کرنے کا ثواب عطا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تیرا یہ صدقہ قبول کر لیا ہے۔ جیسی تمہاری اچھی نیت تھی۔ ہم نے ویسا ہی اچھا اجر عطا کیا ہے جنت میں داخلے کا جو اصول اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا۔ اس کا پہلا جزئیہ تھا کہ داخلے کا خواہشمند شخص اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو۔ اس کا دوسرا جزئیہ یہ تھا کہ فَهُوَ مُحْسِنٌ اور وہ نیکی کرنے والا ہو۔ مقصد یہ کہ جنت میں داخلہ کسی فرقہ یا جماعت کی بنیاد پر نہیں ہوگا۔ کہ وہ یہودی ہو یا عیسائی کہلاتا ہو۔ بلکہ نجات کا قانون اس مقام پر یہ فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو۔ اسکی نیت اور ارادہ درست ہو۔ اور اس کا عقیدہ صحیح ہو۔ اور پھر دوسرا جزئیہ یہ کہ وہ اعمال صالحہ کرنے والا ہو۔ ایسا شخص یقیناً جنت کا حقدار ہوگا۔ اور اس کو نجات حاصل ہو جائے گی۔

اعمال صالحہ

فرقہ بندی
ذریعہ نجات نہیں ہے

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ یاد رکھو نجات کا دار و مدار اکابر پر ہے۔ نہ کہ انبیا پر۔ نسب کے لحاظ سے کوئی کہتا ہی اپنے خاندان سے تعلق رکھتا ہو یا کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک اس کا باطنی طور پر ایمان اور عقیدہ درست نہ ہو۔ اور ظاہری طور پر اعمال صالحہ نہ انجام دیتا ہو۔ ہمارے ہاں جی بہت سی فرقہ بندیوں پائی جاتی ہیں۔ بعض جاہل یا کم فہم لوگ کسی خاص فرقے یا گروہ کو ہی نجات یا فتنہ تصور کرتے ہیں کہ فلاں مسلک والے جنت میں جائیں گے۔ دوسرے نہیں جائیں گے۔ حنفی، شافعی، مائتبی، حنبلی ان میں کتنے لوگ ہیں جو ایک دوسرے کیساتھ تعصب رکھتے ہیں۔ بعض حنفی، خاں بلہ کے ساتھ یا شافعی، مائیکوں کے ساتھ عداوت رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ صرف ہم ہی جنت کے وارث ہیں۔ دوسرے اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح سلوک اور تصوف کے سلسلے ہیں۔ جیسے چشتی، قادری، سہروردی، نقشبندی وغیرہ۔ ان میں سے بھی بعض ایک دوسرے کے خلاف عداوت رکھتے ہیں اور جنت کو صرف اپنی وارثت سمجھتے ہیں باقی سب لوگوں کو جہنمی خیال کرتے ہیں۔ یہ تو محض فردی اختلافات ہیں بنیادوں طور پر چاروں مسالک یا سلسلہ ہائے تصوف میں کوئی اختلاف نہیں۔

شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں: کہ یہ چیزیں فروعات دین میں سے ہیں۔ دین میں ان کی گنجائش موجود ہے۔ مگر اس کی بنا پر دوست و فرقہ و گروہ کو جہنمی قرار دینا جاہالت محض ہے۔ دین میں جتنے مسک اور جتنے سوک ہیں۔ سب کا مقصد واحد ہے۔ اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی۔ کوئی حنفی بڑا شافعی، یا کسی بڑا حنبلی بدعتی بڑا قادری منزل مقصود تو سب کی ایک ہی ہے۔ راستے مختلف ہیں۔ طریقہ تعلیم مختلف ہے۔ مگر مقصد تو مختلف نہیں۔ لہذا اپنے آپ کو جہنمی اور دوست کو جہنمی کہنا بات خود گمراہی کی علامت ہے اس میں اور یہود و نصاریٰ کی گمراہی میں کیا فرق رہ گیا ہے۔ اس غلط فرقہ بندی نے مسلمانوں کو تباہ کیا ہے۔ فروعات میں اختلاف رائے عین فطری امر ہے۔ اور اس کی گنجائش ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ دو ڈاکٹر یا حکیم ایک ہی قسم کے مریض کے لیے مختلف دوائیں تجویز کرتے ہیں۔ مگر کوئی نہیں کہتا کہ فلاں ڈاکٹر بدوقت ہے۔ اور فلاں حکیم درست ہے۔ انہیں سب درست ہی مانتے ہیں۔ کیونکہ مقصد سب کا ایک ہی ہے۔ یعنی مریض کی صحت یا بے مقصود ہے۔ دوا کوئی بھی تجویز کی جا سکتی ہے۔ جو اس کے مناسب حال ہو۔ لہذا دین کے معاملہ میں ایسا تعصب کیوں اختیار کیا جائے۔ کہ فلاں فرقہ ایسا ہے یا فلاں اہم ایسا ہے۔ بجائے یہ سب ایک ہی اللہ تعالیٰ کو رہنے والے تو ہیں۔ ان کے متعلق کسی گروہ میں تعصب نہیں ہونا چاہیے۔

اب دیکھئے ملک میں فوجداری قانون رائج ہے۔ کسی ملزم کو ایک جج، سزائے موت دیتا ہے۔ تو دوسرا اسی قانون کے مطابق اُسے بری کر دیتا ہے۔ مگر کبھی کسی نے کسی جج کو غلط نہیں کہا۔ کیونکہ قانون میں مختلف فیصد جات کی گنجائش موجود ہے۔ اسی طرح دین کے قانون کو مننے والے سائے ہی ہیں۔ خواہ کوئی حنفی بڑا شافعی۔ لہذا ان کے پیروکاروں میں بھی تعصب نہیں آنا چاہیے۔ یہ کہنا کہ فلاں فرقے والے اس طرح نماز پڑھتے ہیں۔ ان کی نماز نہیں ہوتی۔ یہ وہ جہنمی ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اور من حیث القوم مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہے۔ یہ زودیت اور نفرت ہے۔ قرآن پاک نے اس کی مذمت بیان

فرمان ہے۔

اعرض! فرمایا قانونِ نجات یہ ہے۔ کہ جو شخص مَنَ اسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰہِ وَهُوَ مُحْسِنٌ قانونِ نجات جس نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے تابع بنالیا۔ اور وہ نیک کام کرنے والا ہے۔ مجتہد و محب فرماتے ہیں۔ کہ جب اَمْسُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کا ذکر آتا ہے تو اس سے مراد بڑی بڑی چار عبادتیں ہیں۔ یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ اس کے بعد پانچویں درجے میں جہاد آتا ہے۔ علاوہ ان کے ساتھ دوسری نیکیاں بھی ہیں۔ اس کو یوں بیان فرمایا فَمَنْ يَعْمَلْ مِنْ الصَّالِحَاتِ سَوْ كُنِيَ فِيهَا مِمْسِكًا وَهُوَ مُؤْمِنًا بشرطیکہ وہ مومن ہو۔ اس کا معنیہ صحیح ہو۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے کسی عمل کی ناقصی نہیں فرمائیں گے۔ اپنے ہر کام کا بدلہ وہ پائے گا۔ ہاں! اگر ایمان ہی مغفود ہے۔ معنیہ صحیح نہیں ہے۔ تو پاپوں و تہمتوں بڑی بڑی نیکیاں بھی گرد و غبار کی طرح اڑ جائیں گی۔ قیامت کے روز کچھ کام نہ آئیں گی: لَا يَقْدِرُونَ عَلٰی كَسْبِہَا ان کی کھائی میں سے انہیں کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ ان کی نیکیاں گرد و غبار کی طرح اڑ جائیں گی۔ گویا کہ وہ رکھ کے ذرات تھے۔ جو آندھی کے آگے بالکل نہ ٹھہر سکے۔ دوسرے مقام پر آتا ہے: عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ بڑے بڑے عامل، ریاستیں اور تختیں کرنے والے، کام کر کے تھک جانے والے ہوں گے۔ مگر قیامت کے روز تھکی نَارِ حَرَمِیَّةٌ جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ وہ ایمان کی دردت سے محروم تھے۔ سب نیکیاں ریتوں جیسی ہوں گی۔ ہر حال قانونِ نجات فرقہ بندی نہیں بلکہ اتباعِ خداوندی اور اعمالِ صالحہ ہیں۔

فرمایا جس نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے تابع کر لیا۔ اور پھر وہ نیکی کرنا والا بن گیا فَلَهُ اَجْرٌ عِنْدَ رَبِّہٖ پس ایسے شخص کے لیے اپنے رب کے ہاں اجر ہے۔ نیکی کا بدلہ اس کو ضرور ملے گا۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْہُمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُونَ، ایسے اشخاص مقبل میں کسی پریشانی میں مبتلا نہیں ہوں گے۔ نہ ان پر کوئی خوف ہوگا۔ اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں ان پر ہر وقت پریشان رہتا ہے۔ کم از کم موت کا ڈر تو اسے ہر وقت لگا رہتا ہے۔ گویا موت ہر وقت اس کے پیش نظر ہے۔ پھر دولت و صحت کا خوف مسلط رہتا ہے۔ پینا

نہیں یہ بولت مائے پاس ہے گی یا نہیں۔ پتا نہیں کل کو صحت بھی برقرار رہ سکے گی یا نہیں۔ تو اس قسم کے خوف انسان کے ہمیشہ دامن گیر رہتے ہیں۔ مگر جن کا عقیدہ صحیح ہوگا۔ جو اعمال اچھے کرنے والے ہوں گے۔ وہ ان تمام پریشانیوں سے محفوظ رہیں گے۔ انہیں نہ اپنے ماضی پر افسوس ہوگا اور نہ انہیں مستقبل کا کوئی خدشہ ہوگا۔ برخلاف اس کے جنہوں نے کوئی کمائی نہیں کی۔ زندگی کی پونجی کو ضائع کر دیا۔ وہ افسوس کریں گے۔ کہ ہم نے کتنی کوتاہی کی۔ اللہ تعالیٰ نے مہلت دی تھی۔ مگر ہم نے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ نہ عقیدہ درست کیا اور نہ نیکی کا کوئی کام کیا۔ ایمان سے محروم ہے۔ ایسے لوگ خوف اور پریشانی میں مبتلا ہوں گے۔ اور اپنے کئے پر ہمیشہ افسوس کرتے رہیں گے۔

الْمَآءِ

البقرة ۲

درس چل و پھل ۲

(آیت ۱۱۳ تا ۱۱۵)

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ
عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتَّبِعُونَ الْكِتَابَ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ
مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا
كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١١٣﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسِيحَ اللَّهِ أَنْ
يُذَكِّرَ فِيهَا أُمَّةً وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ
أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ لَهُمْ فِي الذُّنُوبِ خِزْيٌ وَلَهُمْ
فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١١٤﴾ وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ
فَإِنَّمَا تُكَلَّفُ شَرْعًا وَلِلَّهِ رُحْمَافَةُ السَّعْيِ ﴿١١٥﴾

توجہ دے: یہودیوں نے کہا نصاریٰ کسی چیز پر نہیں ہیں۔ اور نصاریٰ نے کہا کہ
یہودی کسی چیز پر نہیں ہیں (یعنی ان کا دین صحیح نہیں ہے) حالانکہ یہ کتاب پڑھتے ہیں
اسی طریقے سے اہل لوگوں کی جو جانتے نہیں (جابل ہیں) ان جیسی بات پس اللہ تعالیٰ
ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔ ان باتوں میں جن میں وہ اختلاف
کرتے ہیں ﴿۱۱۳﴾ اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے۔ جو اللہ کی مسجدوں
سے منع کرتا ہے۔ کہ ان میں اللہ کا ذکر کیا جائے۔ اور ان کی بربادی میں کوشش
کرتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں۔ کہ نہیں ہے ان کے لیے کہ داخل ہوں۔ ان
گمروں میں مگر ڈرتے ہوئے۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں رسوائی ہے۔ اور ان
کے لیے آخرت میں عذاب عظیم ہے ﴿۱۱۴﴾ اللہ ہی کے لیے ہیں مشرق اور مغرب
پس ہر بھی تم نہ کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کی توجہ ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ وسعت والا
ہر سب کچھ جانتے والا ہے۔ ﴿۱۱۵﴾

یہودی و نصاریٰ
آئینے منہ

یہودیوں اور نصاریٰ کی بجلہ خرابیوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کہ ایک گروہ

دوسرے کو باطل قرار دیتا ہے۔ اور اپنے آپ کو راہِ راست پر سمجھتا ہے۔ تیسرا گروہ مشرکین کا ہے جو یہود و نصاریٰ دونوں کو باطل کہہ کر اپنے آپ کو صحیح العقیدہ سمجھتا ہے۔ تو گویا یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کا ابطال کرتے ہیں۔ ان آیات میں اسی چیز کو بیان کیا گیا ہے: وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصْرَانِيَّةُ عَلَى شَيْءٍ اور نصرائی کہتے ہیں کہ نصرانی کسی چیز پر نہیں ہیں وَقَالَتِ النَّصْرَانِيَّةُ لَيْسَتِ الْيَهُودِيَّةُ عَلَى شَيْءٍ اور نصرائی کہتے ہیں کہ یہودی کسی چیز پر نہیں ہیں۔ یعنی ان کا دین سچا نہیں ہے۔ اس طرح جب یہ اکٹھے ہوتے ہیں۔ تو آپس میں دست و گریبان ہوتے ہیں۔ یہودیوں کا اعتراض یہ ہے کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہہ کر کفر کیا۔ اور عیسائیوں کا نظریہ یہ ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تو یہودیوں نے نہ صرف ان کا انکار کیا۔ بلکہ انجیل کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ لہذا یہ گمراہ ہوئے۔ فرمایا یہ دونوں فرقے ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے ہیں۔ وَهُمْ يَشْتَلُونَ الْكِتَابَ عِلَالًا یہ دونوں گروہ ہی اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی توراۃ اور انجیل کی تلاوت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان میں اس قدر اختلاف پایا جاتا ہے۔

کتبِ سابقہ
برحق ہیں

حقیقت یہ ہے کہ توراۃ، انجیل، زبور، قرآن پاک اور دیگر صحائف سب کے سب برحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اصل دین اپنی کتب کے ذریعے نازل فرمایا۔ مگر ان بہنجتوں نے تحریف کر کے دین کو مسخ کر دیا تاہم اصل دین ان کی کتابوں میں اب بھی موجود ہے۔ تنہا یہ پڑھتے ہیں۔ لہذا کسی کتاب کا بالکل انکار کر دینا کہ اس میں کچھ سچی باتیں ہیں۔ انصاف کے خلاف ہے۔ اور اہل کتاب کی مہٹ دھرمی کی دلیل ہے۔ ہاں یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہودیوں کا اصل دین تو نمیک تھا۔ مگر انہوں نے خرابیاں پیدا کر دیں۔ یا نصرائی کا دین اور کتاب برحق ہے۔ مگر ان کی تحریفات نے اسے کچھ اور بنا دیا ہے۔ ایک دوسرے مذہب کو بالکل ہی باطل قرار دینا درست نہیں۔

حضرت سیدنا محمد ﷺ
پر الزام تراشی

جب قرآن پاک نازل ہوا تو اس نے توراۃ اور انجیل کی تفسیق کی کہ یہ دونوں آسمانی کتابیں ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ اس کے علاوہ تمام صحیفہ سابقہ کی بھی تفسیق کی۔ البتہ قرآن پاک نے ان مقامات کی ضرورت نشاندہی کی۔ جہاں جہاں سے یہ لوگ بھٹکے ہیں

اور جہاں جہاں انہوں نے کُتب میں تحریر کی ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ یہودیوں نے حضرت
 سلیمان علیہ السلام کی طرف کفر کا کلمہ فُسوب کیا۔ اور کہا کہ اُن کی سھنت مکر پر قائم تھی۔ لہذا ہم بھی
 ان کی سنت پر عمل کرتے ہوئے مکر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دعوے کی تردید کرتے ہوئے
 فرمایا: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ یعنی سلیمان علیہ السلام نے جادو کر کے کفر کا ارتکاب نہیں کیا۔ بلکہ انہوں
 نے خود کفر کا ارتکاب کیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کے صاحبِ شریعت رسول تھے
 اللہ تعالیٰ نے آپ کو بمثالِ حکومت عطا کی تھی۔ اُن سے مکر کی توقع نہ ابھیڑا قیاس ہے۔ انہوں
 نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْ اٰبَعْدِيْ
 یا اللہ مجھے ایسی سلطنت عطا کر جو میرے بعد کسی کو عطا نہ ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو
 شرف قبولیت بخشا اور آپ کے لیے ہوا اور جنات کو مکر کر دیا۔ مگر ان ظالموں نے سمجھا کہ یہ جادو
 کا اثر ہے۔ العیاذ باللہ۔

مشرکین کا نظریہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُدھر شرکین کا حال بھی یہود و نصاریٰ سے کم نہیں۔ کَذٰلِكَ
 قَالَ الْاٰدِیْنَ لَا يَلْمِزْنَكَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ شَرِبْنَا مِنْ شَرِّ مَا بَرَأَ
 کرتے ہیں۔ جو اہل کتاب نے کی۔ یہ کہتے ہیں کہ نہ یہود و نصاریٰ حق پر ہیں اور نہ مسلمان۔
 حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ کچھ بھی نہیں جانتے۔ یہ تو جابلِ علق میں۔ نہ ان کے پاس
 کوئی کتاب ہے جس سے یہ رہنمائی حاصل کر سکیں۔ اور نہ ہی دو ہزار سال کے عرصہ میں ان
 کے پاس کوئی نبی آیا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے جدِ اقدس یا ڈیڑھ ہزار سال تک عرب
 خدمت کیا۔ براہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے بین پہ قائم ہے۔ اس کے بعد ان میں بھڑ
 پیدا ہونا شروع ہوا۔ اور پھر اہلِ وقت بھی آیا کہ سب کے سب شرک کی طرف مائل ہو گئے۔
 ہزاروں میں سے کوئی اکا دکا ہی موصدق تھا۔ ورنہ سب دین سے ہٹ چکے تھے۔

آغوشِ نیک

مدلتِ الٰہی میں ہو کہ

الغرض! یہود و نصاریٰ اور مشرکین تینوں گروہوں نے ایک دوسرے کی تکذیب کی۔
 اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ جو کچھ چاہتے تھے وہ کرتے رہیں۔ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ
 یَوْمَ الْقِيَمَةِ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ کہ کون حق
 پر ہے۔ اور کون اصل دین سے چھڑ چکا ہے۔ ان کا فیصلہ ہر اس معاملہ میں ہو جائے گا۔

فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں فرمایا ان کے درمیان قطعی فیصلہ
 قیامت کو ہوگا۔ تاہم جہاں تک ہدایت اور گمراہی کا تعلق ہے۔ تو اس کے متعلق اسی سورۃ میں
 آئے آیت: قَدْ تَبَيَّنَ التَّشَدُّدُ مِنَ الْغَيِّ ہدایت اور گمراہی بالکل واضح ہو چکی ہیں۔
 دنیا میں حق کے متلاشی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بے شمار ذرائع پیدا فرمادیے ہیں۔ وہ حق و صداقت
 کی پہچان کر سکتے ہیں۔ سورۃ انفال میں ہے: وَيُخَيِّجُ مَنْ حَتَّىٰ عَنْ أَبِي سَلَمَةَ جَوَاطِكُ ہوا
 وہ بھی واضح دلیل کے ساتھ جو زندہ ہے وہ بھی واضح دلیل کے ساتھ زندہ ہے حق و باطل کی تفریق ہو چکی ہے نہ گمراہی کے معتزلین
 یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے پاس واضح دلیل نہیں آئی تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے
 پاس اللہ تعالیٰ کا نبی آیا، اللہ تعالیٰ کی کتاب آئی مگر انہوں نے انکار کر کے مقابل کیا اور مذاکرہ ہوئے
 مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں باعتبار دلیل و عقل، دستور اور قانون ہدایت اور گمراہی
 کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ اب کسی کا کوئی عذر قبول نہیں ہوگا۔ ہم قطعی اور اٹل فیصلہ اللہ تعالیٰ
 کی عدالت میں ہوگا۔ بخاری شریف میں حضرت علیؓ سے مروی ہے: اِنَّا اَوَّلُ مَنْ يَخْشَوْنَ
 بَيْنَ يَدَي الرَّحْمَنِ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن میں گھٹنے ٹیک کر رحمن کے سامنے
 بیٹھوں گا اور درخواست کروں گا کہ اے پروردگار! آپ ان بدد والوں سے پوچھیں کہ یہ
 ہم سے کیوں لڑے تھے گویا اس دن حق و باطل کے تمام فیصلے اللہ تعالیٰ کے دربار میں
 ہوں گے۔ اسی طرح ایک دوسرے کو باطل فرقہ کسنے والوں کا فیصلہ بھی اُسی روز ہوگا۔

اسی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کی تفریق کے لیے تمام محنت پوری کر دی ہے
 اہم بیضاویؒ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: کہ اللہ تعالیٰ نے
 انسان کو عقل و خرد عطا کی۔ انبیاء علیہم السلام معجزات فرمائے۔ کتابیں نازل فرمائیں اب کون سا
 عذر باقی رہ گیا ہے۔ قیامت کو کون کہے گا: مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ
 کہ ہمارے پاس خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ اب تو بشیر و نذیر آچکے۔ لہذا قیامت
 کے دن کوئی عذر قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ حضرت زبیرؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا تھا۔

اَتَكْفُرُ عَلَيْنَا الْخُصُومَةُُ حضرت! قیامت کو ہمارا اور ان کا جھگڑا دوبارہ قیامت ہو گا۔
فرمایا: ہاں! جن تنازعات کا فیصلہ دنیا میں نہیں ہوا۔ ان کا فیصلہ رب العزت کی بارگاہ میں
خود ہو گا۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا: یہ تینوں فرقے یعنی یہود۔ نصاریٰ اور مشرک جو ایک دوسرے
کو گمراہ کہتے ہیں۔ یہ خود سائے کے سائے گمراہ ہیں۔ یہودیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو مارنے
سے نہ صرف انکار کیا بلکہ انہیں دجال کہا۔ اور جب قریب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام
دوبارہ دنیا میں نزول فرمائیں گے۔ تو اصفہان کے ستر ہزار یہودی جن میں ان کے بڑے بڑے
علماء بھی ہوں گے۔ اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مارنے کی بجائے دجال کے پیچھے لگیں گے۔ اور اس
کو مسیح سمجھیں گے۔ یہی لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کو (العیاذ باللہ) دجال سمجھ کر انہیں سولی پر
لٹکانے کیلئے لے گئے۔ ان کھمبھتوں کا یہ حال ہے۔

جب حضور علیہ السلام ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے۔ تو سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس
کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔ مقصد یہودی کی دُجوئی تھی۔ تاکہ وہ مسلمانوں کے قریب ہوں
اور دین کی طرف راغب ہو سکیں۔ تحویل قبلہ کی آیات قرآن پاک کے دو سر پارہ کی ابتداء سے
تشریع ہوتی ہیں۔ مگر اس معاملے میں بھی یہودیوں نے بہت دھرمی کا ثبوت دیا۔ اپنے تعصب
میں مبتلا رہے۔ اور مسلمانوں کے قریب نہ آئے۔ چونکہ حضور علیہ السلام کی دلی خواہش یہی تھی کہ
مسلمانوں کے لیے بیت اللہ قبلہ مقرر ہو۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں تحویل قبلہ کا حکم
دے دیا کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں۔ بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز ادا کریں۔ اسی
طرح یہودی اپنی ضد اور عناد کی وجہ سے اسلام سے اور دور ہو گئے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے ان برائیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ اس قدر
عنادی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو عبادت کرنے سے بھی روکتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي

خَرْابِهَا اس سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے۔ جو اللہ کی مسجدوں میں اس کا

نام لینے سے روکتا ہے اور ان کی بربادی کی کوشش کرتا ہے۔ حضرت مولانا شیخ الحداد

فرمت ہیں کہ اس آیت کے مصداق نصاریٰ ہیں جنہوں نے یسوع کا مقابلہ کر کے توراۃ کو جلا
تھا۔ اور بیت المقدس کو دیران کیا تھا۔ یہ آیت مشرکین مکہ پر بھی صادق آتی ہے۔ جنہوں نے ۵۶
میں مسلمانوں کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا تھا۔ اور حرم پاک میں عمرہ ادا نہیں کرنے دیا تھا۔ حالانکہ
مسلمان محض عمرے کی ادائیگی کے لیے آئے تھے۔ ان کا لڑائی کر نیکا ارادہ نہیں تھا۔ یہ تو اس وقت
کے واقعات ہیں۔ یہ آیت آج بھی اُسی طرح نافذ ہے۔ جس طرح یہ اپنے نژد دل کے وقت تہ
آج بھی جو کوئی اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں اس کا نام لینے سے روکتا ہے۔ مسجد کی بربادی کا عہد
ہوتا ہے۔ وہ اس آیت کی رو سے بہت بڑا ظالم ہے۔

یسودی اور نصرانی ہمیشہ ایک دوسرے کو مسجد میں جا کر عبادت کرنے سے روکتے رہے
ہیں۔ تاریخ شاہد ہے۔ کہ جب بھی یسوع کو موقع ملا انہوں نے نصاریٰ کے ساتھ ہی سوک کیا۔
اور جب نصاریٰ کو غلبہ حاصل ہوا تو ان ظالموں نے بیت المقدس کو اکھاڑ دیا۔ گدازہ کو نذر آتش
کیا۔ اور عبادت خانوں کو برباد کیا۔ مشرکین مکہ نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ایسا ہی سوک کیا۔ مکی
زندگی میں حضور علیہ السلام خانہ کعبہ میں نماز ادا نہیں کر سکتے تھے۔ مشرکین مسلمانوں کو سخت اذیتیں
دیتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی پٹائی کا ذکر بخاری شریف میں موجود ہے۔ ابو جہل کی حرکات
کا ذکر خود قرآن پاک نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ﴿اَرَاَيْتَ الْكَذِبِيْنَ هُمْ اِذَا
اِذَا حُكِمَ عَلَيْهِمْ كِتَابٌ مِنْ رَّبِّهِمْ اَوْ اِذَا نُذِرَتْهُمْ كُنُوزُهُمْ اَوْ اِذَا نُذِرَتْهُمْ كُنُوزُهُمْ اَوْ اِذَا نُذِرَتْهُمْ كُنُوزُهُمْ﴾
سے روکتا ہے۔

دوسرے مقام پر جھوٹے مدعی نبوت کو بڑا ظالم کہا گیا ہے۔ کہ اُس سے بڑا کون ظالم ہو
سکتا ہے۔ جو نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرتا ہے۔ اور یہ بھی دیا کہ اُس سے بڑا کون ظالم ہے جس کے
پاس خدا تعالیٰ کا نبی آئے، ہدایت کی بات پیش کرے اور وہ اس سے انکار کر دے۔
تاہم اس مقام پر خدا کی تعریف یہ کی گئی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے گھر میں اس کی مسجد میں عبادت
کرنے سے، نماز پر مہنے سے روکتا ہے۔ یہ تو ظاہری رکاوٹ ہے۔ کہ کسی کو عبادت کرنے

سے روک دیا جائے۔ یہ عبادت خانے کی بربادی کے مصداق ہے۔ اس کے علاوہ ایک
 باطنی بربادی بھی ہے۔ کہ وہاں پر غیر اللہ کی پرستش کی جائے۔ بہ عبادت کو فروغ دیا۔ ایسا کرنے
 سے نظامِ توحید عبادت خانہ آباد ہوگا۔ مگر باطنی طور پر بہایت سے خالی ہوگا اور بہ باطنی غربت سے۔
 سورۃ حج میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عبادت خانہ یوں بنانا کہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے
 گرانے کا حکم نہیں دیا۔ مسلمانوں کی مسجد کا بھی یہی حکم ہے۔ ان کو گرانے یا ان کی بے حرمتی کرنے
 کی اجازت نہیں دی گئی۔ مگر دیکھ لیجئے ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے وقت کیا کچھ ہوا۔ مشرقی پنجاب
 میں پچاس ہزار مسجد کی بے حرمتی ہوئی۔ ہندوؤں اور سکھوں سے کیا توقع کی جاسکتی تھی۔ دوسری پنجاب
 میں بھی یہی کچھ ہوا۔ کتنے نہ۔ کتنے جہنمیں تباہ و برباد کر دیا گیا۔ دونوں فریقوں نے غلط کام کیا۔
 عبادت خانے خواہ کسی سے متعلق ہوں۔ ان کی بے حرمتی نہیں ہونی چاہیے۔

ظہور اسلام کے وقت جو بے قابلِ شرک سے تائب ہو کر ایمان کی دولت سے بہ دانا
 ہوئے۔ انہوں نے اپنے مندر اور بت خالصہ گرا دیے تھے۔ اور وہاں پر مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ یہاں
 سمندر تہارت بنے۔ کہ ان لوگوں نے اپنے جی تہیر کردہ معابد کی جگہ مسجدیں تعمیر کر لیں۔ عبادت خانے
 کی جگہ عبادت خانہ ہی تعمیر ہوا۔ تاہم مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں بھی غیر مسلم اقوام کی
 عبادت گاہوں کو نقصان نہیں پہنچایا۔ محمد بن قاسم جب سندھ پر حملہ آور ہوا۔ تو ہندوؤں کے بعض
 مندروں کو نقصان پہنچا تھا۔ مسلمانوں نے خود اس نقصان کی تدفی کی۔ ورنہ نقصان زدہ مندروں کو
 دوبارہ تعمیر کر دیا۔ کیونکہ کسی کے عبادت خانے کو گرانے کا حکم ہرگز نہیں ہے۔

البتہ سلطان محمود غزنوی نے سونات کے مندر کو ٹھکانہ کوئی چھپا کر نہیں کیا تھا۔ دقیق طور
 پر وہاں مسجد بھی بنادی۔ مگر وہ دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ ایک ہزار سال کے بعد ہندوؤں نے پھر وہاں
 پر مندر تعمیر کیا۔ راجہ پرشاد نے سو لاکھ روپے کے عوض کابل سے مندر کا گیسٹ بھی واپس منخوا کر
 اسی جگہ نصب کیا۔ جہاں سے اکٹھا لایا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ غلط کام کا نتیجہ کبھی صحیح نہیں ہو سکتا۔
 ترکوں نے بھی اپنے دور میں ابا صوفیہ کا مندر جاکر وہاں مسجد تعمیر کر لی۔ جب اخیر

کو وہاں غلبہ حاصل ہوا۔ تو وہاں پڑ کر جانا۔ اب چیتختے ہیں کہ ہماری مسجد حق ہے۔ بہت بڑی لائبریری
 تھی۔ جو ضائع ہو گئی مگر جس طرح مرنے کی۔ اسی طرح کا جواب انہوں نے دیا۔ اب چیتختے
 چلانے کا کیا مطلب۔ وہاں اگر عیسائی خود عثمان ہو کر اپنے گھر جا کو مسجد میں تبدیل کر دیں۔ تو وہ
 جائز ہے۔ مگر کسی کے عبادت خانے کو زبردستی کرنا بالکل نامناسب ہے۔

مسجد کے نواب

جس طرح مسجد کا ظہری طور پاک صاف رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح مسجد کو باطنی خرابی
 سے محفوظ رکھنا بھی اہل اسلام کی ذمہ داری ہے۔ ————— باطنی خرابی یہ ہے کہ مسجد کو اس
 کے اصل مقصد کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ مسجد عبادت خانہ ہے۔ اس میں
 نماز، تلاوت، ذکر و اذکار ہونا چاہیے۔ نہ کہ دنیا کے دوسرے کاروبار۔ اسی لیے حضور علیہ السلام
 نے مسجد میں حد قائم کرنے سے منع فرمایا ہے۔ مسجد میں کسی مقدمے کا فیصلہ تو ہو سکتا ہے۔ مگر ملزم
 کو سزا سنیں دی جا سکتی ہے کہ اس سے مسجد کی بھیر مٹی ہوتی ہے۔ مسجد میں لڑائی جھگڑا کرنا، فحش کلامی۔
 گالی گلوچ کرنا، گندگی پھینکنا، تجارت یا لین دین کرنا۔ یہ سب مسجد کے آداب کے خلاف ہے
 حضور علیہ السلام نے گندہ چیز کا مسجد میں اعلان کرنے سے منع فرمایا۔ بلکہ فرمایا کہ جو شخص مسجد میں
 گندگی کا اعلان کرے۔ اس کے حق میں یوں دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ تیری چیز تجھے واپس لوٹائے
 تو نے آداب مسجد کا خیال نہیں رکھا۔ اسی طرح فرمایا کہ مسجد میں تجدد کرنے والے کے حق
 میں کہو کہ اللہ تعالیٰ تجھے اس تجارت میں نفع نہ دے۔

مسجد میں شعر گوئی سے بھی منع کیا گیا ہے۔ ہاں البتہ اگر کوئی اچھی بات کہتا ہے اللہ تعالیٰ
 اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتا ہے۔ تو جائز ہے۔ ایسی شعر گوئی حضور صلی اللہ
 علیہ وسلم کے صحابی حضرت حسان بن ثابت سے منقول ہے۔ موجودہ زمانے کی طرح مسجد
 میں ہر قسم کی شعر گوئی کی اجازت نہیں۔ جن میں عشقیہ غزلیں گائی جاتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
 نے تاشد الاشعار سے منع فرمایا۔

۱۔ ابوداؤد ص ۳۹۱ ۲۔ ترمذی ص ۴۷ ۳۔ مسلم ص ۲۱۱

۴۔ ترمذی ص ۲۱۱، دارمی ص ۲۹۶ ۵۔ ترمذی ص ۴۷ ۶۔

مسجد کی بے ادبی کے بعض دوست ذرائع سے بھی نسخ کیا گیا ہے۔ مثلاً ابن ماجہ شریف کی روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ چھوٹے بچوں یا کسی پاگل کو مسجد میں نہ آنے دو۔ وہ مسجد کی بھڑکتی کابوٹ بن سکتے ہیں۔ چھوٹے بچے یا نابالغ و غیر کرٹے گا۔ وہ ابھی شوق نہیں رکھتا اس جب بچہ پانچ سات سال کا ہو جائے تو مسجد میں آ سکتا ہے۔

الغرض! فرمایا اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے منع کرتا ہے۔ اور مسجدوں کی بربادی کے لیے کوشش کرتا ہے۔ فَمَا بَأْسَ الْيَهُودِ مَا كَانُوا يَكْفُرُونَ أَنْ يَكُونُوا خُلُوعًا لِّأَخِيهِمْ ان لوگوں کا اصل میں حق ہی نہیں ہے کہ وہ مسجدوں میں داخل ہوں مگر خوف کہتے رہتے۔ یعنی کنارہ اس لائق ہی نہیں کہ مسجدوں میں داخل ہوں۔ سوائے اس کے کہ وہ خوفزدہ ہوں۔

الْأَخْيَارُ یعنی اچھے۔ عیب یہ بھی ہے کہ مسجد میں خشوع و خضوع کے علاوہ کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ آؤ ذکر بلند کرنا قیامت کی نشانیوں میں سے بتایا گیا ہے۔ مسجد میں جمعہ و پکار اور ایسی ایسی دنیوی باتیں کرنے کی ممانعت ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے إِذَا مَرَرْتُمْ بِرِيَاضِ الْجَنَّةِ فَارْتَعُوا جب تم جنت کے باغوں میں جاؤ، تو وہاں چڑچڑک یا کرو۔ صحابہؓ نے عرض کیا حضور! اس سے کیا مراد ہے۔ فرمایا جب تم مسجد میں جاؤ تو وہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو۔ اس کی تفسیر و تفسیل بیان کرو۔ تلاوت کرو۔ درود پاک کا ورد کرو۔ معتکف ہو کر خاموشی سے بیٹھو۔ اگر اعتکاف کی نیت کر کے بالکل خاموش بھی بیٹھو گا۔ تو باہر کی باتوں اور کئی گنا ہوں سے بچے گا۔ اور اللہ تعالیٰ سے اجر بھی پائے گا۔ مگر لوگ اکثر ایسا نہیں کرتے۔ مسجد میں فضول کہیں مارتے ہیں۔ خشوع و خضوع سے محروم رہتے ہیں۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا۔ جب خشوع و خضوع اٹھ جائے گا۔ آپ ایک بڑی مسجد میں داخل ہوں گے، وہاں پانچو آدمی موجود ہوں گے۔ مگر ان میں ایک

بھی ایسا نہیں ہوگا۔ جس کے چہرے پر خشوع و عاجزی کے آثار نظر آتے ہوں۔ سب فضول
حرکات میں مصروف ہوں گے۔

فرمایا جو شخص مہاجرین میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے سے روکتا ہے۔ اور مسجد کی بربادی چاہتا ہے
لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ لِّیْلَے لوگوں کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے وَلَهُمْ
فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ اور ان کے لیے آخرت میں بھی سخت عذاب ہوگا۔
اہل ایمان کو مکہ چھوڑنے کا بڑا دکھ تھا۔ چہرہ بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز
پڑھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی دی۔ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ مَشْرِقُ
اور مغرب سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔ فَاسْمَعُوا لَوْ اَتَمَّ جِدَّہِ رُخَّ کر دے فَشَئَ
وَجْہُ اللّٰہِ تم اللہ کی توجہ اُدھر ہی پاؤ گے۔ لہذا تم کسی قسم کی گنجائش محسوس نہ کرو وَلِلّٰہِ
ہر وقت تمہاری ساری بات ہے۔

استقبال قبلہ

استقبال کعبہ کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ سفر کے دوران اندھیری رات
یا طوفان باد و باران میں اگر قبلہ کا رخ معلوم نہ ہوتا، تو ہر شخص جس طرف رُخ ہوتا اُنہی طرح
نماز ادا کر لیتا۔ ترمذی شریف میں آتا ہے کہ ایسا ہی کوئی واقعہ صحابہ کرام کو پیش آیا جب
حضور علیہ السلام کو پتا چلا تو یہی آیت تلاوت فرمائی فَاسْمَعُوا لَوْ اَتَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ یعنی
تم نے جس طرف بھی رُخ کر کے نماز پڑھی ہے۔ سب کی نماز درست ہے۔ اللہ تعالیٰ
کے ہاں مقبول ہے۔ اگر قبلہ کا رخ درست نہیں تھا تب بھی نماز لوٹنے کی ضرورت نہیں۔

جب کوئی آدمی سواری پر سفر کر رہا ہو۔ تو جس طرف بھی وہ جا رہا ہے اسی طرف نفلی نماز ادا کر سکتا ہے
صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر حضور علیہ السلام سفر پر تھے۔ اگرچہ آپ کا رخ مبارک قبلہ کی طرف
نہیں تھا۔ پھر بھی آپ نفلی نماز ادا کر لیتے تھے۔ تو ایسے ہی مواقع کے لیے فرمایا کہ تمہارا رُخ تب طرف
بھی ہو۔ اللہ تعالیٰ اُدھر ہی متوجہ ہے اِنَّ اللّٰہَ وَابِعٌ عَلَیْہِ اللّٰہُ تعالیٰ بڑی وسعت والا
اور سب کو جاننے والا ہے۔ وہ ہر شخص کو اس کے حالات کے مطابق بدلہ عطا فرمائے گا۔

الْعَمَّ
در چل و شتر ۱۶

البقرة ۲
(آیت ۱۱۶ تا ۱۱۹)

وَقَالُوا اخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَنَهُ بَلْ لَمْ يَكُنْ لَكَ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلٌّ لَكَ قَانُونٌ ۝۱۱۶ بَدِيعُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝۱۱۷ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝۱۱۸ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ ۝۱۱۹

ترجمہ: اور کہا ان لوگوں نے کہ اللہ نے بیٹا بنالیا۔ پاک ہے اس کی ذات، بلکہ اُسی کے لیے ہے۔ جو پچہ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ سب اُسی کی اطاعت کرنے والے ہیں ۝۱۱۶ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے تو اُسے آتا ہے۔ ہو جا۔ پس وہ ہو جاتی ہے ۝۱۱۷ اور کہا ان لوگوں نے جو نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کیوں نہیں کلام کرتا۔ یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ اسی طرح کہا ان سے پہلے لوگوں نے ان کی بات کی طرح۔ ان کے دل آپس میں جڑے جڑے ہیں۔ تحقیق ہم نے ان لوگوں کے لیے آیات بیان کر دی ہیں جو یقین رکھتے ہیں ۝۱۱۸ بے شک ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا۔ اور آپ سے درخت والوں کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا ۝۱۱۹

اللہ تعالیٰ والہ
سے پاک ہے

اہل کتاب کے غلط عقائد کی بحث مسلسل چلی آرہی ہے۔ ان آیات میں ان کی ایک اور بدعتیہ گئی کا بیان ہے۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنالیا ہے۔
قَالُوا اخَذَ اللَّهُ وَلَدًا اس غلط عقیدے میں یہ قیمنوں مگروہ شامل ہیں۔ یعنی

یہود، نصاریٰ اور مشرکین قَالُوا کی ضمیر ان تینوں کی طرف لٹتی ہے۔ سورۃ توبہ میں موجود ہے کہ یہودیوں کے ایک فرقہ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنایا ہے؟ وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ بْنُ اللَّهِ اگرچہ تمام یہود کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ تاہم ایک گروہ ایسا ہے جو اہل کتاب میں شامل ہے۔ مگر عقیدہ یہ رکھتا ہے۔ اسی طرح نصاریٰ کا عقیدہ تو واضح ہے۔ کہ یہ کھل کر کہتے ہیں الْمَسِيحُ بْنُ اللَّهِ یعنی عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ قرآن پاک نے یہ بات تصریح کے ساتھ بیان کی ہے۔ کسی مخلوق کو خدا کا بیٹا بنانا اتنا قبیح فعل ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے، اس کے حکم سے زمین و آسمان پھٹ جائے۔ اور خدا تعالیٰ کا قہر نازل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی بات منسوب کرنا بڑی ہیہودہ بات ہے مشرکین عرب کے متعلق تصریح موجود ہے۔ کہ وہ فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے وَجَعَلُوا الصَّلَاطَةَ الَّذِينَ هُمْ عَبْدُ الرَّحْمَنِ اِنَاثًا۔

اس باطل عقیدے کے رد میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا مَجْنُونٌ اللہ کی ذات پاک ہے مبرا اور منزہ ہے۔ بیٹے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا دو وجوہ سے محبوب ہے۔ اگر بیٹا غیر جنس کا ہو تو یہ انسان کے لیے عیب ہے۔ اور اگر ہم جنس ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے لیے عیب ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، فردانیت اور یگانگت کے خلاف ہے۔

مخلوق کے لیے اولاد کا ہونا اس لیے معیوب نہیں۔ کہ مخلوق عاجز ہے۔ اسے اولاد کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر انسان اولاد کے بڑے مشتاق ہوتے ہیں اولاد کی عدم موجودگی میں انہیں سلسلہ نسب منقطع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ آخری عمر میں خدمت سے محروم ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے اللہ تعالیٰ تو احد ہے۔ اس کی صفت تو بے غنی ہے۔ وہ صمد ہے۔ وہ ہر ایسی چیز سے بے نیاز ہے۔ لہذا اس کی طرف اولاد کی نسبت کرنا بہت بُری بات ہے۔

یہ حقیقت بھی قابل غور ہے۔ کہ اولاد کی پیدائش اس کے باپ کے مادہ سے ہوتی ہے جو اس کے جسم سے الگ ہو کر رحم مادر میں منتقل ہوتا ہے۔ اور پھر وہ بچے کی صورت میں اس کے جسم سے علیحدہ ہوتا ہے۔ تو اس قسم کی تولید کی نسبت اللہ تعالیٰ کو طرف کرنا بہت

قیح حرکت ہے۔ کیونکہ اللہ جل شانہ ہر ایسی چیز سے منزہ ہے۔ سُبْحَانَہ سے یہی مراد ہے۔
 جب انسان کے عقیدے میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی معرفت میں نقصان
 آتا ہے۔ تو اس کے نتیجے میں یا تو تشبیہ آتی ہے۔ یا تہک یہ ہوتا ہے۔ تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ
 مخلوق کی صفت اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کی جائے۔ مثلاً لا یموت۔ یا تہک یہ ہوتا ہے۔ تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ
 یہی صفت اللہ تعالیٰ میں ثابت کی جائے تو یہ تشبیہ کا ارتکاب ہوگا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی صفت
 مختصہ کو مخلوق میں ثابت کیا جائے، تو شرک ہو جائے۔ مثلاً قادر مطلق، علیم کل اللہ تعالیٰ کی
 ذات ہے۔ اور اگر یہی صفت کسی مخلوق میں مانی جائے۔ تو شرک ہوگا۔ سُبْحَانَہ کا لفظ
 اللہ تعالیٰ کی اسی پاکیزگی پر دلالت کرتا ہے۔

تشبیہ و تہک

صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ السلام سے سُبْحَانَہ کا مطلب پوچھا تو آپ نے فرمایا:
 تَنْزِيَهُ اللَّهِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ بِرَقْمٍ كِي بَدَلِي رَجَبٍ سَے پاکیزگی۔ کسی نے حضرت عبداللہ بن
 عباسؓ سے دریافت کیا کہ حضرت اللہ جل شانہ کا معنی تو ہم جانتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے
 بڑا ہے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا مطلب جی سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں الْحَمْدُ لِلَّهِ
 کا معنی یہ ہے کہ سب حمد و ثنا اور تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ حضرت سُبْحَانَہ کا مطلب
 آپ سمجھادیں۔ آپ نے جواب دیا۔ یہ کون سی شکل بات ہے۔ سُبْحَانَہ اللہ ایک ایسا کلمہ ہے۔
 جو اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف کے لیے منتخب فرمایا ہے اور فرشتوں کو بھی حکم دیا ہے۔ کہ اس کلمے
 کے ساتھ میری تعریف کیا کرو۔ الغرض! یہ چاروں کلمات یعنی اللَّهُ أَكْبَرُ۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔
 الْحَمْدُ لِلَّهِ اور سُبْحَانَہ اللہ خدا تعالیٰ نے اپنی تعریف کے لیے مقرر فرمائے ہیں۔ مطلب یہ
 ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے۔ تمام تعریضیں اسی ذات کے لیے ہیں۔

مالک اور طبرک

فرمایا اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بَلَّ لَّهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ
 وَأَنْ مِّنْ مِّنْ سَمَانٍ وَزَمِينَ كِي ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ یعنی یہ تمام چیزیں مملوک ہیں
 اور اللہ جل شانہ ان کا مالک ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ اور انسان میں باپ اور بیٹے کی نسبت نہیں

ہے۔ بلکہ ملک اور ملک کی نسبت ہے۔ اور حیران کن ہے۔ جسے ہر قسم کا اختیار حاصل ہے اور اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ کُلُّ لَدُنَّا قَانُونٌ۔ اب اس کی اطاعت کرنے والے میں۔ اس کے تحویلی حکم کی خلاف ورزی کسی میں محال نہیں۔ وہ کسی کو تیار کرے۔ یہ کہ کوئی نذرست کر دے۔ کسی پر موت طاری کر دے۔ اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ کائنات کی ہر چیز کو اس کی فرمانبرداری کرنی ہوگی۔ ہاں شریعت کے احکام ایسے ہیں جسے ان ٹال سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے نماز پڑھو۔ زکوٰۃ ادا کرو۔ جہاد کرو۔ ان ان احکام پر عملدرآمد میں کوتاہی کر سکتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے تحویلی حکم کے سامنے سب کو تسلیم ختم کرنا پڑے گا جب موت کے فرشتے آجاتے ہیں۔ تو پھر کون ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے حکم کو ٹال سکے۔ خود مرنے والا اور اس کے سامنے حمایتی دیکھتے۔ وہ جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا تحویلی حکم پورا ہو جاتا ہے۔ گویا یہاں پر اللہ تعالیٰ کی دو صفات کا ذکر ہوا۔ اول یہ کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے۔ اور دوسری یہ کہ وہ ہر چیز کا متصرف بھی ہے۔ جو چاہے کرے اس کے راستے میں کوئی حادثہ نہیں آتی۔

صفت ابداع

اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی تیسری صفت ابداع کا ذکر بھی ہے۔ فَرِیْدٌ بِکَلَمٍ لِّلصَّوْتِ وَالْمَرْحُومِ وَهَآسَمَانُ اور زمین کا ایجاد کرنے والا ہے۔ ابداع اس تخلیق کو کہتے ہیں جس کا پہلے نمونہ موجود نہ ہو کہ جسے دیکھ کر کوئی چیز تیار کی جاسکے۔ اور پھر موجود بھی ایسا ہے کہ وَاِذَا قَضٰی اَمْرًا جِبَّ اَمْرًا کسی کام کے کرنے۔۔۔ کا فیصلہ کرتا ہے۔ فَاِنَّمَا يَقُولُ لَّذٰکُنْ تَوَدَّ کِتَابَہُ ہو جائے کوئی پس وہ ہو جاتی ہے۔ یہ کُنْ ایسا لفظ ہے۔ جس میں سرعت اور تیزی کا حکم پایا جاتا ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ کُنْ فرماتے ہیں۔ تو کسی چیز کے معرض وجود میں آنے کے لیے نہ کسی۔ ذرے کی ضرورت پڑتی ہے۔ نہ ذرہ ان مطلوب ہوتا ہے۔ اور نہ کسی کاریگر یا مددگار کی مدد درکار ہوتی ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم صادر ہوتے ہی کام ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ کُنْ کا لفظ بھی محض تعبیر کے لیے ہے۔ ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ فرما لیتے ہیں، کہ کون سی چیز کس سطح پر مطلوب ہے۔ تو وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی

طرف خلقت

اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرنا سمجھتے ہیں اور گستاخی ہے۔ یہ بے محل اور فضول بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اور منزہ ہے۔ اس کی چار صفات کا بیان بھی

ہو گیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کَذَّبَنِي ابْنُ اَدَمَ وَلَمْ
يَكُنْ لَهٗ ذَلِكَ اِنَّا نُمَجِّدُكَ جَبَلًا ہے۔ حالانکہ اس کے لیے یہ بات مناسب نہیں۔ اور
انسان مجھ کو گالی دیتا ہے۔ حالانکہ یہ بھی اس کے مناسب حال نہیں۔ پھر فرمایا کہ فَامْتَكِ
تَكْذِيبُكَ اَيُّهَا اَسْ كَا جَبَلًا یہ ہے کہ لَنْ يُعِيدَنِي كَمَا بَدَأَنِي اِنَّا كَا
کہ مجھے دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا۔ جس طرح کہ پہلی مرتبہ کیا۔ یعنی انسان قیامت کا منکر ہے
یہ اللہ تعالیٰ کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔ اور گالی اس لحاظ سے دیتا ہے کہ وہ میری طرف
اولاد کی نسبت کرتا ہے۔ حالانکہ میری بیوی ہے اور نہ اولاد ہے۔ اور نہ ہی مجھے انکی
ضرورت ہے۔ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنا لیا ہے۔ تو وہ گویا اللہ تعالیٰ
کو گالی دیتا ہے۔ لَقَوْلُكَ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حقیقی بیٹا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہو۔ تو وہ خدا کا جبر ہو گا
اگر خدا تعالیٰ کا جبر مانا جائے گا۔ تو خدا تعالیٰ خود بھی حادث ہو گا۔ بسیط نہیں ہے گا۔ اسی طرح
مجازاً بھی کسی کو خدا کا بیٹا نہیں کہہ سکتے۔ کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا اس قدر قرب حاصل کرے
کہ بیٹے کی طرح ہو جائے۔ بیٹا چونکہ متصرف ہوتا ہے۔ وہ باپ کی مرضی کے خلاف بھی کوئی کام
کر سکتا ہے۔ بعض اوقات باپ کو مجبوراً بیٹے کی بات ماننا پڑتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی صفت
تو یہ ہے كُلُّ لَهٗ قَانِتُونَ سب کے سب اس کے مطیع ہیں۔ اس پر کوئی بھی تصرف نہیں
کر سکتا۔ لہذا یہ بات بھی غلط ہے۔ کہ کسی کو مقرب الہی ہونے کی بناء پر خدا تعالیٰ کا بیٹا تسلیم کر لیا
جائے۔ جیسا کہ عیسائیوں میں یہ چیز پائی جاتی ہے۔

ایک اور غلط بات جو بعض لوگ کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے۔ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ
علم سے عاری۔ جاہل لوگ کہتے ہیں لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اللہ تعالیٰ ہم سے براہِ راست
کلام کیوں نہیں کرتا۔ اَوْ تَأْتِيُنَا آيَةٌ مِّنْ رَبِّنَا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ جس کی بناء پر
ہم اللہ تعالیٰ کے نبی اور اس کی کتاب کی تصدیق کر سکیں مفسرین کرم بیان کرتے ہیں کہ مشرکین میں

اللہ تعالیٰ سے
کلام کی خواہش

سے ایک شخص رافع بن حرمید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کھنے لگا۔ آپ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ تو آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے براہ راست کلام کرے۔ یا وہ کوئی خاص نشانی ہمارے پاس بھیجے۔ تب سے رکھ کر ہم تصدیق کریں۔ فرمایا یوقونی اور حماقت کا سوال ہے۔ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ اس طرح کی باتیں تو ان سے پہلے لوگوں نے بھی کی تھیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بلکہ پُرانا یہود وہ بول ہے۔ آج کے دور کے کافر، مشرک اور جاہل لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ فلاں نشانی ہونی چاہیے۔ یا اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کلام کیوں نہیں کرتا۔ فرمایا تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ اس قماش کے تمام اگھے پچھلے لوگوں کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ اسی لیے تو وہ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ اور لایعنی سوال پیش کرتے ہیں۔

حضور علیہ السلام
کے معجزات

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ یہ لوگ کون سی نشانی طلب کرتے ہیں حالانکہ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ہم نے تو یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے بے شمار نشانیاں یا معجزات دکھائیے ہیں۔ کسی ایک آدمی نشانی کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دست مبارک پر تقریباً تین ہزار معجزات ظاہر فرمائے۔ اور یہ سارے ان لوگوں کے سامنے ہیں۔ کیا شوقِ القم کا مجزہ کوئی ڈھکی چھپی بات ہے۔ کیا ان لوگوں نے کھجور کے خشک تنے کو روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپ کی انگلیوں سے پانی کی نریں جاری ہو جانا کس کے علم میں نہیں یہ سب کچھ ان لوگوں کے سامنے ہے۔ مگر یہ نشانیاں ان لوگوں کو نظر آتی ہیں۔ جو یقین رکھتے ہیں اور جن کے دل میں ایمان کی دولت موجود ہے۔ وہ سمجھ چکے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے پیچھے نبی ہیں اور جن کے دل میں عناد ہے اس قسم کی بے معنی باتیں وہی کرتے ہیں۔ البتہ نبی کے دل میں تکلیف ہوگی۔ غم لاحق ہوگا۔ کہ اتنی واضح نشانیاں موجود ہونے کے باوجود یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی پر اڑے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے براہ راست باتیں کر کے فرشتوں کی صف میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ یا اپنے آپ کو انبیاء علیہم السلام کے برابر سمجھتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ ان سے بات کرے۔ یہ سب ناجائز مطالبات ہیں

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام
کیسے تسلی

جب کوئی شخص تمام تر نشانیاں دیکھنے کے باوجود ایمان نہ لائے۔ تو یقیناً دل میں فوس

پیدا ہوگا۔ حضور علیہ السلام کے ساتھ یہی معاملہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلیت ہوئے فرمایا۔
 رَمَّاكَ سَلَكٌ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا اے پیغمبر! ہم نے آپ کو حق کے ساتھ نبی اور رسول
 بنا کر بھیجا ہے۔ آپ اپنی امت کے لیے بشیر اور نذیر ہیں۔ یعنی آپ اہل ایمان کو جنت کی خوشخبری
 سناتے ہیں۔ اور منکرین کو دوزخ کی وعید بھی سناتے ہیں۔ جو لوگ آپ کا انکار کرتے ہیں۔ وہ لازماً
 اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے۔ آپ ان کی حرکات پر غمگین نہ ہوں۔ اور نہ ہی ان کے
 دوزخ میں جانے پر کوئی قلق محسوس کریں۔ کیونکہ وَلَا تَسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ
 آپ سے دوزخیوں کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔ کہ یہ لوگ جہنم میں کیوں گئے۔ بلکہ اُن
 سے سوال ہوگا: مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ اللہ تعالیٰ پہچھے گا۔ تمہاری جہنم رسید ہونے کی کیا وجہ
 تھی۔ پھر وہ خود ہی اس کا جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔ مسکین سے ہمدردی نہیں
 کرتے تھے۔ فضولیات میں گسستے تھے۔ اور روزِ قیامت کی تکذیب کرتے تھے۔ لہذا آپ
 اُن کی حرکات سے دل برداشتہ نہ ہوں اِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلْغُ آپ کا کام صرف بلغا ہے
 باقی ان سے ہم خود نپٹ لیں گے۔

آلہ

درس چل و بخت

البقرة ۲

(آیت ۱۲۳-۱۲۴)

وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مَتَابَهُمْ قُلْ
 إِنَّ هُدَى اللَّهِ هِيَ الْهُدَىٰ وَلَكِنْ اتَّبَعْتُ أَهْوَاءَهُمْ بِمَا
 لِيَ بِالْكَذِبِ جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا وَصِيرٍ
 ۱۲۳ ﴿الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلْكَ أُولَٰئِكَ
 يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمَنْ تَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَبِيرُونَ ۱۲۴﴾
 لِبَنِي إِسْرَٰءِيلَ أَذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ
 وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۱۲۵ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ
 عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ
 وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۱۲۶﴾

ترجمہ: اور ہرگز راضی نہ ہونگے آپ سے یہودی اور نصرانی یہاں تک کہ آپ ان کی
 امت کا اتباع کریں۔ آپ کہہ دیجئے بیشک اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔ اور
 آپ نے اگر ان کی خواہشات کا اتباع کیا۔ بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آچکا
 ہے۔ تو نہیں ہوگا۔ آپ کے لیے اللہ کی طرف سے کوئی حمایتی اور مددگار ۱۲۳
 جن کو ہم نے کتاب دی ہے۔ وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس کی تلاوت
 کا حق ہے۔ یہی لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جو کوئی اس کے ساتھ کفر کرے گا
 پس یہی لوگ نقصان اٹھائیولے ہیں ۱۲۴ اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمتیں
 یاد کرو جو میں نے تم پر کیں۔ اور یہ بات کہ بیشک میں نے تم کو جہان وادوں پر
 فضیلت بخشی ۱۲۵ اور ڈرو اس دن سے کہ نہ کام آئے گا کوئی نفس کسی کی
 طرف سے ذرا بھی۔ اور نہ قبول کیا جائے گا اُس سے بدلہ۔ اور نہ اُس کو سفارش فائدہ
 دیگی۔ اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ۱۲۶﴾

یہود و نصاریٰ کی خرابیاں مختلف اذکار میں بیان ہو رہی ہیں اس سے پیشتر اس بات کا ذکر بھی آچکا ہے کہ اہل کتاب پابستے ہیں کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ بھی پہلے دین یعنی یہودیت یا نصاریت کی طرف پلٹ آئیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ اہل ایمان کمزور ہو جائیں۔ اگرچہ ان پر حق واضح ہو چکا ہے۔ تاہم وہ حسد کی بنا پر بنی آخر الزماں یہ ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعض باتوں میں مخالفت بھی کرتے تھے۔ یہ حقہ یہ تھی کہ شاید یہ لوگ ہمارے ہو کر ایمان لے آئیں۔ چنانچہ مسلمان بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ ہجرت کے بعد بھی سولہ سترہ ماہ تک قبلہ بیت المقدس ہی رہا۔ مگر بعد میں یہی معلوم ہوا کہ مشرک تونادانی کی وجہ سے حق کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور اہل کتاب حسد اور غنا کی بنا پر ایسا کرتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مشرک یا تو ختم ہو گئے یا ایمان قبول کر لیا۔ مگر یہود و نصاریٰ باطل پر اڑے رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو خبردار کیا ہے کہ اہل کتاب سے آپ کوئی امید نہ رکھیں۔ یہ دیکھو دانت حق کی مخالفت کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَٰكِنْ تَرْضٰی عِنْدَ الْيَهُودِ وَلَا النَّصْرٰی یہودی و نصاریٰ آپ پر برگزینی نہیں ہوں گے حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ جب تک کہ آپ ان کی ملت کا اتباع نہ کریں۔ اُن کا مذہب اختیار نہ کریں۔ ان کا طریقہ نہ اپنائیں لفظ لَنْ تاکہ نفی کے لیے آتا ہے۔ یعنی ہرگز راضی نہیں ہوں گے اہل کتاب کو حق بات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ تو مسلمانوں کو اپنے دین سے خوف کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خود ہدایت قبول نہیں کریں گے۔ اہل کتاب کی جملہ خرابیاں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آخری ہتھکنڈ کی کہ آپ ان سے کوئی امید وابستہ نہ کریں کہ شاید یہ ایمان لے آئیں گے۔ بلکہ یہ تو اُلٹے مسلمانوں کو اپنے دین پر لانا چاہتے ہیں۔ جو کرنا ممکن ہے۔

فرمایا یہ لوگ جس ملت پر آپ کو لانا چاہتے ہیں۔ وہ ان کی خود ساختہ بات ہے قَدْ اٰتٰی الْاٰیٰتِ الْاٰلٰہِیَّہُ الْاٰتِیَّہُ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے اگر آپ ہدایت الہی کو چھوڑ کر ان کی ملت کا اتباع کریں گے تو یہ ہوا کی پیروی بن جائیگی۔ جو کہ ہدایت کی ضد ہے۔ اور اگر حق واضح ہونے اور علم آ جانے کے بعد آپ ان کی خواہش

گزشتہ صفحہ پر

ضمندی کے لیے
اہل کتاب کی طرف

ہدایت الہی
اصل ہدایت ہے

اتباع کرنے لگیں وَلَٰكِنْ اَتَّبَعْتَ اَهْوَاءَ هُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ
 تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ قَوْلٍ وَلَا نَصِيرٍ اللہ کی طرف سے آپ کے کوئی
 حمایتی ہوگا اور نہ مددگار۔ یعنی اے نبی علیہ السلام اور اہل ایمان اب تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی آخری
 کتاب ہدایت آچکی ہے۔ اگر اس کو چھوڑ کر اہل کتاب کی خواہشات کے پیچھے چلنے لگے۔ تو پھر
 اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آسکتی ہے۔ اگرچہ یہ آپ کے قطعاً ممکن نہیں کہ حق کو ترک کر دیں تاہم قانون
 کے طور پر اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی کہ اصل ہدایت اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے۔ اسی
 کی پیروی کرنا ہے۔ اور کسی دوسری چیز کے پیچھے نہیں چلنا۔ یہ قاعدہ سب کے لیے ہے۔ اور اس سے
 کوئی بھی بری الذمہ نہیں۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا
 وَلَٰكِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ اگر آپ سے بھی شرک
 سرزد ہو گیا۔ تو آپ کے بھی سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ اور آپ نقصان اٹھانے
 والوں میں ہوں گے۔ یہ اصول صرف حضور علیہ السلام کے لیے ہی نہ تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمام
 انبیاء علیہم السلام پر یہی وحی بھیجی کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ لہذا آپ حق کی پیروی کرتے
 رہیں اور اہل کتاب کی خواہشات کی طرف توجہ نہ دیں۔

یسود و نصاریٰ کا دین اسلام تو کتاب الہی کے ذریعے ہی نازل ہوا تھا۔ اور وہ برحق تھا۔ مگر
 اب ان کی ملت تحریف کی وجہ سے بگاڑ چکی تھی۔ لہذا اب وہ قابل اتباع نہیں رہی۔ بلکہ اب تو
 آخری نبی کا دین غالب آئے گا۔ وہی قابل اتباع ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا هُوَ الَّذِي اَرْسَلَ
 رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنٍ اَلْحَقِّ لِيُظْهِرَ عَلٰى الدِّيْنِ الَّذِيْ هُوَ الْعَالٰى وَهُ رَحِيْمٌ ذٰلِكُمْ هِيَ
 جس نے اپنے آخری نبی کو سچے دین سے کر بھیجا ہے۔ تاکہ اس دین کو حقیقی ادیان پر غالب کرے جب
 مقصد رسالت دیگر ادیان پر غالب منظر تو یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ علم اور حق کی آمد کے بعد اہل کتاب
 کی خواہشات کی پیروی کی جائے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ کسری کی ہلاکت کے بعد کوئی
 دوسرا کسری پیدا نہیں ہوگا۔ اور قیصر کی ہلاکت کے بعد کوئی دوسرا قیصر نہیں ہوگا۔ مگر رومیؒ نے یہاں

نزولِ مسیح علیہ السلام تک باقی رہیں گے۔ اور تم ان تمام سے بادرست و گریبان رہو گے۔ کبھی ان کو غلبہ حاصل ہو گا۔ اور کبھی تم غالب آؤ گے۔ گویا یہ لوگ قربِ قیامت تک باطل پر ڈٹے رہیں گے۔ لہذا ان سے قبولِ حق کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔

اہل کتاب میں
اہل ایمان

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ایک اصولی بات بیان فرمائی ہے۔ کہ جب کسی قوم کی بڑائی بیان کی جاتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس قوم کے سوائے لوگ ایسے ہی ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ ان کی اکثریت ان صفات کی حامل ہے۔ ان میں بعض اچھے بھی ہو سکتے ہیں۔ یہاں پر یہی چیز بتائی جا رہی ہے۔ کہ اگرچہ اہل کتاب کی اکثریت ایسی ہے۔ جو اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹی ہوئی ہے۔ تاہم ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں۔ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْكِتَابِ جنہیں ہم نے کتابِ عطا کی ہے۔ يَتْلُونَهَا حَقَّ تِلَاوَةٍ جو اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کرنے کا حق ہے۔ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِالْهُدَىٰ یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں تورۃ اور انجیل پر ایمان رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے۔ جو لوگ سابقہ کتب کا دیر پر صحیح معنوں میں ایمان رکھیں گے۔ وہ ہی آخر الزمان کا انکار کیسے کر سکتے ہیں۔ کیونکہ تورۃ و انجیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی واضح نشانیاں موجود ہیں۔ اور جو حضور علیہ السلام پر ایمان لائے گا۔ وہ قرآن پر بھی ایمان لائے گا۔ یہ ساری کی ساری کتابیں اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہیں۔ اور ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ مسلمان تو تمام کتب کا دیر پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر یہ کم نکتہ قرآن پاک پر ایمان نہیں لاتے۔ بہر حال فرمایا کہ اہل کتاب سات کے سات بے ایمان نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بھی ایسے ہیں جو کتاب کو صحیح طور پر پڑھتے ہیں۔ لہذا ایسے لوگ ایمان دار ہیں۔

حقِ تلاوت

تلاوت کا حق ادا کرنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس کے احکام پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ جو شخص زبانی تلاوت تو کرے مگر اس کے احکام کی پروا نہ کرے۔ یا اس کے احکام کو توڑ موڑ کر پیش کرے یا اس کی غلط تاویل کرے۔ جیسا کہ اہل کتاب کرتے تھے۔ تو ایسے شخص نے تلاوت کا حق ادا نہیں کیا۔ قرآن پاک کی تلاوت میں بھی یہی اصول کار فرما ہے مندرک حاکم کی روایت میں آتا ہے۔

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حق تلاوت یہ ہے کہ کتاب کی حلال کردہ چیز کو حلال اور حرام کردہ چیز کو حرام سمجھے۔ ایک دوسری حدیث میں آتا ہے: اُس شخص کا کوئی ایمان نہیں مگر کہ اسْتَحَلَّ حَرَامًا مَذَّ جَسَّ نَفْسًا لَمْ يَكُنْ يَدْرِي مَا كُنْ يَكْفُرُ بِهٖ۔ لہذا لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حلال و حرام کی پوری پوری پاسداری کی جائے۔ یہودیوں کی عرت اس کے الفاظ اور کلمات میں تحریف نہ کی جائے۔ کتاب الہی کے محکم اور مشابہات تمام آیات پر ایمان ہونا چاہیئے۔ صحیحات میں کتبائے بھی آتی ہیں۔ اُن پر بھی یقین ہونا چاہیئے۔ اور عمل کرنا چاہیئے۔ یہ حق تلاوت ہے۔ ایمان لانے کے بعد احکام کا اتباع بھی ضروری ہے۔ اگر عمل نہیں کرتا تو اس نے حق تلاوت ادا نہیں کیا۔

منکرین کیلئے
خدا

فرمایا وَمَنْ يَكْفُرْ بِهٖ اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ کفر کئے گا۔ یعنی اس کی تلاوت کا حق ادا نہیں کرے گا۔ اس کے احکام کو چھپانے گا۔ اس کی غلط تاویلیں کرے گا۔ جیسا کہ یہودی کرتے تھے فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ پس یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں اس دنیا میں تو شاید نرا سے بچ جائیں گے۔ مگر ان کا انجام کارِ بُرا ہوگا۔ اور آخرت میں یہ لازماً خسار پانے والوں میں ہوں گے۔ اُس وقت انہیں معلوم ہوگا۔ کہ انہوں نے احکام میں تحریف کر کے اور کتمان حق کے ذریعہ کتنا نقصان دہ سودا کیا تھا۔

حق و باطل
کی پہچان

اہل کتاب کے دو گروہوں کا ذکر ہوا۔ ایک گروہ وہ ہے جس کی برائیاں مسلسل بیان ہو رہی ہیں اور جو اپنی ضد و عناد کی وجہ سے ایمان سے محروم ہوا۔ دوسرا وہ گروہ ہے جو کتاب کو صحیح طریقے سے پڑھتا ہے۔ اور پھر اس میں تحریف کرنے کی بجائے اس کے احکام پر ایمان لاتا ہے۔ انہیں لوگوں میں حضرت عبد اللہ بن سلام ہیں۔ یہودی عالم تھے مگر منصف مزاج تھے حضور علیہ السلام سے پہلی ملاقات میں ہی ایمان قبول کر لیا۔ یہ بار بار کہتے تھے کہ مجھے یقین ہے کہ آپ ہی اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ جن کی بشارت کتب سابقہ میں آچکی ہے۔ ان کی اکثریت متعصب تھی۔ جنہوں نے ایمان قبول نہیں کیا اور آج تک اُسی دگر پر چلتے آئے

ہیں۔ ان میں سے کوئی اکاؤنٹ ایسا نکلتا ہے جو تعصب کو بالائے طاق رکھ کر کتاب کا مطالعہ کرتا ہے۔ اور پھر حق کو قبول کرتا ہے۔

اسی میں ایک حق پرست محمد اسد (لیوپولڈ) ہیں۔ یہ بھی یہودی عالم تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انگریزی زبان میں روڈ ٹو ناکائی (ROAD TO NAKKAI) یعنی ملک کی طرف سڑک انہیں کی کتابوں میں سے ایک اور کتاب اسلام ایٹ کراس روڈ (ISLAM AT CROSS ROAD) یعنی اسلام چورسے پر بھی لکھی ہے۔ بڑے سمجھ دار اور قریب کار ہیں۔ کچھ عرصہ پاکستان میں بھی قیام کیا ہے۔ آج کل اُصر یورپ میں ہی کیوں مقیم ہیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے انہیں ایمان کی دولت سے نوازا۔ محمد یحیٰ عیسیٰ دانشور تھے۔ انہوں نے قرآن پاک کا مستند ترجمہ کیا ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔ اسی طرح ملک و کنویرہ اول کے زمانے میں مٹر کو لیم تھے۔ آپ کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ ایمان کی دولت سے شرف ہوئے۔ وہ وضو کے طریقہ سے متاثر ہوئے۔ اور کہا کہ یہ طریقہ یقیناً ایک سچے مذہب کا ہی ہو سکتا ہے۔ اُس نے اپنے خاندان کے انہی اشخاص کو مسلمان بنایا۔ عیسیٰ بڑے ناراض ہوئے۔ تاہم وہ اپنا کام کر گیا۔ بلکہ اُس نے عیسائیوں کو ہمیشہ مناظرہ کی دعوت دی۔ پیشے کے لحاظ سے بیرسٹر تھا۔ کوئی اس کے مقلدے پر نہیں آتا۔ اس کا نام عبد اللہ رکھا گیا۔

الغرض! یہود و نصاریٰ کی اکثریت بخاری رہی ہے۔ ان میں سے بہت کم لوگ ایمان لائے۔ یہ لوگ سازشی ہیں۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق ہمیشہ غلط پراپیگنڈا کر کے لوگوں کو بہ ظن کرتے ہیں۔ ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ کوئی مسلمان یہودی یا عیسائی نہ بھی بن سکے تو کوئی بات نہیں۔ اُسے کم از کم مسلمان نہیں رہنا چاہیئے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مسلمان کو بے دین ضرور بنادیں۔ اپنے دین پر اس کا عقیدہ متزلزل کر دیں۔ اور اس طرح ان کا رشتہ اپنے پیغمبر کے ساتھ کٹ جائے۔ یہ ان کی سازش ہے۔ جس کا شکار مسلمان ہر دور میں ہوتے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی تقریباً چالیس برائیوں کی نشاندہی کے بعد انہیں آخر میں نصحاء انداز میں انعامات یاد کرائے۔ اور فرمایا: يَا بَنِي إِسْرَآءِيلَ اذْكُرُوا لِي بَنِي إِسْرَآءِيلَ يَادْكُرُو
فَعَمَلِي السَّيِّئِ افْعَلْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي اَنْ نُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِ مِصْرَ اَوْ نَكُونَنَّ مِنَ الْفَآئِزِ
 بنی اسرائیل پر انعامات

وَاِنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ اور میں نے تمہیں جہان والوں پر فضیلت دی۔ بنی اسرائیل پر انعامات اور ان کی فضیلت کا تذکرہ ان دروس میں تفصیلاً آچکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک مرتبہ پھر یاد دہانی کرائی۔ مگر یہ ایسی ناشکرہ کفار قوم ہے کہ حسد کی آگ میں جل کر تمام حسنات فطرت کوٹ کر گئی۔

قیامت کا
نقشہ

فرمایا ہے بنی اسرائیل! تم نہ سمجھنا کہ ان تمام برائیوں کے باوجود تم آخرت میں کسی نہ کسی طریقے سے خود ہو جاؤ گے۔ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُجْزَىٰ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا اس دن سے ذرو جس دن کوئی کسی کے کچھ کا نہ آ سکے گا۔ اُس دن انسان کے بچے کے تمام ذرائع خواہ وہ قوت کے ذرائع ہوں یا گرفت دزاری کے سب ناکام ہو جائیں گے۔ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ اور نہ اس سے بدلہ قبول کیا جائے گا۔ دنیا میں تو مال یا جان یا کسی قدر کے بدلے کوئی جان چھڑائی جاسکتی ہے۔ مگر قیامت کے دن مجرم سے کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی۔ صرف اسکی اپنی جان ہی قابل مواخذہ ہوگی۔ فَرَأَىٰ ذَٰلِكَ تَنْفَعُهَا شَفَاعَةُ اُس دن کسی کی سفارش بھی سودمند نہیں ہوگی۔ اس دن کوئی کسی بہ بخت کی سفارش بھی نہیں کرے گا۔ تمنا یہ غصہ، باطل ہے کہ سنت ابراہیم علیہ السلام تمہیں دوزخ میں گرنے سے بچالیں گے۔ سفارش تو ایماذار کی ہو سکتی ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت سے جس سفارش کے زعم میں ہے بنی اسرائیل! تم بدلا ہو اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے اب بھی مجھ جاز۔ اور ایمان قبول کر لو۔

فرمایا جب اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آجائے گا تو پھر قَوْلًا هُمْ يُنصَرُونَ ان کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ اللہ رب العزت کی عدالت میں ٹھیک ٹھیک فیصلے ہوں گے۔ اُن فیصلوں کو بدل کر مجرمین کی مدد کرنے والی کوئی ہستی نہیں ہوگی۔ اگلی آیات میں قت ابراہیم کی تائیس سے شروع کر کے حضور علیہ السلام کی نبوت اور آپ کی صداقت کا بیان ہے۔

البقرة

(آیت ۱۲۴)

الْمَ
وَرَسُولٌ مِّنْ دُونِهِ

وَإِذَا بَشُلَىٰ رِئُوسَهُ رَبُّهُ يُكَلِّمُتْ فَاتَّمَّهِنَّ قَالَتِ النَّبِيُّاتُ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَتْ وَمِمَّنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ﴿١٢٤﴾

ترجمہ: اور اس وقت کو دھیان میں لاؤ، جب آزمایا ابراہیم (علیہ السلام) کو اس کے رب نے چند باتوں کے ساتھ۔ پس انہوں نے ان باتوں کو پورا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے، فرمایا میں تمہیں لوگوں کے لیے پیشوا بنانے والا ہوں۔ (ابراہیم علیہ السلام) نے کہا کہ میری اولاد میں سے بھی (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا۔ میرا وعدہ ظالموں کے لیے نہیں

ہے ﴿۱۲۴﴾

گزشتہ درسی
پر ایک نظر

سورۃ بقرہ کی ابتداء میں قرآن پاک کے کتاب ہدایت ہونے کا بیان تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے تین گروہوں کا ذکر کیا۔ پہلا گروہ ہدایت کو قبول کرنے والوں کا دوسرا منکرین کا اور تیسرا منافقین کا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع سے اپنی توحید کا اقرار اور اپنی عبادت کے لیے کہا۔ پھر قرآن پاک کی صداقت اور حقانیت کو بیان فرمایا۔ اس کے ساتھ پیغمبر علیہ السلام کی نبوت اور آپ کی صداقت کا ذکر کیا۔ اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ نے اگے تخلیق آدم علیہ السلام اور پھر ان کی خلافت ارضی کا ذکر کیا۔ جو اللہ تعالیٰ کی حکمت میں طے ہو چکا تھا۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ جو کہ اپنے زمانے میں ایک عظیم قوم تھی اُسے اُس وقت اقوام عالم پر فضیلت حاصل تھی۔ اس کے بعد ان خرابیوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر آتا ہے۔ جو بنی اسرائیل میں پیدا ہو چکی تھیں۔ اگرچہ بنی اسرائیل کی خرابیاں لاتعداد ہیں مگر ان آیات میں ان کی چالیس کے قریب خرابیاں بیان ہوئی ہیں۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خطاب کیا اور فرمایا اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کو یاد کرو اور ان کی نافرمانی نہ کرو۔ فرمایا: وَامْنُوا بِمَا أَنزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ اِسْ كُنَابٍ پر ایمان لاؤ جس کو میں نے سب سے آخر میں نازل کیا ہے اور وہ سابقہ کتب کی مُصَدِّق ہے۔

تَبَيَّنَ اسْتَوَانُكَ اذْكَرُوا کے جملہ کو دوبارہ دہرایا گیا۔ اور اس قوم کو بار بار توجہ دلائی گئی۔ کہ وہ ہٹ دھرمی، غصہ اور عناد کو ترک کر کے حق کو قبول کر لیں۔ مگر یہ لوگ اپنے باطل حقانہ پر اڑے ہوئے اور پیغمبر آخر الزمان علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کی آخر کتاب قرآن پاک کا انکار کرتے ہوئے۔

قیامت کے متعلق بنی اسرائیل کا نظریہ درست نہیں ہے۔ شفاعت کے متعلق انہوں نے غلط عقیدے بنائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام باتوں کی نشاندہی کر دی ہے۔ یہاں سے لیکر آگے روز تک حضور علیہ السلام کی نبوت، آپ کی صداقت اور حقانیت کا ذکر ہے۔ آپ کی معرفت نازل ہونے والی کتاب اللہ کا ذکر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ملتِ منیغہ کے پہلے امام حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ کیونکہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اسی ملت کے آخری امام ہیں۔ اور پھر اسی ضمن میں مرکزِ ہدایت مکہ معظمہ، اس کی تاسیس اور اس کی فضیلت کا ذکر ہے۔ یہ ساری باتیں آگے آرہی ہیں۔

یہاں سے لے کر لَئِيسَ الْبَدَانَ تَوَلَّوْا وَجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ الْمَغْرِبِ تک ملتِ ابراہیمی کا تذکرہ آئے گا۔ درمیان میں ضمناً اور بھی بہت سے مسائل آئیں گے۔ لیکن خیالی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور نبوت کا تذکرہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کسی ہزار سال پہلے دعا کی تھی: رَبَّنَا وَبَعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ لَئِيسَ الْبَدَانَ تَوَلَّوْا وَجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ الْمَغْرِبِ۔ ان میں رسول بھیج۔ چنانچہ آپ کی نبوت کے علاوہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں پیدا ہونے والے دیگر انبیاء علیہم السلام کا ذکر بھی آئے گا۔

امتحان کی غرض
و غایت

یہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ میں ان امتحانات کا بیان ہے۔ جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے جد الانبیاء علیہ السلام کو آزمایا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَ اِذَا بَسَّلْنَا بَنِيهِمْ رَبُّهُم بِكَلِمَتٍ فَاَقْبَلُوْهُمُ اور اس وقت کو یاد کرو، جب ابراہیم علیہ السلام کو ان کے رب نے بعض باتوں میں آزمایا۔ اِبْسَلْنَا کا معنی امتحان یا آزمائش ہوتا ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر آتا ہے: سَكُوْنُهُمْ بِالْحُسْنِ وَالسَّيِّئَاتِ ہم نے اچھائی اور برائی کے ساتھ لوگوں کا امتحان کیا۔ تاکہ بات کھل کر سامنے آجائے۔ حدیث شریف میں حضرت عمرؓ کا قول ہے: بُلِيْنَا بِالسَّأْوِ فَصَبَرْنَا ہم کو تکلیفوں کے ذریعے آزمایا گیا تو ہم نے

نمبر کیا۔ مگر جس وقت ہمیں راحتوں کے ساتھ آزمایا گیا ہم صبر نہ کر سکے گویا ابتلی کا معنی آزمائش ہے۔
 یہاں پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ آزمائش تو وہ ہے۔ جسے کسی کی اہلیت یا کارکردگی کا علم نہ
 ہو مگر اللہ تعالیٰ تو عظیم کمال ہے۔ وہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے بھی جانتا تھا کہ
 آپ کس حیثیت اور قدر و منزلت کے نبی ہوں گے۔ اور چہ جس قدر بھی آپ میں اوصاف پائے
 جاتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی کے عطا کردہ تھے۔ تو ان حالات میں خود حضرت ابراہیم علیہ السلام
 کی آزمائش کا کیا مطلب؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ آزمائش کی غرض و غایت یہ بھی ہوتی ہے
 کہ کسی کو آزمائش میں ڈال کر اس کی حیثیت کو دوسروں پر واضح کیا جائے۔ امتحان لینے والے کو
 تو علم ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت کیسے مگر دوسرے لوگ اس سے ناواقف ہوتے ہیں۔ لہذا
 امتحان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے امتحان کی یہی غرض
 غایت ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام دنیا والوں پر ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ جس ہستی کو میں نے اپنا خلیل
 منتخب کیا ہے۔ اس میں کیا خوبیاں ہیں۔ جن کی بنا پر انہیں بلند مقام حاصل ہوا ہے۔ الغرض
 اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے۔ وہ چاہے تو انبیاء علیہم السلام کا امتحان لے لے۔ اور نہ چاہے تو
 ایک گنہگار کو معاف کر دے۔ بہر حال یہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائشوں کا ذکر ہے۔
 حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل کے مقام اُرم میں پیدا ہوئے جو موجودہ بغداد سے ساڑھے ستر میل
 کے فاصلے پر واقع ہے۔ اُس زمانے میں بابل آشوریوں کی سلطنت اور بڑا امجدن ملک تھا۔ یہ شہر
 کلدانیوں کا پایہ تخت بھی رہا۔ مگر زمانے کی دستبرد کے آگے ٹھہر نہ سکا۔ اور تباہ و برباد ہو گیا
 اب اس کے کھنڈرات سے اس زمانے کی اشیائے حال نکال کر انہیں عجائب گھروں میں تبدیل
 کر دیے ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح کے کھنڈرات ہیں۔ جس طرح ہمارے ہاں ٹیلدا کے کھنڈرات ہیں۔
 اسی طرح کے بعض مقامات سندھ میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں کے کھنڈرات سے پرانی تہذیبوں
 کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وطن مالون بابل تھا۔ جس کے
 اب کھنڈرات ہی باقی رہ گئے ہیں۔ خرپنہ زمانے میں یہ بہت بڑا شہر اور تہذیب و تمدن کا مرکز تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام
 کا وطن مالون

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مختلف آزمائشوں کے لیے یہاں پر کلمت کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ جمع کا صیغہ ہے۔ تاہم مبہم ہے۔ مفسرین کرام بہت سی آزمائشوں کا ذکر کرتے ہیں۔ آپ کی آزمائش کا پہلا مرحلہ اس وقت شروع ہوتا ہے۔ جب آپ نے ہوش و حواس سنبھالا اور ارد گرد کے ماحول مطالعہ کیا۔ قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں آپ کے جو واقعات بیان ہوئے ہیں۔ ان کے مطابق سب سے پہلے آپ کی اپنے والد، قوم اور بادشاہ وقت کے ساتھ کشمکش پیدا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اہل عمریں ہی رشد و ہدایت سے نوازا تھا۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ ۖ تَبِعْهُ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ کو کعبہ عطا کی۔ چنانچہ آپ نے اپنے مشرک زاد ماحول کا یہ اثر یا کر آپ شرک اور کفر سے متنفر ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے کفر و شرک کی مذمت بیان کرنا شروع کی۔ خاندان، قوم اور بادشاہ سب آپ کے دشمن ہو گئے۔ یہاں تو معمولی تنازعہ ہو جائے تو لوگ بھاگ جاتے ہیں مگر آپ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ اور آپ پچاس ساٹھ سال تک اپنے ماحول کے سامنے سینہ پھریں۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کے عبادت خانہ میں جا کر سارے بتوں کو توڑ دیا۔ تو آپ کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک مخالف تو پہلے ہی تھے اب انہیں یقین ہو گیا کہ ان کے بتوں کی توہین ابراہیم علیہ السلام کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ بادشاہ قوم کے ساتھ تھا۔ لہذا فیصلہ یہ ہوا۔ حَرِّقُوْهُ وَانصُرُوْا اللّٰهَ تَعَالٰی مَعَنَا ۖ مَعَكُمْ بَارَءٌ۔ معبودوں کو جو نقصان پہنچا یا گیا۔ اس کی تلافی صرف اسی طرح ہو سکتی ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں زندہ بدو دیا جائے۔ چنانچہ جیسا کہ واقعات بیان ہوئے ہیں۔ اس فیصلہ پر عمل درآمد کے لیے بہت بڑی مہم میں ایندھن جمع کیا گیا۔ اور پھر اسے ایک کھائی میں اچھی طرح جلا کر بھینق کے ذریعے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس میں پھینک دیا۔ ان حالات میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام آزمائش میں پورے اترے انہوں نے آگ میں ڈالے جانے کے وقت بھی کوئی بغیر فزع نہیں کیا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر معافی کی کوئی درخواست نہیں کی۔ بلکہ نہایت خند و بشتانی سے آگ میں ڈالے جانے کو قبول کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اَرَادُوْا بِہٖ کَيْدًا ۖ جَعَلْنٰہُمْ اِلٰخٰسِرِيْنَ ۚ وَاٰیۡکَ دَاوُۡدَ کَیۡدًا ۚ جَعَلْنٰہُمْ اِلٰخٰسِرِيْنَ ۚ تھے۔ کسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام بے نقص و ہستی سے ناپید کر دیا جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ

نے فرمایا کہ ہم نے ان بھائیوں کو ہی گھاٹے والا بنایا۔ یعنی ان سب کو ناکارہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ثابت قدم رکھا۔ اور آپ اس امتحان میں کامیاب و کامران ہوئے۔ اسی کے تحقق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بعض باتوں میں آزما دیا۔ فَاتَّخَذُوا آبَآءَ انْزِمَاتٍ میں پورے اترے۔ یہ آپ کی پہلی بڑی آزمائش تھی۔

دوسری آزمائش
وطن سے ہجرت

اسی بڑی آزمائش دیکھنے کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم آپ پر ایمان نہ لائی۔ بلکہ آپ کو ایک دوسرے امتحان سے کڈنا پڑا۔ آپ کا خاندان ایک یونی حضرت سارہ اور خدیجہ حضرت لوط علیہ السلام پر مشتمل تھا۔ لوط علیہ السلام بھی جن ہی سے آپ کی تحویل میں تھے۔ اور آپ پر یقین بھی رکھتے تھے۔ اتنی بڑی قومن عظمت میں کوئی دوسرا شخص ایمان نہیں لایا۔ اگرچہ قوم پہلے منصوبے میں ناکام ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جان کے دشمن تھے۔ اور آپ کے قتل کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہجرت کا حکم دیا۔ یہ آپ کی دوسری آزمائش تھی۔ ہجرت کرنا معنی وطن اور گھر بار چھوڑنا بڑا مشکل کام ہے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔ تو نبی اس کی تعمیل میں ذرا تامل نہیں کرتا۔ بلکہ نبی کے ساتھ اگر اہل ایمان کو بھی ہجرت کا حکم دیا جائے تو وہ اس کھٹن گھاٹی کو عبور کر لیتے ہیں۔ ہمارے نبی آخر الزمان علیہ السلام اور صحابہ کرام کی ہجرت ایک اہم تاریخی واقعہ ہے۔ اسی لیے قرآن وَالشَّاقِقُونَ اور الْمُهَاجِرِينَ کہہ کر ان کی تعریف فرماتا ہے۔

الغرض حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم پر بیک کتے ہوئے ہجرت کے لیے تیار ہو گئے۔ اور فرمایا اِنِّیْ مُہَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ میں اللہ کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔ چنانچہ آپ نے یوپی اور بھٹیجے کے درمیان بابل اور عراق کو چھوڑا۔ آپ کو مصر کے راستے سے شام اور فلسطین پہنچنے کا حکم تھا۔ راستے میں شرق اردن کے علاقے میں بحر میت آتا ہے۔ اس کے کنارے پر بنے متھن لوگ آباد تھے۔ انہوں نے اہل درت کا نظریہ حکومت قائم کر رکھا تھا۔ اس مقصد پر حضرت لوط علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ تم یہیں قیام کرو۔ اور ان لوگوں کو دین حق کی دعوت دو۔ چنانچہ آپ وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیوی بچے کے ساتھ آگے شام اور فلسطین اور پھر نہ تک چلے گئے۔ منہ میں آپ کو ایک اور آزمائش

سے دوچار ہونا پڑا۔ جب وہاں کے ظالم حاکم نے آپ کی بیوی حضرت سارہؓ کو قبضہ میں کرنا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ثابت قدم رکھا۔ اور اس جابر حاکم سے نجات دلائی۔

تیسری آزمائش
بیوی بچے سے
جانی

مصر کے حاکم نے حضرت سارہؓ کو ایک لونڈی دی تھی۔ اگرچہ وہ لونڈی نہیں تھی مگر اس وقت وہ لونڈی کی حیثیت میں تھی۔ حضرت سارہؓ نے ہاجرہ لونڈی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بخش دی۔ اور اس طرح وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی بن گئی۔ شام و فلسطین کے قیام کے دوران حضرت ہاجرہؓ سے بچہ پیدا ہوا۔ جس کا نام امی اسماعیل (علیہ السلام) رکھا گیا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی شہ خوار کی عمر میں تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا۔ کہ اے ابراہیم! اس بچے اور اس کی ماں کو عرب کے دور دراز بیابان وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ آؤ۔ آپ نے حکم کی تعمیل میں بیوی اور بچے کو بھرا لیا۔ اور موجودہ مکہ مکرمہ والے مقام پر پہنچے۔ جو کہ اس وقت بے آب و گیاہ وادی تھی۔ اس مختصر قافلے کے ساتھ کوئی رہان بھی نہیں تھا۔ ایک مشکیزے میں تھوڑا سا پانی اور کچھ کھجوریں تھیں۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے لخت جگر اور بیوی کے پاس چھوڑ کر چلے آئے۔ یہ سارے واقعات آپ سنتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کبھی کبھی جاتے اور اپنے بیوی بچے کی خبر گیری کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بیابان وادی میں زمزم جیسے بہترین پانی کا انتظام فرمادیا۔ پھر وہاں بوجہ ہم قید کے لوگ آباد ہو گئے۔ اور اس طرح وہ دیران اور غیر آباد جگہ بستی میں تبدیل ہو گئی۔

چوتھی آزمائش
بیٹے کی قربانی

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایک اور بڑی آزمائش آئی۔ جب حضرت اسماعیلؑ بارہ تیرہ سال کے ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آگیا۔ کہ اس بچے کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دو۔ اس واقعہ کی تفصیل بھی قرآن پاک کے مختلف مقامات پر آئی ہے۔ آپ کو بار بار خواب آیا۔ آخر آپ نے اس کا ذکر بچے سے کیا۔ بچہ بڑا صابر تھا۔ اس نے جواب دیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر دیں۔ چنانچہ آپ اس کے لیے تیار ہو گئے۔ حتیٰ کہ بیٹے کی گردن پر پھری چلا دی۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی۔ کہ اس نے قربانی بھی قبول کر لی اور بچہ بھی صحیح سلامت نکلا۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جان و مال، اولاد ہر طریقے سے آزمایا۔ اور آپ اس آزمائش میں پستے اترے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس ثابت قدمی پر جو انعامات عطا کیے۔ ان کا ذکر بھی قرآن پاک میں آتا ہے۔

۱ احکام القرآن کے نام سے بہت سے بزرگوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں حلال و حرام سے متعلق قرآنی احکام کی تشریح کی گئی ہے۔ سب سے پہلی تفسیر امام ابو جبر جساًس نے کی ہے۔ یہ حنفی امام ہیں ان کا زمانہ چوتھی صدی ہجری ہے۔ ان کے بعد پانچویں صدی میں امام ابو جبر بن العربی ہوئے ہیں آپ کا تعلق بنی مسلک سے ہے۔ اور آپ کا وطن مالوف اندلس تھا۔ آپ بھی بہت بڑے مفسر قرآن تھے۔ حضرت امام شافعیؒ کی احکام القرآن موجود ہے۔ اگرچہ انہوں نے خود یہ کتاب نہیں لکھی۔ مگر امام بیہقیؒ نے ان کی کتابوں سے متعلقہ تفسیری آیات کو منتخب کر کے علیحدہ کتابی صورت دی ہے۔ آپ چوتھی صدی ہجری کے محدث اور امام ہیں۔ کشف اور سلوک کے بہت بڑے امام شیخ ابن عربیؒ ساتویں صدی میں ہوئے ہیں۔ انہوں نے بھی احکام القرآن کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ انہوں نے حلال و حرام کے مسائل کی بجائے تصوف پر زیادہ مسائل جمع کیے ہیں۔ موجودہ دور میں مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کو بھی احکام القرآن تالیف کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ آپ نے اپنے بعض شاگردوں اور مریدوں کو اس کام کی تکمیل کے لیے کہا۔ چنانچہ احکام القرآن کا ایک حصہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اور دوسرے مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے تالیف کیا اور ایک حصہ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ابھی بقایا ہیں۔ جن کی تکمیل نہیں ہو سکی۔

۲ الغرض امام ابو جبر بن العربیؒ نے اپنی کتاب احکام القرآن میں لکھا ہے: ﴿سورة نجم کی آیت وَابْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّى﴾ کا یہی مطلب ہے کیا تم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خبر نہیں پہنچی جنہوں نے پورا پورا کر دکھایا یعنی اللہ تعالیٰ کی عرف سے جو بھی حکم آیا۔ انہوں نے پورا کیا۔ اور اس طرح ہر آزمائش پر پورے اترے۔ آپ نے اپنا سارا مال مہمانوں اور محتاجوں کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ آپ اکیلے کھانا نہیں کھایا کرتے تھے۔ جب تک کوئی نماز نہ شامل ہو جاتا۔ آپ نے اپنے آپ کو آگ میں ڈالے جانے کے وقت بھی ذرا پس و پیش نہ کیا۔ اپنے قلب کو ہمیشہ رحمان کے سامنے رکھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے وقف کر دیا اور آپ ہر سختی میں کامیاب ہوئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام
امام ان سید

حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ مبارک ہستی ہیں۔ کہ جب ان اٹھانوں میں کامیاب ہوئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے خوش ہو کر انعام مرحمت فرمایا۔ قَالَ اِلٰی جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا میں تمہیں لوگوں کا امام یعنی پیشوا بنانے والا ہوں۔ امام وہ ہوتا ہے جسکی اقوال و افعال میں اقتداء کی جائے۔ اس لحاظ سے تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امت کے امام ہوتے ہیں وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اٰمَةً يُحَدِّثُونَ بِاٰمُرِنَا مَجْمُوعًا حکم سے امت کی رہنمائی کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کا ذکر خیر ہو رہا ہے، وہ ترقی غنیفہ کے بہت بڑے امام ہیں۔ آپ کا لقب ابوالانبیاء ہے۔

آپ تمام بعد میں آنے والے انبیاء علیہم السلام کے باپ اور جد امجد ہیں۔ الغرض تمام آئمہ نشوں میں سے گنتے کے بعد اللہ تعالیٰ نے شہدہ بنایا کر لے ابراہیم! میں تجھے لوگوں کا امام یعنی پیشوا بناتا ہوں۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت کا انعام پایا۔ تو فوراً درخواست پیش کر دی۔ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ عَمِلْ صَالًا مَّا كَرِهَ الْغَالِبُ جس طرح تو نے مجھے منصب

ظالم محروم ہے

امت سے نوازا ہے۔ کیا یہ سلسلہ میری اولاد میں بھی جاری رہے گا۔ کیا میری اولاد بھی اس عمدہ جیل پر فائز ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔ منصب امت صرف اہل ایمان کے لیے ہے۔ قَالَ لَا يَنْكَالُ عَهْدِي الظَّالِمِيْنَ كَفَرًا يَمِيْرًا وَعَدُوًّا لِّلْمُؤْمِنِيْنَ كَيْفَ يَكُوْنُ ظَالِمًا اس قابل نہیں ہوتا کہ اُسے منصب امت عطا کیا جائے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے حصے میں آتا ہے۔ اور یہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو چیز عطا ہوئی۔ وہ نبوت ہے۔ فقہار مجتہدین حکامین وغیرہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے آنکھ نہ کھلنے کے وقت کی مقررہ بھی کنٹر یا شرک کیا ہو تو وہ عمدہ نبوت کا مستحق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو اس قدر پاک رکھتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے علاوہ خلافت اور حکومت والے جو امام ہیں۔ ان میں سے بھی جو کوئی ظالم ہے۔ اس آیت کی رو سے حکومت کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک امت کے قابل وہی لوگ ہیں جو عدل و انصاف کو سر بلند رکھنے والے ہیں۔ کوئی بھی ظالم ہیشوائی کے لائق نہیں ہے۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَاَتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُمَسِّكًا وَّعٰهَدْنَا اِلٰى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعٖلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْقٰئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝۱۲۵
وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَاَرْزُقْ اَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاَمِئْتُهُ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضٰطَرُّهُ اِلَى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۲۶

تس جہرہ د اور اس بات کو دسیان میں لاؤ۔ جب کہ ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے لیے رجوع اور امن کی جگہ بنایا۔ اور ابراہیم (علیہ السلام) کے کھڑا ہونے کی جگہ کو مصلیٰ یعنی نماز کی جگہ بنا لیا۔ اور ہم نے ابراہیم اور اسمعیل (علیہما السلام) کی طرف حکم بھیجا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف بیٹھنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک و صاف رکھو ۝۱۲۵ اور اس بات کو یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے رب! اس شہر کو امن والا بنا دے اور یہاں کے بسنے والوں کو پھلوں سے روزی دے۔ جو کوئی ان میں سے ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا اور جس شخص نے کفر یا میں اُسے سخت دوزخ کا دہ پانچاؤں کا چہرے کشاں کشاں دوزخ کے مذاب کی طرف سے جاؤں گا۔ اور وہ لوٹ کر جانے کی ست بڑی جگہ ہے ۝۱۲۶

گزشتہ
سے
پچھلے
بنی اسرائیل کی خبروں کے تذکرہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت کا ذکر کیا ہے۔ قرآن پاک کی حقانیت بھی بیان ہوئی ہے۔ مگر اس سلسلہ کی بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے شروع ہوئی۔ کیونکہ اگلی آیات میں اس دعا کا

ذکر ہے۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق کی تھی۔ گویا اس سائے سلسلہ کی بنیاد تو وہاں سے شروع ہوئی ہے۔ مگر پہلے قید حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت اور پیشوائی کا ذکر فرمایا ہے آپ پر آنے والی آزمائش کا ذکر آیا۔ اور پھر ان تمام امتحانوں میں آپ کی کامیابی کا بیان بھی آیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو امامت عامہ بھی عطا فرمائی۔ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا اِس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے متعلق بھی دعا کی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا یَنْتَلِ عَهْدِی الظَّالِمِیْنَ مَیْرَ اَعْمَ ظَالِمُوْنَ کُتِبَ بِہِمْ سَیِّئٌ مَّا۔ وہ منصب امامت کے اہل نہیں ہوں گے معلوم ہوا کہ امامت میں سے حصہ اس کو ملے گا۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے نیک اور صالح ہوگا۔ اور کفر و شرک کا مرتکب اس عہدہ سے محروم ہے گا۔

شیعہ امامیہ کا
غلط استدلال

شیعہ امامیہ نے اس آیت سے بہت غلط استدلال کیا ہے۔ انہوں نے حضرت البرہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ آپ صاحبان دعوٰی باللہ امامت کے اہل نہیں تھے۔ کیونکہ زندگی کے پہلے حصہ میں وہ کفر و شرک کے مرتکب ہوئے تھے۔ اور ایمان بعد میں لائے۔ برخلاف اس کے حضرت علیؓ اوائل عمر سے ہی مومن تھے۔ لہذا خلافت کے اہل وہ تھے۔ شیعہ حضرات نے یہ غلط استدلال کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ ابتداء میں کفار میں شامل تھے۔ اسی طرح خالد بن ولیدؓ سَیِّفٌ مِّنْ سَیِّفِوْنَ اللہ، حضرت البر عبیدہؓ، حضرت عباسؓ، حضرت عمرؓ، جنود صلی اللہ علیہ وسلم کے بیچا اور حضرت خلیلؓ اور آپ کے دیگر چچا زاد وغیرہ سب کے سب ابتدائے نبوت کے زمانہ میں اسی سوسائٹی کا حصہ تھے۔ جو مشرکین مکہ کی سوسائٹی تھی۔ مگر جوں جوں اللہ تعالیٰ ان کو سمجھ عطا کرتا رہا۔ یہ اصحاب ایمان کی دولت سے مشرف ہوتے رہے۔ اور اپنے کفر و شرک پر معنی ساقط ہوتے رہے۔ تا تب ہو گئے۔ اس ضمن میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَہٗ گناہ سے توبہ کرنے والا بالکل اسی طرح ہو جاتا ہے۔ گویا کہ اس نے کوئی گناہ

کیا ہی نہیں۔ حضور علیہ السلام کا یہ بھی ارشاد ہے۔ **اَلْاِسْلَامُ كَيْفَ فَرَمَا كَانَ قَبْلَهُ لَدُنَّ** لانے کے بعد مومن کے سابقہ تمام گناہ مٹ جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے تمام صلی بہ کرامؑ۔ اسلام کی دولت سے مالا مال ہو کر سابقہ تمام گناہوں سے پاک و صاف ہو گئے۔ لہذا اس کے باوجود ان پر کفر و شرک کا الزام لگانا قبیح حرکت ہے۔ اور مذکورہ آیت کریمہ سے غلط استدلال ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امت کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کا تذکرہ بیان فرمایا۔ **وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمِّنًا** اس بات کو خیال میں رکھو جب ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے لیے مٹا اور امن والا بنایا۔ بیت اللہ سے مراد خانہ کعبہ ہے۔ اور مٹا بہ کے دو معنی آتے ہیں۔ پہلا معنی لوٹنے کی جگہ ہے۔ ظاہر ہے کہ لوگ یہاں بدبار آتے ہیں۔ لوگوں کا ذوق و شوق انیس دنیا کے کونے کونے سے اللہ تعالیٰ کی عبادت و عبادت کے لیے کھینچ کھینچ کر لاتا ہے۔ دباں پر ایک مرتبہ پہنچ جانے والا سیراب نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا ذوق و شوق اور بڑھ جاتا ہے۔ اور اس کی خواہش ہوتی ہے۔ کہ کسی طرح دوپھر وہیں پہنچ جائے۔ **مَثَابَةً** کا یہی معنی ہے۔ اور اس ضمن میں تعلیم بھی یہی دی گئی ہے کہ حاجی طوافِ دراع کے وقت یہ دعا مانگے۔ اے اللہ! یہ میرا آخری عہدہ ہو بلکہ مجھے پھر بھی موقع دے کہ میں تیرے گھر کی زیارت کروں۔ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کو **هُدًى لِّلْعَالَمِينَ** یعنی دنیا بھر کے لیے ہدایت کا مرکز بنایا ہے۔ سورۃ آل عمران میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

مَثَابَةً کا دوسرا معنی "ثواب کی جگہ" ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ اس مقدس مقام پر جس قدر ثواب حاصل ہوتا ہے۔ وہ کسی دوسری جگہ پر نہیں ملتا۔ ابن ماجہ شریف کی روایت میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان موجود ہے۔ مسجدِ حرام یعنی حرم شریف میں ایک نماز پڑھنے کا ثواب دوسری جگہ پر ایک لاکھ نماز کے ثواب کے برابر ہوتا ہے اور جو شخص بیت المقدس یا مسجد نبوی میں ایک نماز ادا کرتا ہے۔ پچاس ہزار نمازوں کا ثواب پاتا ہے۔ بہر حال یہاں پر مٹا بہ کے دونوں معنی ہیں یعنی مرکزِ ہدایت اور ثواب کی جگہ۔

اور یہ بھی فرمایا کہ جس نے بیت اللہ شریف کو امن والی جگہ بنایا: ظاہر ہے۔ جو شخص ایسی حالت میں پہنچ جاتا ہے۔ اُسے آخرت کے عذاب سے امن مل جاتا ہے۔ اور ظاہری طور پر بھی جو کوئی احرام کی حالت میں وہاں جاتا ہے۔ اس کو پناہ حاصل ہو جاتی ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا: مَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا

ہم اے اہم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: کہ اگر کوئی مجرم حرم میں داخل ہو جائے۔ تو اس کے خلاف تعزیری کارروائی حرم میں بھی جائز ہے۔ اُسے حرم سے باہر نکالا جائے گا۔ اور پھر مد جاری کر دی جائے گی۔ بعض دوسرے آئمہ فرماتے ہیں: کہ اگر کوئی قاتل جیسا بڑا مجرم بھی حرم میں داخل ہو جائے تو اُسے وہاں کچھ نہ کہو ہاں اس کا دانا پانی بند کر دو۔ جب مجبور ہو کر خود ہی مدود حرم سے باہر آئے تو اس پر مد جاری کر دی جائے۔ گویا یہ مقام ظاہری طور پر بھی گمراہ امن ہے۔

مقامِ ابراہیم

بیت اللہ شریف کے ضمن میں مقامِ ابراہیم کا ذکر فرماتے ہوئے فرمایا: وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُّمَلِّينَ اور ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو — نماز کی جگہ بناؤ۔ مقامِ ابراہیم سے مراد کوئی کمرہ نہیں ہے۔ جہاں آپ نماز ادا فرمایا کرتے تھے بلکہ یہ وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ شریف کی تعمیر کی تھی۔ آپ کے پاؤں مبارک کے نشانات اس پتھر پر اب بھی موجود ہیں۔ یہی وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کھڑے ہو کر حج کا اعلان کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا تھا: وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ اے ابراہیم! لوگوں میں اعلان کر دو کہ اللہ تعالیٰ کا گھر تعمیر ہو چکا ہے۔ اس کاج کرنے کے لیے آؤ۔ تفسیر مدارک میں آتا ہے: کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا: پروردگار! میری آواز کون سنے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: امتارا کام اعلان کرنا ہے۔ میں اس آواز کو تمام نسل انبی کی پشتوں پہ پہنچا دوں گا۔ جن کی قسمت میں بیت اللہ کاج مقدر ہے۔ ان تک آپ کی آواز پہنچے گی۔ بہر حال مقامِ ابراہیم وہ پتھر ہے جس کے متعلق فرمایا کہ اس کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ۔

سنت عمرؓ کی فضیلت کے باب میں حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپؐ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ تم شیساں پر نماز پڑھنے کا حکم ہو۔ تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت فرمائی: **وَتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّیً ۖ**

مقام ابراہیم تقریباً چودہ انچ مربع چھوٹا سا پتھر ہے۔ تورہ بت اللہ شریف کے قریب ہی تعمیر کعبہ کے وقت سے پڑا ہے۔ اور یہ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی دو ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ اس چھوٹے سے پتھر کو تسلی بنا کر اس کے اوپر تو نماز نہیں پڑھی جاسکتی۔ تاہم اس سے مراد یہ ہے کہ پتھر کے قرب و جوار میں نماز ادا کی جائے۔ چنانچہ ہر طواف کرنے والا طواف کے صلت چکر پلے کرنے کے بعد دو رکعت مقام ابراہیم کے قریب ادا کرتا ہے۔ اگر اس کے بالکل قریب جگہ نہ ملے تو پیچھے کہیں بی دو رکعت واجب الطواف ادا کر لیے جاتے ہیں۔

اہم عظیم البوصیضہ کے نزدیک عواف کے دو رکعت واجب ہیں۔ جب کہ دوسرے کمرہ کرام اُسے سنت کہتے ہیں۔ بہر حال اس مقام پر نماز پڑھنے کی بہت زیادہ فضیلت ہے۔ پہلے یہ پتھر ایک چوڑے پر رکھ دیا تھا۔

مگر موجودہ حکومت نے مقام ابراہیم کے چوڑے اور زمزم کے چوڑے کو ہٹا دیا ہے۔ اور اب مقام ابراہیم شیشے کے ایک غوبہ بند کر دیا گیا ہے۔ اور اس کے اوپر پیل کی خوبصورت جالی لگا دی گئی ہے۔ اور اس طرح بت کی دہری حفاظت کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ اگر کسی جسے ایک خول و نقصان پہنچے تو کم از کم وہ راقہ مذہب ہے۔ حکومت سعودیہ نے لاکھوں دیال کے خرچ سے حفاظت کا یہ انتظام کیا ہے اب مقام ابراہیم دورے تو نظر نہیں آتا۔ مگر جالی کے قریب کھڑے ہو کر دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے۔ کہ اس پر حضرت

ابراہیم علیہ السلام پاؤں کے نشان موجود ہیں۔ یہ پورا دھماکہ باب تمت سے ٹھوڑے فاصلے پر مطاف میں رکھا ہوا۔ عام ایام میں تو طوافین مقام ابراہیم اور بیت اللہ شریف کے درمیان ہی چلتے ہیں مگر ایام حج میں جوں جوں ریش بڑھتا ہے۔ ہر ایک طواف کرنے والوں کے درمیان میں آجاتا

یعنی مشرکین پیہ میں ان کے دلوں پر شرک کی نجاست پڑی ہوئی ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ دل و دماغ کفر، شرک، بدعت و دیگر خرافات سے پاں و درختہ توجیہ پر صحیح طریقے سے ایمان ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام صحت فرماتے ہیں کہ ملت کو پایہ کی بھی ضروری ہے۔ ہماری ملت میں کفر، شرک و بدعت کی جو کنگری سرایت کر چکی ہے۔ اس سے بچ بچھڑانا بھی ضروری ہے۔ گندے عھدہ نے پوری ملت کو ناپاک کر رکھا ہے۔ لہذا انفرادی طہارت کے ساتھ ساتھ اجتماعی پاکیزگی کی بھی ضرورت ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام
کی خصوصیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بہت سی خصوصیات ہیں۔ صحیح احادیث میں آیت ہے کہ آپ سب سے پہلے شخص اول من احدثن میں جنہوں نے غنم یا۔ تفسیری روایتوں میں یہ بھی آیت ہے کہ نبیاء علیہم السلام تختون پیدا ہوتے ہیں۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام ایسے نہیں ہوئے۔ انہیں کسی سال کی عمر میں غنم کا حکم ہوا۔ چنانچہ تادم کے مقام پر انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے سنتِ تطہیر ادا کی۔ اب ہم یہ سب کہ جو شخص مسلمان ہو جائے اُسے چاہیے کہ یہ سنت ادا کرے، خواہ عمر کے کسی حصے میں ہو گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے انسان ہیں جن کی دہمعی میں سفید بال نکلنے شروع ہوئے۔ آپ سے پہلے کسی انسان کے ساتھ ایسا نہیں ہوا سب کی دہمعی سیاہ ہی۔ مگر آتی تھی۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام جوانی سے نکل کر بڑھاپے میں داخل ہوئے۔ تو سفیدی دیکھ کر عرض کیا۔ مولا کریم! یہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ وقار ہے۔ آپ نے پھر عرض کیا۔ اے اللہ! زدنی وقاراً میری اس عزت کو ور بڑھاؤ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اللہ کریم کی وحی آئی کہ اے ابراہیم! انت اکرم اھل الارض الی آپ میرے نزدیک روئے زمین کے تمام انسانوں سے برگزیدہ ہیں۔ جب آپ نماز ادا کرتے وقت حالت سجدہ میں ہوتے ہیں تو آپ کا سر نہیں گھٹنا چاہیے۔ چنانچہ سب سے

۱۔ اللہ الرحمن فی تفسیر القرآن ج ۱ ص ۲۶۵ ۲۔ تفسیر عزیزی ص ۲۲۹ پ

۳۔ تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۲۹ ۴۔ تفسیر عزیزی ہندی ص ۲۲۹ ۵۔ تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۲۹ پ

پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پا جا رہا تھا۔ اگرچہ تہ بند پہنا بھی درست ہے۔ تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پا جا رہا بھی پہنا کر دو۔ اور تہ بند بھی باندھا کر دو۔ یہود تہ بند نہ باندھتے تھے۔ آپ نے دونوں چیزوں کی بابت فرمائی۔ آپ نے پا جائے کی تعریف فرمائی ہے۔ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینے کا ذکر کسی صحیح حدیث میں نہیں آیا۔ تاہم پا جا رہا ضرر پہننے کا ذکر آتا ہے۔

ابن ابی شیبہ کی روایت میں آتا ہے کہ مہاجر پکھڑے ہو کر سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خطبہ دیا۔ اور دھیمی کی روایت میں ہے کہ مہانوں کی خاطر سب سے پہلے آپ نے نان شیر مال تیار کیا۔ یہ کھانا دودھ اور نان کے مرکب سے تیار کیا جاتا ہے۔ بمائے ہاں برصغیر میں حیدر آباد دکن اور کھنڈوا لے بڑے شوق سے تیار کرتے ہیں۔ اور مہانوں کو پیس کر دیتے ہیں۔ بڑی لذیذ چیز ہے اسی طرح معافیت کا طریقہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جاری ہوا۔ جب کوئی شخص باہر سے آتا تو آپ اس سے گلے ملتے۔

معافیت کا
پس منظر

کہتے ہیں کہ بیت المقدس کے قریب حضرت ابراہیم علیہ السلام جانوروں کی چراگاہ کی تلاش میں کسی پہاڑ کے اندر تک چلے گئے۔ انہوں نے ایک مقام پر نہایت غناک آواز سنی۔ کوئی شخص نہایت خشوع و خضوع سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا تھا۔ آپ اُدھر متوجہ ہوئے۔ تو دیکھا کہ ایک ضعیف عمر شخص اپنے حال میں محو ہے۔ آپ نے اس بڑے شخص سے دریافت کیا کہ تم کس کو یاد کر رہے ہو۔ اُس نے کہا اللہ تعالیٰ کو۔ آپ نے پوچھا تمہارا اللہ کہاں ہے۔ اُس نے جواب دیا آسمان پر ہے۔ فرمایا زمین پر بھی وہی خدا ہے۔ پھر آپ نے پوچھا تمہارا قبلہ کدھر ہے۔ تو بڑھے نے بیت اللہ شریف کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے پوچھا تمہارا ٹھکانا کہاں ہے۔ اُس نے جواب دیا نیچے اسی غار میں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بڑھے کا ٹھکانا دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ تو بڑھے نے کہا کہ وہاں جانا محال ہے۔ کیونکہ راستے میں گہری ندی پڑتی ہے۔ جسے عبور نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کاتم کیسے پہنچ جاتے ہو۔ تو اُس نے جواب دیا خرق عادت

کے طور پر چلا جاتا ہوں۔ یہ ایک کرامت ہے۔ جس کی وجہ میں خشک پاؤں مذی کو عبور کر لیتا ہوں
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا جو ہم بھی اسی طریقے سے چلتے ہیں۔ جو خدا تمہارے لیے پانی کو مسخر
کرتا ہے۔ وہ میرے لیے بھی کرے گا۔ چنانچہ دونوں پل میسے۔ غار میں اترے تو آگے مذی تھی۔
اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُسے عبور کر لیا۔ اور آپ کے پاؤں تک نہیں بھیگے۔ پانی کے نیچے آپ
اُس شخص کے عبادت خانے میں پہنچے تو دیکھا کہ اس کی نشاندہی کے عبادت خانے کا رخ واقعی بیت اللہ
شریف کی طرف تھا۔ آپ بہت خوش ہوئے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں یہ خدا پرست انسان ہے۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے بزرگ ریا و کر سب سے خوفناک دن کون سا ہے۔
تو اس نے جواب دیا کہ جس دن اللہ تعالیٰ کرسی عدالت پر بیٹھے گا۔ اور بنی اور اللہ تعالیٰ کے
سب مقرب لڑ رہے ہوں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہم
دونوں کو اس دن کے خطرات سے محفوظ رکھے۔ بوڑھا کہنے لگا۔ کہ مجھے دعا کرتے ہوئے تین
سال ہو گئے ہیں مگر میری دعا قبول نہیں ہوئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا کہ تمہاری
دعا کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں اس پہاڑ میں گیا۔ تو مجھے ایک نوجوان ملا جس کے بال بکھرے ہوئے
تھے۔ میں نے اُس سے پوچھا تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ اُس نے جواب دیا۔ کہ اللہ تعالیٰ کے
دوست ابراہیم علیہ السلام کے جانوروں کے لیے چراغ تلاش کر رہا ہوں۔ بوڑھا کہتا ہے کہ اس
دن سے میں یہ دعا مانگ رہا ہوں کہ اے مولا کریم! اگر دنیا میں تیرا کوئی خلیل ابراہیم علیہ السلام
بھی ہے۔ تو مجھے اس کی زیارت نصیب فرما۔ مگر آج تک میری یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ حضرت
ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا بڑے میاں! اللہ تعالیٰ نے تیری دعا قبول فرمائی ہے اٹھو اور میرے
ساتھ نہالنے کرو۔ چنانچہ معلقے کا طریقہ وہاں سے جاری ہوا۔

حج کی فضیلت

بیت اللہ شریف کی تعمیر کا تذکرہ آگے آئے گا۔ پہلے کعبۃ اللہ اور حج کی فضیلت کے متعلق
کچھ بیان ہوگا۔ صحیح احادیث میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ
کی رضا اور اس کے حکم کی تعمیل میں حج کیا۔ تو وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے۔ گویا کہ

وہ آج ہی پیدا ہوا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ بیت اللہ شریف پر ہر روز ایک گیس ریتیں نازل ہوتی ہیں۔ ان میں سے ساٹھ طواف کرنے والوں پر، چالیس دیگر عبادت کرنے والوں پر اور بیس اُن لوگوں پر نازل ہوتی ہیں۔ جو بیت اللہ شریف کی طرف دیکھتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: **النَّظَرُ إِلَى الْكُفَّةِ عِبَادَةٌ** یعنی بیت اللہ شریف کی طرف دیکھنا بھی عبادت ہے۔ البتہ طواف کے دوران کعبہ کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ بلکہ طواف سے فاصلہ ہو کر نہایت ذوق و شوق اور محبت سے بیت اللہ شریف کی طرف دیکھنا چاہیے۔ صحیح روایت میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حجر اسود جنت کے یا قوتوں میں سے ایک یا قوت ہے۔ یہ پتھر بہشت سے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے نور کو مٹا دیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو سورج کی طرح یہ مشرق و مغرب کو روشن کرتا۔

طواف کا
مجدد ثواب

تاریخ از رقی میں آتا ہے کہ طواف کی نیت سے گھر سے چلنے والا شخص ایسا ہے۔ جیسے کہ وہ دیارے رحمت میں چنا شروع کر دیتا ہے۔ جب مطاف میں پہنچتا ہے۔ تو گویا رحمت کے دریا میں غوطے لگاتا ہے۔ اور جب طواف شروع کرتا ہے۔ تو ہر قدم اٹھانے کے عوض اُسے پانچ سو نیکیاں مل جاتی ہیں۔ اور جب قدم نیچے رکھتا ہے۔ تو ہر قدم کے بدلے پانچ سو گناہ مٹ جاتے ہیں۔ اور جب وہ شخص طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیمؑ تک آتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے کہتے ہیں کہ اے بندے! تیرے سابقہ گناہ تو دھل گئے۔ اب آئندہ زندگی میں محتاط رہو۔ اعمال صالحہ انجام دیتے رہو۔ اس نئے میرے اچھی زندگی کا آغاز کرو۔

حرم پاک

حرم پاک کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرمت والا خطہ بنایا ہے۔ کسی کے لیے اس میں لڑائی کرنا حلال نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ فتح مکہ کے دن تھوڑی دیر کے لیے صرف میرے لیے حرم میں لڑائی حلال ہوئی تھی۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد حرم شریف میں لڑائی قطعاً حرام ہے۔ یہ خطہ ہمیشہ محترم ہے اور امن والا شہر ہے۔ چنانچہ یہاں پر

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ
 جب ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا اے مولا کریم! اس شہر
 کو امن والا بنائے۔ دوسرے مقام پر هَذَا الْبَلَدَ کا لفظ آتا ہے۔ گویا یہ ابھی کھلی جگہ بنے
 شہر آباد نہیں ہوا، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کی سرمت کی دعا کر رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم کی
 روایت میں آتا ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق سے در ہزار سال پہلے بیت اللہ شریف دالی زمین کو
 اللہ تعالیٰ نے تیار کیا۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ کے فرشتے عبادت کرتے تھے۔ وہاں پر ایک
 پردہ سا اٹھا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ کو پوری دنیا کا مرکز قرار دیا۔ اور پھر اسی جگہ سے تمام زمین
 کو پیدا کیا۔ گویا یہ مقام ساری زمین کا وسط (وسط البلد) ہے۔ یہ جوری نے اپنی شرح شامل میں
 لکھا ہے۔ جس شخص کو بخیر مچوتی ہو۔ اس کی پیشانی پر کچھ دیا جائے الْعَمَلَةُ وَسُطُ الْبَلَدِ وَاللَّهُ
رَؤُفٌ بِالْعِبَادِ تو اس کی عمر بڑھ جائے گی۔

فرمایا اے اللہ اس شہر کو امن کا گہوارہ بنائے۔ وَأَرْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ اے اللہ اس
 کے بننے والوں کو پھلوں سے روزی دے۔ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ جو
 کوئی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے قَالَ وَمَنْ كَفَرَ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس نے کفر کیا فَأَمْتَعْنَاهُ
فَلْيَدَّ اِسْرَافُهُ افسوس! فائدہ پہنچاؤں گا۔ ثُمَّ اَصْطَرَفْنَاهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ پھر اسے کشاں
 کشاں دوزخ کی طرف بجاؤں گا۔ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ ثُمَّ اَصْطَرَفْنَاهُ
 فائدہ سے مڑ دیا ہے۔ کہ دنیا کی زندگی میں تو ممکن ہے کہ کافر بھی آدم سے رہیں۔ لیکن اس کے
 بعد انہیں بہر حال دوزخ میں جانا ہوگا۔ مگر اہل ایمان کو دونوں چیزیں حاصل ہوں گی دنیا میں امن بھی
 نصیب ہوگا۔ اور آخرت میں نجات بھی حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا
 کو قبول فرمایا۔ چنانچہ عرم پاک اور شہر مکہ کی خیر و برکات کا سلسلہ جاری ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔

الْعَا

البقرة ۲

درس پنجاہم

(آیت ۱۲۷ تا ۱۲۸)

وَذِيذُ رَفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاسْمَعِيلُ رَبَّنَا
 تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ
 لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاِرنَا مَنَاسِكَ وَتَبَّ
 عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۱۲۸﴾

ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم اور اسمعیل (علیہما السلام) بیت اللہ
 شریف کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ اور دونوں کہتے تھے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم سے
 قبول فرمائے کہ تو سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۱۲۷﴾ اے پروردگار! بنائے ہم
 دونوں کو اپنی فرمانبرداری کرنے والے۔ اور بنائے ہمارے اولاد میں سے بھی ایک
 اپنی فرمانبرداری امت۔ اور بتلا ہم کو ہمارے احکام۔ اور ہمارے اوپر رجوع فرما مہربانی کے
 ساتھ۔ بے شک تو ہی رجوع فرمانے والا اور از حد مہربان ہے ﴿۱۲۸﴾

رہنمائی

اس آیت کا تعلق سابقہ درس کی آیت مبارکہ ﴿وَلَا تُدْرِكُهُ الْبَصَرُ وَلَا دُجِلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ﴾
 کے ساتھ ہے۔ وہاں پر تھا کہ اُس بات کو یاد کرو جب ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے
 رجوع کی جگہ، مرکزِ ہدایت اور جائے امن بنایا۔ اس کے ساتھ مقام ابراہیم کا ذکر ہوا۔ بیت اللہ شریف
 کو پاک و صاف رکھنے کا حکم ہوا۔ وہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا ذکر بھی تھا۔ جس میں بایں
 شکر کہ کے یہ بھلوں کی روزی طلب کی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو شرف قبولیت بخشا
 جسے ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔

تاریخ کتبہ

آیت زیر درس میں بیت اللہ شریف کی تعمیر کا ذکر ہے۔ یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام
 کے فضائل میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کی تعمیر آپ کے ہاتھوں سے
 کرائی چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿وَلَا ذِيذُ رَفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ
 وَاسْمَعِيلُ وَدٰكُسٰى مَبٰرَكٌ مَّحْمُوْدٌ﴾ جب ابراہیم اور اسمعیل علیہما السلام یعنی باپ بیٹا اپنے

مبارک ہاتھوں سے بیت شریف کی بنیادیں اٹھائے تھے۔ بعض دوسری احادیث میں آتا ہے کہ بیت اللہ شریف کی ابتدا کی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے کی تھی۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام سے دریافت کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے اولین گھر کی تعمیر کا ذکر آیت **بِأَنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا** میں آیا ہے۔ اس آیت میں لفظ کتبہ استعمال ہوا ہے۔ مگر کتبہ اور مکہ ہم معنی الفاظ ہیں۔ تورات میں کتبہ کا ذکر بھی آتا ہے۔ اے اُمّ القریٰ بھی کہتے ہیں۔ گویا دنیا میں اللہ تعالیٰ کا سب سے پہلے تعمیر ہونے والا گھر بیت اللہ شریف ہے۔

صحابہ کرامؓ نے عرض کیا، حضور! اس کے بعد کون سا گھر تعمیر ہوا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا، بیت المقدس۔ نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ بیت اللہ اور بیت المقدس کی تعمیرات میں چالیس سال کا وقفہ ہے۔ یہاں پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں تو بہت زیادہ فرق ہے۔ پھر دونوں گھروں کی تعمیر میں صرف چالیس سال کے وقفہ کا کیا مطلب؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس تعمیر سے مراد حضرت ابراہیم اور حضرت داؤد علیہما السلام والی تعمیرات مراد نہیں بلکہ ان دونوں گھروں کی اولین تعمیرات مراد ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں انجام پائیں۔ اس کے بعد حضرت نون علیہ السلام کے زمانے کا طوفان آیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی سیلاب آئے۔ جن میں بیت اللہ شریف کی عمارت بہ گئی۔ اور وہاں پر صرف ایک ٹیلہ سا باقی رہ گیا، عمارت منہدم ہو گئی۔ پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی دوبارہ تعمیر کا حکم دیا۔

قرآن پاک کے لفظ **قَوَاعِدَ** سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ یہ اس عمارت کی اولین تعمیر نہیں تھی۔ بلکہ یہ عمارت اپنی اصل بنیادوں پر دوبارہ اٹھانی جا رہی تھی۔ چونکہ اس وقت عمارت کے کوئی نشانات باقی نہ تھے۔ صرف ایک ٹیلہ سا باقی تھا۔ تو عمارت کی اصل بنیادوں کی نشاندہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بادل کا ایک ٹکڑا بھیجا جس نے اس اصل ٹیلہ پر سایہ کر کے اس کا تعین کر دیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مجھ گئے کہ بیت اللہ شریف کا اصل مقام یہ ہے چنانچہ

آپ نے اسی جگہ پر دوبارہ تعمیر شروع کی۔ اُس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر مبارک چودہ سال کی تھی۔

خبر گیری کیلئے
حضرت ابراہیم علیہ السلام
کی آمد و رفت

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت سارہؑ شام و فلسطین میں تھے۔ جب کہ حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیل علیہ السلام حجاز میں تھے۔ آپ ایک سال دو سال میں ایک مرتبہ آکر بیوی بچے کی خبروں کرتے۔ تاہم آپ کی بیوی سارہؑ کی یہ شرط تھی کہ آپ بیوی بچے کی خبر گیری کے لیے قیس وقت کے لیے جاسکتے ہیں۔ ان کے پاس رات کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہوئی۔ اس عرصہ میں حضرت ہاجرہؑ کا انتقال ہو گیا۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے قبیلہ بنو جہم میں نکاح کر لیا۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹے کی خبر گیری کے لیے آئے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام گھر پر موجود نہیں تھے۔ انہوں نے ان کی بیوی سے دریافت کیا۔ تو اس نے بتایا کہ کہیں شکار کے لیے گئے ہوتے ہیں۔ آپ نے گھڑان اوقات کے بارہ میں پوچھا تو اس عورت نے کہا کہ ذریعہ حاش کوئی نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے گزرا اوقات ہو رہا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کوئی کام نہیں کرتے۔ اس لیے فاقے آتے ہیں۔ یہ شکایت سن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ جب تیرا شوہر آئے تو اسے میرا سلام کہنا اور ساتھ یہ پیغام بھی دینا کہ وہ اپنے گھر کی چوکھٹ بدل دیں۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام شکار سے واپس آئے تو انہیں باپ کی آمد کی خبر و بکت معلوم ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے بیوی کے بتانے سے پہلے خود ہی پوچھ لیا کہ میرے بعد کون آیا تھا۔ بیوی نے بتایا کہ ایک بوڑھا آدمی آیا تھا۔ اُس نے مال احوال پوچھا تو میں نے سب احوال بتا دیے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پھر دریافت کیا کہ وہ کوئی پیغام بھی دے گئے ہیں۔ تو بیوی نے کہا کہ ہاں۔ وہ کہہ گئے ہیں کہ اپنے گھر کی چوکھٹ تبدیل کر دو۔ آپ پیغام کا مطلب سمجھ گئے۔ چنانچہ بیوی کو الگ کر دیا۔ اور بتایا کہ اب میں تمہیں گھر میں نہیں رکھ سکتا۔

اس کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام نے درس و تدریس کیا۔ کئی سال بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام

دوبارہ تشریف لائے۔ اتفاق سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پھر گھر میں موجود نہیں تھے۔ اُن کی بیوی موجود تھی۔ آپ نے اُس سے گھر کے حالات دریافت کئے۔ اُس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے گھر کے حالات بہت اچھے ہیں۔ میرا خاندان بھی بڑا اچھا آدمی ہے۔ نیک سیرت اور عبادت گزار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میں رزق بھی دیا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام شکار جی کرتے ہیں۔ گزر اوقات بھی بڑی اچھی جو رہتی ہے۔ اس عورت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سواری سے اترنے کی درخواست کی تاکہ آپ کی خاطر تواضع کر سکے۔ مگر آپ نے کہا کہ میں نے گھر مانا نہیں ہے ہاں جب تمہارا خاندان آئے۔ تو اُسے میرا یہ پیغام دینا کہ تمہارے مکان کی تو کھٹ بہت اچھی ہے اُسے تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ یہ پیغام دے کر چلے گئے۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام گھر واپس آئے۔ تو بیوی نے پیغام دیا۔ آپ نے فرمایا وہ میرے باپ تھے۔ اور یہ پیغام دے گئے ہیں کہ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں۔

یہ واقعہ بھی تفسیری روایتوں میں موجود ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قیسری مرتبہ مکہ معظمہ آنے کا ارادہ کیا۔ تو اپنی بیوی حضرت سارہ سے طے کر لیا کہ اس دفعہ میں کچھ عورتوں کے ساتھ نہ جاؤں گا۔ چنانچہ یہ ان ایام کا ذکر ہے کہ آپ کریمت اللہ شریف کی تعمیر کا کام ہوا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ خانہ کعبہ کی اصل بنیادوں کی نشاندہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بارل کے ایک نعرے کو مقرر کیا۔ اور اس طرح باپ بیٹے نے بیت اللہ شریف کی تعمیر کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مقام ابراہیم پر گھر لے کر دیواریں بنیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام آپ کے لیے گارا اور پتھر لاتے رہے۔ اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کی تعمیر کے بعد جب یہ عمارت طوفانی نوح کی نذر ہو گئی تو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ہاتھوں دوبارہ تعمیر ہوئی۔ کہتے ہیں کہ یہ عمارت ذی قعدہ میں شروع ہو کر ذی الحجہ میں تقریباً ایک ماہ میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔

بیت اللہ شریف کی تعمیر مذکور کے بعد دوبارہ تعمیر قصی بن کلاب کے زمانے میں ہوئی جو حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد تھے۔ حضور علیہ السلام نے اپنے زمانہ مبارک

تعمیر کے مختلف
ادوار

میں بیت اللہ شریف کی عمارت پھر بوسیدہ ہو چکی تھی۔ چنانچہ قریش مکہ نے چندہ جمع کر کے بیت اللہ شریف کو دوبارہ تعمیر کیا۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر بارہ پینیس برس تھی۔ گویا یہ تعمیر آپ کی بعثت کے پانچ برس قبل ہوئی۔ کہتے ہیں کہ رسالہ مکہ نے طے کر لیا تھا کہ اس مقدس تعمیر میں پاک لال استعمال نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ پاک و صاف اور حلال مال سے جو چندہ جمع ہوا وہ پورنی عمارت کی تعمیر کے لیے کافی تھا۔ لہذا عظیم والاسات ہاتھ کا حصہ چھوڑ کر باقی عمارت پر بیت اللہ تعمیر کر دیا گیا۔ اسی موقع پر حجر اسود کی تنسیب کا مجوزہ اٹھا ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا فیصلہ حضور عید السلام کے مبارک وقتوں کے اس طرح کر دیا کہ سارے لوگ خوش ہو گئے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ نبوت میں بیت اللہ شریف کی تجدید نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ تو سرمایہ کی کمی تھی۔ اور دوسری یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں اس کو دوبارہ تعمیر کر آؤں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرز پر کرتا۔ اور اس وقت عمارت میں تغیر و تبدل کرنا مناسب نہیں تھا۔ نیز یہ کی وفات کے بعد حجاز میں نوسال تک حکومت حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس رہی، حجاز، مکہ، مدینہ اور طائف وغیرہ آپ ہی کے زیرِ نگرانی تھے۔ اُس زمانہ میں آپ نے بیت اللہ شریف کو دوبارہ تعمیر کیا۔ اور آپ نے یہ عمارت ابراہیمی بنیادوں پر قائم کی یعنی حطیمہ کو خانہ کعبہ میں داخل کر لیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت کے بعد حجاج بن یوسف نے عبدالملک بن مروان کے حکم پر عمارت کی تجدید کی اور حطیمہ کو پھر باہر نکال دیا۔

ہارون الرشید نے اپنے زمانے میں حطیمہ کو پھر شامل کر کے از سر نو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت اہم مالک نے اُسے ایسا نہ کرنے کی درخواست کی۔ آپ کا نظریہ یہ تھا کہ ایسا کرنے سے یہ مقدس گھر آئندہ آنے والوں کے لیے کھلونا بن جائے گا۔ چنانچہ ہارون الرشید نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے بعد ترکوں کے عہد میں سلطان مراد خان کے زمانے میں بیت اللہ شریف کی تعمیر کی تجدید ہوئی۔ یہ سلسلہ کا واقعہ ہے۔ موقوفہ عمارت وہی ترکوں کی تعمیرِ مجدد ہے۔ اب تک بیت اللہ کی عمارت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ موجودہ سعودی حکومت کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے کہ انہوں نے بھاری رقم خرچ کر کے اس کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ اور زائرین کے آرام و سہولت کے لیے بڑے

بڑے — منصوبوں پر کام کیسے ہے ۔

الغرض جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو ساتھ ساتھ نہایت مخلصانہ انداز میں دعا بھی کہہ رہے تھے۔ رَبَّنَا قَبِّلْ لَنَا اے ہمارے پروردگار! ہم سے یہ خدمت مقبول فرما لے إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ بیشک تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ تو دعا کو مستجاب بھی ہے۔ اور ہمارے اخلص کو بھی جانتا ہے۔ لہذا ہمارے عمل کو قبول فرما لے۔

ظاہر ہے کہ قبولیت کے بغیر ہر عمل بیکار محض ہے۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے کہ ہمارا عمل قبول ہو جائے۔ ہر مومن کی بھی یہی مناجات ہوتی ہے کہ اے اس کی نیکی بارگاہِ رب العزت میں مقبول ہو جائے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ اگر مجھے علم ہو جائے کہ میری دو رکعت نماز قبول ہوگئی ہے۔ تو میں اس کے ہاتھ میں دنیا و دنیا کی ہر چیز کو خیر اداوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قبولیت کا جو معیار مقرر فرمایا ہے وہ بہت بلند ہے إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ اور گھمرو! اللہ تعالیٰ متقیوں کے اعمال کو ہی قبول فرماتا ہے۔ نیکی اُسی کی مقبول ہوگی جس کا دل تقویٰ سے معمور ہے۔ اگر تقویٰ سے خالی ہے۔ دل میں کفر، شرک، نفاق اور ریاکاری پھرتی ہوئی ہے۔ تو کوئی عمل بھی قبول نہیں ہوگا۔ قبولیت کا معیار خلوص اور تقویٰ ہے۔

اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام اگرچہ چھ دو سال کے نیکے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے نیکی اور تقویٰ کی دولت ابتداء سے زندگی سے ہی ردیعت کر دی تھی۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں باپ بیٹا کے عمل کو شریعت قبولیت بخشا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام بڑے بزرگ رسولؐ بنیت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف سورتوں میں آپ کی تعریف کی ہے۔ آپ صاحب شریعت رسول ہوئے ہیں۔ تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی متعدد بیویاں اور بارہ بیٹے تھے۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ایک بیٹے کی نسل سے اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے خاندان پیدا کیے۔ آپ کا سب سے بڑا بیٹا نابت تھا۔ اور سب سے چھوٹا قیدار تھا۔ کہ

بعد بیت اللہ شریف کی ترویث آپ کے بڑے بیٹے نابت کو ہی ملی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں بڑے کو اتنی فضیلت بخشی۔

قبولیت دعا
کی شرائط

ترمذی شریف کی حدیث میں نبی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے ——— وَتَقْبَلُ صَلَوةٌ
بَعْدَ طَهْرٍ طَهُورٍ یعنی اللہ تعالیٰ طہارت کے بغیر کسی نماز کو قبول نہیں ———

فرماتے۔ گویا نماز کی قبولیت کے لیے طہارت بمنزل شرط کے ہے۔ پاکیزگی کے بغیر کتنی نمازیں پڑھو
قیام کرو۔ رکوع و سجود کرو۔ کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح دیگر نیکیوں کی شرط بھی ایمان اور اخلاص ہے۔
اس کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں۔ اسی طرح بعض برائیاں ایسی ہیں جن کے ارتکاب سے نیکیاں مردود
ہو جاتی ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ایک مرتبہ شراب نوشی کرنے والے کی چالیس دن تک
نماز قبول نہیں ہوتی۔ اگر توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ معاف فرماتے ہیں۔ ورنہ قانون یہی ہے۔ فرمایا
جو غلام اپنے مالک کی مرضی کے خلاف بھاگ جائے، وہ جب تک واپس نہ آئے، اس کی کوئی
نماز قبول نہیں ہوتی، کیونکہ اس نے مالک کو بدھو کا دیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت میں آیت کریمہ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا اَخْلَصْ فِي
دِينِكَ يَكْفِيكَ قَلِيلاً مِنَ الْعَمَلِ دین میں اخلاص پیدا کر لو تو کچھ تھوڑا عمل بھی
کفایت کر جائے گا۔ اسی واسطے قرآن پاک میں آتا ہے تَخْلِصِينَ لَهُ السَّعْيَ اخص کے
ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اور اخلاص ایک ایسی نعمت ہے جو توجہ کے بغیر حاصل نہیں ہو
سکتی۔ اہم ابوہریرہ صحت فرماتے ہیں۔ اگر انسان میں خلوص موجود ہے۔ اس کا عقیدہ توحید پر ہے، افہم
درست ہے، تو پھر اس کے اعمال بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی
فرمانبرداری

بیت اللہ شریف کی تعمیر کے تذکرہ کے بعد امت مسلمہ کی تاسیس اور پھر نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم
کی بعثت کی دعوت۔ یہی مرکزی محور ہے۔ جو اگلی آیت میں آ رہا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے
اپنی دعا میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی درخواست پیش کی۔ گویا نبی علیہ السلام کے ظہور

۱۔ ترمذی ص ۲۱۶ ۲۔ ترمذی ص ۲۱۷

۳۔ جامع سفیرنا شرح فیض القدر ص ۲۱۶ ۴۔ احکام القرآن ص ۲۱۶

سے ہزاروں سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپ کے لیے دعا کی۔ اور دُعائے پت سے
میں عرض کیا رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ سے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار
بنائے۔ کہ ہم دونوں ہر حالت میں تیری اطاعت کرتے رہیں جائیں۔ ابراہیم علیہ السلام کی ہمیشہ
یہی دعا رہی تُوَفِّقْنِي مُسْلِمًا وَالْحَقُّ بِالصَّالِحِينَ نے اللہ۔ ہمارے موت فرمانبردار کی
کی حالت میں آئے۔ رجب وصیت کرتے ہیں تو فرماتے ہیں فَلَا تَعْلَمُ تَنَزَّالًا وَأَنْتَ مُقِيمُونَ
کوشش کرو بھائی کہ تمہارا مقررہ سوسم اور فرمانبردار کی حالت میں ہو چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام
اور اسماعیل علیہ السلام نے جی بن دعا کی۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ اللہ! ہمارے
کو اپنا فرمانبردار بنا۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی ممکن ہے۔ دوسری جگہ موجود ہے اللہ تعالیٰ
نے فرمایا ہے اِبْرَاهِيمُ اسْلِمْنَا فَرَّغْنَا بِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ آپ نے جواب دیا سَلَّمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ
میں رب العالمین تمہیں کو یہ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بعض مسلمانوں کے بعد ابراہیم علیہ السلام کو اہست
عطا کی۔

امت مسلمہ کی
تاسیس

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے اپنے لیے اللہ تعالیٰ کی فرمانبردار کی دعا مانگی۔ اور
پھر اپنی اولاد کے متعلق دعا کی وَهَلْ ذُرِّيَّتَنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ اے ہمارے اور
میں سے ایک فرمانبردار بنائے۔ یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس وقت یہ دعا کی گئی،
اس وقت حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام ہی موجود تھے۔ لہذا امت مسلمہ کی دعا حضرت
اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے حق میں جاتی ہے۔ کیونکہ حضرت حق علیہ السلام تو اس وقت تک ابھی
پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ اسی مقام پر یود و نصاریٰ دھرم لکھتے ہیں۔ اور حضور علیہ السلام کی ولادت
کا انکار کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ دعا حضرت اسحق علیہ السلام کے حق میں ہے۔ اور
امت مسلمہ بھی آپ ہی کی قوم ہے۔ حالانکہ تاریخ ثواب سے واضح ہو رہا ہے کہ امت مسلمہ
کا تعلق حضرت اسماعیل کی اولاد سے ہے۔ جو اس وقت موجود تھے۔ اور دعائیں شامل تھے چنانچہ
یہ قبولیت دعا کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری نبی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے
مبعوث فرمایا۔

من مبعوث
کی تعبیر

دعا کے دو حصے تھے میں باپ بیٹے نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی وَادِّعَا مَسْكَنًا

اے پروردگار! ہم کو ہمارے مناسک حج بھی بتا دے۔ مناسک مناسک کی جمع ہے جس کا لفظی معنی دھونا ہے۔ اسی لیے عربی والے کپڑا دھو لے کر نسک الشوبہ بولتے ہیں۔ نسک قربانی کو بھی کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے عبادت و ریاضت کو نسک کہتے ہیں۔ اور عابد کو ناسک اور عبادت گاہ یا قربانی کی جگہ کو مناسک کہتے ہیں۔ گویا معنی یہی نکلتا ہے کہ جس طرح دھونے سے کپڑا میل کچیل سے پاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قربانی اور عبادت سے انسان کے گناہ دھل جاتے ہیں۔

جب خانہ کعبہ کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ ترجیاً کہ گذشتہ درس میں ذکر آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اعلان حج کا حکم صادر فرمایا۔ تو ضروری تھا کہ جس حج کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس کا طریقہ اور احکام بھی معلوم ہونے چاہئیں۔ اسی لیے باپ اور بیٹا دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ارکان حج بھی سکھلا دے تاکہ جو لوگ اس ارادے سے آئیں وہ تیرے احکام کے مطابق اس فریضہ کو ادا کر سکیں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات کے میدان میں اونٹ کی سواری پر خطبہ ارشاد فرمایا: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ** اے لوگو! مجھ سے احکام حج اچھی طرح سیکھ لو لَعَلَّكُمْ لَا تَارَكُمُ بَعْدَ عَامِي هَذَا شاید اس سال کے بعد تمہارے ساتھ طاقات نہ ہو سکے۔ اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ آپ اس حج کے بعد دوبارہ مکہ مکرمہ نہ آ سکے۔ اور تین ماہ بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ بغرض مناسک سے حج کا طریقہ اور اس کے احکام مراد ہیں۔ جن کے مطابق قیامت تک آنے والے لوگ حج کرتے رہیں گے۔

لفظ **أَرَنَا** رویت یا رائی سے ہے۔ اس کا مصدر رائی بھی آتا ہے۔ اگر رویت مصدر یا جائے تو اس کا معنی آنکھ سے دیکھنا ہے۔ اے اللہ! ہمیں مناسک حج دکھا دے اور رائی مصدر ہو تو اس کا معنی بڑے سے جاننا ہوگا: **أَلَمْ تَسْأَلِ الْكَذِبِيَّ** سے رویت قبل مراد ہے تو یہاں بھی ارنانا کا معنی یہ ہوگا کہ میں مناسک حج کا علم عطا فرماؤ۔ **وَتُبَّ عَلَيْنَا** اور ہمارا

توبہ قبول فرما، مہربانی کے ساتھ ہم پر جوع فرما۔ اَنْتَ اَنْتَ لَتَوَابُ الرَّحِيْمُ بِشَكْرٍ
 توبہ قبول کرنے والا ہے۔ یعنی مہربانی کے ساتھ رجوع کرنے والا ہے۔ تو از حد مہربان ہے۔
 باپ اور بیٹے کی دعا کے دو حصے مکمل ہوئے۔ تیسرے حصے میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ
 علیہ وسلم کی بعثت کی درخواست کی گئی ہے۔ جو اگلے درس میں آئے گا۔

اَللّٰہُ
درس پنجاہ ویکٹ

انبیاء
(آیت ۱۲۹)

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ
الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ان کے اندر انیس میں سے ایک رسول بھیج،
جو ان پر تیری آیتیں تلاوت کرے، اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے، اور انکو پاک
کرتے۔ بیشک تو نہ بد دست اور حکمت والا ہے ﴿۱۲۹﴾

جس وقت حضرت ابراہیم اور اسمعیل علیہما السلام خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھ رہے تھے۔ تو رفتہ
ساتھ دعا بھی مانگ رہے تھے۔ دعائے بعض حصے گزشتہ درس میں بیان ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلے انہوں
نے عرض کیا رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اے ہمارے پروردگار! ہم سے یہ عمل قبول فرما۔ اِنَّكَ
اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ تو سنتا بھی ہے در ہر شخص کی نیت اور اذکار کو بھی جانتا ہے دونوں
باپ بیٹے اپنی عاجزی کا اظہار کیا، اور عرض کیا کہ ہمارے اس عمل مقصد تیری رضا ہے۔ لہذا تو ہم
سے یہ عمل قبول کر لے۔

دعائے دوسرے حصے میں عرض کیا رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ اے ہمارے پروردگار!
ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنالے۔ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةٌ مُّسْلِمَةٌ لَّكَ مَآ وَرِہَا نِیْ اَوْلَادِ
میں سے ایک ایسی جماعت بنا جو تیری فرمانبردار ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کی دعا کو شرف
قبولیت بخشا۔ اور حضرت ابراہیم اور اسمعیل علیہما السلام کی اولاد میں امت مسلمہ پیدا کی۔ بنیادی طور تو
اس امت مسلمہ میں عرب ہی شامل ہوئے۔ جو کہ اسمعیلی نسل کے قریش تھے۔ اس کے بعد انصاریہ
نہیں شامل ہوئے۔ اور پھر جو لوگ بھی ان کے ساتھ ملتے ہیں۔ وہ سب اس امت میں شامل
ہیں۔ اس دعائے ابراہیمی کا نتیجہ کئی ہزار سال بعد نکلا جب اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ
علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔

دعا کے قیامت عصر میں عرض کیا: **وَإِنَّمَا مَنَّا سَكَنَةٌ** اور ہمیں نہایت چھوٹی جگہ بھی تھی تاکہ ہمارے بعد آنے والے بھی اسی طریقے کے مطابق بیت اللہ شریف کا حج کرتے رہیں۔ نیز یہ دعا کی: **وَتَبَّ عَلَيْنَا**۔ اے اللہ! ہماری توبہ قبول فرما لے کیونکہ **إِنَّكَ أَنْتَ السَّوَابُ الرَّحِيمُ** توبہ قبول کرنے والا اور مہربان سے بہ نسبت براہیم علیہ السلام یہ دعا کر سکتے تھے۔ اور صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام آمین کہہ کر دعا میں شامل تھے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بعثت

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دعا چوتھا جز یہ تھا: **رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ** اے ہمارے پروردگار! ان کے اندر انہیں میں سے ایک رسول ببعث فرما۔ یہاں یہ سوال بید ہوتا ہے کہ حضرت براہیم علیہ السلام نے امت مسلمہ کی درخواست پہلے اور رسول کی بعثت کی دعا بعد میں کیوں کی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت براہیم علیہ السلام نے امت مسلمہ کی درخواست اپنی اولاد میں سے کی تھی۔ ظاہر ہے کہ قریش عرب حضرت براہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی اولاد میں سے ہی ہیں جنہوں نے امت مسلمہ کی داغ بیل ڈالی۔ پھر ان کے ساتھ انصار مدینہ شامل ہوئے۔ اور پھر باقی اقوام عالم کو امت مسلمہ کی رکینیت حاصل ہوئی۔ چونکہ نبی آخر الزمان علیہ السلام کی بعثت امت مسلمہ میں سے مطلوب تھی۔ اس لیے امت کا ذکر پہلے کیا اور بعثت نبوی کا بعد میں کیا۔ سورہ جمعہ میں اسی قسم کا ذکر ملتا ہے: **جَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰی** نے احسان جتلاتے ہوئے فرمایا: **هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِیْ اُولٰٓئِہِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ** اللہ تعالیٰ کی وہ ذات ہے جس نے عرب کے ناخوندہ لوگوں میں اپنا رسول بھیجا۔ ظاہر ہے کہ عرب کے اکثر لوگ کھٹے پڑنے سے عاری تھے۔ کرنی اکاؤنٹ کا آدمی ہی نوشت و خواند سے واقف تھا۔ لہذا اس مقام پر انہوں کا ذکر کیا۔ مگر مخاطب وہی قریش ہیں۔ جو کہ حضرت براہیم علیہ السلام کی نسل میں سے تھے۔

عظیم الشان رسول

لفظ **رَسُوْلًا** اسم نکرہ ہے۔ اور اس سے عظمت کا اظہار ہوتا ہے لہذا اس کا معنی صرف رسول نہیں بلکہ عظیم الشان رسول ہوگا۔ دوسری آیات میں بھی یہ لفظ نکرہ کے طور پر ہی استعمال ہوا ہے۔ جیسے **بَعَثَ فِیْ اُولٰٓئِہِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ** اس میں **مِنْهُمْ** کی قید سے بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ میں سے ایک عظیم الشان رسول ببعث فرمایا۔

گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی اولاد میں سے اُمت مسد بنائی۔ اور پھر ان میں سے الرَّسُولُ نہیں بلکہ رُسُوْلٌ یعنی نہایت عظمت والا رسول مبعوث فرمایا۔ یہ ایک عام سنت اللہ بھی ہے۔ کہ ہر نبی اپنی قوم میں سے مبعوث ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق ایسا ہی مذکور ہے۔ مثلاً عاد، ثمود، صالح علیہ السلام کی قوم قوم ابراہیم، حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی قومیں، غنیکہ ہر نبی اپنی ہی قوم میں ہوا ہے کہیں باہر سے نہیں آیا۔ چنانچہ نبی آخر الزمان علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے ان کی اپنی ہی قوم قریش میں سے مبعوث فرمایا۔ ایسا ہونا منطقی طور پر ضروری بھی ہے۔ کیونکہ اپنی ہی قوم میں سے ہونے کی وجہ سے نبی کے اخلاق و اطوار کو ہر شخص جانتا اور پہچانتا ہے۔ اور اس کے اخلاص کی بنا پر نبوت کی تصدیق کر سکتا ہے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کی بعثت کی سعادت بھی آپ کی اپنی قوم کو حاصل ہوئی۔ چونکہ نبی اپنی ہی قوم میں سے ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اُسی جنس میں سے یعنی انسان ہوتا ہے کہ انسانوں کی طرف مبعوث ہونے والا نبی انسان ہی ہوگا۔ کسی غیر نسل سے نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہو، تو امت کو نبی کے اتباع میں سخت دشواری پیش آ سکتی ہے۔ یا بعض معاملات میں اتباع ناممکن بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر کسی فرشتہ یا جن کر ان لوں کی طرف نبی مبعوث کیا جائے۔ تو یہ نسل ہی مختلف ہوگی۔ نبی اور امت کے درمیان تخیل میں فرق ہوگا۔ ان کی بود و باطل اور عادات و خصائل میں فرق ہوگا۔ ان کی ضروریات مختلف ہوں گی۔ لہذا نبی کا اتباع کیسے ممکن ہوگا۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ نبی کا اپنی قوم کی جنس سے ہونا کوئی غار کی بات بھی نہیں ہے۔ عَلَّمَ عَقَامٌ دَاوُدَ نَبِيَّ كُورَيْنَ یہ لکھتے ہیں الرَّسُولُ رَأْسُ رِجَالِ الْخَلْقِ لِيَتَّبِعُوا الْأَحْكَامَ يَعْنِي نَبِيَّ وَهُوَ الْإِنْسَانُ بَوَاتُورٌ۔ جسے اللہ تعالیٰ لوگوں کی طرف احکام شرعیہ پہنچانے پر مقرر کرتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کام کے لیے جس انسان کو منتخب فرماتے ہیں۔ اس پر وحی نازل فرماتے ہیں اور اس کی شان کو بلند فرماتے ہیں۔ لوگوں نے خواہ مخواہ باطل عقائد وضع کر لیے ہیں کہ نبی کو انسان کئے سے اس کی نمود باللہ تو بین ہو جاتی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں بلکہ نبی کا انسان ہونا تو انسانیت

نبی انسان
ہی ہوتا ہے

کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو کہہ رانی خَالِقًا بَشَرًا مِّنْ طِينٍ میں
بشر کو مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں۔ اس میں تحقیر کی کون سی بات ہے۔ نہ معلوم لوگوں نے یہ
کیسے سمجھ لیا ہے کہ بنی کو بشر کہنے سے بنی کی توہین ہو جائے گی۔ اس پر ضرور ہے کہ بنی ایک
عام انسان کی طرح نہیں ہوتا۔ جس میں ہر نیک و بد شامل ہوتا ہے۔ بلکہ بنی کو تمام امت پر فضیلت
حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ معصوم ہوتا ہے۔ البتہ جہاں تک انسانیت یا بشریت کا تعلق ہے۔
قرآن پاک نے بار بار اس کی تصدیق کی ہے قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اللَّهُ تَعَالٰی
خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اعلان بشریت کرایا ہے۔ دوسری جگہ آپ ہی کی زبان سے کھلایا
”هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلُكُمْ“ آپ فرمادیکھتے کہ میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک انسان
ہوں اور اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ نہ میں عالم الغیب ہوں۔ نہ مختار کل ہوں۔ نہ میرے قبضے میں
خزانے ہیں۔ نہ تمہاری فرمائش پوری کرنا میرے بس میں ہے۔ میں تو اللہ تعالیٰ کا رسول اور
انسان ہوں۔

حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام بھی یہی کہتے ہیں کہ میں بھی
تمہاری طرح انسان اور بشر ہوں۔ جس طرح تم کسی کی اولاد ہو اسی طرح میرے بھی۔ میں باپ میں
جس طرح تمہاری نسل سے تمہاری اولاد ہے۔ اسی طرح میری بھی ہے۔ تمہاری بھی ضرورت
زندگی میں اور میری بھی ہیں۔ باقی انسانوں پر پیش آنے والی دلدرد بیماری، صحت وغیرہ
انبیاء علیہم السلام پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ تمام طبعی امور حتیٰ کہ موت و حیات بھی سب پر طاری
ہوتی ہے۔ البتہ فرمایا کہ بنی کو امت پر فضیلت ہے: ”يُؤْتِيهِ الْوَقْدَ نَارًا“ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔
اور یہ بہت بڑی عزت و اکرام والی چیز ہے۔ جو آئے حاصل ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ اس کام
کے لیے منتخب کر لے۔ اس سے زیادہ فضیلت والی اور کوئی چیز نہیں غرضیکہ انبیاء کرام علیہم السلام
بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ مگر انسانیت میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ انسان کہنے میں ان کی
توہین نہیں ہوتی۔ بلکہ انسان تو وہ ہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق پر فضیلت بخشی۔
اسی لیے تو فرمایا ”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ“ ہم نے آدم کے بیٹے یعنی انسان کو عزت بخشی۔

امتی خواہ کتنا بھی نیک کلام صالح اور پاکیزہ ہو۔ وہ معصوم نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ عام انسان تو گنہگار ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف بنی ہمیشہ معصوم ہوتا ہے۔ اس صفت کے بغیر بنی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اس میں معصومیت معفود ہو تو اس کا اتباع ممکن نہیں لہذا کوئی بدترین شخص بھی بنی کی تہین نہیں کر سکتا۔ وہ معصوم ہے۔ اگر کوئی شخص بنی کے درجے میں برابر کی کا دھوے کرے تو وہ مومن نہیں رہتا۔ مگر ہمسے ہی بھائیوں نے بنی کو انسانیت کے دائرے سے خارج کر کے نُوْرٌ مِّنْ نُّوْرِ اللّٰہِ کا خطاب دے دیا۔ بھائی یہ تو عیسائیوں والا عقیدہ ہے وَجَعَلُوا اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہٖ حُجْرًا ۝ اللہ کے لیے اُسی کے بندوں میں جبر و بنایا اور مشرک ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ تو خالق ہے۔ باقی سب مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو عورت کے بطن سے پیدا کیا ہے۔ یہ اس کی کمال صفت کا ظہور ہے۔ اس کو خدا کا جبر و بنانا سخت بے ادبی اور گستاخی ہے۔ انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی فضیلت عطا کی ہے۔

تلاوت قرآن پاک

فرمایا اے ہمارے رب! امت مسلمہ میں انہی میں سے ایک رسول بھیج کیسے ہو
عَلَيْہُمْ اٰیٰتُکَ جو ان پر تیری آیات تو دت کرے۔ آیت سے مراد احکام یا فرمان ہے جو بنی پر نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ بزرگم علیہ السلام نے عرض کیا کہ مولا کریم! جس عظیم الشان بنی کی بعثت کی دعا کر رہا ہوں اس کا پہلا فرض یہ ہو کہ وہ تیری آیتیں ان کو پڑھ کر سنائے اور انہیں تیرے احکامات آگاہ کرے۔ کیونکہ بنی کیلئے اللہ تعالیٰ کا عام حکم ہے یٰۤاَیُّہَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَبِّکَ ۚ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی حکم آپ پر نازل ہوا آپ اُسے اُنکے امت تک پہنچا دیں۔

تلاوت کے دو معنوم ہوتے ہیں۔ اس کا پہلا مقصد احکام کو دوسروں تک پہنچانا یا دوسروں کو تعلیم دینا ہوتا ہے۔ اور اس کا دوسرا مقصد خود اپنی ذات کے لیے تلاوت ہے جس طرح ہم قرآن پاک کو کلام الہی ہونے کی وجہ سے ثواب کے لیے پڑھتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ جس قدر بار بار تلاوت کرے گا۔ تنہا ہی ثواب کا اتھار ہو گا۔ خود لفظ قرآن کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ کتاب جو بار بار پڑھی جائے۔

اللہ تعالیٰ کی آیت جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے، وہ وحی کے ذریعے حضور علیہ السلام کی ذات والا صفات پر نازل ہوئی تھیں، جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو آپ گھر سے باہر تشریف لاتے اور کاتبان وحی میں سے جو بھی قریب ہوتا اسے طلب فرماتے اور حکم کرتے کہ اس آیت یا سورۃ کو فلاں مقام پر لکھو تو وہ لکھ لیتے، بعض اوقات آپ عام مجلس میں تشریف لاتے اور اعلان فرماتے کہ اچھی! بھی اللہ تعالیٰ کا یہ فرین نازل ہوا ہے بعض اوقات یہاں ہوتا کہ مجمع عام میں تشریف فرما ہوتے اور آپ پر وحی کی کیفیات طاری ہو جاتیں، آپ کا چہرہ متغیر ہو جاتا اور پھر بخیر و برکت دیر بعد آپ ارشاد فرماتے کہ یہ وحی نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ حضرت زید، حضرت علی، حضرت عثمان یا جو بھی کاتب مل جاتا اسے تحریر کروا دیتے۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ عظیم الشان رسول تیری آیات کی تلاوت کرے گا۔ اب دوسری بات یہ بتائی کہ وَيُؤْتِيهِمُ الْكِتَابَ کہ وہ رسول امت کو کتاب کی تعلیم دے گا۔ کسی کتاب کو صرف پڑھ کر سنا دینا اور چیز ہے۔ اور اس کی تعلیم دینا دوسری بات ہے۔ یہاں پر کتاب کی تعلیم کا ذکر ہے۔ اور علم محنت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ امام بخاری فرماتے ہیں إِنَّمَا يُعَلِّمُ بِالتَّعَلُّمِ علم خود بخود حاصل نہیں ہوتا، بلکہ سیکھنے سے آتا ہے۔ اور جو لوگ خود بخود سیکھتے ہیں، استاد کی مدد حاصل نہیں کرتے۔ صرف کتابیں پڑھ کر عالم بنا چاہتے ہیں، وہ علم میں کچھ سبھتے ہیں اور ان میں اکثر گمراہ ہوتے ہیں۔ ان میں کما حقہ علم کی نچنگی نہیں آتی، علم حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت درکار ہوتی ہے۔ سلف صالحین نے حصول علم میں جس قدر محنت کی ہے اس کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اہم شافعی فرماتے ہیں کہ میں سولہ سال تک اس حالت میں رہا کہ رات کو ریاس لٹکتی تھی تو رات بھر ایک پیالہ پانی بھی نہیں پیتا تھا، کہ کہیں مطالعہ میں غفلت نہ آجائے۔ اگر غنودگی طاری ہوگئی تو مطالعہ اودھوا رہ جائے گا۔ چالیس چالیس سال تک لوگوں نے اتنی بڑی بڑی محنت کی ہے۔ تب جا کر علم حاصل ہوا ہے۔

بہر حال تعلیم ایک اہم چیز ہے۔ اس کے بغیر انسان میں کمال پیدا نہیں ہوتا، بلکہ وہ

استاد کی مدد سے سیکنا پڑتا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ دنیا کا کوئی آدمی سے ادنیٰ یا اعلیٰ سے اعلیٰ پیشہ ہو جب تک کوئی استاد کے سامنے زانوئے تلمذتہ نہیں کرے گا علم و فن حاصل نہیں کر سکتا۔ توبار ہو یا درزی، ڈاکٹر ہو یا انجینئر، ہر فن کی صحبت حاصل کرنا ہوگی۔ اس کے بغیر وہ اپنے فن میں کامل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح یہ تعلیم جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء عظیم السلام کے ذریعے سے بھیجی ہے۔ سب زیادہ دقیق ہے۔ یہ بغیر استاد کے کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ ایسی کوشش کرنے والے منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکیں گے بلکہ گمراہ ہو جائیں گے۔ لہذا وحی کی تعلیم کے لیے پیغمبر کی ضرورت ہے۔ اور اس لحاظ سے آپ کی ایک صفت معلم بھی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے۔ وہاں یہ دو گروہ اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔ ایک گروہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والوں کا تھا۔ جو ذکر میں مشغول تھا۔ اور دوسرا گروہ تعلیم و تعلم کا کام کر رہا تھا۔ حضور علیہ السلام اس دوسرے گروہ میں تشریف فرما ہوئے اور فرمایا اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا یعنی مجھے اللہ تعالیٰ نے معلم بنا کر بھیجا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہی دعا کی تھی وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ بِاللُّغَةِ اُنْیٰسَی اِیسا نبی بھیج، جو انہیں کتاب کی تعلیم دے۔

تعلیم کتاب کے سلسلے میں بعض اوقات الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ صحابہ کرام صاحبان تھے۔ عربی ان کی مادری زبان تھی۔ اس کے باوجود بعض امور کے سمجھنے میں دقت پیش آتی تھی۔ اس سورۃ بقرہ میں خیط اسود اور خیط ابیض کا ذکر آتا ہے۔ عدی بن حاتم اس کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ حالانکہ خالص عرب اور پھر شاعر بھی تھے۔ زبان پر عبور حاصل ہونے کے باوجود وہ ان الفاظ کے مفہوم تک نہ پہنچ سکے۔ آپ خیط ابیض اور خیط اسود کو سفید و سیاہ دسی سمجھتے رہے۔ حالانکہ اس سے مراد رین اور رات ہے۔ اسی طرح ظلم کا معنی سمجھنے میں صحابی کرام کو غلطی ہوئی اور پریشان ہو گئے۔ حضور علیہ السلام نے وضاحت فرمائی کہ یہاں پر ظلم سے مراد شرک ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ شرک بہت بڑا ظلم ہے خود قرآن پاک میں تصریح موجود ہے۔ غرض!

اس قسم کے نجات تعلیم کے ذریعے مل جاتے ہیں۔ کہیں کسی حکم کو خاص کرنا ہوتا ہے۔ کسی کی عمومیت بیان کرنی ہوتی ہے۔ جو کہ استاد کے بغیر ممکن نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی حکمت میں یہ بات بیان ہوئی ہے۔ کہ بعض چیزیں جنات کے قبیلے سے ہوتی ہیں۔ انسان ذرا سی توجہ کرے، تو آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ اور بعض ایسی ہوتی ہیں۔ جن کو آسانی سے سمجھنا ممکن نہیں ہوتا۔

جیسے فرمایا: **رَسُولُكَ رَسُوْلُهُ بِالْهَدْيِ وَدِيْنُ الْحَقِّ** وہ ذاتِ خداوندی جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا۔ یہاں پر ہدایت اور دینِ حق کو سمجھنے کے لیے استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ ایسی معمول چیز نہیں ہے جو ادنیٰ توجہ سے معلوم ہو جائے۔ اس لیے فرمایا کہ اے اللہ! انہیں میں سے رسول بھیج جو انہیں کتاب کی تعلیم دے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیسری دعائے حق **وَكَيْلَهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ** ایسا رسول مبعوث فرمایا جو کتاب کے علاوہ انہیں حکمت کی تعلیم بھی دے۔ حکمت کی تشریح میں مفسرین کرام کے بہت سے اقوال ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ حکمت سے مراد انوارِ قلوب یا باطنی باتوں کا جانتا ہے۔ بعض دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ حکمت عقل کی دلیل اور دل کی بصیرت کا نام ہے۔ حضرت ام المومنین فرماتے ہیں **مَعْرِفَةُ الدِّينِ وَالْفِقْهُ فِيهِ وَالتَّوْبَعُ لَكَ** یعنی حکمت نام ہے دین کی معرفت۔ اس کی سمجھ اور اس کے اتباع کا۔ عام طور پر حکیم کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے۔ **مِنْ اَتَقَنَ الْعِلْمَ وَالْعَمَلَ حَكِيمٌ** وہ ہے جس نے علم اور عمل میں مہارت حاصل کر لی۔ اگر طرک کا معنی ماہر فی الفن ہے۔ خواہ وہ بے عمل ہو۔ مگر حکیم وہ ہوگا جو علم اور عمل میں مہارت ہوگا۔

بعض فرماتے ہیں کہ شریعت الہیہ میں جتنی مصلحتیں اور دین کے جتنے احکام ہیں ان کو پہچاننے کا نام حکمت ہے۔ حق اور باطل کے درمیان امتیاز کرنا بھی حکمت کہلاتا ہے۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت کو بھی حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعض کہتے

ہیں کہ تمام چیزوں کو ان کی حقیقت کے ساتھ جاننے کا نام حکمت ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے
 اللَّهُمَّ ارِنَا الْحَقَّ حَقًّا لِّهِ اَللّٰہ! ہمیں حق کو سمجھنے کی توفیق عطا کر۔ ایسا نہ ہو کہ ہم باطل کو حق
 سمجھنے لگیں۔ بزرگان دین کی دعا میں آتا ہے کہ ہمیں چیزیں اس طرح دکھا جس طرح وہ واقعہ
 میں ہیں۔ بسا اوقات آدمی کسی چیز کو سمجھتا کچھ ہے مگر حقیقت میں کچھ اور ہوتا ہے۔ امام ابن عربہؒ
 جو کہ لغت کے اہم ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو تمہارے لیے نصیحت کا باعث بنے یا تمہیں
 بُرائی پر زجر کرے یا کسی قبیح کام سے روکے یا کسی بزرگی کے کام کی طرف دعوت دے وہ سب
 حکمت ہے۔ اہم راغب جو لغت اور تفسیر کے اہم ہیں فرماتے ہیں الْحِكْمَةُ اِمَّا بَلَدٌ
 الْحَقُّ بِالْعِلْمِ وَالْعَقْلُ بِالْحَقِّ کہ علم اور عقل کے ذریعے پالینا حکمت ہے اور بعض فرماتے
 ہیں کہ قول اور عمل میں برابری کا نام حکمت ہے۔

اہم بیضاوی اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ ایسی چیز جس کے ذریعے انسان کے
 نفس کی تکمیل ہوتی ہو حکمت ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے رَأْسُ الْحِكْمَةِ خَافَةُ
 اللّٰہ یعنی حکمت کی جڑ اور نیا اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔ جس انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا
 ہو جائے سمجھ لو کہ اس میں حکمت کی بنیاد قائم ہو گئی ہے۔ حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے مَنْ
 خَلَصَ لِلّٰہِ رُبْعَيْنِ يَوْمًا جَسَدُہٗ یَمْلَأُ دَن تَمَّ اَخْلَاصُہٗ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت
 کی جبروت ینابیع الحکمة مِنْ قَلْبِہٖ عَلٰی لِسَانِہٖ حکمت کی سوتیں اس کے دل
 کی طرف سے اس کی زبان پر جاری ہو جائیں گی۔

بعض محققین کہتے ہیں حکمت نام ہے معرفۃً اَفْضَلُ الشَّیْءِ بِاَفْضَلِ
 الْعُلُومِ افضل چیز کو افضل علم کے ساتھ جاننے کا نام حکمت ہے۔ ظاہر ہے کہ سب سے افضل
 چیز اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات ہیں۔ اور سب سے افضل وہ علم ہے جس سے انسان کو
 حضور قلب حاصل ہو جائے۔ اگر اس کے دل میں ایسی کیفیت پیدا ہو جائے تو وہ ذات تعالیٰ کی

ذات اور اس کی صفات کو پہچان سے کا اور سمجھ جائے گا کہ یہ شخص حکیم ہے۔ تاہم عام فہم معنی میں حکمت الشوریٰ کعبہ اور پستے کی باتوں کو کہتے ہیں ایسی باتیں احکام ہوتے ہیں۔ ان کی مصلحتیں اور ان کے اثر بھی ہوتے ہیں۔ ان کے غوامض ہوتے ہیں۔ اس میں سنت بھی شامل ہے۔ اور حضور نبی کریم علیہ وسلم نے یہ تمام باتیں کھائی ہیں اس لیے فرمایا وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وہ رسول جو لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

دعا کا چوتھا جزو تھا وَيُزَكِّيهِمْ اور ان کو پاک کرے۔ یہ لفظ بڑے دور رس معانی تزکیہ نفس کا حامل ہے۔ پاکیزگی سے مراد یہ ہے کہ ان سے تمام رذائل دور ہو جائیں۔ اور تمام فضائل ان میں پیدا ہو جائیں۔ رذائل میں خفاق، بد اخلاق، گندگی، معاصی، بد انتمائی، اور دیگر تمام شریر چیزیں آتی ہیں جن میں صریح پاکیزگی مطلوب و مقصود ہے۔ تزکیہ اسی کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام۔ اس موقع پر یہ بات سمجھائی کہ کسی قوم میں فوز و فلاح اور سعادت تزکیہ کے بغیر نہیں آسکتی۔ لہذا انہوں نے امت مسلمہ کے لیے تزکیہ کی دعا کی۔ اور پھر آپ کی دعا کا اثر بھی کھینے حضور نبی اکرم علیہ السلام کے اولین مخا طبین کی جہالت مثالی تھی۔ ان کی خباثت، جہالت اور ہٹ دھرمی سب کچھ عیاں ہے۔ مگر اس تزکیہ کی بدولت کیسے کیسے جلیل القدر لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے تن من و عن ہر چیز دین پر قربان کر دی۔ ایک درس کے مقام پر تزکیہ کو یوں بیان فرمایا خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ وصول کر لیں تُطَهِّرَهُمْ و تزکیہ کرے۔ وہ ظاہری اور باطنی بر دو پہلوؤں سے پاک ہو جائیں گے۔ غرضیکہ تزکیہ سے مراد ظاہری پاکیزگی بھی ہے۔ اور باطن کی پاکیزگی بھی ہے۔ اسی لیے فرمایا۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ان میں ایسا رسول بھیج جو تیری آیات پر حاکم کرے۔ انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا آخری حصہ تزکیہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی لیے

اس کو دعائے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔ بزرگان دین کی بیعت حصول تزکیہ کا ایک ذریعہ ہے جو کہ حضرت علی سے چلا آیا ہے۔ بزرگان دین مرید کو وظیفہ بتاتے ہیں۔ عبادت دریا سنت کا طریقہ سکھاتے ہیں۔ اور ضروری پرہیز بھی بتاتے ہیں۔ تاکہ مرید بانیوں سے پاک ہو جائے اور اس میں خوبیاں اجاگر ہو جائیں۔ مگر آج پیری مریدی ایک پیشہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ بیعت ایک

بیعت اور
تزکیہ

رہی چیز بن کر رو گئی ہے۔ فاسق فاجر، بے نماز، بیٹرا اور کتے پالنے والے گدی نشین ہیں۔ اور جھلا سے بیعت لے رہے ہیں۔ نہ پیر کو احکام الہی کا علم ہے۔ نہ مرید کے پٹے کچھ پڑتا ہے۔ بس چہ رسوم ادا کر کے پیری مریدی کے بندھن میں بندھ گئے۔ نہ پیر نے تربیت کی، نہ حلال و حرام کی تمیز سکھائی، تو تزکیہ کیسے ہوگا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نبی نے جن لوگوں سے بیعت لی تھی۔ اُس کا کوئی مقصد تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں نبی علیہ السلام کو ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں سے ان شرائط پر بیعت لیں کہ کفر و شرک کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ گناہ کی باتوں سے پرہیز کریں گے۔ پتھری نہیں کریں گے۔ بدکاری نہیں کریں گے۔ کسی پرستان نہیں بندھیں گے وغیرہ وغیرہ۔ فرمایا اگر ان شرائط کے مطابق مرد اور عورتیں بیعت کریں۔ تو ان کی بیعت میں اور جو ان شرائط کو پورا نہ کریں ان سے بیعت نہیں۔ مگر آج حالت یہ ہو چکی ہے کہ بیعت بھی ہو رہی ہے۔ اور کفر، شرک، بدعات کی بھی فراوانی ہے۔ کوئی پیر مرید سے نہیں پوچھتا کہ کیا کر رہے ہو۔ قبریں پکی بن رہی ہیں، گنبد تعمیر ہو رہے ہیں۔ ان پر قوالی ہو رہی ہے۔ گانے گائے جاتے ہیں۔ قبروں پر چادریں چڑھتی ہیں، سجدے ہوتے ہیں۔ بتائیے اب تزکیہ کہاں سے آئے گا۔ بزرگان دین نے ان باتوں کا حکم نہیں دیا تھا۔ انہوں نے تو اپنے لیے جھوٹا بھی پسند نہ کیا۔ اس دنیا کی پوری زندگی مسافروں کی طرح گزار دی۔ مگر آج ان کی قبروں پر عالیشان گنبد بنائے جاتے ہیں۔ لاکھوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ جن بزرگوں کی تعلیم یہ تھی کہ مرد کے لیے سونا اور ریشم حرام ہے۔ انکی قبروں پر سونے کے دروازے اور ریشم کی چادریں چڑھائی جا رہی ہیں۔ کیا وہ بزرگ ان ظرافت سے سبزار نہیں ہوتے ہوں گے۔ وہ تو ساری عمر ایمان کی دعوت دیتے رہے، کفر و شرک سے بیزاری کا اظہار کرتے رہے، مگر ہم ان کے بعد کیا کر رہے ہیں۔ غرضیکہ پیغمبر کا ایک فریضہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کا تزکیہ کرتا ہے۔

حنوز علیہ السلام کے پاس ایک شخص آیا۔ حضور! میں نے فلاں جگہ پر جانور ذبح کرنے کی منّت مانی ہے کیا اسے پورا کر دوں۔ آپ نے پوچھا۔ اُس جگہ کبھی کوئی بت تو نہیں تھا یا کسی نہانے میں وہاں کوئی بزرگ تو نہیں بیٹھا تھا۔ لوگوں نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے وہاں پر جانور ذبح کرنے کی اجازت دے دی۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ زمانہ جاہلیت

ہیں وہاں کوئی تھان جو جس کی پوجا ہوتی ہو۔ کوئی بزرگ کسی درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ تو درخت
کی پوجا ہونے لگی۔ آپ نے اس قدر احتیاط فرمائی۔

الغرض! حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسمعیل علیہ السلام نے دعا کے آخر میں اللہ تعالیٰ
کی تعریف فرمائی۔ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ اے مولا کریم! تو ہی کمال قدرت کا
مالک ہے۔ عزیز کا معنی غالب ہے۔ یعنی ہر چیز پر تیرا ہی غلبہ ہے۔ اور حکیم سے مراد۔ کمال حکمت
کا مالک بھی تو ہی ہے۔ تیرے سب امور حکمت اور مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہماری دعا کو
قبول فرما اور امت مسلمہ قائم کر اور پھر ان میں عایشان رسول بھیج جو تیری آیات پڑھے۔ انہیں
کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

وَمَنْ يَدْعُبْ عَنْ مِلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مِنْ سَفِهَةٍ نَفْسِهٖ وَلَقَدْ
اصْطَفٰیْنٰهٗ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۳۰
اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٖ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِذٰبِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۳۱
وَوَضٰی بِهَا اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهٖ وَيَعْقُوْبُ يَبْنٰی اِنَّ اللّٰهَ
اصْطَفٰی لَكُمْ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُوْنَ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ ۝۱۳۲
اَمَرَكُمْ شُهَدَاۤءُ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ
لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ
وَاللّٰهَ اَبَاۤیْكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۝۱۳۳
وَوَحَّزْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝۱۳۴ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ
وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تَمْلِكُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝۱۳۵

ترجمہ بد اور نیس اعراض کرتا ابراہیم (علیہ السلام) کی امت سے معذور شخص جس
نے اپنے نفس کی بیوقوف بنایا۔ اور البتہ تحقیق ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو پسند فرمایا دنیا میں
بیشمار آخرت میں البتہ نیکوکاروں میں شمار ہوگا ۝۱۳۰ جب اُس کے رب نے فرمایا ابراہیم
ہو جاؤ۔ تو اُس نے کہا میں فرمانبردار ہو چکا ہوں رب العالمین کے لیے ۝۱۳۱ اور ابراہیم
(علیہ السلام) نے اپنے بیٹوں کو اس امت پر قائم رہنے کی وصیت کی۔ اور یعقوب (علیہ السلام)
نے بھی۔ اور کہلے میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے دین کو چن لیا ہے پس
تم نہ مرد، مگر اس حالت میں کہ تم فرمانبرداری کرنے والے ہو ۝۱۳۲ کیا تم حاضر
تھے جب یعقوب (علیہ السلام) کو موت آئی تھی جب اسنوں نے اپنے بیٹوں سے
کہا تھا، تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے۔ تو انہوں نے کہا۔ کہ ہم عبادت کریں گے
تیرے معبود کی اور تیرے آباؤ اجداد، ابراہیم، اسمعیل، اور اسحق (علیہم السلام)

سے ایک ایسی روشنی نکلے ہوئے ہے جس سے شام اور بصری کے محلات روشن ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ اونٹوں کی گردنیں نظر آرہی ہیں۔ اس حدیث کی ترجمانی مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی طویل نظم مردِ جزرِ اسلام میں خوب کی ہے۔

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا دعائے غلیل و نویدِ مسیح

جہاں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا تعلق ہے۔ قرآن پاک نے اس کو بھی واضح کر دیا ہے۔ آپ نے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں تمہاری طرف رسول مبعوث ہوا ہوں۔ میں اپنے سے پہلی کتاب توراة کی تصدیق کرنے والا ہوں۔ ”وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ“ اور اپنے بعد آنے والے رسول کی بشارت دینے والا ہوں۔ جن کا نام نامی اور اسم گرامی احمد ہوگا۔ عبرانی اور سریانی زبان میں احمد کو فار قلیط کہا گیا ہے جس کا معنی دنیا بھر کا تعریف کیا ہوا۔

شاعری میں مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی؟ غالب کے شاگرد تھے اور علومِ دینیہ میں حضرت مولانا شاہ اسماعیل صاحب کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں آپ زیرِ تعلیم تھے۔ یزید اس ہنگامے کی وجہ سے اپنی تعلیم کو جاری نہ رکھ سکے۔ آپ کا شمار قومی شاعروں میں ہوتا ہے۔ آپ نے اسلام کے غرور و زوال کی داستان نہایت مؤثر انداز میں نظم کی صورت میں پیش کی ہے۔ آج کل لوگ میلادِ خواتی کہتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کی مرح کے نام پر کھڑیہ اور شرکیہ کھات کہہ جاتے ہیں۔ ایسی تمام نعمتوں کے مقابلے میں مولانا حالی کا یہ ایک ہی شعر کافی ہے۔ حدیث کے مخزن کو ایک شعر میں کمال طریقے سے سمو کر حضور علیہ السلام کی تعریف کی ہے۔

تفسیرِ معالم التنزیل میں شانِ نزول اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ یہودی علماء میں سے حضرت عبداللہ بن سلامؓ کو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے کی توفیق عطا فرمائی۔ آپ کے بھائی کے دو بیٹے بھی صاحبِ علم تھے۔ آپ نے ان سے کہا کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ توراة میں یہ بیان موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں بنی اسرائیل اور بنی اسمعیل میں ایک بنی مبعوث کروں گا۔

اہمیت کا نشان
نزول

جس کا نام احمد ہوگا۔ اور جو شخص اس پر ایمان لائے گا، ہدایت پا جائے گا۔ اور جو اس کا انکار کریگا وہ ملعون ہوگا۔ چنانچہ ان دو بھائیوں میں سے ایک بھائی مسلمان ہو گیا اور دوسرا یہودیت پر قائم رہا۔ آیات زیر درجہ میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ملت ابراہیمی
سے اعراض

فَرَاوَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ لَا مَنَافَةَ لَهُمْ فَتًا وَهُمْ فِي سُلْطَانٍ مُبِينٍ
کرتا ملت ابراہیمی سے مگر وہ شخص جس نے اپنے نفس کو یوقوت بنالیا۔ یعنی ایسا کام وہی کر سکتا ہے جو پرے درجہ کا یوقوت ہو۔ اپنی عقل و ضرر کو بردہ سے کار نہ لاتا ہو۔ وہ عقل مند شخص جس کی اپنی کوئی رائے ہو۔ وہ ملت ابراہیمی سے اعراض نہیں کر سکتا۔

دین ملت
اور شریعت

دین، ملت اور شریعت تین مختلف چیزیں ہیں۔ دین تمام انبیاء علیہم السلام کی مشترک میراث ہے۔ قرآن پاک کے دو حکم مقام پر آتا ہے: شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ یعنی ہم نے آپ کی طرف وہی دین نازل کیا جو نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کی طرف نازل کیا۔ دین ایک بنیادی معیہ ہوئے جو حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی رہا ہے۔ ہمیں اولین نبیر توحید ہے۔ اسکے بعد فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور قیامت پر ایمان ہے۔ یہ ایسے بنیادی عقائد ہیں۔ جن میں کسی زمانے میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ ملت میں سوئے سوئے اصول اور کلیات ہوتے ہیں۔ جنات انبیاء علیہم السلام کی ملت میں بھی بہت مذمت شرک ہوتا ہے اور ملت کبھی منحرف نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ بعض کلیات ہر ملت میں قائم رہے ہیں۔ مثلاً طہارت، خدا کے سامنے عاجزی، ساحت و حیاض، عدل و انصاف، تہذیب نفس وغیرہ۔ یہ ایسی چیزیں ہیں۔ جو تمام ملل میں قدر مشترک رہی ہیں۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام اور حضور علیہ السلام کی گویا ایک ہی ملت ہے۔ ایسے ملت اسلام کہ لیں یا ملت ابراہیمی، مطلب ایک ہی ہے۔ اور اس آخری دور میں حضور علیہ السلام کا اتباع ہی ملت ابراہیمی کا اتباع ہے۔ جو شخص نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی ملت کا فرد نہیں ہے۔ اُسکی طرف سے ملت ابراہیمی سے تعلق کا دعویٰ باطل ہے۔ ایسا شخص گمراہ ہوگا۔ چنانچہ اس وقت

یودی اور نصرانی دونوں ملعون گردہ ہیں۔

ہر نبی کی شریعت مختلف ہوتی ہے۔ شریعت میں مسائل کی جزئیات ہوتی ہیں جو مکالمہ زمان کی مناسبت سے ہلتی رہتی ہیں۔ اسی لیے فرمایا: لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا ہم نے ہر امت کے لیے جدا جدا شریعت بنائی ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے عَنْكَ مَفْشَرُ الْأَنْبِيَاءِ أَوْلَادُ عِلَاقَتٍ دِينًا وَاحِدًا ہم انبیاء علیہم السلام کا گردہ علاقائی بھائی ہیں۔ مگر ہمارا دین ایک ہی ہے۔ علاقائی بھائی وہ ہوتے ہیں جن کا باپ ایک ہو اور مائیں مختلف ہوں حضور علیہ السلام نے اس مثال سے یہ بات سمجھائی کہ دین ایک بنیاد پر ہے۔ جو کہ غیر تغیر پذیر ہے۔ مگر شرائع یعنی عزیمات مختلف زمانوں میں ہلتی رہتی ہیں۔ جیسے حلال و حرام کے مسائل ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں دو گئی بنیں بیک وقت ایک مرد کے نکل میں آسکتی تھیں۔ ہماری شریعت میں یہ ناجائز ہے۔ ان کی شریعت میں اونٹ کا گوشت کھانا جائز نہیں تھا۔ مگر ہماری شریعت میں جائز ہے۔ مقصد یہ کہ شریعت ایک تغیر پذیر چیز ہے۔ امت کے بڑے بڑے اصول مشترک ہوتے ہیں۔ اور دین بالکل غیر تغیر پذیر ہے۔ یہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام
کا مرتبہ ذیشان

وقت ابراہیمی کے تذکرہ کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہاں پر تعریف بیان فرمائی ہے۔ وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں نبوت و رسالت اور امامت و پیشوائی کے لیے منتخب فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دنیا میں درجہ کمال تک پہنچایا اور آپ کو عزت اور شرف عطا کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے منتخب شدہ برگزیدہ انسان تھے وَلَئِنَّ فِي الْاٰخِرَةِ لَعِمْرَ الصّٰلِحِيْنَ اور آخرت میں وہ نیکو کاروں میں شمار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دنیا اور آخرت ہر دو مقام میں بزرگی عطا فرمائی۔ لَئِنْ اَنْتَ اِلَّا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَالْاَعْمٰوْنَ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام
کی شہرہ نامزدی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نبوت و امامت جیسے منصب جلیلہ پر فائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ اَسْلِمْ اَنْتَ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ اَنْتَ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ اَنْتَ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ

کا ارشاد گرامی ہے۔ مَنْ مَاتَ عَلَى شَيْءٍ ابْتَغَى اللَّهُ عَلَيْهِ جَوْشَخْصٍ حَسْبِ عَقِيدَةٍ پرمے گا۔ اُمّی پر قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔ لہذا تمہاری موت دین حق پر آنی چاہیے۔ تاکہ روزِ محشر یہی دین لے کر اٹھو۔

یہودیوں کے لٹریچر میں اس وصیت کے ضمن میں حضرت اسحق علیہ السلام کا بھی ذکر ہے۔ کہ انہوں نے بھی اپنی اولاد کو ایسی ہی وصیت کی تھی۔ جب ان کا وقتِ موعود آپہنچا، تو انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو بلا کر کہا کہ میں تم کو اس خدا کا واسطہ دیتا ہوں، جس کی صفاتِ لہِ عظیم، قیوم اور عزیز ہے۔ اور جو آسمان و زمین کے درمیان ہر چیز کا خالق ہے۔ تم اُمّی خدا کا خوف رکھنا اور اُسی کی عبادت کرنا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی وقتِ آخر اپنے بیٹوں کو پاس بلا کر کہا۔ مجھے خدا شہ ہے۔ کہ تم میں سے کوئی بت پرستی اور شرک کی طرف میلان رکھتا ہے۔ تو بیٹوں نے جواب دیا۔ سُن لے اسرائیل! لے ہمارے باپ! ہمارا خدا وہی ہے جو سُبُوحٌ قُدُّوسٌ ہے۔ اور جس طرح ایک خدا تعالیٰ پر تیرا ایمان ہے۔ اُسی طرح ایک خدا پر ہمارا بھی ایمان ہے۔ بہر حال یہ حضرت ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام کی وصیت کا ذکر تھا۔ جو اس آیت میں بیان ہوا۔

اگلی آیت میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت کا بطور خاص ذکر فرمایا۔ یہودیوں نے کہا کہ یاد دہانی کرائی جا رہی ہے۔ کہ تمہارا یہ دعویٰ باطل ہے۔ کہ تم ابراہیم، اسمعیل، اسحق اور یعقوب علیہم السلام کو ماننے والے ہو۔ انہوں نے یہودیت یا نصرانیت کی تعلیم نہیں دی تھی۔ ان کی تعلیم تو واضح طور پر توحید پر مبنی تھی۔ فرمایا اس واقعہ کو یاد کرو وَاٰخِرُ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ۔ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ کیا تم اس وقت موجود تھے۔ جب یعقوب علیہ السلام کے پاس موت آئی۔ اِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِي جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا، تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے یہودیوں کی روایت میں یہ بھی موجود ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا مجھے شبہ ہے کہ تم میں کوئی شرک کی طرف میلان

نہ رکھتا ہو۔ ترمیٹوں نے بیک آواز جواب دیا قَالُوا نَعْبُدُ إِلَهَكَ ہم تیرے معبود کی عبادت کریں گے وَاللَّهُ أَبَاحُكَ اور تمہارے آباؤ اجداد اب اس معبود وَاسْمَعِيلَ واسحق اور اسماعیل اور اسحق علیہم السلام کے معبود کی عبادت کریں گے۔ إِلَهًا وَاحِدًا جسے جو ایک ہی معبود ہے۔ ہم صرف اُسی کی عبادت کریں گے۔ وَنَحْنُ لَكُمْ مُسْلِمُونَ اور ہم صرف اُسی کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔ یہ سب باتیں حضرت یعقوب علیہ السلام کے دم واپسین کے وقت کی ہیں۔ جو اپنی اولاد کو دین توحید اور ملت ابراہیمی پر کار بند بننے کی تلقین فرما رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان تمام واقعات کے پیش نظر یہود و نصاریٰ کے لیے ملت ابراہیمی سے انحراف کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر ان میں ذرا بھی انصاف کا مادہ موجود ہو۔ اور وہ تعصب کی عینک اتار کر دیکھیں تو انہیں حضور علیہ السلام پر ایمان لانا ہو گا۔ کیونکہ آپ ہی ملت ابراہیمی کے پتھے پیرو کار اور پتھے جانشین ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے اس دعوے کی تردید فرمائی ہے کہ وہ ملت ابراہیمی پر ہیں۔ آگے سورۃ آل عمران میں آئے گا۔ کہ اے بنی اسرائیل! اگر تمہارا دعوایہ یہ ہے کہ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پر ہو۔ تو بنی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا پڑے گا۔ آپ کے بغیر سب ادیان باطل ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف تمہاری جھوٹی نسبت کچھ مفید نہ ہوگی۔

ہر امت اپنے
افعال کی ذمہ دار
ہے

ان جلیل القدر مخبروں حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد کی توحید پر سختی کے بعد فرمایا۔ يَذَلُّكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی، وہ دین توحید پر قائم رہی لہٰذا مَا كَسَبَتْ انہیں کے لیے ہے جو کچھ انہوں نے کیا۔ یعنی ان کے عقیدہ اور اعمال و افعال کا اجر ان کو ملے گا وَلَكُمْ مَقَاتُكُمْ اور تمہارے لیے وہ ہو گا جو تم کا دُعا ہے۔ اگر تم بھی ان کے طریقے پر چلتے ہوئے دین اسلام اور ملت ابراہیمی کا دامن تمام لوگے۔ تو مراد کو پہنچو گے۔ اور اگر بنی ضد اور عناد پر قائم رہے۔ تو ملت ابراہیمی سے خالی خولی نسبت کچھ کام نہ آئے گی اور تمہارے عقیدے اور اعمال کے مطابق ہی تمہیں بدل دیا جائے گا۔ اہم غزالیؒ نے بڑی عمدہ مثال دی ہے۔ کہ اگر بیٹا بھوکا یا پیاسا ہو اور باپ کھاپی لے۔ تو بیٹے کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اس کی بھوک اور پیاس رفع نہیں ہوگی۔

جب تک وہ خود نہیں کھائے پئے گا۔ اسی طرح یسود و نصاریٰ کے آباؤ اجداد کا دین اسلام پر قائم ہونا انہیں کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ جب تک یہ خود ہٹ دھرمی چھوڑ کر ملت ابراہیمی کو نہ اپنائیں۔ فرمایا وَلَا تَسْأَلُونَنَا عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے آباؤ اجداد کا دین کیا تھا۔ وہ کیا کرتے تھے، بلکہ تمہیں خود ان کی صحیح معنوں میں پیروی کرنا ہوگی۔ تمہارے اعمال کی باز پرس تمہیں سے ہوگی۔

اللہ کا ہم اختیار کیا ہے۔ اور کون زیادہ بہتر ہے اللہ سے بہتیار ملک کے

اللہ ہم اسی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے ہیں (۱۳۸)

گزشتہ سیرت

یہود و نصاریٰ اور شرکین میمنہ و مابینہ کے مخالف تھے۔ خصوصاً اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ اپنی یہودیت اور نصاریت کو سیقتِ ابراہیمی خیال کرتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی یہی چیز اختیار کرنی دعوتِ مسیح تھی۔ مدینہ طیبہ کے اطراف میں جسے ولسے یہودیوں میں ایک بڑا عالم عبد اللہ بن مسور یا مشور زمان تھا۔ اُس نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دی کہ آپ یہودیت اختیار کر لیں ہدایت پابائیں گے۔ دلیل اُسی بھی یہ تھی کہ وہی اصل ابراہیمی طریقے پر قائم ہیں۔ مابینہ ان کا یہ دعوئے غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہودیت تورات کی بجائی ہوئی شکل ہے۔ اور نصاریت انجیل کی نسخہ صورت۔ انہوں نے آسمانی کتابوں میں شرک کی آمیزش کے اپنے مذہب کو باطل کر لیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف خالی نسبت پر ہی اترتے ہیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے ان کے باطل عقائد کو رد فرمایا ہے۔

یہودیت

اہل کتاب کا باطل کی طرف دعوت کا طریقہ یہ تھا کہ وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارًا تَهْتَدُوا۔ وہ کہتے تھے کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ۔ ہدایت پاباؤ گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعوت کو رد فرماتے ہوئے نبی علیہ السلام کو ارشاد فرمایا کہ اہل کتاب کی دعوت کے جواب میں قُلْ بَلِّغْ مِلَّةَ آبَائِهِمْ حَنِيفًا۔ آپ ان کو کہہ دیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ ہم تمہارا باطل مذہب اختیار کر لیں۔ اور اگر اس میں بگاڑ نہ بھی پیدا ہو تو بھی تورات اور انجیل تو مفسور ہو چکی ہے۔ اب قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ جو کہ پہلی کتابوں کی ناسخ ہے لہذا اب تورات اور انجیل پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔ یہودیت کا باطل طریقہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایجاد ہوا تو وہ یہودیت ہے۔ ہرگز ان کا طریقہ نہیں جسے اختیار کیا جاسکے۔ اسی طرح موجودہ نصاریت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دو سال بعد ایجاد ہوئی ہے۔ موجودہ نصاریت کا پیش کردہ عقیدہ تثلیث ہرگز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم نہیں ہے۔ لہذا یہ دونوں مذہب کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہیں ہیں۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ مسالطہ ابراہیمی نہیں ہے۔ بَلِّغْ مِلَّةَ آبَائِهِمْ حَنِيفًا۔ ہم تو اصل قسمت ابراہیمی کی پیروی کریں گے۔ اُس حقیقی قسمت کو اختیار کر کے ہی پرہیزگار

ہیں گے پہلی آیتوں میں گنہگار ہے کہ صحیح ملتِ ابراہیمی ہی ملتِ اسلامیہ ہے۔ وَمِنْ ذُنُوبِهِ
عَنْ مَلَّةٍ يُدْرِكُهَا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ اور اس ملت سے انحراف نہ
کر لی بیوقوف ہی کر سکتا ہے۔ اور ان کا طریقہ تراشہ تعالیٰ کی اطاعت کا طریقہ ہے۔ اور اس
آخری دور میں شریعتِ محمدیہ ہی ملتِ ابراہیمی کی اصل بنشیں بن۔ لہذا ہم تو اس ملت کا اتباع کریں
گے جو حضرت ابراہیم خلیفہ علیہ السلام کی ملت ہے۔ اور یہ اب شریعتِ محمدی کی شکل میں بہت
پاس موجود ہے۔

لفظِ حنیف
کا معنی

حنیف عربی زبان میں اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کے پاؤں میں کچی ہو۔ اور وہ چلتے وقت
ایک طرف کو مائل ہو جاتا ہو۔ اس کو احنف بھی کہتے ہیں۔ لفظ حنیف اُسی مانے سے ہے اور
اس کا معنی ہے۔ ہر طرف سے کٹ کر ایک طرف لگنے والا یعنی یکسو۔ اور اصطلاحاً حنیف اُس شخص
کو کہتے ہیں جو ہر طرف سے کٹ کر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ حُنْفٌ
لِلّٰهِ غَيْرُ مُشْرِكٍ بِدِینِ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق بھی یہی آتا ہے۔ وَمَا
كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ آپ شرک کرنے والوں میں نہ تھے۔ مگر جس یودیت اور نصاریت
کی دعوت تم سے ہے ہو۔ وہ تو شرک سے آلودہ ہے۔ تم تو عتیدۃ البیت کے قابل ہو
جسہں تشبیہ پائی جاتی ہے۔ لہذا ہم تمہارا مشرک زردین قبول نہیں کر سکتے بلکہ ہم تو ملتِ ابراہیمی کا اتباع
کریں گے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیف تھے اور شرک سے پاک تھے۔

شاہِ راز اللہ مکث دہلوی اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حنیف جو شخص ہو
مگر جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا قائل ہو۔ حج کرنے والا ہو۔ نماز میں بیت اللہ شریف کی طرف رخ
کرنے والا ہو۔ فتنہ کرنے والا ہو۔ اور محرمات نکاح کو حرام سمجھتا ہو۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی
تفسیر میں ملتِ ابراہیمی کی چالیس خصوصیات بیان کی ہیں جو اسلام میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں پر پنج کرے
دائے مہر اور ایاں تختہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو مانا ہو۔ بہ حال حضرت ابراہیم علیہ السلام
حنیف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے استاد فرمایا کہ آپ فرمادیں کہ تم تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت

کہ تباہ کریں گے۔ تمہاری خود ساختہ یودیت و نہرانیٹ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

ان بات

فرمایا کہ آپ ان کو اہل قسب ابراہیمی کی تشریح بھی کر دیں۔ فَقُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ یعنی یوں کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر یعنی ہماری تہذیب و دین اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہے۔ ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں مٹھاتے۔ نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ حلال و حرام میں کسی چیز میں اس کا شریک نہیں بناتے۔ بر خلاف اس کے بنی اسرائیل نے حلال و حرام کا منہ سب پار دیوں کے پرہ کر رکھا ہے۔ جسے پار دی حلال کر لے وہ حلال ہے۔ اور جس چیز کو پار دی حرام قرار دے لے، وہ حرام ہو جاتی ہے، حالانکہ تحلیل و تحریم تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ یہ منہ سب اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ اور کسی کے پاس نہیں ہے۔ ہاں جب نبی کسی چیز کی حلت و حرمت کا فتویٰ دیتا ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کے حلال و حرام کردہ حکم کے مطابق ایسا کرتا ہے خود اپنی مرضی کے کسی چیز کو حلال و حرام قرار نہیں دیتا۔ یہودی چونکہ حلال و حرام کا اختیار اپنے اجداد اور رہبان کو سونپتے ہیں۔ اس لیے وہ تحلیل و تحریم میں شرک کے متکب ہوتے ہیں۔

قرآن
برایمان

اہل ایمان کو خطاب ہو رہا ہے کہ ایمان باللہ کے بعد تمام کتب کا دیہ پر ایمان لانے کا بھی اعلان کر دو وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا مِنْ كِتَابٍ إِلَّا هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقٌ لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ازل کی گئی یعنی قرآن پاک وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا مِنْ كِتَابٍ إِلَّا هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقٌ لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ اور جو کچھ نازل کیا گیا ابراہیم، اسمعیل، اسحق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر مکمل آسمانی کتابیں تو چار ہیں۔ ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام پر چھوٹے چھوٹے صحیفے بھی نازل فرمائے۔ چنانچہ قرآن کریم میں سورہ ابراہیم علیہ السلام کے صحائف کا ذکر آتا ہے۔ یہاں پر اسی صحائف کا ذکر ہے۔ کہ جس طرح انبیا کتب کا دیہ پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح ان صحیفہ آسمانی پر ایمان بھی ضروری ہے۔ یہاں تک کہ جس قابل ذکر کتاب میں آیتیں نہایت اہم علیہ السلام کی ہیں، ان سے چاہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے بعد ان انبیا کے بعد جو کتب نازل ہوئے وہی انبیا پر ایمان لانا ایمان کا مشیور ہے۔

فرمایا ہمارا ان کتابوں پر بھی ایمان ہے وَمَا أُولَیٰ مُوسٰی وَعِیْسٰی جِو مَوٰی اور عیسیٰ علیہما السلام کو عطا کی گئیں۔ یعنی توراۃ اور انجیل وَمَا أُولَیٰ النَّبِیُّوْنَ مِنْ دَیْنِهِمْ اور اس چیز پر بھی ایمان لائے جو دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی بغضیکہ یہ ایک قاعدہ کلیہ آگیا کہ اللہ تعالیٰ نے نوع انسان پر جس وقت اور جو کچھ اپنے پیغمبروں کے ذریعے بھیجا ہے۔ سب پر ایمان ہونا لازم ہے۔

ابن ابی حاتم کی روایت میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جہاں تک ایمان لانے کا تعلق ہے۔ تم زبور، توراۃ اور انجیل پر ایمان رکھو مگر وَلِیَسَعِدْکُمْ الْقُرْآنُ عمل کرنے کے لیے تمہارے لیے قرآن پاک کافی ہے۔ یعنی سابقہ کتب پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن پاک نے سابقہ کتب کے احکام کو منسوخ کر دیا ہے۔ اب قابل عمل احکام صرف قرآن کریم کے ہیں۔

اہم شافعی کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کل ایک سو چار کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ ان میں چار کریمہ کتب ہیں۔ یعنی زبور، توراۃ، انجیل اور قرآن کریم اور سو چھوٹی کتبیں صحیفے ہیں۔ جو حضرت آدم، نوح، ابراہیم علیہم السلام اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے۔ ایسے ہی صحیفوں کا ذکر حضرت یونس، حضرت ایوب، حضرت سلیمان علیہم السلام اور دیگر کئی انبیاء کرام کے ساتھ بھی آتا ہے۔ موجودہ مجموعہ کتب معراجہ بائبل کہتے ہیں، اس میں ۳۹ صحائف شامل ہیں۔ ان کتابوں اور صحائف میں اگرچہ بہت کچھ تحریف و تزیین ہو چکی ہے۔ تاہم یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہیں اور ہمارا ان سب پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بذریعہ وحی انبیاء کرام پر نازل فرمائے۔

رسول اللہ ایمان

آگے اس بات کا اقرار ہے لَا تَفْشَقُ بَیْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ تَمَامُ ہمارا ان تمام رسولوں پر بھی مکمل ایمان ہے۔ جن پر کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے۔ بلکہ ان انبیاء کرام پر بھی ایمان ہے جن پر کوئی باقاعدہ کتاب نازل نہیں ہوئی۔ اور ہم ان کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتے جہتِ حقیقت یہ ہے کہ ایمان مکمل اُسی صورت میں ہوتا ہے جب تمام انبیاء علیہم السلام پر بلا تفریق ایمان ہو

کسی پر ایمان لانا اور کسی پر نہ لانا۔ یہ تو کفر کے مترادف ہے۔ بنی اسرائیل اسی وجہ سے گمراہ ہوئے کہ وہ بعض انبیاء کرام علیہم السلام پر تو ایمان لائے مگر بنی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا۔ دیکھو! اہل اسلام تمام سابقہ انبیاء کرام پر یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام و دیگر سب پر ایمان رکھنے کے ساتھ بنی آخر الزمان علیہ السلام پر بھی ایمان لائے ہیں۔ مگر یہ دود و نصاریٰ آخر نبی کے منکر ہیں۔ اس لیے یہ کافر ٹھہرے ہیں۔ لَا تَفْتَرِقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ كَمَا مَطْلَبُ یہ ہے کہ ہمارے تمام انبیاء کرام پر یکساں ایمان ہے۔ ہم کسی میں بھی تفریق نہیں رکھتے۔ جو انبیاء کرام ہیں تو ہم کی طرف اور جس زمانے میں بھی مبعوث ہوئے، اگرچہ ہم انہیں جانتے نہیں مگر ان کی بعثت کے یکساں طور پر قائل ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اہل ایمان! تم سبے برحق ہونے کی نشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نبیوں اور اس کی تمام کتابوں کو برحق مانتے ہو۔ اور ان میں کوئی تفریق نہ کرنا نہیں رکھتے۔ وَخُنْ لَهُ مُسْلِمُونَ اور ہم اسی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں جس نے تمام انبیاء اور کتابیں نازل فرمائیں۔ اور یہی ملتِ ابراہیمی کا اصول ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کو معیارِ حق قرار دیا۔ اور فرمایا
فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُ بِهِ اگر یہ کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ بھی اُسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو فَقَدْ اهْتَدَوْا تو یہ بھی ہدایت پا جائیں گے گویا نزولِ قرآن کے زمانہ میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین صحابہؓ معیار قرار پائے۔ مگر بعد میں آنے والوں کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ بھی انہیں کا طریقہ اختیار کریں۔ وہ بھی اُسی معیار پر پرکھے جائیں گے۔ چونکہ اُس زمانے کے یہود و نصاریٰ صحابہؓ کے معیار پر پورے نہ اُترے۔ وہ اس طرح تمام انبیاء کرام اور تمام کتابوں پر ایمان نہ لائے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ ایمان لائے تھے۔ لہذا وہ مردود ہوئے۔ آج بھی جو کوئی صحابہ کرامؓ کے طریقے کے خلاف کرے گا۔ گمراہ ہوگا۔ اسی لیے تو حضور علیہ السلام نے نامی گروہ کے متعلق فرمایا مَا أَنَا عَلَيْهِمْ وَأَصْحَابِي

مصدق

یعنی نجات یافتہ وہی لوگ ہوں جو میرے اور میرے عتاب کے طریقے پر ہوں گے۔ باقی سب گمراہ ہوں گے۔ صحابہ میں سے آپ نے خلفائے راشدین المدین کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔
 کیونکہ ان کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے تمام خطہ زمین پر دین کو استحکام بخشا۔ واقعہ یہ کہ تکلیف کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو مسلمانوں سے ٹکرے سکے۔ سب مغلوب ہو چکے تھے۔ نہ صرف
 دلیل سے بلکہ سیاسی طور پر اسلام غالب آچکا تھا۔ یہ تو حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے امین جہلش
 کی وجہ سے حالات نے پٹا کھایا۔ ورنہ پچاس سال تک اسلام ہزٹن سے غالب رہا۔

الغرض! یہودیوں نصاریٰ کو فرمایا کہ تمہارا دین اور تمہارا ایمان درست نہیں ہے بلایت
 حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تم بھی دین حق پر اسی طرح ایمان لے آؤ جس طرح اہل
 ایمان لاتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں کرو گے۔ اپنی عند اور بہت دھرمی پر اڑے رہو گے تو ہدایت نہیں
 پاؤ گے۔

اہل ایمان
 کی کامیابی

فرمایا اگر یہ مکمل ایمان لانے کی بجائے وان تو تھو اگر یہ رد و رانی کریں گے فَاِنَّكُمْ
 لَكُمْ فِي شِقَاقٍ تَوْبَةٍ يَحْضُرُ خُذُوا اخْتِلَافَ مِثْلٍ پڑے ہوئے ہیں۔ یہ نہ تو منصف مزاج ہیں
 اور نہ ہی حقیقت کے طلبکار ہیں۔ آپ اپنا کام کرتے چاہیں۔ ان کی پروا نہ کریں فَسَيَكْفِيكُمْ
 اللَّهُ ان کی طرف سے ہر شرف و رکے جواب میں اللہ تعالیٰ آپ کی کفایت کرے گا۔ آپ کو
 ان کی شرارتوں اور جیل ساز یوں سے محفوظ رکھے گا۔ اور جو لوگ آپ کے متبع ہیں۔ وہ بھی ہر حال
 میں گے: اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ آپ کے دشمن ہی ذلیل و خوار ہوں گے۔ آپ اور آپ کے
 ساتھی بالآخر کامیاب و کامران ہوں گے۔ چنانچہ اہل کتاب نے دیکھ لیا کہ عتورے سی عمر میں
 اسلام یوں سے عرب اور پھر اُدھی دنیا تک پھیل گیا۔ وہی اہل کتاب جو آپ کے خلاف طح طرح کی
 سازشیں کرتے تھے۔ انہیں مدینہ طیبہ اور دیگر قلعوں سے نکلنا پڑا۔

ملوکیت کی
 خسریاں

صحابہ کرامؓ نے جو معیار قائم کیا تھا وہ بڑے اونچے درجے کا معیار تھا۔ اور اس پر کار بند
 رہنا بھی آسان نہیں تھا۔ چنانچہ بعد میں آنے والے لوگ اس معیار کو قائم نہ رکھ سکے اور خلافت کی بجائے

ملوکیت کا راستہ اختیار کر لیا۔ خلافت راشدہ کے طریقے کو پس پشت ڈال دیا اور عیاشی و فحاشی والا طریقہ اختیار کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بنی اسرائیل کی طرح یہ بھی ذلیل ہوئے۔ یہ درست ہے کہ بعد میں کچھ اچھے لوگ بھی آئے اور اسلام کو وقتی طور پر تقویت بھی حاصل ہوئی۔ مگر بحیثیت مجموعی بگاڑ پیدا ہوتا چلا گیا۔ اور ملوکیت اور ڈکٹیٹر شپ آگئی اور ہر صاحب اقتدار اپنی من مانی کرنے لگا۔ چوبہ کی افضل حق ہماری قوم کے بڑے مدبر انسان ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب میں بڑے ذکھ کے ساتھ ایک جملہ لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب بنی امیہ کا دور آیا تو انہوں نے خلافت راشدہ کے نفیس فرش کی جگہ شنشاہیت کا ناٹ بچھا دیا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ جو معیار حق صحابہؓ نے قائم کیا تھا اس میں زوال آگیا۔ اور امت میں اتفاق و اتحاد کا دامن مارا رہ گیا۔ جنگ اُمد میں اگرچہ شکست کا رمن کرنا پڑا مگر صیہ کرارم نے وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ مَّا يَكْمُلُ لَكُمُ الْكَيْدُ مِنَ الْكَيْدِ کو برداشت کیا۔ بلکہ اپنے اتحاد کو اور مضبوط کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑا۔ بلکہ تھوڑے ہی عرصہ میں اسلام عرب سے نکل کر دور دور تک پھیل گیا۔

اہم البو بخربصا ص فرماتے ہیں کہ جس معاملہ میں وحی کے ذریعے رہنمائی نہ کی گئی ہو، اُس معاملے میں نبی کے لیے بھی واجب ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرے۔ مگر ملوکیت کے راستے پر چل نکلنے والے صاحب اقتدار لوگوں کو اپنی من مانی کرنے کا کہاں حق پہنچتا ہے۔ ایسے لوگ تو ابلیس کے راستے پر چلنے والے ہیں۔ کابل مصر اور بخارا وغیرہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں وہاں کے ملوک نے کس قدر ظلم کیے۔ اسلام کے صحیح طریقے کو چھوڑ کر باطل طریقے پر چل نکلے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر صدیوں سے زوال محیا ہوا ہے۔ الغرض! اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو فرمایا کہ اگر کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ اپنی ضد پر اڑے رہیں تو آپ گھبرائیں نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارا حامی و ناصر ہو گا۔ ان کے مقابلے میں وہ تمہارے لیے کفایت کرے گا وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ وہ ہر ایک کی دُعا کو سنتا اور ہر چیز کو جانتا ہے۔ اُس سے کچھ مخفی نہیں۔

مبغوثہ

فرمایا یہ آپ کو یہودیت اور نصرا نیت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ آپ انہیں فرمائیے کہ صِبْغَةَ اللہِ ہم نے تو اللہ تعالیٰ کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ تمہاری باطل یہودیت اور نصرا نیت سے ہمارا کیا تعلق؟ اور اللہ تعالیٰ کے رنگ سے مراد کوئی رانسی رنگ از قسم شہنشاہ نیلایا پیدا نہیں بلکہ توحید اور اخلاص کا رنگ ہے۔ یہ وہ رنگ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے سے انسان کے چہرے پر نمایاں ہوتا ہے۔ یہ رنگ ان کے اقوال و افعال و اعمال پر کار کی وجہ سے اور چمکتا ہے۔ ہم نے یہ رنگ اختیار کیا ہے۔ یہ یہودیت اور نصرا نیت والا رنگ نہیں جو کہ کپڑوں اور جسم پر لگا کر عیسائیت میں تختی کا اظہار کرتے ہیں

فرمایا: وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً اور اللہ کے رنگ سے اچھا کون سا رنگ ہوگا۔ جو کہ توحید، عبادت، ریاضت، دیانت اور ایمان کا رنگ ہے۔ یہ ملت ہر ابھی کا رنگ ہے جو صرف اہل ایمان کو حاصل ہے۔ جو اس ملت پر صحیح معنوں میں کار بند ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کے سحر گذار ہیں۔ جس نے ہمیں اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ وَنَحْنُ لَهُ عِبْدٌ اِس لیے ہم اسی اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں۔ ہم کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہیں کرتے۔

الْم

درس پنجاہ چہار

البقرة

(آیت ۱۳۹، ۱۴۱)

قُلْ اَتَحَاجُّوْنَكَ فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَا اَعْمَالُنَا
 وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۝۱۳۹ اَمْ تَقُولُوْنَ اِنَّ
 اِبْرٰهِيْمَ وَاسْمٰعِيْلَ وَاسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا
 يَهُودًا اَوْ نَصٰرٰى قُلْ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ وَمَنْ اَظْلَمُ
 مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا
 تَعْمَلُوْنَ ۝۱۴۰ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ
 مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۴۱

ع

ترجمہ: ہاے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے (اہل کتاب سے) کیا تم ہم سے اللہ کے
 بارے میں جھگڑا کرتے ہو۔ حالانکہ وہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب بھی ہے۔ اور ہمارے
 لیے ہمارے اعمال ہیں۔ اور تمہارے لیے تمہارے اعمال۔ اور ہم اُسی کے لیے اخلاص
 کرنے والے ہیں ۝۱۳۹ کیا تم یوں کہتے ہو کہ (حضرت) ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور
 یعقوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے، آپ فرمادیجئے کیا زیادہ
 جانتے ہو یا اللہ تعالیٰ۔ اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا۔ جو اس کو اپنی کوتاہی سے
 جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے پاس ہے۔ اور اللہ ان کاموں سے غافل نہیں ہے
 جو تم کرتے ہو ۝۱۴۰ یہ ایک جماعت ہے جو گنہگار تھی۔ اس کے لیے وہی کچھ ہے
 جو اُس نے کیا۔ اور تمہارے لیے وہ کچھ ہے جو تم نے کیا۔ اور تم سے ان کاموں
 کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔ جو وہ کرتے تھے ۝۱۴۱

گزشتہ درس میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ یہود و نصاریٰ مسلمانوں کو اپنے اہل مذہب کی عزت
 و محبت دیتے تھے کہ یہودی نصرانی بوجہ اولادیت پہاؤ گے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ
 نے اہل ایمان سے کہلویا کہ ہم تو ملت ابراہیمی کے پیروکار ہیں اور اسی پر کار بند رہیں گے۔

کلمہ

رسالت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ حالانکہ گذشتہ آیات میں گدہ پرکھا ہے کہ وَاللّٰهُ يَخْتَعِرُ
بِرَحْمَتِهِ مَن يَّشَاءُ اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے

_____ کسی ایک فرد یا قوم نے ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کی رحمتیں صرف
انہیں کے لیے ہیں۔ اسی چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کسب کیا تم اللہ تعالیٰ کے پاس میں ہم سے
جھگڑا کرتے ہو۔ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ عَلَانِیۃً وہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب بھی۔ اس
میں جھگڑا کی کون سی بات ہے۔ اگر اس نے ایک زمانے میں کسی ایک خاندان کو برتری عطا
کی ہے۔ تو دوسرے زمانے میں دوسرے خاندان کو شرف بخشا ہے۔ کیونکہ وہ ساری مخلوق کا رب ہے
اس کی نظر میں سب برابر ہیں۔ وہ سب کا مالک ہے۔ لہذا تم میں آپس میں مخالفت نہیں پیدا کرنی
چاہیے۔ اور اگر تم نے ضرور جھگڑا ہی کرنا ہے۔ تَرَوْكُنَّ اَعْمَالَنَا وَلَكُنَّ اَعْمَالُكُمْ
ہماری اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہاری اعمال تمہارے لیے۔ یعنی ہم اپنے اعمال کے ذمہ دار
ہیں۔ اور تم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو۔ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ اور ہم تو صرف اُسی خالق و مالک
کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔

اخلاص
فی الدین

اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری ہی ملتِ ابراہیم علیہ السلام کا بنیادی اصول ہے۔ تم
باطل نظریات کی طرف دعوت دیتے ہو۔ یعنی یہودیت یا نصرانیت کو اختیار کیا جائے۔ یہ ممکن
نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت لامحدود ہے۔ وہ جسے چاہے اپنی رحمت سے فضا بھر دے
کسی کو اعتراض کا کوئی حق نہیں۔ بجز اللہ ہم نے ایمان تسلیم کر کے اپنے اندر اخلاص پیدا کیا
ہے۔ اور صحیح معنوں میں ملتِ ابراہیم میں شامل ہونے میں حضور علیہ السلام کا فرمان ہے
اَخْلَصُ فِي دِينِكَ يَكْفِيكَ قَلِيلٌ مِنَ الْعَمَلِ یعنی اپنے دین میں اخلاص پیدا
کر۔ تمہارا اعتزاز عمل بھی کفایت کر جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صرف مخلص عمل ہی قابل

قبول ہوتا ہے۔ ریاکاری اور دکھادے کا عمل ہمیشہ مردود ہوتا ہے۔ اہل کتاب کے عقائد اخلاص سے خالی ہیں۔ وہ ضدی اور عنادی میں۔ لہذا ہماری ان سے مصالحت نہیں ہو سکتی۔ مشرکین کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا: لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ یعنی تمہارے لیے تمہارا دین ہے۔ اور ہمارے لیے ہمارا دین۔ اب صلح کی گنجائش نہیں۔ یہاں بھی اہل کتاب کو فرمایا کہ تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں گویا یہ ایک چیلنج ہے کہ آئندہ جہاد کرنا پڑے گا۔ اس کے بغیر کوئی چارہ کار باقی نہیں رہ گیا۔

انبیائے سابقین کا عقیدہ

اہل کتاب کا دعویٰ تھا کہ پہلے جتنے بھی انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لائے ہیں۔ وہ سب کے سب انہیں کے عقیدہ پر یہودی یا نصرانی تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اس غلط دعویٰ کا جواب دے دیا ہے۔ اَمْرُ تَقْوٰی لَوْ كُنْ كَيْفَ تَمَّ يَهْتَدُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاسْمٰعِیْلَ وَیٰحٰقَ وَیَعْقُوبَ وَالْاَسْبَاطَ کَانَ اٰمُوْدًا اَوْ نَصٰرًا اَوْ حٰنَظِلًا اَبْرٰهٖمَ اِسْمٰعِیْلَ وَیٰحٰقَ وَیَعْقُوبَ عَلَیْہِمُ السَّلَامُ اور ان کی اور یہودی یا نصرانی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ اے پیغمبر! آپ ان کے فرمادیں۔ کہ اس دعوے کے متعلق اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمْرُ اللّٰہِ کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ تعالیٰ زیادہ جانتا ہے۔ کہ انبیائے سابقین کس طریقے پر تھے۔ فرمایا یہ حضرات یہودی تھے اور نصرانی بلکہ وہ تو ضعیف تھے۔ یعنی خالص اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنے والے تھے۔ تمہاری یہ یہودیت یا نصرانیت تو تیراۃ اور انجیل کے بگاڑ کا نتیجہ ہے۔ اور انبیائے متعلقین سے صدیوں بعد کی پیداوار ہے۔ ان کا ان باطل عقائد کے ساتھ کیا تعلق وہ تو خالص ملت اسلامیہ پر کاربند تھے۔ اور اُن کی تبلیغ کرتے ہوئے خاص طور پر جب الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعلق کو پہلے بھی کسی درس میں آپ نے فرمایا: مَا كَانَ اِبْرٰهٖمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا فَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَضِلِيْنَ یعنی آپ تو ضعیف اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار تھے۔ آپ مشرکین میں سے قطعاً نہیں تھے۔ لہذا ان کی نسبت یہودیت یا نصرانیت کی طرف کرنا نہایت ہی قبیح حرکت ہے۔ بجلالہ اللہ تعالیٰ کے نبی یہودیت اور نصرانیت کا باطل طریقہ کیسے اپنا سکتے ہیں۔ جو انکار نبوت، عقیدہ تشبیہ اور تفریق بین الانبیاء والا طریقہ ہے۔ ایسے باطل عقائد تمہیں مبارک ہوں۔ انبیائے سابقین ان سے مبرا تھے۔

آگے اہل کتاب کی ایک درزیادتی کو بیان فرمایا۔ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَبَ شَهَادَةً
عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ اسْ تُخْصِ سَے بڑھ کر کون ظالم ہوگا۔ جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے
گواہی موجود ہو۔ اور وہ اُسے چھپائے۔ یہ گواہی کون کی تھی۔ جسے بنی اسرائیل چھپاتے تھے۔
گواہی حضور علیہ السلام کی بعثت۔ قرآن پاک کی حقانیت اور آخری امت کے ہائے میں تھی۔ آگے
آئے گا کہ بنی اسرائیل ایسا جان بوجھ کر کر لیتے تھے۔ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبَاءَهُمْ
یہ لوگ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح پہچانتے تھے۔ جس طرح اپنے بیٹوں کو۔
مگر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ توراۃ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ
کے متعلق واضح پیشین گوئیاں موجود تھیں۔ مگر یہ لوگ عناد اور حسد کی وجہ سے آپ کو آخری نبی تسلیم
نہیں کرتے تھے۔ گویا توراۃ نے جو گواہی پیش کی تھی اور جو خود ان کے پاس موجود تھی۔ اُسے
چھپاتے تھے۔ انہیں کے متعلق فرمایا کہ اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اپنے پاس
موجود شہادت کو چھپا جائے۔

شہادۃ کا چھپانا دیکھ لے بھی گناہ ہے۔ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ إِثْمٌ قَلْبُهُ
شہادت کو چھپانے والے کا دل گنہگار ہے۔ بلکہ صحیح گواہی دینا تو ضروری ہو جاتا ہے بغیر
ہر جب کہ وہ دین کے متعلق ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ
اللہ تعالیٰ کے لیے شہادۃ کو قائم کرو۔ اس کو چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ ورنہ ظالموں میں
شمار ہو گے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی طرف سے کتاب شہادت کو سورۃ اخلاف میں یوں بیان
فرمایا یَجِدُوكُمْ عِنْدَ مَا كُنْتُمْ فِي التَّوْرَةِ وَلَئِنْ جَعَلْنَا اسْ نَبِیْ اُمّی کی
پیش گوئیاں اور حال توراۃ اور انجیل میں ان کے پاس لکھا ہوا موجود ہے۔ مگر یہ حق بات کو
چھپا لیتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی قبیح حرکات کا علم نہیں بلکہ وہ تو
رہبر کو جانتا ہے۔ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ وہ غافل نہیں ہے تمہارے
تمام کارروائی کو جانتا ہے۔ اور مناسب وقت پر تم سے مواخذہ کرے گا

یہ آیت گذشتہ سے پوچھتا ہے کہ اس میں بھی آپ کی سے۔ یہاں اس کو دہرایا گیا ہے

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ يَوْمَ يَأْتِ أُمّتٌ مَحْمُودَةٌ
جو گزر چکی۔ اس کے لیے وہی کچھ ہے جو اس اُمّت نے کیا اور تمہارے لیے وہ ہے جو تم نے
کیا، وَلَا تَسْأَلُون عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ تم سے ان کے بارے میں سوال نہیں کیا جائیگا۔
کہ وہ کیا کرتے تھے۔ بلکہ تم اپنے کمرے کے ذمہ دار ہو۔ وہ اپنے فعال کے ذمہ دار ہیں۔ مطلب یہ کہ اس
ن کتاب اگرچہ تم اپنی نسبت انبیاء علیہم السلام کی طرف کرتے ہو مگر تم ان کے عقیدے پر قائم
نہیں رہو گے۔ لہذا تمہاری یہ جھوٹی نسبت کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ ان کے عقیدے اور اعمال بیشک
درست تھے۔ لیکن وہ تمہارے کسی کام نہیں آسکتے۔ تمہیں اپنے افعال کی خود جوابدہی کرنا ہوگی۔
تَمَّتِ الْبَرَاءَةُ لَكُمْ فِي هَذِهِ الْآيَةِ وَلَا تَزِدْوا زُرَّةً وَلَا تُخْرِجُوا شَيْئاً مِمَّا كَسَبْتُمْ يَوْمَ يَأْتِ أُمّتٌ مَحْمُودَةٌ
کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک شے بھی ہے لَا تَزِدْوا زُرَّةً وَلَا تُخْرِجُوا شَيْئاً مِمَّا كَسَبْتُمْ
وَلَا تَزِدْوا زُرَّةً وَلَا تُخْرِجُوا شَيْئاً مِمَّا كَسَبْتُمْ بَاب اور بیٹے کے متعلق فرمایا کہ بَاب کا گناہ بیٹے کی گردن پر نہیں ہوگا۔ اور
نہ بیٹے کی زیادتی پر بَاب کو چڑھا جائے گا۔ ہر کوئی اپنے کام کا ذمہ دار ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ
انبیاء علیہم السلام کی طرف محض نسبت کر لینا کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ جب تک ان کی پوری پوری اتباع
نہیں کی جائے گی

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ آیت تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ کا دہرایا جانا خاص مقصد کی بنا پر ہے
صرف اہل کتاب کے لیے تو یہ آیت ایک دفعہ ہی کافی تھی۔ اب جو دوسری دفعہ اس کا تکرار کیا گیا ہے
تو اس سے مراد اہل اسلام کی تفسیر ہے کہ اہل کتاب کی طرح وہ بی خالی نسبت پر تکیہ نہ کرنا
چاہیے۔ بلکہ وہ اپنے عقائد اور اعمال کو پاک کریں۔ اللہ تعالیٰ اور نبی علیہ السلام کے احکام کی پابندی
کریں۔ تو ان کے لیے بھی راہ نجات کھل سکتی ہے۔ اپنے اعمال کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ آج کل
کے پیرزادوں، امیر زادوں، گدی نشینوں کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو محابہ کریں۔
آباد اجداد کی خالی نسبت کسی کام نہیں آئیگی۔ بَاب نیک و صالح تھا تو اس کا عمل اس کے ساتھ ہے
بیٹے کو اپنی جوابدہی خود کرنا ہوگی۔ نسبت تو جب مفید ہوگی تب بزرگوں کے خصائص حسبِ زیادہ

اماموں کے ساتھ نسبت کرنا بھی اسی قبیل سے ہے۔ یہی مالِ شائع طریقت کا ہے۔ اپنی نسبت بلند خاندانوں کی طرف کرتے ہیں مگر ان کی ایک خوبی بھی نہیں پائی جاتی۔ آج چشتیہ اور قادریہ سلسلہ کی طرف نسبت کرنے والے کتنی لغویات میں ملوث ہیں۔ کیا شیخ عبدالقادر جیلانی کا یہی طریقہ تھا۔ ان کی کتابیں موجود ہیں۔ ان کے مواظظ اور دیگر تصنیفات ہیں۔ ایک ایک نقطہ سے ایمان اور حقیقت ٹپک رہی ہے۔ کفر اور شرک سے بیزاری کا اظہار ہو رہا ہے مگر ان کی طرف نسبت کرنے والے کفر و شرک اور بدعت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کے عرس منے جاتے ہیں۔ ان کی قبروں پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں۔ رسومات باطلہ کا دور دورہ ہے۔ مگر نسبت ان کی طرف ہے۔ ایسی نسبت کیا فائدہ ملے گی۔

چشتی اپنے آپ کو خواجہ معین الدین چشتیؒ سے منسوب کرتے ہیں۔ اس ملک میں خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ فرید الدین گنج، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ جیسے مشائخ کے ذریعے اسلام کی آبیاری ہوئی۔ ان کے ذریعے برصغیر کے کتنے لوگوں کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔ کتنے لوگوں کا حلق بائیں قائم ہوا۔ ایسے بزرگوں کا اس خطہ ارضی پر کتنا احسان ہے۔ مگر تاج انہیں کے پرکار چشتیہ خاندان کی طرف نسبت کرنے والے راگ، رنگ اور گانے بھگنے میں مشغول ہیں۔ قوالی کا نام دے کر کتنی ہی رسوم باطلہ کو اپنایا جا رہا ہے۔ مگر جیسا کہ بیان ہو چکا۔ یہ خالی نسبت کام نہیں آئی گی جب تک ان بزرگوں کے نقش قدم پر نہ چلیں گے۔ اسی چیز کو یودیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اہل ایمان کو سمجھایا گیا ہے۔ کہ وہ بھی یودیوں کے راستے پر نہ چل نکلیں۔ بلکہ اپنے اندر حقیقی ایمان بیدار کریں۔

ہم سے ہاں امام البرصیفہؒ کی طرف نسبت کر کے حنفی کھلانے والے لوگوں کی اکثریت سے مگر ان میں سے کتنے ہیں جو صحیح معنوں میں امام صاحبؒ کے طریقے پر چل رہے ہیں۔ محض حنفی کھلانے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا جب تک آپ کا اتباع نہ ہوگا، اسی طرح امام شافعیؒ کی طرف نسبت کرنے والے ہیں۔ وہ بھی اپنے طریقہ پر قائم نہیں ہیں۔ دل میں تعصب بھرا ہوا ہے۔ لاکھ شافعی کھلائیں، کچھ فائدہ نہیں۔ اس قسم کی خالی نسبت تو وہی یودیوں والی نسبت ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خبردار کیا ہے۔ کہ ایمان لانے کے باوجود یہودیت کا راستہ

انتیارتہ کریں۔ اور صحیح معنوں میں ملت ابراہیمی اور شریعت محمدی پر قائم رہیں۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان والوں کا نام لے لے کر فرمایا: اے بنی ہاشم، اے بنی عبد المطلب خبردار! ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن لوگ اعمال لے کر آئیں۔ اور تم محض خاندانی تعلق اور رشتہ داری لے کر آؤ۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں تمہیں نہیں بچا سکوں گا۔ آج اپنی فکر کرو۔ اَلْفِ ذَا اَنْفُسِكُمْ مِنَ النَّارِ اپنی جانوں کو درنخ سے بچا لو۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے۔ کہ ایمان کو درست کرو۔ اعمال صالحہ کی دولت حاصل کرو۔ اس طرح تم کو آخرت میں درجات نصیب ہوں گے

فرمایا یہ امت سبے جو گنہگار ہیں۔ جو کچھ اس امت نے کھایا وہ اس کے لیے ہے اور جو تم نے کھایا وہ تمہارے لیے ہے۔ تم سے ان کے اعمال کے تعلق نہیں پوچھا جائے گا۔ کہ وہ کب کرتے تھے۔ بلکہ تمہاری باز پرس تمہارے اعمال کی وجہ سے ہوگی۔ تم سے سوال ہوگا۔ کہ تم نیکی اور توحید پر کار بند تھے یا نہیں۔ تم شرک، بدعات اور رسومات باطلہ سے بچ سکے یا نہیں۔ تم توحید کی دعوت دیتے تھے یا شرک و افعال کی طرف جھٹکتے تھے۔ تم نیکی اختیار کرتے تھے یا لڑائی جھگڑے میں مصروف رہتے۔ آج اپنا محاسبہ کر لو۔ قیامت کے دن تمہارے کاموں کے متعلق تم سے پوچھا جائیگا۔

نمازِ مسنون کلاں

تالیف

حضرت مولانا صوفی محمد الحمید صاحب سواتی

دامت برکاتہم

نمازِ مسنون غلہ کے بعد نمازِ مسنون کلاں ایک ایسی مفید اور نماز کے موضوع کا جامع کتاب ہے
 جو نماز کے تمام ضروری مسائل مع قوی دلائل از کتاب و سنت احادیث و فقہاء و متکلمین
 دینی و مشائخ و علمائے عظام و جمہور مشائخ و علماء اور ائمہ مجتہدین جمہور مشائخ و علماء کے مضبوط اقوال سے
 مزین ہے جس میں طہارت اذان، اوقات نماز، فرض، سنن و استحباب، مکروہات و
 مفسدت کھرا ہیں ہے۔ ارکان، واجبات و سنن کی پوری حکمت اور ضروری مباحث
 و مسائل۔ جمعہ و عیدین، نماز جنازہ اور نوافل وغیرہ کے جلد اجم مباحث اور اس کے
 ساتھ ذکر دعوت اور خطبات کا ایک بہترین نصاب درج ہے۔
 امام مکرئین کے علاوہ ملہار کرام، اساتذہ عظام اور خصوصاً طلباء علم دین کے لیے ایک نعت
 غیر مترقبہ ہے جس کا انداز بیان اور زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہے۔
 عمدہ کاغذ، بہترین کتابت و طباعت، مسیدی جلد بندی و قیمت ۱۶/- روپے

ناشر

مکتبہ دروس القرآن

محلف سارق گنج گوجرانوالہ

ملنے کے ہیں

۱۔ ادارہ نشر و اشاعت مدرستہ نصرۃ المسلمین گوجرانوالہ

۲۔ مکتبہ دروس القرآن فاقی گنج گوجرانوالہ

علماء کرام، طلباء عظام اور عوام الناس کے لیے گرانقدر علمی تحفہ

شمائل ترمذی

مع اردو ترجمہ و شرح

افادات

مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی مدظلہ

مرتب

الحاج لعل دین ایم اے علوم اسلامیہ

مقدمہ، اضافہ، حاشیہ

مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی

یہ کتاب حضور ﷺ کے شمائل و خصائل کے شعبہ میں امام ترمذیؒ کی مشہور زمانہ تصنیف ہے جو کہ مدارس میں درس نظامی کے انصاب میں بھی داخل ہے اس کتاب کے کل چھپن ابواب ہیں جن میں سے ابتدائی پچیس ابواب کی شرح نہایت دلنشین اور اچھوتے انداز میں منظر عام پر آگئی ہے۔ کتاب کی احادیث پر اعراب، سلیس اردو ترجمہ، عمدہ تشریح اور حواشی میں روایات کے اسماء و کنی، القاب، سن موالید و وفیات کے علاوہ بہت سے علمی، تحقیقی مواد پر مشتمل و محفوی ہے۔ عمدہ کتابت، نفیس طباعت اور معیاری جلد بندی کے ساتھ ۵۰۸ صفحات پر مشتمل جلد اول کی قیمت صرف ۱۳۰ روپے ہے باقی ابواب کی شرح انشاء اللہ العزیز جلد دوم میں شائع ہوگی۔

ناشر: مکتبہ دروس القرآن، فاروق گنج گوجرانوالہ پاکستان

معالم العرفان - دُرُوس القرآن

المطابع

مکتبہ اشاعت کتب اسلامیہ، لاہور

ریکارڈنگ

بلال احمد ناگی صاحب

مترجم

الحاج اعلیٰ دین صاحب (پیشہ - مولوی)

زیر انتظام

انجمن مجاہدان اشاعت قرآن

صدر انجمن

شیخ محمد یعقوب عاجز

جنرل سیکرٹری

بابو غلام حیدر صاحب

نمائندہ

محمود انور بٹ ایڈووکیٹ

ماہنامہ مکتبہ (لاہور)

محمد منیر صاحب Ph: 221943

مکتبہ دُرُوس القرآن گوجرانوالہ